Millennium Edition

بیانِ غالب

شرح

دیوانِ غالب

از

آغا محمد باقر

کتابی دنیا دہلی

BAYANE GHALIB

SHARAH DIWANE GHALIB

By

AGHA MOHAMMAD BAQAR M.A.

Year of Edition 2000

ISBN - 81-87666-01-3

Price Rs. 275/-

کتاب کا نام .... بیانِ غالبؔ شرح دیوانِ غالبؔ

مصنف .... آغا محمد باقر ایم، اے

سنِ اشاعت ۲۰۰۰ء

قیمت ۲۷۵/-

کمپوزنگ .... ڈیزائننگ پلس، دہلی

مطبوعہ .... چودھری پرنٹرس، دہلی

PUBLISHED BY

KITABI DUNIYA

1955, T. Gate, Delhi - 110 006. (INDIA)

Tel.: 3274847 ✦ Fax: +91-11-3280025

e-mail: mnasir@vsnl.com

بیانِ غالبؔ

شرح

دیوانِ غالبؔ

از

آغا محمد باقر ایم۔اے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے مدّت دراز سے دیوانِ غالبؔ کے مطالعہ کا شوق ہے اور میں اس بات کو کلامِ غالبؔ کا معجزہ خیال کرتا ہوں کہ یہ شوق کسی عنوان کم نہیں ہونے پاتا بلکہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ میں صفائی سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں غالبؔ کو کسی خاص نقطۂ نظر سے سمجھنے کا دعویدار ہوں، نہ دیگر شارحین کی طرح ان کی زبان اور طرزِ بیان پر نکتہ چینی کرنے کے لئے اس میدان میں گامزن ہوا ہوں۔ میں تو غالبؔ کے دلدادوں میں سے ایک دلدادہ ہوں اور ان کے کلام کو روحانی مسرّت اور قلبی تسکین کا بہترین ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ ایک طالب علم کی حیثیت سے دیوانِ غالبؔ کا مطالعہ کیا ہے اور یہ شرح اسی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

کلامِ غالبؔ کے نکات سے لطف اندوز ہونے کے لئے میں نے یادگار غالبؔ مصنفہ مولانا حالؔی، شرح حسرؔت موہانی، طباطبائؔی، سہاؔ، مقدمہ دیوان غالبؔ مصنفہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، بیخوؔد، آسیؔ، شوکتؔ میرٹھی اور سعیدؔ وغیرہ کو سامنے رکھ کر دقّتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کیا اور آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر ایک ایسی جامع شرح تیار کی جائے جو دیوانِ غالبؔ کے طلباء کو بیک وقت مختلف شرحوں کی چھان بین سے مستغنی کروے تو یقیناً یہ ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی۔ ایک مدّت تک اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں یہ خیال مانع رہا کہ کہیں ایسا کرنے سے دیگر شارحین کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ میری شرح سے دوسری شرحوں کی مقبولیت پر کوئی اثر نہ پڑے گا تو میں نے بیانِ غالبؔ کی تکمیل کا مصمّم ارادہ کرکے کام شروع کردیا۔

اس شرح کی تالیف سے میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ دیوان غالبؔ کی شرح پڑھنے والوں کو اگر بالتفصیل نہیں تو مجملاً اس قدر ضرور معلوم ہوجائے کہ مختلف شارحین نے غالبؔ کے ہر شعر کو کس نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور اس کے مفہوم میں کیا کیا موشگافیاں کی ہیں، چنانچہ جن اشعار پر شارحین نے اختلاف کیا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ مختصراً ان کے نقطۂ نظر کو پیش کردیا جائے تاکہ پڑھنے والا آسانی سے سمجھ جائے کہ اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے۔ طوالت کے خوف سے میں نے اختصار کو مدِّ نظر رکھا، پھر بھی یہ خیال سامنے رہا ہے کہ ضروری بات نظر انداز نہ ہونے

پائے اس لئے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اگر دیگر شارحین کی شرح سے پُورا پُورا استفادہ منظور ہو تو اُن کی اصلی شرح دیکھئے کیونکہ میں نے عموماً ان کے اختلافی پہلو کو اخذ کیا ہے اور بیشتر مطالب کو جو ان کی شرح مابہ الامتیاز خصوصیات میں شمار کئے جاسکتے ہیں، نظر انداز کردیا ہے۔

میری شرح کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات خاص طور پر یادرکھنی چاہئے کہ جس شرح پر تمام شارحین متفق ہیں۔ اس کے تحت یہ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ تمام شارحین متفق یا ہم خیال ہیں، نیز جہاں کسی شعر کی شرح لکھنے کے بعد کسی شارح کا کوئی مختلف مفہوم درج کیا گیا ہے تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ باقی شارحین میرے ہم خیال ہیں اور محض اسی شارح کو مجھ سے اور دیگر شارحین سے اختلاف ہے۔ اسی طرح جہاں چند شارحین ایک خیال پر متفق ہیں اور باقی دوسرے خیال پر مجتمع۔ وہاں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ ہاں طوالت سے بچنے کے لئے ایسے شارحین کا نام اختلافی شرحوں کے تحت میں نظر نہ آئے، ان کو میرا ہم خیال تصور کرنا چاہئے۔

مولانا حالؔی کی شرح کو میں نے مقدّم خیال کیا ہے۔ جس شعر کی شرح انہوں نے تحریر فرمائی ہے اس کو اسی طرح درج کردیا ہے۔ بعض اشعار کی اُنہوں نے نہایت مختصر شرح لکھی ہے۔ ایسے مقامات پر میں نے خود وضاحت کرنے کی جسارت کی ہے۔ بیخوؔد اور سعیدؔ، مولانا حالؔی کی شرح نقل کرنے میں میرے پیشرو ہیں۔ اس لئے جہاں حالؔی مرحوم کی شرح درج ہو وہاں ان دونوں شارحین کے ناموں کو مقدّر خیال کرنا چاہئے۔

میری شرح کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ میں غالبؔ پر تخریبی نکتہ چینی کرنا سوء ادبی خیال کرتا ہوں اس لئے میں نے عموماً اس سے گریز کیا ہے۔ ہاں جن اشعار کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے ان کی معنوی اور لفظی خوبیوں پر باالتزام اور مسلسل روشنی ڈالی ہے، گویا میرا مطمحِ نظر ادب کے مطالعہ سے روحانی اور قلبی تفریح ہے نہ کہ طعن وطنز اور بدمزگی۔

میں آخر میں پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ شرح طباطبائؔی، آسؔی، سہاؔ، سعیدؔ، بیخوؔد، حسرؔت اور مولانا حالؔی کی شرحوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، اور میرے خیالات کی پختگی ان کی تہِ دل سے ممنون ہے۔

محمد باقر

۲۹ مئی ۱۹۳۹ء

فہرست

قصائد

قطعات

رُباعیات

☆☆☆☆☆☆☆

الف

۱

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا ۱ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ ۲ صبح کرنا شام کا لانا ہے جُوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہئے ۳ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے ۴ مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
مُوئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

۱۔ نقش:۔ صورت، تصویر : فریادی:۔ فریاد کرنے والا: شوخیٔ تحریر:۔ بیدادِ تحریر: کاغذی پیرہن:۔ ایران میں دستور تھا کہ داد خواہ کاغذ کا جامہ پہن کر حاکم کے سامنے جاتے تھے: پیکر:۔ جسم۔

مرزا صاحب نے اس شعر کی شرح ایک خط میں خود بیان فرمائی ہے۔ ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ (فریادی) کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا۔ خون آلود کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے جو صورتِ تصویر ہے۔ اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبارِ محض ہو، موجبِ رنج و ملال و آزار ہے ۱۲ (طباطبائی۔ سعید۔ آسی) اب ملاحظہ فرمائے کہ اس شعر سے شارحین نے کیا کیا نتائج اخذ کئے ہیں:۔

سعید:۔ انسان کی بے بود ہستی اور کشاکش حیات کا نقشہ الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ حاصل شعر کا یہ ہے کہ ہستی خواہ وہ کسی چیز کی بھی ہو باعث تکلیف ورنج ہے۔ حتیٰ کہ تصویر تک بھی جو کہ صرف ایک ہستی محض ہے۔ بزبانِ حال فریاد کر رہی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں رنجِ ہستی میں مبتلا کیا جیسا کہ اس کی کاغذ پیرہنی سے ظاہر ہے۔

آسی و سہا:۔ مولانا روم نے اس مفہوم کو ان اشعار میں ادا کیا ہے۔

بشنواز نے چوں حکایت مے کند وز جدائی ہا شکایت مے کند
کز نیستاں تامرا ببریدہ اند از نفیرم مرد وزن نالیدہ اند

مطلب یہ ہے کہ اصل سے جُدا ہونے کے بعد اضطراری کیفیت پیدا ہونا ضروری ہے، نَے جب نیستان سے جُدا ہوتی ہے تو اس میں فریاد کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب تصویر کاغذ پر بنائی جاتی ہے تو وہ اپنے کاغذی لباس کی بدولت نقاش کی شوخیِ تخلیق کی زبانِ حال سے فریاد کرنے لگتی ہے۔

بیخود:۔ ''ہر پیکرِ تصویر'' سے مراد جملہ حیوانات، جمادات اور نباتات سے ہے اور یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ جب موجوداتِ عالم کا یہ حال ہو تو نقش ہستی کا اپنی بے ثباتی پر فریادی ہونا شاعر کے تخیل بلند اور غیر معمولی جدّت کا ثبوت کامل ہے۔

طباطبائی:۔ کاغذی پیراہن پہننے کا رواج نہ کہیں دیکھا اور نہ کہیں سُنا۔ جب تک اس شعر میں کوئی ایسا لفظ نہ ہو جس سے فنا فی اللہ ہونے کا شوق اور ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو، اس وقت تک اسے بامعنی نہیں کہہ سکتے۔ مصنف کی غرض یہ تھی کہ نقش تصویر فریادی ہے۔ ہستیٔ بے اعتبار اور بے توقیر کا اور یہی سبب ہے کاغذی پیرہن ہونے کا۔ شعر میں ہستیٔ بے اعتبار کی گنجائش نہ ہو سکی۔ اس سبب سے کہ قافیہ مزاحم تھا اور مقصود تھا مطلع کہنا۔ اس لیے ہستی کے بدلے شوخیٔ تحریر کہہ دیا۔ شعر بے معنی ہے۔

طباطبائی کے علاوہ تمام شارحین اس شعر کو بامعنی بتاتے ہیں۔

کاغذی پیرہن پہننے کے سماج کے ثبوت میں یہ اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں:

تا کہ دست قدر ما زدست تو بر بود قلم
کاغذ پیرہن ازدست قدر باو مراد (بابا افغانی)

کاغذی جامہ بپوشید او بدر گاہ آمد
زادۂ خاطرِ من تا بدہی داد مرا (کمال اسمٰعیلی)

۲۔ کاوِ کاو:۔ کاوش و کاہش۔ لفظی تکرار نے جستجو اور سعی پیہم کا مفہوم پیدا کر دیا ہے: سخت جانی:۔ بے حد رنج والم: جُوئے شیر:۔ فرہاد نے شیریں کو حاصل کرنے کے لئے نہر کھودی تھی تلمیح

ہے: صبح کرنا شام کا:۔ شبِ ہجر کا گزارنا:

شبِ ہجر کی مصیبتیں نہ پوچھو، فرقت کی رات کا صبح کرنا اتنا ہی مشکل اور دشوار تھا جتنا فرہاد کا کوہِ بے ستون کھود کر جوئے شیر کا قصرِ شیریں تک لانا مشکل تھا۔ جوئے شیر اور سفیدی صبح میں جو مناسبت ہے۔ اس سے شعر کا مرتبہ بلند ہوگیا ہے۔ شاعر نے سخت جانی کی وجہ سے اپنے آپ کو کوہ کن سے شبِ ہجر کی تاریکی اور سختی کو پہاڑ کاٹنے اور جوئے شیر لانے سے اور سپیدہ سحر کو جوئے شیر سے تشبیہ دی ہے۔

۳۔ جذبہ:۔ کشش: شوق:۔ قتل ہونے کا شوق: دمِ شمشیر:۔ تلوار کی دھار باہر ہوتی ہے۔

میرے شوقِ شہادت کی اس سے بڑھ کر اور کیا کشش ہوگی کہ تلوار کے سینے سے اس کا دم بھی باہر آگیا ہے یعنی وہ میرے قتل کے لئے اتنی بے اختیار ہوگئی ہے کہ اس کا دم اس کے سینے سے باہر نکلا پڑتا ہے۔ اور یہ میرے شوقِ شہادت کی کشش ہے۔

۴۔ آگہی:۔ علیت۔ عقل: دام شنیدن: بچھانا: سننا اور سمجھنا: مدّعا: مطلب مفہوم: عنقا: معدوم:

جس وقت ہم گفتگو کرتے ہیں۔ اس وقت چاہے عقل کتنی ہی سمجھنے کی کوشش کیوں نہ کرے لیکن وہ ہمارے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے اشعار عنقا صفت ہیں۔ وہ دامِ شنیدن میں نہیں آسکتے گویا سراسر اسرار ہیں۔

۵۔ آتش زیرِ پا:۔ بے قرار، بیتاب: مُوئے آتش دیدہ:۔ اگر بال کو آگ کے سامنے رکھیں تو جل کر بل کھا جاتا ہے اور حلقہ زنجیر سے مشابہ ہو جاتا ہے۔

میں زنجیروں میں بھی ایسا بے قرار اور مضطر ہوں کہ سوختہ دل کی گرمی سے میرے پاؤں کی زنجیروں کا حلقہ جلے ہوئے بال کی طرح کمزور ہوگیا ہے۔

حلقہ ہائے زنجیر پا کو مُوئے آتش دیدہ سے تشبیہ دینا مرزا صاحب کا کمال ہے اور ان کا جنونِ عشق مسلم کہ وہ قید و بند سے بھی کم نہیں ہوتا بلکہ زنجیریں بھی گرمیِ عشق سے جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ سعید لکھتے ہیں کہ جلے ہوئے بالوں میں ایک قسم کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا زنجیر سے بو آنے لگی ہے۔

۲

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ۱ صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست ۲ ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ ۳ جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سُود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز ۴ لیکن یہی کہ رفت گیا اور بُود تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی ۵ میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

۱۔ بروئے کار نہ آیا:۔ مقابلے میں نہ آیا: تنگیِ حسود: حاسد بہت تنگ نظر ہوتے ہیں اور وہ کسی کو دیکھ نہیں سکتے یا ان کی نظروں میں کوئی نہیں جچتا: مگر:۔ شاید۔

شاید صحرا بھی باوجود اپنی وسعت کے چشمِ حاسد کی طرح تنگ تھا۔ کہ اس میں سوائے قیس (مجنوں) کے کوئی دوسرا عاشق صحرا نوردی کے لئے نہ آسکا۔ مجنوں کے سوا کوئی اور صحرا نورد پیدا نہ ہونے کا الزام صحرا کی تنگ چشمی پر لگایا گیا ہے اور یہ مرزا ہی کا حصہ ہے۔

۲۔ آشفتگی:۔ پریشانی: نقشِ سویدا:۔ دل پر ایک سیاہ رنگ کا تل ہوتا ہے: سویدا کیا درست: یعنی سیاہی کو دُور کر دیا: دُود:۔ دُھواں۔

سویدا کو داغِ دل اور آشفتگی کو دُود سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں کہ میری آشفتگی اور پریشانی نے داغ سویدا کو درست کر دیا یعنی اسے صاف کر دیا۔ اس داغ کی وجہ سے دل میں اکثر دُھواں نکلا کرتا تھا۔ اب دھواں نکل جانے کے بعد دل کا داغ دور ہو گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ داغِ دل کا سرمایہ یا حاصل محض دُھواں تھا۔ وہ دھواں نکل گیا اور دل صاف ہو گیا۔ سعیدؔ لکھتے ہیں کہ دل کا داغ دُنیا کی مکروہات میں دل لگانے سے پیدا ہُوا تھا اور بیخودؔ کا خیال ہے کہ یہ داغ پریشان حالی میں افشائے راز کے خوف سے آہیں ضبط کرنے کا نتیجہ ہے۔ حسرتؔ کہتے ہیں۔ جس طرح دھوئیں سے دل میں داغ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آشفتہ خاطری اور پریشانی کے دُود سے دل میں داغِ سویدا کی صورت قائم ہوئی ہے (طباطبائی۔ آسی۔ بیخود)

٣۔ قاعدہ ہے جن خیالات اور معاملات کا اثر دل و دماغ پر پڑتا ہے وہی ہمارے خواب میں بھی آتے ہیں اور ہم عالمِ خواب میں اپنی اُلجھنوں کو سلجھاتے ہیں۔ لیکن جب آنکھ کھل جاتی ہے تو ہمارے خیالات پھر وہیں آجاتے ہیں، جہاں وہ حقیقتاً ہوتے ہیں۔ اور اس تمام خوابی کشش سے کوئی فائدہ اور نقصان مرتب نہیں ہوتا۔

سہاؔ:۔ معاملہ کے لوازمات میں من و تو کا مفہوم ادا کیا ہے۔ یعنی من و تو کا انحصار خواب ہستی کے اوہام پر تھا۔ جب فانی الذات ہوئے تو جیسے تھے ویسے ہی رہے۔

سعیدؔ:۔ دُنیاوی زندگی ایک فریبِ نظر تھی۔ جب اسرار کے پردے اُٹھے تو معلوم ہوا کہ عالمِ حیات کا سارا نظام محض ایک خواب تھا اور سُود و زیاں کی کوئی حقیقت فی نفسہٖ نہ تھی۔

طباطبائیؔ و بیخودؔ:۔ عیش اور رنج کا زمانہ گزر جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی انسان یہ سب باتیں خواب میں دیکھتا ہو اور آنکھ کھل جانے پر ان کے اثر اور نقائص فوراً طبیعت سے زائل ہو جائیں۔

آسیؔ:۔ میرا خیال خواب میں تجھ سے کچھ معاملہ کر رہا تھا۔ جس میں میرا فائدہ تھا یا نقصان۔ مگر آنکھ کھلتے ہی وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ نقصان باقی رہا نہ فائدہ۔ میں تھا اور وہی کنجِ تنہائی۔

٤۔ رفت گیا اور بُود تھا:۔ پہلے بچّوں کو آمد نامہ پڑھایا جاتا ہے۔ اور وہ مصدر اور ان کی ماضیاں معنوں کے ساتھ اس طرح یاد کرتے ہیں کہ رفتن جانا۔ رفت گیا: مکتبِ غمِ دل: مکتبِ عشق۔ میں ابھی تک مکتبِ غمِ دل میں مبتدی ہی ہوں اور میرا سبق "رفت گیا" اور "بود تھا" ہے، مکتبِ غمِ دل میں رفت و بود کا سبق یاد کرنے سے کبھی پاس ہونے اور پھر جاتے رہنے کی طرف دماغ منعطف ہوتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکتبِ عشق کا طالب علم مدّت دراز سے ابتدائی درجے میں پڑا ہے اور ابھی تک اگلے درجے میں نہیں جاسکا۔ لفظی رعایات خوب ہیں۔ رفت و بود دونوں ماضی کے صیغے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی دل عیش و فراغت میں تھا اور اب مسرّت و انبساط سے بالکل محروم ہے۔ آسیؔ لکھتے ہیں کہ رفت و بود کو بار بار پڑھنے سے ابتدائے جنون کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

٥۔ ننگِ وجود:۔ وجود و ہستی کے لئے باعثِ عار: ہر لباس میں:۔ مختلف زمانوں اور

اوضاع زندگی میں۔

میرا وجود امنِ انسانیت پر ایک بدنما داغ تھا۔ میں نے اپنے عیوب کو چھپانے کے لئے طرح طرح کے لباس اور طریقے اختیار کئے۔ پھر بھی میرے عیوب ہر لباس میں عریاں ہی نظر آتے رہے۔ آخر جب زندگی ختم ہوئی اور میرا وضعی لباس اُتار کر مجھ کو کفن پہنایا گیا تو میرے وہ عیوب ڈھک گئے جو لباسِ انسانیت پر ایک بدنما دھبّہ تھے اور ایّامِ زندگی میں کسی صورت چھپائے نہ چھپے تھے۔

سہاؔ:۔ وجود سے مراد وجود مطلق ہے۔ گویا میں ہر عالم میں وجود مطلق کے لئے عار تھا۔

سعیدؔ کا خیال ہے۔ جب تک انسان پر انسانیت کا اطلاق ہو سکتا ہے اس وقت تک وہ اپنے آپ کو ان کمزوریوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا، جو اس کی عین فطرت ہیں۔ یہ معائب اسی وقت دُور ہوتے ہیں جب انسان لباسِ زندگی کو چاک کر کے کفن پوش ہو جائے۔

بیخودؔ:۔ میں وہی انسان ہوں جس کو ملائک نے سجدہ کیا۔ دُنیا میں آنے کے بعد میری وہ وقعت و عزت، میرے اعمال و افعال کی وجہ سے باقی نہ رہی۔ البتہ مر جانے کے بعد کفن نے ان داغوں کو چھپا لیا۔

طباطبائیؔ اور آسیؔ:۔ ننگِ وجود ہونے کو برہنگی سے تعبیر کیا ہے۔ فقط لفظ باتشابہ شاعر کے ذہن کو اُدھر لے گیا۔ ورنہ ننگِ وجود اس جگہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

٦۔ تیشہ:۔ کلہاڑی: سرگشتہ خمار:۔ دیوانہ، مدہوش نشہ سے: رسوم و قیود:۔ انسان کی خود پیدا کردہ (غیر فطری) پابندیاں:

بطور طنز کہتے ہیں۔ اے اسدؔ فرہاد پرست عاشق نہ تھا بلکہ وہ غیر فطری رسوم و قیود میں محو تھا۔ اس لئے وہ اپنے سر پر تیشہ مار کر مرا۔ اگر وہ شیریں سے عشقِ صادق کے نشے سے سرگشتہ ہوتا تو اپنے کو تیشہ مار کر ہلاک نہ ہوتا۔ یہ تو صاحبِ عقل جانتے ہیں کہ تیشہ سر پر لگنے سے انسان مر سکتا ہے۔ اس کو چاہئے تھا کہ وہ ایک آہِ جانگداز کھینچتا اور مر جاتا:

٣

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا ۱ دل کہاں کہ گم کیجیے، ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا ۲ درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا!
دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم ۳ آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا!
سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری ۴ حسن کو تغافل میں جُرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھِلنے، آج ہم نے اپنا دل ۵ خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا
حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی ۶ ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

۱۔ ہم نے مدعا پایا:۔ ہم تمہارا مطلب سمجھ گئے۔

اگر کسی کی گمشدہ چیز کسی اور کو مِل جاتی ہے تو وہ چھیڑنے کے لئے کہتا ہے اگر ہمیں مِل گئی تو ہم نہیں دیں گے۔ اگر کسی چیز کو لینے کی نیت ہوتی ہے تو ازراہِ شوخی اسے چھپا دیتے ہیں اور کہتے ہیں اگر تمہاری چیز ہمیں مل گئی تو ہم نہیں دیں گے۔ یہی معصومانہ شوخی اس شعر میں ہے کہ محبوب دل اُڑا کر عاشق سے کہتا ہے۔ اگر ہمیں تمہارا دل کہیں پڑا ہوا مل گیا تو ہم نہیں دیں گے عاشق کہتا ہے کہ میں سمجھ گیا۔ دل تو تمہارے ہی پاس ہے، اگر میرے پاس ہوتا تو میں تمہاری آرزو پوری کرنے کے لئے اسے کہیں اِدھر اُدھر پھینک دیتا اور تم اسے لے لیتے۔ بس اب تم ازراہِ شوخی کہہ رہے ہو کہ اگر ہمیں مِل گیا تو ہم نہیں دیں گے۔

۲۔ درد کی دوا:۔ دردِ زندگی کی دوا یعنی عشق: دردِ بے دوا عشق:

شاعر کا خیال ہے کہ زندگی بغیر عشق کے بدمزہ اور بیکار ہے۔ اگر عشق نہ ہو تو زندگی ایک درد ہے۔ کہتے ہیں کہ جب عشق کا مرض لگا تو زندگی میں لطف آیا کیونکہ غمِ عشق میں غمِ دُنیا کو بھُول گئے۔ گویا ہمیں دردِ زندگی کی دوا مل گئی مگر یہ دوا ایسی ہے جس کا کوئی اُتار نہیں یعنی عشق دردِ بے دوا ہے۔

شد طبیب ما محبت منتش برجانِ ما   محبتِ ما، راحتِ ما دردِ ما درمانِ ما (ظہوری)
مرحبا اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علت ہائے ما (روم)

۳۔ دوست یارِ دشمن:۔ رقیب کا خیر خواہ: اعتمادِ دل معلوم:۔ دل پر بھروسہ نہیں رہا:

نہ ہمارے نالہائے دل محبوب تک پہنچتے ہیں اور نہ آہیں کچھ اپنا اثر دکھاتی ہیں، اس بے اثری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا دل رقیب کا خیر خواہ ہے ورنہ ہماری آہ جانگزا اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے اور ہمارے نالے ان تک ضرور پہنچتے ہیں (طباطبائی)

سعید:۔ چونکہ معشوق دشمن کا خیر خواہ ہے اس لئے دل کو اس پر اعتماد نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آہ بے اثر ہے اور نالہ نارسا کیونکہ وہ صدقِ دل سے نہیں نکلتے۔

بیخود:۔ محبوب ہمارا دشمن ہے اور دل اس کا دوست ہے، اب ہم دل پر خاک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ اسی لئے اس کے نالہ و آہ میں تاثیر نہیں۔ دل کی دشمنی کا خوب ثبوت دیا ہے۔ (آسی۔حسرت)

۴۔ سادگی:۔ بھولا پن: پرکاری:۔ چالاکی: بیخودی:۔ بے پروائی: ہشیاری:۔ خبرداری:

حسینانِ جہاں دیکھنے میں بڑے سادہ اور غفلت شعار نظر آتے ہیں لیکن ان کے بھولے پن پر نہ جانا چاہئے۔ وہ حقیقتاً بڑے عیار اور ہشیار ہیں۔ اور ان کی سادگی اور تغافل شعاری محض اس لئے ہے کہ وہ اپنے چاہنے والوں کی جرأت کو آزمائیں اور دیکھیں کہ عاشق کتنے پانی میں ہیں یا کتنی محبت رکھتے ہیں۔

حسرت:۔ اہلِ حُسن کی ظاہری سادگی اور بے پروائی سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے مشتاقوں کی جرأت آزمائیں اور یہ دیکھیں کہ ان کو سادہ سمجھ کر اربابِ اشتیاق جرأت گستاخی تو نہیں کرتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کی سادگی کو درحقیقت پرکاری اور بیخودی کو ہشیاری سمجھنا چاہئے (سعید تقریباً یہی)

بیخود و طباطبائی:۔ کیسے پیچیدہ خیال کو کس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے نشستِ الفاظ کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ عشاق کا دل دیکھنے کے لئے معشوقوں کا بھولا پن ہوا کرتا ہے۔ درحقیقت یہ بھولا پن خاص ہوشیاری اور عین چالاکی ہے۔

۵۔ جب موسمِ بہار آیا تو غنچے کھِلنے لگے۔ ان کو دیکھ کر ہمارا دل پھر خون ہو گیا اور خود فراموشی کا عالم طاری ہو گیا۔ طبی اصول کے مطابق موسم بہار میں تجدید جنون ہو جایا کرتی ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے (سعید)

حسرت:۔ غنچے کو دیکھ کر ہم کو اپنا دل گم گشتہ و خون شدہ یاد آ گیا کہ اس کی بھی یہی ہیت تھی (سعید۔ بیخود۔ آسی۔ طباطبائی)

سہاؔ:۔ غنچہ کھلنا "سے نرالی بات کرنا یا فتنہ پیدا کرنا اور خون کیا ہوا" سے کشتۂ حسن اور مبتلائے عشق مطلب لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ آج پھر وہی فتنہ بیدار ہوااور ہمارادل جاتا رہا۔

۶۔ اپنی خود فراموشی دکھائی ہے۔ کہتے ہیں۔ ہمیں اپنے دل کا کچھ حال معلوم نہیں کہ وہ کہاں گیا اور کیا ہوا۔ لیکن اس قدر ضرور معلوم ہوا کہ ہم تم دونوں نے مِل کر جب کبھی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تو وہ اکثر تم ہی کو ملا۔ پس ظاہر ہوا کہ میرے دل کو تم سے خاص لگاوٹ ہے۔ اس لئے ہمارے دل کا حال کچھ تمہیں کو معلوم ہوگا۔ ہمیں تو کچھ پتہ نہیں۔

۷۔ شور اور نمک میں رعایت لفظی ہے۔ پند:۔ نصیحت۔ نمک چھڑکا:۔ تکلیف دی: آپ:۔ یعنی ناصح ، بطور طنز استعمال کیا ہے۔

ناصح کی نصیحتوں نے میرے زخموں پر نمک کا کام کیا ہے۔ یعنی ان کے منع فرمانے سے میرے دل کو سخت تکلیف پہنچی۔ کوئی آپ سے ذرا دریافت کرے کہ کسی کو تکلیف پہنچا کر آپ کو کیا لطف حاصل ہوا (سعیدؔ)

طباطبائی:۔ مصنف نے مزہ کو قافیہ کیا اور ہائے مخفی کو الف سے بدلا۔ اُردو کہنے والے اس قافیہ کو جائز سمجھتے ہیں لیکن فارسی والے مزہ اور دوا کا قافیہ نہیں کرتے وہ ہائے مخفی کو کبھی حرف روی ہونے کے قابل نہیں جانتے۔

آسیؔ:۔ شور پند سے نمک چھڑکنے سے لطف اُٹھانا مراد ہے (بیخودؔ)

۴

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا ۱ آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں ۲ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا ۳ میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں ۴ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار ۵ اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

۱۔ سوزِ نہاں:۔ سوزِ دل ، آتشِ عشق: بے محابا:۔ بے خوف: آتشِ خاموش:۔ وہ آگ جو نظر نہ آئے لیکن اندر ہی اندر سلگتی رہے۔ لفظی رعایات قابل داد ہیں۔

میرا دل آتشِ عشق ہے جو میرے دل کے اندر چپکے چپکے سلگ رہی تھی جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ اور اس طریقہ سے جلا کہ آگ لگنے کی کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔

۲۔ آگ:۔ آتشِ عشق: گھر:۔ خانۂ دل:

عشق کے آغاز میں میرے خانۂ دل میں ہر وقت یار کی یاد اور شوقِ وصل کے خیالات موجزن رہتے تھے۔ لیکن عشق کی آگ نے بھڑک کر خانۂ دل اس طرح پھونک ڈالا کہ اب نہ تو ذوقِ وصل باقی ہے اور نہ یادِ دوست۔ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ انتہائی درجہ مایوس اور نا امید ہوتا ہے تو کوئی امید اور توقع باقی نہیں رہتی۔

سہاؔ:۔ عشق کے اس مقام کی طرف اشارہ ہے۔ جب امید و یاس وصل و ہجر، یادِ محبوب غرضیکہ کسی جذبے کا احساس باقی نہیں رہتا اور یہ وہ مقامِ حیرت و عالمِ فراموشی ہے کہ اس کے بعد انا المحبوب اور انا الحق کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

طباطبائی:۔ یعنی رشک کی آگ ایسی تھی کہ معشوق کو دل سے بھلا دیا اور اس کا غیر سے ملنا دیکھ کر ذوقِ وصل جاتا رہا۔ گھر سے دل اور آگ سے رشکِ رقیب مراد ہے۔

۳۔ اے غافل! میں عدم کے مقام سے آگے نکل گیا ہوں ورنہ جب میرا مقام عدم میں تھا تو جب بھی وہاں میں نے آہِ آتشیں کھینچی۔ اُس کی آگ سے عنقا کے پر جل گئے۔ شعر میں خوبی یہ ہے کہ عنقا ایک معدوم پرندہ ہے، گویا وہ مقامِ عدم میں رہتا ہے۔ شاعر کہتا ہے مقام میں تھا تو میری آہِ آتشیں سے عنقا کے پر جل جاتے تھے۔ یعنی فنا فی العدم ہو جانے پر بھی میری آہ میں اس قدر گرمی تھی۔ بقول حسرتؔ اپنی نیستی کے بیان میں مبالغہ کیا ہے۔

سہاؔ:۔ پہلے میری آہ کا اثر یہ تھا کہ اس سے بالِ عنقا جلتا تھا اور اب تو بالِ عنقا بھی نہیں جلتا، گویا پہلے اگر اتنی تاثیر تھی تو اب وہ بھی نہ رہی۔ اور میری بے اثری اور بے ثباتی اور نیستی اس حد تک پہنچ گئی کہ عدم سے بھی گزر گئی ہے یا جب میں عدم میں تھا تو میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جلتا تھا۔ اور اب بالِ عنقا جلنا باالفاظ دیگر یہ کہ آہِ آتشیں میں کوئی تاثیر نہ تھی۔

بیخود:۔ میں نے ابتدائے تعلیم فنا میں شہرتِ عنقا کو بھلا دیا تھا جس کو معدوم ہونے کی ایک سب سے زیادہ دلیل سمجھا جاتا ہے۔ غافل سے مراد وہ لوگ ہیں جو ترقیاتِ انسانی کو نہیں سمجھ سکتے۔

طباطبائی:۔ یہ کہنے سے کہ میں عدم سے بھی باہر ہوں یہ حاصل ہوتا ہے کہ میں نہ موجود ہوں نہ معدوم ہوں اور نقیضیں مجھ سے مرتفع ہیں۔ شاید ایسے ہی اشعار پر دلّی والے کہا کرتے تھے کہ غالب بے معنی شعر کہتے ہیں۔ "پرے" لکھنؤ میں متروک ہے مگر دلّی میں بولا جاتا ہے۔

۴۔ عرض کیجئے:۔ ظاہر یا بیان کیجئے: جوہر اندیشہ:۔ سوچنے کا جوہر۔ میں اپنی طبیعت کی گرمی کا کیونکر اظہار کروں۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں نے محض وحشت صحرا کا خیال کیا تھا کہ اس میں بھی آگ لگ اُٹھی۔ ظاہر ہے اگر وہاں پہنچ جاتے تو قیامت ہی برپا ہو جاتی۔

طباطبائی:۔ یہ مبالغہ غیر عادی ہے کہ طبیعت میں ایسی گرمی ہو جس چیز کا خیال آئے وہ چیز جل جائے۔ عرض کو لوگ جوہر کے ضلع کا لفظ سمجھتے ہیں لیکن جوہر کے مناسبات میں سے عرض بہ تحریک ہے نہ بسکون۔

۵۔ کارفرما:۔ حاکم یعنی دل:

داغوں کو چراغوں سے تشبیہ دی ہے: چراغاں:۔ اظہارِ مسرّت میں بہت سے چراغ روشن کرنا۔

قدیم زمانے میں ملزم کے سر میں چند گہرے زخم ڈال کر ان میں شمعیں لگا کر روشن کر دیتے تھے۔

افسردگی جلنا اور داغ وغیرہ مناسب الفاظ ہیں۔ میرے سینے پر جو بال ہیں، تم ان کو کیا دیکھتے ہو۔ اگر میرا دل جو اس چراغاں یا داغوں کی بہار کا کارفرما تھا سوزِ عشق سے جل نہ جاتا تو پھر تمہیں اس چراغاں کی کیفیت دکھاتا۔ آسی لکھتے ہیں۔ دل میں اتنے داغ تھے کہ اب دل مٹ گیا اور بجائے دل کے چند داغ باقی رہ گئے۔

۶۔ طرزِ تپاک:۔ یعنی ظاہری تپاک اور محبت۔

اے غالب اب میں ہوں اور افسردہ دلی کی آرزو ہے، یعنی شگفتگی اور زندہ دلی سے میں متنفر ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا دل اہلِ دُنیا کے ظاہری تپاک اور باطنی نفاق سے جل کر خاک

ہو گیا ہے۔

آسی:۔ اس شعر میں نکتہ یہ ہے کہ جب دل جل گیا ہے تو اب آزردگی کی آرزو ہے۔ کیونکہ جلنے کے بعد افسردگی پیدا ہوتی ہے۔

۵

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا ۱ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یا رب ۲ تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا
بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل ، ۳ جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد ۴ کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
ہے نو آموز فنا ہمتِ دشوار پسند ۵ سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

۱۔ شوق:۔ عشق: ہر رنگ:۔ ہر طرح سے: رقیب:۔ دشمن:
سروسامان۔ آرائش۔ تکلفات الفاظ متناسب ہیں۔ عشق جس رنگ میں بھی ہو وہ تکلفات اور سازوسامان کا دشمن ہے۔ مجنوں کی تصویر دیکھئے اس کو عشق تھا اس لئے اس کی تصویر ہمیشہ عریاں ہی کھینچی جاتی ہے۔

بیخود:۔ رنگ عشق ایسا واقع ہوا ہے کہ قیس کو تصویر کے لباس میں بھی عریاں رکھا۔ رنگِ تصویر بھی قیس کی عریانی کا پردہ نہ بن سکا۔ ہر رنگ کے معنی عشق میں جنون میں، عریانی میں، تصویر کے رنگ ہیں، الغرض ہر رنگ میں عشق دشمن ناموس ہی رہا اور مرزا صاحب نے بھی اسے عریاں ہی دکھایا۔

طباطبائی:۔ ہر رنگ محاورہ نہیں، ہر طرح ہونا چاہئے۔ تناسب لفظی کے لئے محاورہ چھوڑ دینا مناسب نہیں۔

۲۔ پر افشاں:۔ پھڑ پھڑاتا ہوا، بیتاب، یہ لفظ تیر کے مناسب ہیں۔

غالب:۔ زخم تیر کی توہین بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بہ سبب

ایک طاق سا کھل جانے کے ہوتی ہے۔ تیر تنگیِ دل کی داد کیا دیتا وہ تو تنگیِ دل سے گھبرا کر پرافشاں اور سراسیمہ نکل گیا۔

بیخوؔد:۔ رشکِ دل نے تیر کی خلش سے سینے کو بچا دیا اور وہ اس طرح کہ دل نے ان کے رشک سے جس میں یار کا تیر چوک کر جا لگا تھا۔ جان دے دی۔ اب تیر یار نے دیکھا کہ دل عاشق بغیر زخم کے مر گیا۔ میری ضرورت باقی نہیں رہی۔ ترکِ تعلق کر کے سینے سے نکل گیا۔ تنگ دلی سے رشک کے عربی معنی مقصود ہیں اور پرافشاندن کے معنی ترکِ تعلق کردن۔

آسؔی:۔ تنگ دل رنجیدہ کو کہتے ہیں۔ یہاں لفظ کے معنی کا فائدہ اُٹھایا ہے یعنی میرا دل تنگ تھا اور اس میں زخم فراخ۔ مگر اسی زخم نے میری تنگدلی کے باوجود اتنا بڑا زخم کھایا اور یہی سلوک میرے ساتھ تیر نے کیا کہ وہ پرافشاں میرے دل سے نکلا یعنی تیر کو ایسے موقع پر پرافشانی نہ کرنی چاہئے تھی بلکہ میری تنگدلی پر نگاہ رکھنی چاہئے تھی (طباؔطبائی)

۳۔ بُوئے گُل، نالۂ دل (آہ) دودِ چراغ وغیرہ میں پریشانی کی خاصیت ہے۔ مرزا صاحب نے ان کی پریشانی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ چاہے پھولوں کی مہک ہو (کہ اس کو تو پسند کرتا ہے) اور خواہ نالۂ دل مجبور یا شمعِ محفل کا دُھواں ہو۔ غرض جو بھی تیری محفل میں جاتا ہے وہ وہاں سے پریشان ہو کر نکلتا ہے اور یہ تیری بیدادگری کا ثبوت ہے (سعیؔد۔ آسؔی)

طباؔطبائی:۔ تیری بزم سے نکلنا پریشانی کا باعث ہے۔

بیخوؔد:۔ یہ سب چیزیں پریشان ہونے کی خاصیت رکھتی ہیں۔ شاعر ان پر رشک کرتا اور کہتا ہے کہ ان کی پریشانی کا باعث ہوا نہیں ہے بلکہ یہ بھی تجھ پر عاشق ہو کر تیری بزم سے نکلتی ہے اس لئے پریشان ہیں۔

۴۔ مائدہ:۔ دسترخوان: بقدر:۔ قابلیت کے مطابق: کام:۔ مطلب میرے حسرت زدہ دل کے دسترخوان پر لذتِ درد کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ میرے دوستوں نے اپنے اپنے لب و دنداں کی قوت کے مطابق میرے دسترخوانِ درد سے درد کا ذائقہ چکھ لیا۔ گویا ہر شخص بقدرِ استعداد متاثر ہوا۔ (سعیؔد و حسرؔت)

بیخوؔد و طباؔطبائی:۔ میرے دسترخوان پر لذتِ درد کی کمی نہ تھی لیکن یاروں کو ان کی قابلیت

کے موافق حصہ ملا۔

آسؔی:۔ بقدرِ لب و دنداں کے معنی کم کے ہیں یعنی دوست میرے مائدہ درد پر ہونٹ ہی کاٹتے رہے۔ بہت کم غم کھایا۔

۵۔ نوآموز:۔ مبتدی:۔ ہمّت دشوار پسند:۔ میری ہمّت دشواریوں کو پسند کرتی ہے: یہ کام:۔ یعنی درسِ فنا۔

اے میری مشکل پسند ہمّت فنا کے مدارج جو نہایت مشکل سمجھے جاتے ہیں تو ابتدائے تعلیم ہی میں آسانی سے سیکھ گئی۔ گویا فنا کے مقامات طے کرنے میں تجھے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ چونکہ ہمّت دشواریوں کو پسند کرتی ہے۔ اس لئے اب سخت مشکل آپڑی ہے کہ میں کونسی مشکل اس کے لئے تجویز کروں۔ گویا ہمّت دشوار پسند کے لیے کوئی فنا سے زیادہ مشکل کام چاہئے۔ مطلب یہ کہ ہم سمجھتے تھے جان دینا بہت مشکل کام ہے مگر افسوس ہے کہ وہ بھی آسان نکلا۔

۶۔ طوفان۔ قطرہ۔ شور متناسب الفاظ ہیں۔ اے غالؔب میرے دل میں پھر گریہ کا ایک طوفان اُٹھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی گریہ و زاری میں جو قطرہ باقی رہ گیا تھا وہ طوفان ثابت ہوا (آسؔی۔ سہؔا۔ سعیؔد)

بیخوؔد:۔ پہلی بار تو میں نے اس جوش کو اس قدر ضبط کیا تھا۔ کہ دریائے گریہ کا ایک قطرہ بھی آنکھ سے نہ نکلنے دیا۔ افسوس ہے اب اُس نے طوفان کی صورت اختیار کر لی یعنی رفتہ رفتہ عشق نے ظاہر ہو جانے کا سامان پیدا کر لیا۔

طباؔطبائی:۔(۱) گریہ پر میرا ضبط ایسا غالب تھا کہ میں اُسے قطرہ سے کمتر سمجھتا تھا اب وہ طوفان بن کر مجھ پر غالب آگیا

۲۔ میرے ہم خیال۔

۹

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا ۱ عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا ۲ اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیف نسخہائے وفا کر رہا تھا میں ۳ مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب ۴ اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی ۵ دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے ۶ زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۱۔ بابِ نبرد:۔ قابلِ جنگ، لائقِ میدان بہادر: عشق نبرد پیشہ:۔ عشق جو مردِ میدان (بہادر) کا طالب ہوتا ہے۔

جو شخص کہ میدانِ عشق میں نبرد آزمائی کرنے کے قابل نہ تھا وہ عشق کی ایک دھمکی سے مر گیا یعنی عشق کی تاب نہ لا سکا۔ بات یہ ہے کہ عشق نبرد پیشہ ہے۔ وہ اس مردِ میدان عاشق کو پسند کرتا ہے جو عشق کی مصیبتوں کو برداشت کر سکتا ہے، اگر عاشق میں ہمتِ مردانہ نہ ہو تو مصیبت کا خوف عشق کو باطل کر دیتا ہے۔

بیخود:۔ ''دھمکی میں مر گیا''۔ فرہاد کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ ہم نے دھمکی میں آ کر فرہاد کی طرح جان نہیں دی بلکہ مصائب کا ہمیشہ مردانگی کے ساتھ مقابلہ کیا۔

۲۔ موت کا کھٹکا:۔ موت کا خوف: اُڑنے سے پیشتر:۔ رنگ اُڑنے سے پہلے یعنی بوقتِ مرگ: قاعدہ یہ ہے کہ انسان دنیا کے لہو ولعب میں موت کو بھول جاتا ہے۔ لیکن شاعر کہتا ہے مجھے ہر وقت موت کا احساس تھا اس لئے میرا رنگ پہلے ہی سے زرد ہو گیا تھا۔ گویا جانکنی کے وقت موت کے خوف سے میرا رنگ زرد نہیں ہوا تھا۔ بقول بیخود۔ میں نے اپنے آپ کو فنا ہونے سے پیشتر فنا کر دیا تھا۔ اس بیان کا لطف کچھ اہلِ تصوّف ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ اس زمین میں ایسا بلند شعر کہنا مرزا ہی جیسے مسلم الثبوت اور ماہرِ فن کا کام تھا۔

۳۔ ابھی فرد فرد تھا:۔ میں ابھی ناتجربہ کار تھا: وفا:۔ عشق:

میرے خیالات عشقیہ ابھی پختہ نہ ہوئے تھے۔ گویا میں مکتبِ عشق میں ابھی مبتدی ہی تھا کہ میں نے عشق کی کتابیں باقاعدہ تالیف کرنی شروع کر دی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ ابتدائے عشق میں میری کیفیت پختہ کار عاشقوں کی سی تھی۔

بیخود:۔ ابتدائے عشق میں جب کہ میں وفاداری کے متعلق نسخوں کی تالیف کر کے ادویۂ وفا کے خواص ومزاج قائم کر رہا تھا۔ مجھ پر ستم کا آغاز ہو گیا اور میری وفا کے نسخے ناتمام رہ گئے۔

۴۔ دل تا جگر:۔ دل سے لے کر جگر تک: آگے گرد تھا:۔ کسی زمانے میں گرد تھا: رہگذر:۔ دل سے جگر تک:

میرے دل سے لے کر جگر تک خون ہی خون ہے یعنی میرا دل و جگر خون ہو گیا ہے اور ساحل دریائے خون کا منظر پیش کرتا ہے۔ لیکن کبھی ان مقامات پر وہ کیف آور بہاریں تھیں کہ ان کے سامنے جلوۂ گل بھی ہیچ تھا۔ بقول طباطبائی کسی زمانے میں ہم بھی دل شگفتہ و رنگین رکھتے تھے مگر اب خاطر افسردہ و غمگین رہتے ہیں''

بیخود:۔ انقلاب زمانہ کی کس قدر سچی اور پُر اثر تصویر کھینچی ہے۔

۵۔ غمِ عشق کی کشمکش اور مصیبت سے عاشق کو کبھی خلاصی نہیں ہوتی اگر دل جس کی بدولت عاشق کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے چلا جائے تو پھر بھی اس مصیبت سے نجات نہیں ہوتی۔ کیونکہ دل کے جاتے رہنے کا غم پیدا ہو جاتا ہے۔ حسرتؔ نے میرؔ کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے۔

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا   دل کے جانے کا نہایت غم رہا

آسی:۔ دل کے درد سے مراد دل کے مٹ جانیکا درد ہے ورنہ اگر دل کا درد بمعنی دل میں درد کہینگے تو شعر بے معنی ہو جائیگا۔ دل نہیں ہے اور دل میں درد ہے۔ چہ؟

۶۔ چارہ سازی:۔ علاج: وحشت:۔ وحشتِ عشق: بیاباں نورد:۔ آوارہ دشت

احباب نے میری وحشت کم کرنے کے لئے مجھے قید خانہ میں بند کر دیا تاکہ میں جنگلوں میں مارا مارا نہ پھروں اور جوشِ جنوں (عشق) زیادہ نہ بڑھے، اگرچہ میں زندان میں تھا لیکن میرا خیال اسی طرح بیابان نوردی میں مصروف تھا۔ اس لئے ان کا علاج بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

مجھے اسیر کریں یا مری زباں کاٹیں   مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

۷۔ یہ بے کفن لاش اسدؔ خستہ جان کی ہے۔ خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا کہ اس کی لاش بھی بے کفن پڑی ہے۔ وہ جب تک زندہ رہا۔ تکلفات سے آزاد رہا اور اب مر کر بھی گور و کفن کی قیود سے آزاد ہے بقول بیخود جملہ دعائیہ نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔

آسیؔ:۔ آزاد مرد سے فائدہ اُٹھا کر لاش کو بے کفن کیا ہے اور یہ محاورہ نہایت برمحل صَرف ہوا ہے۔

۷

شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا ۱ تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے ۲ کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل ۳ کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

۱۔ شمارِ سبحہ:۔ تسبیح کے دانوں کو شمار کرنا۔ تسبیح میں سَو دانے ہوتے ہیں: مرغوب آیا: پسند آیا: بُتِ مشکل پسند:۔ وہ محبوب جسے مشکلات پسند ہوں: بہ یک کف بُردن صد دل:۔ ایک جھپٹے میں سَو دل اُڑا لینا:

میرے مشکل پسند محبوب کو تسبیح پڑھنا اس لئے پسند ہے کہ اِس میں اس کی حسبِ خواہش ایک ہی وار میں سَو سَو دل اُڑا لینے کی مشابہت پائی جاتی ہے۔

آسیؔ:۔ اس شعر میں تعقید ہے کہ ظاہرہ ایسے مضمون کو کوہ کندن وکاہ برآوردن سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ بُت کی صفت مشکل پسند اس واسطے رکھی ہے کہ تسبیح بُت کے لئے ایک مشکل اور غیر معتاد فعل ہے۔ طرزِ ادا میں بے تکلفی اور بندش میں چستی ہے۔

۲۔ بفیضِ بیدلی:۔ ناامیدی کی بدولت: نامیدیٔ جاوید:۔ ہمیشہ کی ناکامی۔

پے درپے مایوسیوں اور ناکامیوں سے ہم بالکل ناامید اور بیدل ہوگئے ہیں۔ اس بیدلی کی بدولت دوامی ناامیدی کا برداشت کر لینا ہمارے لئے معمولی سی بات ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب انسان بالکل مایوس ہو جاتا ہے تو پھر بڑی سے بڑی ناکامی بھی اس کے دل پر کوئی اثر نہیں کرتی۔

اور کشائش کو ہمارا ''عقدۂ مشکل'' پسند آ گیا۔ اگر اُسے ہمارا ''عقدۂ مشکل'' پسند نہ ہوتا تو اُس کو سمجھایا جاتا یعنی اب کشائش نہ ہوگی۔

طباطبائیؔ:۔ یعنی دنیا کی طرف سے جو بے دلی و بے دماغی ہم کو ہے۔ اس کی بدولت

صدمۂ نومیدی ویاس کا اُٹھا لینا ہم کو سہل ہے، ہمیں دُنیا پر خود رغبت نہیں ہے۔ کشود کار کی امید ہو تو کیا اور ناامیدی ہو جائے تو کیا۔ پہلے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا عقدۂ مشکل کشائش کو پسند آ گیا ہے۔ یعنی اب کبھی اس کی کشائش نہ ہوگی اس سبب سے کہ کشائش کو اس کا عقدہ ہی رہنا پسند ہے اور پسند اس سبب سے ہے کہ ہمیں پروا نہیں۔ پھر ایسی بے نیازی کشائش کو کیوں نہ پسند آئے (سعیدؔ)

حسرتؔ:۔ کشائش نے اپنا عمل کرنے کے لئے ہمارے عقدۂ مشکل (نومیدیٔ جاوید) کو پسند کیا اور ہماری مشکل آسان ہوگئی۔ اس طور پر کہ ہم کو دُنیا کی جانب سے جو بے دلی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے سبب سے صدمۂ نومیدیٔ جاوید کا برداشت کرنا آسان ہو گیا ہے کیونکہ غایت بے دلی کی حالت میں اُمید و ناامیدی یکساں ہو جاتی ہے۔

بیخودؔ:۔ جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ ہمارا عقدۂ دشوار لاینحل ہے تو اُمید عقدہ کشائی اُٹھ کر ناامیدی کی صورت میں ہمیشہ کو تسکینِ خاطر حاصل ہوگئی۔

آسیؔ:۔ (۱) فکرِ کشائش نے ہمارے دل کو جو بصورت عقدہ ہے پسند کیا اور اس کو لے لیا اور ہم سے ہمیشہ کے واسطے جدا کر دیا۔ (۲) میرے ہم خیال۔

۳۔ ہوا:۔ شوق: آئینہ:۔ اظہار: بے مہری:۔ ستمگری: بخوں غلطیدن:۔ خون میں تڑپنا:

ستم شعار محبوب کا باغ میں سیرِ گل سے لطف اندوز ہونا۔ اس کی بے مہری اور ستم شعاری کا ثبوت ہے۔ کیونکہ وہ سیرِ گل کے لیئے باغ میں نہیں جاتا۔ بلکہ اُسے بسملوں کو خون میں لوٹتے ہوئے دیکھنے کا شوق ہے اور یہ تماشا اسے باغ میں دیکھنے کا خوب موقع ملتا ہے۔ جہاں سُرخ سُرخ پھول شاخوں سے گر کر اور ہوا سے اُڑ کر اِدھر اُدھر رُلتے پھرتے ہیں اور بسمل بخوں غلطیدن کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ تشبیہات نہایت عمدہ ہیں۔ رنگِ گل سے خون اور پھولوں کا ہوا سے ہلنا' بسمل کا خون میں لوٹنا وغیرہ الفاظ بھی مناسب اور قابلِ تعریف ہیں۔

۴۔ جراحت:۔ زخم÷ الماس:۔ ہیرا÷ ارمغاں:۔ تحفہ÷ ہدیہ:۔ تحفہ÷ غمخوارِ جانِ دردمند:۔ عشق÷

اے اسدؔ مبارک ہو' تمھاری دردمند جان کا غمخوار (عشق) آیا ہے اور تمہارے لئے جراحت' الماس اور داغِ جگر کے تحفے تحائف لایا ہے۔ عاشق کے لئے یہ چیزیں تحفہ اس لئے ہیں کہ

اسے درد اور کرب پیدا کرنے والی چیزیں مرغوب ہوتی ہیں۔ الماس کی صفت یہ ہے کہ اس سے دل و جگر زخمی ہوجاتے ہیں۔ اور اگر ہیرے کا سفوف زخم پر لگ جائے تو زخم میں بے حد تکلیف ہوتی ہے۔بقول حسرت ایسے ہدیوں پر مبارک دے کر اپنی ایذادوستی کا اظہار کیا ہے۔

بیخود:- (۱) میرا غمخوار جو دوست کو سمجھانے کے لیے گیا تھا کہ وہ مجھ سے ملے، وہ تحفے لے کر آیا یعنی خود ہی عاشق ہوگیا۔ (۲) میرے ہم خیال۔

طباطبائی:- (۱) میرے ہم خیال (۲) غمخوار سے ناصح مراد ہے اور مبارکباد تشنیع کی راہ سے ہے۔

آسی:-غمخوار سے مراد ناصح لے کر فرماتے ہیں۔ ناصح کے یہ تحفے یعنی گفتگو میرے لیے رنج دہ ثابت ہوگی۔

۸

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا ۱ ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا ۲ یہ زمرد بھی حریف دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں ۳ وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزر گاہِ خیال مے و ساغر ہی سہی ۴ گرنفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی ۵ گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجئے ۶ ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب ۷ ناتوانی سے حرفِ دمِ عیسے نہ ہوا

۱۔ دُنیا میں لفظِ وفا استعمال تو بہت کیا جاتا ہے لیکن کبھی اصلی معنوں استعمال نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے اس بے معنی استعمال اور خالی ذکر وفا سے عاشقِ صادق کی تسلی خاطر نہیں ہوسکتی اس لیے یہ وہ لفظ ہے کہ جس کو کبھی اپنے معانی کا شرمندہ احسان نہ ہونا پڑا۔ شاعر کا مقصود یہ ہے کہ جب دُنیا میں اصلی وفا نہیں تو صرف نقشِ وفا سے تسلی خاطر کیونکر ہوسکتی ہے۔

بیخود:- جو لوگ وفاداری سے نقشِ وفا قائم کرتے ہیں، وہ اپنا وقت بیکار ضائع کرتے ہیں اس لئے نقشِ وفا اہل وفا کے لیے موجبِ تسلی خاطر نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اہلِ وفا دُنیا کے دستور کے مطابق جفا کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں۔ شاعر مصرعہ ثانی سے اپنے دل کو تسلی دیتا ہے۔

طباطبائی:- لوگ دُنیا میں وفا کر کے تسلی چاہتے ہیں۔ جب وفا کر کے تسلی نہ ہوئی تو لفظ وفا بے معنی رہ گیا۔ حاصل یہ کہ وفاداریٔ عشاق بے معنی بات ہے۔

۲۔ کاکلِ سرکش:- لہراتی ہوئی یا بے قابو زلف÷ زلف کو افعی سے تشبیہ دی ہے÷ سبزۂ خط:- آغاز خط۔ زمرّد سے تشبیہ دی ہے÷ زمرّد:- ایک قسم کا سبز قیمتی پتھر ہے جسے دیکھ کر سانپ اندھا ہوجاتا ہے÷ حریف:- مقابل÷

تیرا زمردین سبزۂ خط افعی پر کچھ اثر نہیں کرتا۔ اس کے اثر سے تیری سانپوں جیسی زلفوں کی ایذارسانی ختم ہوجانی چاہیئے تھی۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود خط نکل آنے کے تیری زلفوں کی دل کشی اور حُسن میں کوئی کمی نہیں آئی۔

۳۔ اندوہِ وفا:- غمِ وفا÷

میں نے چاہا تھا کہ میں مرجاؤں تاکہ مجھے وفاداری کے رنج و غم سے نجات مِل جائے لیکن افسوس کہ وہ یار ستمگر میرے مرجانے پر بھی راضی نہ ہُوا۔ کیونکہ اُسے مجھ جیسا وفا شعار کوئی اور عاشق نظر نہ آتا تھا اور میری وفاداری دیکھیئے کہ میں نے یہ ستم بھی بہ طیبِ خاطر برداشت کرلیا۔ سعید۔ بیخود۔ طباطبائی کا حسنِ ظن ہے کہ معشوق کو اپنی رسوائی اور بدنامی کے اندیشے سے میرا مرجانا بھی گوارا نہیں۔

لفظی اور معنوی خوبیاں اس شعر میں بہت ہیں۔ کثرتِ اندوہ، علاج میں درماندگی، اس پر بھی دل آزاری و جفا کاری، اور اس حالت میں معشوق کی مرضی پر شاکر رہنا۔

۴۔ گزرگاہ:- راستہ÷ نفس:- سانس÷ جادہ:- راستہ÷ تقویٰ:- پرہیزگاری÷

اگر میرا سانس منزل پرہیزگاری کا راستہ نہ بنا تو کچھ مضائقہ نہیں۔ یعنی اگر میں متقی اور پرہیزگار نہ ہُوا تو نہ سہی۔ میرا دل جام و شراب کی گزرگاہ تو ہے، چلو میں رند ہی سہی، کچھ نہ کچھ تو ہوں۔ بقول بیخود۔ رندی اور پرہیزگاری کو برابر تصوّر کیا گیا ہے۔

۵۔ منت کش:-ممنون÷ گلبانگ:- دلکش آواز۔

میں ترے وعدۂ وصل نہ کرنے سے بھی خوش ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تو وعدۂ وصل کرتا تو میرے دل کو اس سے تسلی ہوتی اور میرے کان وعدۂ وصل کی آواز کے ممنون ہوتے۔ خدا کا

شکر ہے کہ تو نے کبھی وعدہ نہ کیا اور میرے کان وعدہ کی تسلی بخش آواز کے کبھی ممنون نہ ہوئے۔

۶۔ ہم اپنی بدنصیبی اور محروم القسمتی کی کس سے شکایت کریں۔ وہ تو حد سے گزر گئی ہے۔ ہماری آخری خواہش یہ تھی کہ ہم مرجائیں لیکن قسمت کی محرومی دیکھیئے کہ ہمیں موت بھی نہ آئی۔ موت ایسی چیز ہے جو اکثر بن مانگے مل جاتی ہے لیکن ہم اس سے بھی محروم رہے۔

۷۔ جنبشِ لب:- حرکتِ لب ÷ حریف:- مدِّ مقابل ÷ دمِ عیسیٰ:- حضرت عیسےٰ قم باذن اللہ کہہ کہ مُردوں کو زندہ کردیتے تھے۔

غالبؔ اس قدر نحیف وناتواں تھا کہ وہ عیسےٰ کی جنبشِ لب کا صدمہ بھی برداشت نہ کرسکا۔ عیسےٰ نے قم باذن اللہ کہنے کے لئے اپنے ہونٹوں کو حرکت دی۔ گویا زندہ کرنے کے کلمات ادا بھی نہ کرپائے تھے۔ کہ غالبؔ مرگیا اور حضرت عیسےٰ جو اس کو زندہ کرنے آئے تھے وہی اس کی موت کا باعث ہوگئے۔ (سب متفق)

آسیؔ:- (۱) میرے ہم خیال (۲) اپنا لب ہلایا تھا کہ دُعا کریں' اسی میں چل بسا (۳) عیسےٰ کو بُلانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی (۴) عیسےٰ کو بُلانے کے لئے جو لب ہلائے اسی میں خاتمہ ہوگیا۔

۹

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا ۱ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا
بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا ۲ کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو ۳ لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے ۴ مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے ۵ کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ۶ ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ ویرانی تماشہ کر ۷ مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے مرے درباں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں ۸ چراغِ مردہ ہوں میں بیزباں گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے ۹ دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ ۱۰ سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا ۱۱ قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ ۱۲ کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

۱۔ ستائش گر:- مدّاح ÷ باغِ رضواں:- باغِ جنت ÷ طاقِ نسیاں:- وہ طاق جس میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائیں۔ بالائے طاق رکھنا۔ معنی ترک کرنا۔ طاق نسیاں پر رکھنا اور بھی مبالغہ پیدا کرتا ہے۔ بہشت کو تحقیراً گلدستہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ لطف یہ ہے کہ گلدستہ سجاوٹ کے لیے طاق ہی پر رکھا جاتا ہے۔ تشبیہ بالکل اچھوتی ہے۔ طباطبائی کہتے ہیں۔ اس شعر میں معنوی خوبی نہیں۔ حسنِ بیان وبدیع سے تعلق ہے۔

زاہد جس باغ جنت کی تُو اس قدر تعریفیں کرتا ہے۔ وہ ہم جیسے بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا ایک گلدستہ ہے۔ گویا ہمارے نزدیک جنت کو توقیر کچھ بھی نہیں ہم تو اسے طاقِ نسیاں میں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ بقول آسیؔ بہشت کی تحقیر اسی کے مناسب لفظ گلدستہ سے کی گئی ہے اور پھر بھی اس کو باعثِ زینت قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ خود کو بیخود کہا ہے۔ اس لیے اس کو طاقِ نسیاں پر رکھا ہے۔

حسرتؔ:- ہم بیخودی کے ایسے خوشگوار عالم میں ہیں۔ جس کے مقابلہ میں ہم نے جنّت کو بھی فراموش کردیا ہے۔

۲۔ مژگاں:- پلکیں ÷ مژگاں کو سُوئی سے تشبیہ دی ہے۔ کاوشِ مژگاں:- یعنی چھیدنا ÷ مرجان:- مونگا۔ سُرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کو قطرۂ خون سے تشبیہ دی ہے۔ مرجان تسبیح میں ڈالا جاتا ہے۔

میں مژگانِ یار کی کاوشیں کیا بیان کروں۔ ان کی کاوشوں سے مرا ہر قطرۂ خون تسبیح مرجان کا دانہ بن گیا ہے یعنی میرے قطراتِ خون کو مژگانِ یار نے دانۂ مرجان کی طرح چھید ڈالا ہے۔ ظاہر ہے ہر قطرۂ خون کو چھیدنا بڑا کاوش کا کام ہے۔

سہاؔ:- قطراتِ خون دانے ہوتے ہیں اور مژگانِ رشتہ' جن سے ایک تسبیح تیار ہوگئی ہے۔

بیخودؔ:- مژگانِ یار کی کاوش نے قطرۂ خون آنسو بنا دیا۔ جنہوں نے مسلسل جمع ہوکر تسبیح

مرجان کی صورت اختیار کرلی ہے۔

۳۔ سطوت:- رعب÷ نیستان:- وہ مقام جہاں نے اُگتی ہے۔ اور نے میں سے نالہ نکلتا ہے÷ دانتوں میں تنکا لینا:- اظہارِ عجز کرنا۔ ہوا ریشہ نیستاں کا:- نے (بانسری) بن گیا÷

قاتل محبوب کا رعب بھی میرے نالوں کو روک نہ سکا۔ ان کی بارعب شخصیت کو تسلیم اور اپنی عاجزی کا اظہار کرنے کے لئے جو تنکا میں نے دانتوں میں لیا تھا وہ نے بن گیا اور نالے کرنے لگا۔

آسی:-تنکا نیستاں کا ریشہ بن گیا۔ یعنی اُس نے سینکڑوں نے پیدا کردیں۔ جس سے نالہ کشی اور بھی بڑھ گئی۔

۴۔ سروچراغاں:- چراغوں کو ایسے طریقے سے رکھنا کہ سرو کی صورت پیدا ہوجائے÷ تخم:- بیج÷ تماشا:- سیر÷

اگر مجھے زمانے نے مہلت دی تو میں تم کو ثابت کرکے دکھاؤں گا کہ میرے دل کا ہر داغ سرو چراغاں کا بیج ہے۔ یعنی ہر داغِ دل سے سروچراغاں پیدا ہوجائے گا۔ بالفاظ دیگر ہر داغِ دل سے اتنی شرر باری ہوگی کہ بہت سے سروچراغاں نظر آئیں گے۔

آسی:- بہت اچھا شعر ہے۔ باریکی یہ ہے کہ میرا عشق روز افزوں ہے۔ ''دی اگر فرصت زمانے نے'' سے مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔

۵۔ آئینہ خانہ:-شیش محل۔ جس مکان میں ہر طرف آئینے ہی آئینے ہوں۔ شبنمستان:- وہ مقام جہاں اوس پڑی ہو۔ جس طرح آفتاب کے سامنے شبنم نہیں ٹھہر سکتی اسی طرح آئینہ خانہ تیرے جلوہ کی تاب نہ لاسکا۔ جب تُو نے آئینہ خانہ میں اپنا جلوہ دکھایا تو ہر آئینہ شبنم کی طرح پانی ہوکر بہہ گیا۔

سہا:- (۱) ہم خیال (۲) پرتوِ خورشید سے شبنم کا ہر قطرہ چمک اُٹھتا ہے اسی طرح تیرے جلوہ سے آئینہ خانہ جگمگا اُٹھا (۳) آئینہ کی جلا ماند پڑگئی۔ سعید سہا کے دُوسرے معنی بھی لکھتے ہیں۔

آسی:- تیرے جلوے نے آئینہ خانہ کا وہ نقشہ بنادیا جو دھوپ شبنم کا بنا دیتی ہے۔ بعض

حکما کا قول ہے کہ شبنم آفتاب سے پیدا ہوتی ہے اور آفتاب ہی اس کو جذب کرلیتا ہے یعنی آئینہ خانہ تیرے جلوے کی تاب نہ لاسکا۔

۶۔ مضمر:- پوشیدہ÷ تعمیر:- بنانا' مراد بقا÷ خرابی:- تخریب۔ فنا÷ ہیولیٰ:- اصل و مادۂ ہر شے÷ خونِ گرم:- سرگرم۔ سرگرمی' کوشش۔

اس شعر میں شاعر نے ایک مسئلہ طب سے استفادہ کیا ہے۔ اطبا کہتے ہیں کہ حرارت غریزی باعث زندگی انسان ہے' خون کو تحلیل ہوکر حرارت غریزی میں تبدیل ہوتا ہے۔ پھر یہی حرارت غریزی خون کو تحلیل کرتی ہے تاکہ دوسرے قویٰ کے لئے غذا بہم پہنچے۔ غرض وہ نتیجہ تحلیل خون بھی ہے اور خود بھی خون کو تحلیل کرتی ہے اور دونوں عملوں کے توازن سے ہستی انسان قائم رہتی ہے۔ اسی کو شاعر کہتا ہے کہ میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔ ''یعنی میں وہ دہقان ہوں جس کی سرگرمی خود اسی کے خرمن کے لئے برق کا کام کرتی ہے (خرمن کو جلاتی ہے) گویا میرا وجود ہی میری فنا کی دلیل ہے کہ اس میں فنا ہونے کی قابلیت قدرت نے پوشیدہ رکھی ہے۔

سعید:- دہقان کا خون گرم باعثِ خرابی ہے (پیدائشِ خرمن) دراصل بجلی کا ہیولیٰ ہے۔ یعنی فنا خود اس کی فنا کا باعث ہے کیونکہ نہ خرمن پیدا ہوتا نہ بجلی گرتی۔ خون کو بہ لحاظ حدّت برق سے تشبیہ دی ہے۔

۷۔ اُگا ہے سبزہ:- اگر گھروں میں گھاس اگ آئے تو ویرانی کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے÷ تماشہ کر:- سیر دیکھ۔ تماشہ کردن۔

ا۔ میرے گھر کی ویرانی ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ ہر طرف گھاس اُگ آئی ہے اور میرا دربان جو غیر لوگوں کو اندر آنے سے روکنے کے لئے نوکر رکھا گیا تھا وہ اب گھاس نوچتا پھرتا ہے۔ بچارا گھاس نہ نوچے تو اور کیا کرے۔ ویرانی کی وجہ سے گھر میں تو کوئی آتا نہیں۔ اس کو اپنی نوکری کی فکر ہے اس لیے اسباب ویرانی دوُر کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس قسم کی گھاس سبزۂ بیگانہ کہلاتی ہے۔ گویا دربان اس کو بیگانہ سمجھ کر نکالتا پھرتا ہے۔

بیخود:- اگر ویرانی کو مخاطب کیا جائے تو لطف سے خالی نہیں۔ آسی سبزۂ بیگانہ کے معنی بیج

میں نہیں لاتے اور اس کے بغیر شعریت پیدا نہیں ہوتی۔

۸۔ خون گشتہ:- خون شدہ' وہ آرزوئیں جن کا خون ہو گیا ہو یعنی پوری نہ ہوئی ہوں÷ چراغِ مُردہ:- بُجھا ہوا چراغ÷ بے زبان:- چراغ کی لو کو زبان سے تشبیہ دیتے ہیں اس لئے بجھے ہوئے چراغ کو زبان کہا ہے۔

میری خاموشی میں لاکھوں خون گشتہ آرزوئیں پوشیدہ ہیں۔ گویا میں گورِ غریباں کا بجھا ہوا چراغ ہوں۔ یعنی میری بے زبانی گورِ غریباں کے بجھے ہوئے چراغ کی طرح لاکھوں خوں گشتہ آرزوؤں کی دلیل ہے (سب متفق) بجھے ہوئے چراغ کو بے زبان آدمی اور خون گشتہ آرزوؤں کو گورِ غریباں کے ساتھ مشابہت دینا نہایت خوب ہے۔

سعید:- گورِ غریباں میں بجھے ہوئے چراغ کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نہ معلوم مدفونین کی (جو کہ اس قدر بیکس ہیں کہ ان کی قبروں پر کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں) کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہوا ہوگا۔ بقول آسی مضمون نہایت حسرتناک الفاظ میں ادا ہوا ہے۔

۹۔ پرتو:- عکس÷ ہنوز:- ابھی' اس لفظ سے ظاہر ہے کہ خیال جاتا رہا ہے لیکن اس کا پرتو باقی ہے جس کی وجہ سے دل کے تنگ و تاریک حجرہ میں کچھ روشنی باقی ہے÷ دلِ افسردہ:- خانۂ دل جس میں (خیالِ یار کے نکل جانے سے) افسردگی طاری ہے÷ حجرہ:- تنگ و تاریک کوٹھڑی' گویا افسردگی سے حجرۂ زنداں بن گیا ہے۔ حجرۂ یوسف۔ جس میں یوسف کو قید کیا گیا تھا۔ وہ نہایت تنگ و تاریک تھا لیکن اُن کے حُسن کے نُور سے وہ منوّر ہو گیا تھا۔ پرتوِ خیالِ یار کو حضرت یوسف کے پرتوِ حسن سے اور اپنے دلِ افسردہ کو حجرۂ زندانِ یوسف سے تشبیہ دی ہے۔

میں ابھی اپنے محبوب کو بالکل نہیں بھولا۔ اب تک خیالِ یار کا عکس دل میں باقی ہے اور فقط اس پرتو سے میرا افسردہ دل حضرت یوسف کا حجرۂ زندان بن گیا ہے۔ کہتے ہیں۔ حضرت یوسف کے نورِ حسن سے تنگ و تاریک حجرہ بقعۂ نور بن گیا تھا۔

سعید:- حضرت یوسف کا پرتو ان کے آزاد ہونے کے بعد بھی زنداں میں رہ گیا تھا۔ اسی طرح حجرۂ دل میں پرتو خیالِ یار باقی ہے۔

آسی:- ہنوز سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق نے خود خیالِ یار کو رخصت نہیں کیا بلکہ وہ

افسردگی دل سے جاتا رہا' جو ستم ہائے محبوب کا نتیجہ تھی۔ افسردگی کے معنی ٹھٹھر جانا اور سکڑ جانا ہے۔ اس لئے دل میں جگہ باقی نہ رہی افسردہ ہونے سے حجرہ کی مشابہت ہے۔

۱۰۔ تبسّم ہائے پنہاں:- زیرِ لب مسکراہٹ۔ جس کا اثر محض ہونٹوں پر ظاہر ہو۔ تبسم حجاب آمیز۔

عاشق نے محبوب کو خواب میں تبسم ہائے پنہاں کرتے دیکھا ہے اور وہ اس خواب سے اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ محبوب آج رقیب کی بغل میں سو رہا ہے اسی وجہ سے وہ خواب میں حجاب آمیز تبسم کرتا ہوا دکھلائی دیا ہے ورنہ وہ ستم شعار میرے خواب میں آتا اور تبسم ہائے پنہاں کرتا؟ غیر ممکن ہے (حجاب آمیز مسکراہٹ وصل کا پتہ دے رہی ہے)

بیخود و طباطبائی:- تو رقیب کی بغل میں سویا ہوا ہے اور تیری حجاب آمیز مسکراہٹ مجھے خواب میں نظر آرہی ہے۔

۱۱۔ لہو پانی ہونا:- رونا۔ خیال ہے کہ خون پانی ہو کر آنسو کی صورت اختیار کرتا ہے÷ قیامت ہے:- انتہائی مصیبت ہے÷ سرشک آلود ہونا:- آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانا۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تیری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے سے کتنے عشاق کا لہو پانی ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ گیا ہوگا یعنی انہیں کس قدر تکلیف پہنچی ہوگی۔ تیری آنکھوں میں آنسو آجانا تیرے چاہنے والوں کے لئے قیامت سے کم نہیں۔

سعید:- (۱) تیرے غم میں معلوم نہیں کتنے حرماں نصیبوں کا خونِ جگر آنسو بن کر آنکھ کے راستے نکلا ہوگا۔ تب کہیں تیری آنکھیں سرشک آلود ہوئی ہیں۔ (۲) میرے ہم خیال۔

بیخود:- کس کس عاشق کا لہو پانی کی طرح تو نے بہایا ہوگا۔ اب ان بے گناہوں کی یاد تجھ کو رُلا رہی ہے۔

طباطبائی:- مژگانِ معشوق جو ہمیشہ عشاق کے دل و جگر میں کھٹکا کرتی ہیں۔ اس کا آنسو وہی آنسو ہے جو عشاق کے دل میں پیدا ہو کر آنکھوں کی طرف جایا چاہتے ہیں اور تیری مژہ پر آنسو ہونا اس کی علامت ہے کہ عشاق کا لہو پانی ایک ہوگیا۔

حسرتؔ:- تیری جفا سے کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا جس کی ندامت کے باعث تیری آنکھیں سرشک آلود ہیں۔ (۲) میرے ہم خیال۔

۱۲۔ نظر میں ہے:- بھولا نہیں ہوں۔ پیش نظر ہے÷ جادہ :- راستہ÷ شیرازہ:- جزبندی' اجز کو اکٹھا سی دینا÷ اجزائے پریشان:- بکھرے ہوئے جز۔

اے غالبؔ جادۂ راہِ فنا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ گویا اسے میں کبھی نہیں بھولتا کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ دُنیا کے اجزائے پریشان رشتۂ فنا میں منسلک ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی تمام چیزیں چاہے ان میں کتنا ہی تبائن اور اختلاف کیوں نہ ہو' فنا ہوکر ایک ہو جاتی ہیں۔ گویا رشتہ فنا میں تمام اوراق عالم سے ہوئے ہیں۔

۱۰

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا ۱ حباب موجہ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے ۲ کہ موج بوئے گُل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

۱۔ یک بیاباں ماندگی:- اتنی تھکان جو ایک بیابان کی آوارگی سے پیدا ہو یعنی بہت زیادہ تھکان÷ ذوق:- ذوقِ صحرا نوردی÷ حباب:- بلبلا÷ موجہ:- موج۔

رفتار کو موج اور نقشِ قدم کو حباب سے تشبیہ دی ہے۔ کثرت ماندگی سے بھی میرا ذوقِ صحرا نوردی کم نہ ہوگا۔ کیونکہ میرا نقشِ قدم موجہ رفتار کا حباب ہے۔ موج اور حباب کا ذوقِ روانی کسی صورت میں کم نہیں ہوتا بلکہ موج جس قدر آگے بڑھتی ہے حباب پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں مٹتے ہیں پھر بن جاتے ہیں اور موج کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں' اسی طرح میری کثرتِ ماندگی صحرا نوردی میں مانع نہیں ہوسکتی بلکہ میں کثرت ماندگی کے باوجود آگے بڑھتا چلا جاؤں گا۔

بیخودؔ:- جس طرح موجِ آب آگے بڑھنے کی غرض سے اُبھرتی ہے اسی طرح میرا نقشِ قدم آگے بڑھنے کا شوق رکھتا ہے۔

۲۔ بے دماغی:- بیزاری۔ نفرت÷ ناک میں دم آنا:- بیزار ہونا۔ تنگ ہونا÷ یہ محاورہ خوب برمحل صرف ہوا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ مجھ کو چمن سے بہت دلچسپی تھی لیکن اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ بوئے گل

سے بھی میرا دل بیزار ہے۔ اور میں اس سے گھبراتا ہوں بتقاضائے فطرتِ انسانی اکثر اوقات مایوسی اور افسردگی کی وجہ سے مرغوب اور دل پسند چیزوں سے بھی نفرت و بیزاری ہوتی ہے۔

سعیدؔ:- وفورِ عشق سے یہ بے دماغی پیدا ہوجاتی ہے۔

بیخودؔ:- انقلاب زمانہ سے محبت نے نفرت کی صورت اختیار کرلی ہے۔

۱۱

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفت ہستی ۱ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی ۲ جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

۱۔ سراپا رہن عشق:- ہمہ تن مبتلائے عشق÷ ناگزیر:- مجبور' ناچار÷ ناگزیرِ الفت ہستی:- جان کو عزیز رکھنے پر مجبور ہوں÷ حاصل :- خرمن' انجام÷ عشق کو برق اور ہستی کو خرمن سے تشبیہ دی ہے۔

میں سرتاپا رہن عشق ہوں یعنی مبتلائے عشق ہوں مگر لطف یہ ہے کہ پھر بھی اپنی جان کو عزیز رکھنے پر قدرتاً مجبور ہوں۔ پس میری مثال اس شخص کی سی ہے جو برق کی پرستش کرتا ہے اور جب برق اس کے خرمن پر گر کر خرمن کو جلا ڈالتی ہے تو پھر اس کے جل جانے کا افسوس بھی کرتا ہے۔

حسرتؔ:- میں طاعت گزار ہوں برقِ عشق کا اور طالب ہوں فنا کا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے چونکہ الفتِ ہستی فطرتِ انسانی میں داخل ہے اس لئے جان بھی عزیز ہے۔ بس میں حاصل یعنی ہستی کا افسوس کرتا ہوں جس سے میرے کمالِ شوق فنا میں کسی قدر نقص بھی نمودار ہے۔ مختصر یہ کہ میں موت کا طلبگار ہوں اور اپنی ایسی زندگی پر افسوس کرتا ہوں جس پر موت کو ترجیح ہے۔

۲۔ بقدر ظرف:- حوصلے کے مطابق÷ تشنہ کامی:- پیاس÷ خمار:- نشہ کا اُتار÷ خمیازہ:- جمائی۔ نشہ اُترنے کی نشانی۔ جب نشہ ٹوٹتا ہے تو آدمی بار بار جمائیاں اور انگڑائیاں لیتا ہے۔ ساحل کی کجی کو انگڑائی کی صورت میں دکھلایا ہے۔

اے ساقی ہر شخص کو بقدر حوصلہ تشنہ کامی ہوا کرتی ہے مگر میرا ظرف بہت بڑا ہے۔ حد یہ ہے کہ دریائے شراب بھی مجھے سیر نہیں کرسکتا۔ بس یوں سمجھ لے اگر تو دریائے شراب ہے تو میں اس دریائے شراب کا ساحل ہوں اور ساحل کی یہ خاصیت ہے کہ باوجود نزدیکی وفیاضی دریا کے وہ کبھی سیر

نہیں ہوتا بلکہ ٹیڑھا ہو ہوکر انگڑائیاں ہی لیا کرتا ہے کہ اُس کا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ اور اسے شراب کی ضرورت ہے۔ اس لئے اگر تو بہ افراط شراب پلاسکتا ہے تو میں بھی ساحل ہوں' گویا میرا ظرف تیری دریادلی کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ (۲) یا یہ کہ جس قدر تیرا حوصلہ شراب پلانے میں بڑھا ہوا ہے اُسی قدر میرا ظرف بھی بڑا ہے۔ آسی نے پہلے معنی لکھے ہیں اور باقی شارحین دوسرے معنی لکھتے ہیں۔

۱۲

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۱ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے ۲ یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز ۳ میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں ۴ طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جانگداز کا
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے ۵ ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز ۶ ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا
تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

۱۔ محرم:- واقف÷ نوا:- آواز÷ پردہ:- پردۂ ساز÷ جس میں سے نغمہ پیدا ہوتا ہے÷ ساز:- آلۂ موسیقی÷ حجاب:- پردہ÷ پردہ کو ساز کے ساتھ مناسبتِ لفظی ہے۔

اے شخص چونکہ تو راز کے نغموں سے نا آشنا ہے اس لئے تو نغمۂ حقیقت کو نہیں پہچان سکتا۔ اگر تو چشمِ حقیقت میں سے دیکھے تو تجھ کو ہر چیز پردۂ ساز کی طرح نغمہ خیز اور اسرارِ غیبی کو ظاہر کرنے والی دکھائی دے۔ لیکن چونکہ تو نغمۂ راز سے نابلد ہے اسلئے پردۂ ساز تیری آنکھوں کے سامنے پردے (اوٹ) کا کام دیتا ہے اور تو اس سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔

۲۔ رنگ شکستہ:- اُڑا ہوا رنگ÷ صبحِ بہار:- موسم بہار میں صبح کے وقت پھول کھِلتے ہیں اور اسی وقت خوبانِ جہاں انگڑائیاں لیتے ہوئے اُٹھتے ہیں نیز جب سوکر اُٹھتے ہیں تو نیند کے خمار سے طبیعت سُست اور رنگ پھیکا پڑجاتا ہے۔ سستی دُور ہوجانے کے بعد طبیعت شگفتہ ہوتی ہے۔ یہ منظر

غالب نے دُوسرے مصرعے میں پیش کیا ہے۔

کہتے ہیں جب محبوب خواب ناز سے اُٹھتا ہے تو اُس کا اُڑا ہوا رنگ صبحِ بہار کے رنگ اُڑنے کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جس وقت ایک طرف کلیاں کھلتی ہے اور دوسری طرف معشوقوں کے گلہائے ناز شگفتہ ہوتے ہیں۔ یعنی مسکراتے ہوئے بیدار ہوتے ہیں۔

سعید:- (۱) عاشق کا رنگِ شگفتہ دیدنی ہے اور چونکہ اے معشوق یہ تیری وجہ سے ہے۔ اس لئے تجھے اپنے اندازِ محبوبی کو برسرِ کار لانا چاہئے۔

بیخود:- میرا اُڑا ہوا رنگ میرے دوست کی صبح بہار نظارہ ہے اور وہ یہی وقت تو ہے جب اس کے گلہائے ناز کھلا کرتے ہیں۔ اے معشوق صبح کے وقت میرے منہ پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی دیکھ کر تو بھی اپنے نازوانداز کے پھول کھلانے میں مصروف نازوانداز ہوجا۔

آسی:- نظارۂ معشوق نے میرا رنگ اُڑا دیا ہے اور وہ رنگ پریدہ مثلِ صبحِ بہار اور پھولوں کا کھلنا لازم وملزوم ہیں اور وہ پھول نازِ معشوق کے پھول ہیں۔ یعنی معشوق جب اپنے نظارہ سے میرا رنگ اُڑتا ہوا دیکھے گا تو اُس کو اپنے حُسنِ ادا پر ناز ہوگا۔ آسی۔ طباطبائی کے ہم خیال ہیں۔ طباطبائی نے اس قدر اور لکھا ہے کہ میرے منہ پر ہوائیاں اُڑتے ہوئے دیکھ کر وہ سرگرمِ ناز ہوگا۔ یعنی میرا رنگ اُڑ جانا وہ صبح ہے جس میں گلہائے ناز شگفتہ ہوں گے۔

حسرت:- شبِ وصل کی صبح کو محبوب کا رنگ شکستہ ''صبحِ بہار نظارہ'' ہے۔ یعنی اس کی دلپذیری قابلِ دید ہے۔ اس لئے گلہائے ناز کے شگفتہ ہونے کا یہی خاص وقت ہے۔

۴۔ صرفہ:- فائدہ÷ طعمہ:- نغمہ÷ نفسِ جانگداز:- جان کو پگھلادینے والی آہ۔

آہ کو ضبط کرنے میں میرا ہی فائدہ ہے۔ ورنہ ایک ہی آہِ جانگداز میرا خاتمہ کردے۔

طباطبائی:- اپنی توانی و نقاہت اور اپنی آہ کی شدّت وحدّت کا بیان مقصود ہے۔

۳۔ نظر ہائے تیز تیز:- غضب آلود نگاہیں÷ مژہائے دراز:- لمبی لمبی پلکیں۔

تو غضب آلود نظروں سے غیر کو دیکھتا ہے اور مجھے تکلیف ہوتی ہے کہ تیری مژہ ہائے دراز کا غیر پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اس طرح دیکھنے سے تیری مژگانِ دراز کو مفت میں تکلیف ہوتی ہے اور اس تکلیف سے میرا دل کڑھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خشم آلود نگاہوں سے بھی تو مجھ کو دیکھ۔

سہاؔ :- مژہ ہائے تیز تیز :- الفت بھریں نظریں۔ تیری نازک مژگاں کو رقیب کے پتھر جیسے دل کے چھیدنے میں تکلیف ہوتی ہوگی ان کے لیے تو میرے جیسا نرم دل چاہیے۔

بیخودؔ :- جو لطف و عنایت کی نگاہیں تُو غیر پر کرتا ہے اُن سے میرے دل میں رشک و حسد پیدا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تیرا عشق رشک کی برچھیاں میرے دل میں چبھوتا ہے۔

آسیؔ :- تو غیروں کو تیز نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس سے میرے اُوپر برچھیاں چلتی ہیں یا ہر وقت تیری پلکوں کے عشق کا دُکھ اُٹھاتا ہوں اور تو غیروں کو دیکھتا ہے۔ ہائے علامت جمع ہے بطور کلمۂ تاسف بالکل غلط ہے۔ طباطبائیؔ دونوں صورتوں کو صحیح بتاتے ہیں۔

۵۔ بساط :- فرش۔ شیشہ باز۔ بیخودؔ۔ شعبدہ باز بوتل کو اُچھالتے ہیں۔ پھر اس کو اپنے جسم پر لیتے ہیں اور اس طرح ناچتے ہیں کہ بوتل جسم پر پھرتی رہتی ہے اور زمین پر گرنے نہیں پاتی۔

طباطبائیؔ :- مردِ شعبدہ باز اس کو کہتے ہیں جو شعبدہ دکھاتے وقت ہاتھوں کو اور سر کو ہلاتا ہے۔

آسیؔ :- ہندوستان کے نٹ اور کتھک برتن میں پانی بھر کر سر پر رکھ کر ناچتے ہیں اور وہ گرنے نہیں پاتا۔

شراب میں اس قدر جوش پیدا ہوا ہے کہ شیشے خود بخود گردش میں آ گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فرش کا ہر گوشہ شیشہ باز کا سر ہے کہ اس پر شراب کے لبریز شیشے گردش رقص کر رہے ہیں۔ محفلِ مے نوشی کا نقشہ بہت خوب کھینچا ہے۔

۶۔ کاوش۔ کریدنا۔ کھودنا۔ گرہ نیم باز :- آدھی کھلی ہوئی گرہ دل گرہ سے تشبیہ دی ہے معلوم ہوتا ہے کہ گرہِ دل کو پہلے تھوڑا بہت کھولا جا چکا ہے۔

میرا دل جو تنگی و گرفتگی عشق سے گرہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ناخن پر کاوش کے اس طرح تقاضے کر رہا ہے کہ اس گرہ کو بالکل کھول ڈال۔ نیم باز نہ رہنے دے یعنی مزید کاوش کر۔ ان تقاضوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ناخن ابھی اس کا مقروض ہے۔

آسیؔ :- (۱) میرے ہم خیال (۲) گرفتگی سے اگرچہ دل گرہ ہو کر رہ گیا لیکن کاوش سے باز نہیں آتا اور میں برابر اس کو ناخن سے کھودے جاتا ہوں (۳) دل میں جو ابھی تھوڑا سا زخم ہے اس

کو اور بڑھانا چاہتا ہے۔

بیخودؔ :- یار کی گرہ بند قبا ہم سے آدھی کھل سکی۔ اس جرم میں ہمارا دل ہم سے کاوش کا تقاضا کر رہا ہے اور ناخن پر ابھی تک گرہ کا قرضہ باقی ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اپنے دل کو اس ناخن سے کہ جس سے بندِ قبا پورا نہ کھل سکا۔ کرید کر زخمی کر لیں۔ اس سے زیادہ اس ناکامی کا بدلہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

۷۔ تاراج کرنا :- برباد کرنا۔ لوٹنا۔ دفینہ :- پوشیدہ خزانہ ÷ غمِ ہجراں :- غمِ جدائی۔

اسدؔ کا وہ سینہ جس میں کہ گہر ہائے راز محفوظ تھے۔ کاوشِ غمِ ہجراں نے لُوٹ لیا یعنی غمِ جدائی نے اسے کھود کھود کر نکال لیا اور برباد کر دیا۔ آسیؔ اور طباطبائیؔ کہتے ہیں۔ اس بیان سے یہ مقصود ہے کہ غم نے رسوا کر دیا۔

۱۳

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا ‘ ۱ رکھیو یارب یہ درِ گنجینہ جو ہر کھلا
شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا ۲ اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب ۳ آستیں میں دشنہ پنہاں ‘ ہاتھ میں نشتر کھلا
گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں گو نہ پاؤں اُس کا بھید ۴ پر یہ کیا کم ہے ‘ کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال ۵ خُلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں ۶ زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا ۷ جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول ۸ آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال ۹ نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُن کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

۱۔ اشعار کا دفتر کھلا :- مشاعرہ جاری ہو گیا ÷ گنجینہ گوہر :- مراد بزمِ شعرا یا محفلِ شہنشاہ‘ ان مشاعروں کی طرف اشارہ ہے جو قلعۂ معلےٰ میں ہوا کرتے تھے۔ بہادر شاہ کے مذاق سخن اور مجمع

شعرا کے لحاظ سے بزمِ شہنشاہ کو گنجینہ گوہر کہا ہے۔ رکھیو در کھلا :- آباد رکھیو۔

شہنشاہ کی محفل میں پھر شعرا اپنا اپنا کلام پڑھ رہے ہیں۔ اس مشاعرے کی تجدید سے مسرور ہو کر دعا مانگتے ہیں کہ یارب اس مخزن کو ہر سخن کو ہمیشہ آباد رکھنا۔

طباطبائی:- بزمِ شاہی جو گنجینہ گوہر ہے تو محض اس سبب سے کہ میرے اشعار کا وہاں دفتر کھلا ہے اور یہ دعا ہے کہ الٰہی اس در کو آباد رکھ اور اس کا فیض جاری رکھ۔

۲۔ انجم رخشندہ:- چمکتے ہوئے ستارے ÷ منظر:- سماں ÷ تکلف:- شان ÷ بتکدہ:- بت خانہ میں چراغ روشن ہوتے ہیں۔ ستاروں کو چراغ سے تشبیہ دی ہے یا ستارے ہی بتوں سے مشابہ ہیں۔

رات ہوگئی چمکنے والے ستارے نکل آئے اور ستارے اس تکلیف اس شان سے برآمد ہوئے جیسے بتکدے کا دروازہ کھلتا ہے۔ بتکدے یا کسی معبد کا دروازہ جس شان سے کھولا جاتا ہے وہ ظاہر ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ رات ہوئی اور ستارے بڑی آن بان سے نمودار ہوگئے۔

بیخود:- رات ہوگئی۔ بزمِ سخن منعقد ہونے کا وقت آگیا۔ انجمِ رخشندہ (اشعار) کا منظر کھل گیا اور وہ (اشعار) ایسے آراستہ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ڈھلے ہوئے بُت سامنے رکھ دیئے ہیں جو منہ سے بول رہے ہیں۔

۳۔ دشنۂ پنہاں:- خنجر چھپا ہوا ÷ نشتر:- جنون کو دور کرنے کے لیے نشتر سے فصد کھولی جاتی ہے ÷ دوست:- دوست نما دشمن ÷

اگر چہ میں دیوانہ ہوں۔ پھر بھی میں دوست نما دشمن کو خوب پہچانتا ہوں اسلئے اسکے دھوکے میں نہیں آتا میں سمجھتا ہوں اُس نے مجھے دکھانے کے لیے ہاتھ میں نشتر لے رکھا ہے تاکہ میں سمجھوں کہ میرے جنون کا علاج فصد کھول کر کرنا چاہتا ہے لیکن درحقیقت اس کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا ہے اور اس نے اپنی آستیں میں خنجر چھپا رکھا ہے کہ اس بہانے سے موقع پاتے ہی مجھے قتل کر ڈالے۔ مطلب یہ ہے کہ میں فریب سے جان دینا نہیں چاہتا۔ باوجود دیوانہ ہونے کے ظاہری دوست اور پوشیدہ دشمن کو پہچانتا ہوں۔

۴۔ بھید پانا:- راز کو جاننا ÷ وہ پری پیکر کھلا:- بے تکلف ہوگیا۔

اگرچہ میرے لیے یہ نہایت تکلیف دہ ہے کہ میں اس کی باتیں نہیں سمجھ سکتا اور اس کا راز نہیں پاسکتا۔ پھر بھی یہ کونسی کم خوشی کی بات ہے کہ وہ پری وش محبوب مجھ سے بے تکلف ہوگیا ہے۔ آئندہ خود بخود مجھے رازداری کا موقع مل جائے گا۔

۵۔ حُسنِ عمل:- نیک کام کرنا ÷ خیالِ حُسن:- تصوّرِ معشوق۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اعمال نیک کی بدولت نیک لوگوں کی قبروں میں جنّت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ عذابِ قبر سے محفوظ رہتے ہیں۔ خیالِ حُسن یعنی تصوّرِ محبوب بھی حسنِ عمل کا ہم پایہ ہے کیونکہ خیالِ حسن سے میری قبر میں جنّت کا دروازہ کھل گیا ہے گویا حسنِ یار کے تصوّر کی بدولت دنیا میں نیک کام کرتے ہیں لہذا خیالِ حُسن حُسنِ عمل ہوا۔

سہا:- حسرت۔ طباطبائی:- تصوّرِ چہرۂ معشوق سے قبر میں باغِ بہشت دکھلائی دے رہا ہے کیونکہ اس کے چہرے میں باغ کی سی رنگینی ہے تو گویا تصوّرِ حسن اور حسنِ عمل کا ایک ہی ثمرہ ہے۔

بیخود:- میں حسنِ یار (معشوقِ حقیقی) کے تصوّر میں ایسا محو ہوگیا ہوں کہ اس کو حُسنِ عمل (عبادت) خیال کرتا ہوں اور اس خیال کی بدولت میری قبر میں جنّت کی کھڑکی کھل گئی ہے۔

آسی:- (۱) میرے ہم خیال (۲) میں عشق کی بدولت دُنیا کے جھگڑوں سے علیحدہ اور ہمیشہ ظلم و ستم سہتا رہا۔ اب مرنے کے بعد بھی وہی خیال ہے۔ تو انہی وجوہات سے خیالِ حُسن حُسنِ عمل بن گیا اور اسی کا یہ بدل ہے۔

۶۔ ہے وہ عالم:- وہ کیفیّت ÷ منہ پر کھلنا:- زیب دینا ÷ نقاب:- پردہ۔ زمانہ قدیم میں نقاب مذکر بولا جاتا تھا۔ اب دہلی والے مؤنث بولتے ہیں۔

گورے گورے چہرے پر کالی کالی زلفیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن غالب اپنے محبوب کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ باوجود چہرے پر نقاب ہونے کے اس کے حُسن کا وہ عالم ہے کہ ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ سبحان اللہ! اس شوخ کے چہرے پر نقاب زلفوں سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ دیکھا ہی نہیں اور مُنہ پر کھلا کے معنوں نے شعر میں جدّت اور حُسن پیدا کردیا ہے۔

بیخود:- معشوقِ حقیقی کا حُسنِ دلفریب باوجود اس قدر پردوں کے جو ظہورِ تجلیات قلب

مشاق پر کر رہا ہے اس کی صفت بیان نہیں ہو سکتی۔

۷۔ کمال مہربانی سے اس نے مجھ سے کہا کہ تم کو میرے در پر پڑے رہنے کی اجازت ہے۔ یہ سُن کر میں نے اپنا لپٹا ہوا بستر کھولنا شروع کیا۔ لیکن اس کی شوخی دیکھئے، جتنی دیر میں میں نے لپٹا ہوا بستر کھولا (یعنی بہت ہی جلدی) وہ اپنے الفاظ سے پھر گیا اور مجھے اپنا بستر لپیٹنا پڑا۔ اپنی خانہ بدوشی، محبوب کی وعدہ خلافی اور تلوّن مزاجی اور اس کی شوخی اور ستم ظریفی کا خوب پُر لطف نقشہ کھینچا ہے۔

۸۔ شبِ غم:- شبِ ہجر÷ بلاؤں کا نزول:- مصیبتیں نازل ہونا÷ اختر:- ستارہ÷

آج شبِ غم تاریک کیوں ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ آسمان سے مصیبتیں زمین پر نازل ہو رہی ہیں اور تاروں نے اُن کے اُترنے کا تماشہ دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف کر لی ہیں۔ اسی لیے روئے زمین پر تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ شبِ غم کی تاریکی اور بلاؤں کے نزول سے گھبرا کر کہتے ہیں کہ کیا آج ستاروں کی آنکھیں آسمان کی طرف دیکھتی رہیں گی اور سطح زمین کو اپنی روشنی سے منور نہیں کریں گی معنی کیا یہ بلائیں ساری رات نازل ہوتی رہیں گی اور ستارے تمام رات ان کے تماشے میں محو رہیں گے۔

بیخود:- اگر روشنی ہوتی اور میں ان بلاؤں کو آسمان سے اُترتے ہوئے دیکھ سکتا تو شاید اپنی حفاظت کی تدبیر کرتا!

آسی:- مصنف اعتراضاً کہتا ہے کہ شبِ غم اس قدر تاریک کیوں ہے حالانکہ آج بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور دیدہ اختر نحوست بھی ادھر ہی کھلا رہے گا جس سے تاریکی نہ ہونا چاہیئے۔ کیوں ازراہِ اعتراض ہے نہ کہ بطریقِ سوال۔

۹۔ غربت:- مسافری÷ حوادث:- آفاتِ ارضی وسماوی۔ مراد خبر مرگ÷ نامہ کھلا:- دستور تھا کہ جس خط میں کسی عزیز کی خبر مرگ ہوتی تھی اسے کھلا ہوا ہی روانہ کرتے تھے۔

میں مسافری میں کیسے خوش رہ سکتا ہوں جب کہ حادثات کا یہ عالم ہے کہ وطن سے جو خط آتا ہے وہ اکثر کھلا ہوا ہوتا ہے یعنی اس میں کسی نہ کسی عزیز کی موت اور دوست کی خبر درج ہوتی ہے۔ آسی دوسرے معنی یہ لکھتے ہیں کہ میرے عزیز اور دوست مجھے کھلے ہوئے خط بھیجتے ہیں یعنی مجھے

رازداری کے قابل نہیں سمجھتے۔

۱۰۔ اُمّت میں ہوں:- پیرو ہوں÷ کام بند رہیں:- ناکامیاب و مایوس رہیں÷ گنبد بے در:- یعنی آسمان۔ شبِ معراج سے کنایہ ہے کہ جب رسولِ مقبول عرش پر تشریف لے گئے تو آسمان اُن کے لئے کھل گئے۔

اے غالبؔ! میرے کام کیونکر بند ہو سکتے ہیں، میں تو اُس کی اُمّت میں ہوں جس کے لیے آسمان کا بے در گنبد کھل گیا تھا۔ گویا میری کامیابی حضرتِ رسول کی اُمّت میں ہونے کی وجہ سے یقینی ہے۔

۱۴

۱ شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا — شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا
۲ واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام — گریہ سے یاں، پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
۳ واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال — یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
۴ جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو — یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
۵ یاں سرِ پُر شور بیخوابی سے تھا دیوارِ جو — واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
۶ یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی — جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
۷ فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا — یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

۱۔ برقِ سوزِ دل:- تپشِ قلب کی بجلی÷ زہرہ آب تھا:- پتہ پانی ہو گیا تھا یعنی سخت ہیبت زدہ تھا÷ شعلۂ جوّالہ:- گردش کرنیوالا شعلہ۔ شعلۂ لرزاں تھا÷ گرداب:- بھنور÷

رات کو میرے دل کی گرمی اور ہیبت سے ابر کا پتہ پانی پانی ہو گیا تھا اور اس پانی میں جو بھنور پڑتے تھے وہ میرے دل کی تاثیر سے شعلہ ہائے لرزاں معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شبِ ہجر میں پانی اور آگ کا ایک طوفان اُٹھ رہا تھا۔

۲۔ کرم:- کرم کرنے یعنی تشریف لانے÷ عنان گیر:- مانع÷ خرام:- چلنا یعنی تشریف

لانا÷ پنبہ بالش:- تکیہ کی رُوئی ÷ کفِ سیلاب:- سیلاب کے جھاگ÷

اُدھر اُن کو میرے گھر تشریف لانے میں بارش کا عذر تھا۔ اور ادھر میری یہ حالت تھی کہ ان کے انتظار میں تکیئے پر سر رکھے اس طرح رو رہا تھا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہہ گئے اور میرے تکیئے کی رُوئی اس سیلاب میں کفِ سیلاب معلوم ہوتی تھی۔

سعید:- معشوق نے بارش کا تو بہانہ کیا۔ لیکن میری حالت کو نہ دیکھا جو اس کے نہ آنے سے زار ہو رہی تھی اس لئے انکو آنا ملتوی نہ کرنا چاہیئے تھا۔

آسی:- (۱) میرے بخیال (۲) کفِ سیلاب تکیہ کہ رُوئی تھی یعنی رُوئی کا تکیہ بہا بہا پھرتا تھا (۳) سیل میں اس قدر جھاگ تھے کہ رُوئی معلوم ہوتی تھی۔

۳۔ خود آرائی:- بناؤ سنگار۔ آرائش ÷ موتی پرونا:- بہت زیادہ آرائش کرنا ÷ تارِ نگہ نایاب تھا۔ دکھائی نہ دیتا تھا÷

وہ تو اپنی آرائش اور بناؤ سنگار میں موتی پرو رہے تھے یعنی حد درجہ مصرف تھے اور ادھر انتظار میں ہماری یہ حالت تھی کہ روتے روتے کثرتِ گریہ کے باعث نظر بھی نہ آتا تھا۔ یعنی ہم نے تارِ نگاہ میں اتنے دُرِ اشک پروئے تھے کہ تارِ نگہ بالکل چھپ گیا تھا۔

اس شعر میں تشبیہ نہیں دی گئی بلکہ دو متشابہ چیزوں کا ذکر کر دیا ہے جو کمالِ فن ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خوبی یہ ہے کہ جو کچھ محبوب کر رہا ہے وہی عاشق بھی کر رہا ہے۔ عاشق کی اشک باری اور معشوق کی خود آرائی کی تصویر خوب کھینچی ہے۔

۴۔ باغ میں سُرخ سُرخ پھول اس کثرت سے تھے کہ ان کے عکس نے آبجو میں چراغاں کر دیا تھا لیکن یہاں ہمارا یہ حال تھا کہ اشکبار آنکھوں سے خالص خون کے نالے بہے چلے جاتے تھے۔ گویا آبجو کے مقابلہ میں چشم تر تھی۔ اور شاخہائے گل کے جواب میں پلکوں پر لہو کی بوندیں۔ قطراتِ اشک رنگیں کی گل سے تشبیہ بہت خوب ہے۔

۵۔ سرِ پُر شور:- سرِ شوریدہ۔ پُر از سودا÷ بے خوابی:- نیند نہ آنا ÷ دیوار جُو:- (سر ٹکرانے کے لیئے) دیوار ڈھونڈتا تھا÷ فرقِ ناز:- سرِ پُر غرور÷ بالش:- تکیہ÷ کمخواب:- اعلیٰ قسم کا قیمتی کپڑا÷

نیند نہ آنے کی وجہ سے میرا پُراز سودا سر دیوار کی تلاش میں تھا کہ اس سے ٹکریں مار کر بیہوش ہو جائے۔ اور ادھر محبوب اپنا سرِ ناز کمخواب کے تکیہ پر رکھے۔ کمال ناز سے محوِ خواب تھا۔ بے خوابی اور کمخواب کی رعایت خوب ہے۔

۶۔ نفس:- آہ÷ بساط:- فرش÷ احباب:- احبابِ محبوب یعنی رقیب÷

ادھر ہماری بزمِ بے خودی میں ہماری آہ کی شمع روشن تھی اور اُدھر محبوب کی محفل میں ان کے احباب کے لیے پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ یعنی ہماری یہ حالت کہ صدمہ فراق سے ہم بے خود ہو رہے تھے اور ادھر محبوب رقیبوں کے جلسہ میں عیش اُڑا رہا تھا۔

۷۔ فرش سے تا عرش:- زمین سے آسمان تک÷ طوفان:- کثرتِ جوش÷ موجِ رنگ:- عیش و عشرت÷ سوختن کا باب:- سوختن کی پوری گردان÷

اُن کی محفل میں فرش سے لیکر عرش تک عیش و نشاط کا ایک طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور یہاں محض جلنا ہی جلنا ہے۔

آسی و طباطبائی:- (۱) دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ یہاں کا زمین و آسمان آگ لگا دینے کے قابل تھا۔

۸۔ اس رنگ سے:- اس طرح سے' غزل کی طرف اشارہ ہے۔ خونناب:- خالص خون' یعنی دردخیز اشعار÷ کاوشِ ناخن:- کاوشِ غم÷ لذت یاب:- لذت کش÷

یکا یک میرا دل جو کاوشِ غم سے لذّت یاب ہو چکا تھا۔ اس طرح سے یعنی اشعارِ ذیل کی صورت میں خونناب ٹپکانے لگا۔ گریز کا بالکل نرالا ڈھنگ ہے۔

۱۵

نالہ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا	۱	تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر' گو بیتاب تھا
مقدمِ سیلاب سے کل کیا نشاط آہنگ ہے	۲	خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں	۳	پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسانے ورنہ یاں	۴	ذرہ ذرہ رُوکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا
آج کیوں پروانہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟	۵	کل تلک تیرا بھی دل مہروفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا ۶ انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

۱۔ اندازِ اثر:- اثر ÷ نایاب:- مفقود ÷ سپند:- کالا دانہ جو نظرِ بد کو دُور کرنے کے لئے جلاتے ہیں۔

رات کو میرے نالہ دل میں بالکل اثر نہ تھا۔ وہ اگرچہ سخت بیتاب تھا لیکن اس کی بیتابی اور جلنا بزمِ وصلِ غیر کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے کالے دانے کا کام دے رہا تھا۔ گویا میری بیتابی اور تپشِ دل کا اثر اُلٹا تھا۔

۲۔ مقدمِ سیلاب:- آمدِ سیلاب ÷ نشاطِ آہنگ:- خوش۔ مسرور÷ سازِ صدائے آب:- جل ترنگ۔ چینی کے سات پیالوں میں پانی بھر کر لکڑی سے اُنہیں بجاتے ہیں۔

سیلاب کے آنے سے میرا دل بہت ہی مسرور تھا کیونکہ اس کی آمد سے خانہ بربادی اور کلی تباہی کی توقع وابستہ تھی۔ اس تمنا کے پورا ہونے کی خوشی میں صدائے آب اور مکان کے دریا بُرد ہونے کی آواز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرا گھر جلترنگ کا ساز تھا۔ "صدائے آب" اور "آہنگ" سے شعر میں خوب لُطف پیدا ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق اپنی بربادی سے مسرور ہوتے ہیں۔ صدائے آب اور مکان کی دریا بُردگی سے جو آواز پید ہوتی ہے اس میں اس کو جل ترنگ کے نغموں کا لطف آتا ہے۔

۳۔ نازش:- فخر÷ خاکسترنشینی:- خاک نشینی، بربادی ÷ اندیشہ:- خیال ÷ سنجاب:- ایک جانور ہے جس کی کھال کے پوستین بنائے جاتے ہیں اور رنگ اس کا خاکی ہوتا ہے۔ یہ پوستین بہت قیمت پاتے ہیں۔ ہم رنگی سے بسترِ سنجاب اور خاکسترنشینی میں رعایت پیدا ہوگئی۔

میں جن ایام میں خاک نشین تھا اس زمانہ میں قناعت کی بدولت خاک پر مجھ کو جس قدر فخر و غرور تھا وہ بیان نہیں کرسکتا۔ یوں سمجھ لو کو میرے پہلوئے خیال کو بسترِ مرگ پر بسترِ سنجاب کی سی راحت ملتی تھی۔ اس بیان سے اپنی قناعت اور مشکل پسندی کا اظہار مقصود ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خاک نشینی میں انسان کبر و غرور سے خالی نہیں رہتا۔

طباطبائی:- میں خاک نشین تھا مگر میرا دل قناعت کے فخر و ناز کے سبب سے فرشِ سنجاب پر لوٹ رہا تھا۔

آسیؔ:- خاک نشینی کے ایّام کا فخر و ناز کیا بیان کروں کہ اس زمانہ میں ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ کبھی ہم بھی بسترِ قاقم و سنجاب پر تھے اور اس طرح سے خیال عیش نصف عیش بنا ہوا تھا مگر افسوس کہ اب وہ زمانہ نہ رہا۔ یہ معنی اندیشے کے لفظ سے پیدا ہوئے ہیں۔

۴۔ کچھ نہ کی:- کچھ نہ کیا۔ محروم رکھا÷ جنونِ نارسا:- عشقِ ناقص یا بے اثر÷ رُوکش:- مدِ مقابل÷

افسوس کہ میرے عشقِ ناقص نے مجھے اکتسابِ تابندگی سے محروم رکھا۔ ورنہ یہاں تو خاک کا ہر ذرہ بے مقدار ہونے کے آفتابِ عالم تاب کا مدِ مقابل تھا۔ اگر ہمارا عشق یاوری کرتا تو ہم باوجود ذرّہ بے مقدار ہونے کے آفتاب عالمتاب کی طرح چمکتے، یعنی عشقِ نارسا کی بدولت ہم خاک کے معمولی ذرہ سے بھی کمتر رہے یا یہ کہ اگر عشق ہم کو جلا کر خاک کر دیتا تو ہماری خاک کا ہر ذرہ آفتاب عالمتاب کا ہم پایہ بن جاتا۔

طباطبائی و بیخودؔ:- جنون نارسا (عشقِ ناقص) نے ہم کو اکتسابِ فیض (تجلیات انوارِ الٰہی و اتحادِ معشوق) سے محروم رکھا، ورنہ دنیا کا ہر ذرّہ اکتساب نور سے رشکِ آفتاب بنا ہوا تھا۔

آسیؔ:- (۱) میرے جنون نے نارسائی کی اور حدِّ جنون کو نہ پہنچ سکا ورنہ جنون کے مقام کا ہر ذرہ رشکِ خورشید تھا (۲) جس مقام پر جنون پہنچ چکا تھا اس مقام کا ہر ذرّہ رُوکشِ آفتاب تھا۔

۵۔ باب:- کتاب کا ایک حصہ۔ دروازہ۔ سرچشمہ÷

پتہ نہیں آج کیا بات ہے کہ تجھے اپنے اسیروں (عاشقوں) کی پرواہ نہیں۔ ورنہ کل تک تو اس قدر بے پروانہ تھا بلکہ تیرا کل مہر و وفا کا سرچشمہ تھا اور تُو اُن کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔

بیخودؔ نے باب کے معنی دروازے کے لیے ہیں۔ آسیؔ کو باب پر اعتراض ہے کہ یہ اُردو میں مستعمل نہیں۔ خالص فارسی ہے۔

۶۔ صید:- شکار÷ دام:- جال÷ دیدۂ بیخواب:- کھلی ہوئی آنکھ۔ حلقہ دام کو دیدۂ بیخواب سے تشبیہ دی ہے اور وجہ شبہ یہ ہے کہ چشمِ بیخواب حلقہ دام کی طرح کھلی رہتی ہے۔ بہت

خوب تشبیہ ہے۔

تُو ان ایام کو ذرا یاد کر' جب تیرے دام کا ہر حلقہ شکار کے انتظار میں چشمِ بے خواب کی طرح کھلا رہتا تھا یعنی تو ہر وقت عشاق کا خیال رکھتا تھا۔ کہ میں کس طرح اور کیونکر ان کو اپنے دام میں پھنساؤں۔

۷۔ کفِ سیلاب:- وہ جھاگ جو طوفان خیز پانی میں تیرتے پھرتے ہیں ÷ سیلِ گریہ:- طوفانِ اشک ÷

میں نے رات غالبؔ کو رونے نہ دیا۔ اگر وہ روتا تو پھر تم دیکھتے کہ اس کے سیلاب گریہ میں آسمان کفِ سیلاب کی طرح تیرتا پھرتا۔ گویا اس کی اشک باری سے اس قدر طوفان آتا کہ آسمان کو بھی جھاگ کی طرح بہالے جاتا۔ سیلِ گریہ آسمان تک پہنچ جاتا اور اس کے تھپیڑوں سے آسمان کفِ سیلاب کی طرح بہتا۔

۱۶

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب ۱ خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو ۲ توڑا جو تُو نے آئینہ تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں ۳ جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا
موجِ سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال! ۴ ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب ۵ دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

۱۔ ودیعت:- امانت۔ امانت ہمیشہ واپس کرنی پڑتی ہے÷ دینا پڑا حساب:- یعنی آنکھوں سے خون بہانا پڑا۔

حالیؔ:- یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھی اور اس لیے اس کے ایک ایک قطرے کا حساب اسی طرح دینا پڑے گا۔ جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔ بقول سعیدؔ سوائے مژگانِ یار کی خلش کے کسی اور کی محبت میں خونِ جگر آنکھوں سے رواں نہیں کیا جاسکتا۔

آسیؔ نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے:- حساب لینے میں غضب پایا جاتا ہے یا حساب اس

وقت دینا پڑتا ہے۔ جب کوئی بدنظمی ہوتی ہے میں بے قراری میں بہت سا خون بہا چکا تھا مگر اس کے بعد بھی اس کی یادِ مژہ کی کاوش اور محبت نے مجھے چین نہ لینے دیا اور جس قدر میں خون رو چکا تھا اتنا ہی پھر خون رُلایا۔ اس احتساب میں مجھے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ شعر بطریق افسوس تھا۔

۲۔ ایک شہرِ آرزو:- وہ شہر جس میں آرزوئیں آباد ہوں۔ یعنی بے حد آرزوئیں ÷ آئینہ تمثال دار:- وہ آبدار آئینہ جس میں عکس نظر آتے ہیں۔ یعنی میرا دل۔

تُونے میرے دِل کے آبدار آئینے کو توڑ ڈالا۔ اس میں تو آرزوؤں کا ایک شہر آباد تھا' تو نے اسے توڑ کر میری ہزاروں آرزوؤں کا خون کو دیا اس لئے اب میں ہوں اور ایک شہر آرزو یعنی تمثال دار کی بربادی کا ماتم ہے۔ بقول حسرتؔ تو نے ایک دلکشی کر کے میری ہزاروں آرزوؤں کا خون کر دیا۔

سعیدؔ:- تونے میرے دل کے آئینہ کو جس میں تیری صورت نظر آتی تھی توڑ ڈالا تو میری تمناؤں کا خون ہوگیا۔

بیخودؔ:- تونے آئینہ اس حالت میں توڑا جب تُو اس میں اپنا منہ دیکھ رہا تھا۔ گویا تُو تماشائی تھا اور میں یہ موقع غنیمت جان کر تجھ کو دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں ہزاروں تمنائیں اور آرزوئیں جوش مار رہی تھیں۔ تیرے غرورِ حُسن نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنا ثانی دیکھتا۔ تُو نے آئینہ توڑ ڈالا اور اس کے ٹوٹ جانے سے میری تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ گویا آرزوؤں کا ایک شہر تیرے آئینہ توڑ نے سے برباد ہوگیا۔

طباطبائیؔ:- آئینہ میں ایک ہی عکس نظر آتا ہے لیکن جب اسے توڑ ڈالا تو ہر ٹکڑے میں وہی پورا عکس دکھائی دیتا ہے۔ یہاں پر ہر عکس کو دیکھ کر ایک ایک آرزو کا خون ہوتا ہے۔ غرضیکہ جس آئینہ میں معشوق کے عکس وتمثال کا جلوہ تھا اس کے ٹوٹنے سے ایک شہر آرزو کا خون ہوگیا ہے۔ آسیؔ اس شرح کو غلط قرار دیتے ہیں۔

۳۔ جاں دادہ:- کشتہ ÷ ہوا:- آرزو ÷ جب میں زندہ تھا تو مجھے کوچہ گردی کا بہت شوق تھا اور یہی شوق میری موت کا باعث ہوا۔ اس لیے میری لاش کو اب گلی کوچوں میں کھینچے پھرو تا کہ مرنے کے بعد بھی میری آرزو پوری ہوتی رہے۔

طباطبائی:- ہوا کے معنی آرزو اور رہگذر سے مراد رہگذر معشوق ہے۔

سعید:- چونکہ میں نے سرِ رہگذر معشوق کی آرزو میں جان دی ہے۔ اس لیے میری نعش کو گلیوں میں گھسیٹتے پھرو تا کہ میری آرزو پوری ہو جائے۔ بیخود نے طباطبائی کی شرح پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اس طرح رفتہ رفتہ لوگ میری نعش کو معشوق کی گلی میں لے جائیں گے اور میرا مدعا حاصل ہو جائے گا۔

آسی:- مجھے بڑا شوق تھا کہ سڑکوں اور شاہراؤں کی ہوا کھاتا پھروں جیسا کہ اکثر امراء شام کو ہوا خوری کے لیے نکلتے ہیں اس لیے مرنے کے بعد مجھے یہ سزا دو کہ میری لاش کو کوچوں میں کھینچے پھرو اور اس طرح سے میری نازک دماغی اور شوق کو لوگوں پر ظاہر کر کے دُنیائے ناپائدار اور اس کے شوقوں سے عبرت دلاؤ کہ کبھی یہ ایسا نازک دماغ تھا' اب اتنا مجبور ہے یا یہ کہ میری حالت زندگی میں بھی مجنونوں کی تھی بعد مرگ بھی وہی ہو۔ آسی جاندادہ کی جگہ دلدادہ لکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے' ہوا کے معنی آرزو نہیں لینے چاہئیں۔ کیونکہ دلدادہ کے معنی آرزومند ہیں۔ اس طرح سے دلدادہ بیکار ہو جاتا ہے۔

۴۔ سراب:- ایک خاص قسم کی ریت ہے جو دور سے پانی معلوم ہوتی ہے پیاسا اس کی طرف جاتا ہے۔ پانی کی امید میں بڑھتا چلا جاتا ہے' اور آخر کار پیاس سے ہلاک ہو جاتا ہے۔

جوہرِ تیغ:- تلوار کے خطوط مجھ سے دشتِ وفا کا حال نہ پوچھو وہ تو موجِ سراب کی طرح مہلک ہے اور پیاسے (وفاپرست) کو دھوکا دیکر ہلاک کر دیتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ دشتِ وفا کا ہر ذرہ جوہرِ تیغ کی آبدار ہے' بھلا دشتِ وفا میں گامزن ہو کر کوئی کہاں تک بچ سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وفا جان لئے بغیر نہیں رہتی۔

آسی:- (۱) بخیال (۲) مجھے اپنی وفا سے کیا کیا امیدیں تھیں یعنی جذب کی توقع اور معشوق کی جانب سے بھی وفا کی امید' مگر وہ سراب نکلا اور میری وفا بیکار رہی اور سرِ دستِ وفا کے ذرہ ذرہ نے مجھے قتل کر دیا۔

۵۔ ناتجربہ کاری کی وجہ سے غمِ عشق کو ہم کچھ کم خیال کرتے تھے لیکن جب حقیقتاً عشق میں کمی ہوئی تو دنیا کی تمام آفتوں نے گھیر لیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ دُنیا کی تمام آفتیں اور آفتِ عشق

برابر ہے۔ (۲) عشق دُنیا کے غموں سے کہیں زیادہ ہے کہ عشق کے مقابلے میں کوئی اور آفت نہیں آتی۔ بیخود و طباطبائی نے آخری مفہوم لکھا ہے اور سعید و آسی نے دونوں مفہوم۔ بہر حال آخری مفہوم بہتر ہے۔

۱۷

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ۱ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی ۲ در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو ۳ آپ جانا اُدھر' اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے ۴ جوہرِ آئینہ بھی' چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ! ۵ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط ۶ تو ہو' اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا' ۷ لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ۸ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اُس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

۱۔ انساں ہونا:- حقیقی صفات انسانی پیدا کرنا ÷ بسکہ:- بہت زیادہ ÷

حالی:- بادی النظر میں کہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے' تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے اس کا بھی عین انسان بنا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں بلکہ شاعرانہ استدلال ہے۔ جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔

آسی:- چونکہ ہر کام کا آسان ہونا مشکل ہے۔ لہذا ہر آدمی بھی آدمی نہیں کہا جاسکتا۔

طباطبائی:- کمال انسانیت کے مرتبہ پر پہنچنا سہل نہیں ہے۔

۲۔ خرابی۔ ویرانی' بربادی ÷ کاشانہ:- جھونپڑا ÷ در و دیوار سے ٹپکنا:- ظاہر ہونا ÷

بیابان:- بالکل ویران÷ الفاظ بہت ہی مناسب لائے ہیں۔

میری گریہ وزاری کا مدّعا یہ ہے کہ میرا گھر ویران ہوجائے۔ چنانچہ اس گریہ وزاری کے اثر سے میرے گھر کے در و دیوار سے ویرانی ٹپکتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گھر اس نحوست سے کوئی دن میں بالکل ویران ہوجائے گا۔

٣۔ وائے:- افسوس ÷ دیوانگیِ شوق:- جنونِ عشق÷ ادھر÷ معشوق کی طرف÷

مجھ کو اپنے عشق کے دیوانہ پن پر افسوس آتا ہے کہ اس کے تقاضے سے میں بار بار تیری طرف جاتا ہوں اور پھر آپ حیران و پریشان ہوتا ہوں کہ میں یہاں کیوں آیا کیونکہ رسائی وہاں تک ممکن نہیں۔ بقول آسی یہ شوق تھا یعنی جنون تھا کہ تیرے کوچے میں ہزار بار گئے اور ہزار بار آئے۔

طباطبائی :- ہر دم یعنی ہر مرتبہ سانس لینے سے میں اس مبدأ حیات و وجود کی طرف دوڑتا ہوں اور اپنی نارسائی سے حیران ہوکر رہ جاتا ہوں۔

بیخود:- بار بار معشوق حقیقی کا مشتاق جمال ہوکر اپنی خودی سے گزر جاتا ہوں اور نارسائی کی وجہ سے حیران ہوکر سوچتا رہ جاتا ہوں کہ میں کہاں اور اس کا دیدار کہاں۔

٤۔ جلوہ:- حسنِ یار÷ تقاضائے نگہ:- تقاضائے دید÷ جوہرِ آئینہ:- آئینہ فولادی مراد ہے۔

وہ خطوط جو صیقل کرتے وقت پڑتے ہیں۔ مژگانِ آئینہ بنا چاہتے ہیں۔ چونکہ یار کا جلوۂ حُسن بہت ہی زیادہ تقاضائے دید کرتا ہے اس لیے اس کے حکم کی تعمیل میں آئینہ آنکھ اور اس کے جوہر (خطوط) پلکیں بن جانا چاہتے ہیں آئینہ کو آنکھ اور اس کے جوہر کو مژگاں سے تشبیہ دی ہے۔

سہا و سعید:- مژگاں ہونا سے آنکھ بنا مراد ہے یعنی جو ہر آئینہ شوق تماشا میں یہ چاہتا ہے کہ مژگان (آنکھ) بن جائے۔

آسی:- (١) چونکہ اس کا جلوہ ہر ایک سے تقاضائے نگہ کرتا ہے۔ جب آئینہ میں اس کا عکس پڑا تو اس کے جوہر میں یہ خاصیت پیدا ہوگئی کہ وہ مژگانی کرنے لگا یا اس کے جلوہ کے اثر سے مژگان بن گیا۔ (٢) ہم خیال÷

٥۔ عشرت:- مسرّت ÷ اہلِ تمنا :- عشاق÷ عید نظارہ:- نظارہ کی عید۔

قتل گاہ میں عشاق کی خوشیوں کا حال نہ پوچھ۔ وہ قتل گاہ میں شمشیرِ یار کو عریاں دیکھ کر شوقِ شہادت سے بہت زیادہ مسرور ہوگئے جیسے انہوں نے عید کا چاند دیکھ لیا اور اُن کے لیے عید نظارہ آگئی۔ مصنّف کا کمال یہ ہے کہ خیال خود بخود شمشیر اور ہلال کی تشبیہ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔

طباطبائی:- لفظ ہلال تنگیِ وزن سے نہ آسکا اور شعر کا مطلب ناتمام رہا۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق کو شمشیر عریاں دیکھ کر ایسی مسرّت حاصل ہوئی کہ ہلال عید کا نظارہ دکھائی دیا۔ آسی کہتے ہیں۔ عید نظارہ ترکیب مقلوب ہے مصنف نظارۂ ہلالِ عید کہنا چاہتا تھا۔

٦۔ خاک :- قبر ÷ لے گئے داغِ تمنا:- آرزو پوری نہ ہوئی افسوس لے گئے ۔ بصد رنگ گلستاں ہونا:- ہر طرح سے تم باغ کی طرح شاداب رہو۔

افسوس ہم تو دُنیا سے نامراد گئے اور داغِ آرزو اپنے دل میں لے گئے۔ اب خدا کرے تم ہمیشہ خوش و خرم رہو اور باغ کی طرح پھولو پھلو۔ حسرت و سعید لکھتے ہیں کہ یہ معشوق پر طنز ہے۔ طباطبائی کہتے ہیں باغ باغ ہونا محاورہ ہے۔ گلستاں ہونا غالب کا تصرّف ہے۔

٧۔ عشرت:- عیش راحت÷ پارۂ دل:- دل کا ٹکڑا یعنی دل÷ زخمِ تمنا کھانا:- آرزو پوری نہ ہونا۔ زخم بمعنی رنج÷ ریشِ جگر :- زخمِ جگر÷ غرقِ نمکدان:- زخم پر نمک چھڑکنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ غرق نمکدان ہونے سے انتہائی تکلیف مراد ہے۔

ناکامی اور محرومی کا زخم کھانا دل کے لیے عین راحت ہے اور زخم جگر کا نمکدان میں غرق ہوجانا اس کے لیے انتہائی لذت کا باعث۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق ایذا دوست ہوتے ہیں۔

سہا و بیخود:- پارۂ دل سے دل کا ہر ٹکڑا مراد لیتے ہیں۔

٨۔ زُود پشیماں:- جلد پشیمان ہوجانے والا۔

اُس نے مجھے قتل کرنے کے بعد ظلم سے توبہ کرلی۔ ہائے وہ جلد پشیمان ہوجانے والا کس قدر جلد پشیمان ہوا ہے۔ کاش اس نے قتل کرنے سے پہلے ظلم سے توبہ کی ہوتی' اب توبہ کرنے سے کیا فائدہ؟ زود پشیمان کے طنزیہ استعمال سے خوب لطف پیدا ہوگیا ہے۔

طباطبائی:- لہو دیکھتے ہی رحم آگیا کہ میں نے یہ کیا کیا' نہ غصہ آتے دیر لگی اور نہ پشیمان ہوتے۔ ممکن ہے زود پشیمان طنز سے کہا ہو۔ یعنی جب کام اختیار سے باہر ہوچکا اس وقت رحم آیا۔ کیا

جلد پشیمان ہوا (بیخود)

آسی:- پہلا مفہوم وہی ہے جو میں نے لکھا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ پیدا کیا ہے۔ میں تو قتل ہو ہی چکا تھا۔ اب رقیبوں کی باری آئی تو اُس نے بہت جلد پشیمان ہو کر قتل کرنے سے توبہ کرلی۔

۹۔ اس چارگرہ کپڑے کی قسمت پر افسوس ہے جو بدقسمتی سے عاشق کا گریبان بن گیا۔ کیونکہ وہ جنونِ عشق کے ہاتھوں ہمیشہ تار تار رہے گا۔ وصل میں معشوق ازراہِ شوخی چاک کردیگا اور ہجر میں عاشق خود اس کی دھجیاں اُڑادیگا آبِ حیات میں لکھا ہے کہ جب غالب قمار بازی کے جرم میں قید تھے تو کپڑے اس قدر میلے ہوئے کہ جوئیں پڑگئیں۔ جس دن قید سے چھوٹے۔ کُرتہ پھاڑ کر وہیں پھینک دیا اور اس موقعہ پر یہ شعر پڑھے۔

حسرت:- شعر تو بہت خوب ہے لیکن دونوں مصرعوں میں تکرار نے بے لطفی پیدا کردی ہے۔

۱۸

شبِ خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا	۱	تامحیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا	۲	جادہ اجزائے دوعالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے	۳	خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن	۴	دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا
نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بباد	۵	یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

۱۔ خمار:- نشہ کا اُتار ÷ شوقِ ساقی:- انتظارِ ساقی ÷ رستخیز اندازہ:- قیامت کی مانند ÷ محیطِ بادہ:- خطِ ساغر، جہاں تک شراب ہو ÷ خمیازہ:- انگڑائی ÷ صورتِ خانہ:- بتکدہ ÷

رات کو ساقی کے شوقِ انتظار میں قیامت کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ یہ کیفیت اس قدر بڑھی تھی کہ شراب بھی میری طرح خمار کی وجہ سے شیشے میں انگڑائیاں لینے لگی تھی اور اس طرح سے ایک بتکدۂ خمیازہ یعنی انگڑائیوں کے بتخانے کا منظر پیدا ہوگیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شے ساقی کی آمد کی منتظر تھی۔ (۲) انتظار کی کوفت سے انگڑائیاں لے رہی تھی۔ شراب کے جوش کو انگڑائی سے تشبیہ دینا نادر خیال ہے۔ سعید اس شعر کو مہمل قرار دیتے ہیں۔ بیخود لکھتے ہیں کہ انگڑائی لینے میں

ہاتھ بلند ہو کر آپس میں مل جاتے ہیں۔ یہی شکل رستخیز کی ہے۔ ظاہر ہے یہ تشریح مزید وضاحت چاہتی ہے۔

طباطبائی:- رات کو میرے شوق نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور شوق میں بے لطفی و بے مزگی جو تھی اس وجہ سے اسے خمار سے تشبیہ دی اور یہاں سے لیکر دریائے بادہ تک میرے خمیازہ کا صورت خانہ بنا ہوا تھا یعنی میں نے خمار میں ایسی ایسی لمبی انگڑائیاں لیں جن کی درازی محیطِ بادہ تک پہنچی، غرض یہ ہے کہ انگڑائی لینے میں جو ہاتھ پاؤں پھیلتے تھے وہ گویا شراب کو ڈھونڈتے تھے۔ (آسی)

۲۔ یک قدم وحشت:- تھوڑی سی وحشت ÷ دفترِ امکان:- دُنیا ÷ جادہ:- راستہ ÷ دو عالم دشت:- دشتِ دو عالم کثرتِ ویرانی ÷

تھوڑی سی وحشت سے دفترِ امکان کی کُل حقیقت مجھے معلوم ہوگئی۔ گویا جادۂ وحشت دشتِ دوعالم کے اجزا کا شیرازہ تھا کہ اس میں عالمِ بقاوفنا دونوں منسلک تھے۔ مدعا یہ ہے کہ بغیر وحشتِ عشق کے حقائق دو عالم معلوم نہیں ہوتے۔

طباطبائی:- ممکنات نے اپنے مبداء سے ایک ذرا سی وحشت و مغائرت جو کی تو عالمِ امکان موجود ہوگیا اور اس وحشت کا ایک قدم جس جادہ پر پڑا۔ گویا وہ اوراق دوصد دشت کا شیرازہ تھا۔ اس سبب سے کہ وحشت میں قدم جب اُٹھے گا۔ دشت ہی کی طرف اُٹھے گا اور عارف کی نظر میں تمام عالمِ امکان ویران ہے، دو عالم دشت کی ترکیب میں مصنف نے دشت کی مقدار کا پیمانہ عالم کو بنایا ہے۔

۳۔ مانع:- روکنے والا ÷ وحشت خرامی:- دیوانہ وار پھرنا ÷ صحراگرد:- جنگلوں میں پھرنے والا ÷ خانہ بے دروازہ:- یعنی صحرا ÷

مجنوں کا گھر تو بے دروازہ تھا یعنی وہ جنگل میں رہتا تھا۔ کسی کو اس تک پہنچنے میں روک ٹوک نہ تھی۔ پھر معلوم نہیں کیوں لیلےٰ بتقاضائے وحشت مجنوں تک نہ پہنچ سکی اور کون سی چیز اُس کی ملاقات میں مانع ہوئی۔ طباطبائی لکھتے ہیں کہ صحراگرد مجنوں کی صفت ڈال کر اُس کے گھر کا پتہ دیا ہے۔

بیخود:- لیلیٰ کئی مرتبہ محمل میں سوار ہو کر مجنوں کے پاس گئی، لیکن ساربان کی غمازی اور پاسِ عصمت کے خوف سے نہ ملی۔ مرزا صاحب اسی قصّے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

آسی:- مجنوں ایسے گھر میں قید تھا جس میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ اور اس سبب سے وہ کہیں آجا نہیں سکتا تھا مگر لیلےٰ جس کے گھر میں دروازہ تھا وہ وحشت خرامی کرسکتی تھی۔ اس کو کون مانع تھا۔ اس پر جذبِ جنوں کا اثر ہونا چاہیے تھا۔

۴۔ رسوائی:- بدنامی ÷ استغنا:- بے احتیاج ' بے نیاز = مرہونِ:- ممنون ÷ حنا:- مہندی ÷ غازہ:- گلگونہ

حسن کی بے نیازی کی شان یہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ غازہ اور حنا سے بے نیاز ہوتا۔ پس جو ہاتھوں پر مہندی اور رخساروں پر غازہ ملا گیا ہے اس سے استغنائے حُسن ثابت نہیں ہوتا بلکہ ان چیزوں کا استعمال حُسن کے اندازِ استغنا کی رسوائی اور بدنامی کا موجب ہے کیونکہ ہاتھ مہندی کا اور رخسار غازہ کا مرہون منت ہے اور زیرباریٔ احسان استغنا کی رسوائی کا باعث ہے۔

۵۔ اوراقِ لختِ دل:- یعنی دل کے ٹکڑے اُن کو ورقوں سے تعبیر کیا ہے ÷ بادوادن:- پریشان و برباد کرنا ÷ بے شیرازہ:- ورق ورق پریشان ÷

میرے نالۂ دل نے اوراق دل کو پریشان و برباد کردیا۔ افسوس کہ یہ ہی منتشر دیوان میرے نالے کی یادگار تھا۔ گویا دل ایک دیوان تھا اور لختِ دل اُس کے اوراق منتشر تھا' جن کو آخر کار نالۂ دل نے پریشان کرکے برباد کردیا۔ آسی و طباطبائی پارہ ہائے دل کو اوراق سے پھر اوراق کو دیوانِ بے شیرازہ سے تشبیہ دی اور نالہ کو شاعر فرض کیا ہے۔ جس نے اپنی یادگار کو آپ برباد کردیا۔

بیخود:- مضامین عالی (دل کے ٹکڑے) جو نالۂ دل کی صورت میں زبان سے نکلے تھے ان کو میرے جوشِ طبع نے اوراقِ دل بنا کر ہوا میں اُڑایا یعنی میرے اچھوتے خیالات کو عالم میں پھیلا دیا۔ اب جو میں نے خیال کرکے دیکھا تو یادگار نالہ ایک دیوانِ بے شیرازہ تھا۔ یعنی موجودہ دیوان۔

19

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ۱ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک ۲ ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ ۳ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں ۵ عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی ۶ یہ جنونِ عشق کے انداز چھپ جائیں گے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟ ۷ ہیں گرفتارِ وفا زندان سے گھبرائیں گے کیا؟

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

۱۔ غمخواری:- علاج معالجہ ÷ سعی:- کوشش

میرے دکھ کے علاج معالجہ میں میرے احباب کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ فرض کیا اُنہوں نے یہ سوچتے ہوئے کہ میں زخم کو نوچ نہ سکوں' میرے ناخن کاٹ دیئے اور زخمِ دل پر مرہم لگادیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب تک یہ زخم بھرے گا کیا میرے ناخن نہ بڑھ آئیں گے اور کیا میں دوبارہ زخم کو نہیں نوچ سکوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ ناخن بڑھ آنے پر میں زخم کو پھر خراب کرڈوں گا اور اس طرح ان کی کوششیں بیکار ضائع ہوجائیں۔ اپنی ایذادوستی کا اظہار کیا ہے۔

۲۔ بے نیازی:- بے توجہی' بے پرواہی ÷ حد سے گزری:- حد سے زیادہ ہوگئی ÷ کیا: یعنی کیا کہا۔

بندہ پرور آپ کی بے نیازی بہت ہی زیادہ ہوگئی۔ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا کہ ہم تو اپنا حالِ دل سُنائے جائینگے اور آپ بار بار کہے جائینگے کہ کیا کہا۔ کیا کہا یعنی آپ کب تک تجاہلِ عارفانہ فرمائیں گے۔

بیخود:- کیا سے دو معنی پیدا ہوتے ہیں (۱) استفسار یعنی تجاہلِ عارفانہ (۲) طنز یعنی تو نے جو کچھ کہا جھوٹ کہا۔

۳۔ دیدہ و دل فرشِ راہ:- یعنی بسروچشم شوق سے' میری سر آنکھوں پر تشریف لائیں۔

حضرت ناصح اگر تشریف لاتے ہیں تو شوق سے تشریف لائیں۔ میں اُن کے راستے میں دیدہ و دل بچھاؤں گا۔ گویا اُن کا پرتپاک خیر مقدم کروں گا۔ لیکن خدارا کوئی مجھے یہ بات سمجھادے کہ وہ مجھے کیا سمجھائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا جذبۂ عشق پندونصیحت سے فرو نہیں ہوسکتا۔ گویا

محبت کے معاملہ میں بے اختیار ہو چکا ہوں۔ اس لیے ان کی نصیحت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

بیخود: - ازراہِ شوخی پہلے مصرعہ میں حضرتِ ناصح کا پُرتپاک خیر مقدم ہے اور دوسرے میں ان کی فہمائش کو اس حقارت سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مجھے کیا سمجھا سکتے ہیں۔ یعنی ان کی ہستی ہی کیا ہے؟

۴۔ کفن باندھنا: - شہادت کے لئے تیار ہو جانا÷ عذر: - بہانہ÷

آج میں قاتل کے پاس سر پر کفن باندھ کر اور تلوار لے کر جاتا ہوں، جب میرے پاس کفن بھی ہوگا اور تلوار بھی ہوگی تو پھر وہ قتل کرنے میں کوئی بہانہ نہیں کر سکیں گے کہ قتل کرنے کو تلوار نہیں ہے یا کفن نہیں ہے۔ بقول بیخود کفن باندھنے سے یہ لطف پیدا ہو گیا ہے کہ مجھ سے بڑھ کر اور کون سرفروش ہو سکتا ہے۔

۵۔ اگر ناصح نے ہمارا جنونِ عشق کم کرنے کے لئے ہم کو قید کر دیا ہے تو کچھ مضائقہ نہیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس طرح قید کرنے سے جنونِ عشق جاتا رہیگا؟ مطلب یہ ہے کہ قید و بند سے جنون عشق دُور نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ قید و بند دشت نوردی کو روک سکتا ہے لیکن انداز جنون عشق کو نہیں روک سکتا۔

بیخود: - ناصح کسی کو قید نہیں کرتا۔ اس کے بار بار سمجھانے اور مجبور کر کے پاس بٹھانے کو قید سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ناصح کے سامنے بھی اپنے خیال میں مستغرق رہتے ہیں۔

۶۔ خانہ زاد: - غلام÷ گرفتارِ وفا: - پابندِ وفا÷

ہم شروع ہی سے زلف کے خانہ زاد غلام ہیں۔ اس لیے ہم زنجیروں سے نہیں بھاگ سکتے اور ہم قید سے یوں نہیں گھبرا سکتے کہ پابندِ وفا ہیں یعنی جو شخص خانہ زاد زلف اور پابندِ وفا ہو اس کے لیے زنجیر و زنداں باعثِ فرار و پریشانی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس قسم کے مصائب اُٹھانے کا عاشق پہلے ہی سے عادی ہوتا ہے۔ نیز زنجیر و زنداں عاشق کے نزدیک الفت زلف اور وفاداری کا انجام ہیں۔ پھر ان سے گھبرانا کیا؟

۷۔ معمورہ: - بستی۔ آبادی یعنی دہلی ÷ غمِ الفت: - غمِ عشق÷

دہلی میں غمِ الفت کا بھی کال پڑ گیا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری غذا یہی غمِ الفت ہے۔

اگر اب ہم اس بستی میں رہے تو پھر کیا کھائیں گے؟ یعنی بھوکے مر جائیں گے۔ اس لئے اب ایسی جگہ چلیے جہاں غمِ الفت بہ افراط ملے یعنی عشق کرنے کے لیے محبوب بکثرت ہوں۔

آسی: - قحط ایک وبا ہے یعنی اگر معشوق نہیں دیگر عزیز و اقارب کا غم بھی کھانے کو نہیں ملتا۔ گویا الفت سے محض عشق نہیں بلکہ باہمی تعلقات مراد ہیں۔ سہا کا بھی تقریباً یہی خیال ہے۔

۲۰

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا ۱ اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا ۲ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا ۳ کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا!
کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو ۴ یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ۵ کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا، وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا ۶ جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے ۷ غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے ۸ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا!
ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ۹ نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا!
اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا ۱۰ جو دُوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب!
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

۱۔ ہماری تقدیر ہی میں نہ تھا کہ ہم وصلِ یار سے لطف اندوز ہوتے۔ اگر ہم مر نہ جاتے یعنی جیتے رہتے تو ہم کو وصلِ یار کا مزید انتظار کرنا پڑتا۔ چونکہ انتظار موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اس لیے اچھا ہی ہوا کہ ہم مر گئے اور انتظارِ وصلِ یار کی تکلیف سے نجات پا گئے۔

۲۔ خیال یہ ہے کہ عاشق کے لیے وعدۂ وصل انتہائی خوشی کا باعث ہے اور اس سے عاشق صادق کو شادی مرگ ہو جانا چاہیئے۔ کہتے ہیں ہم تیرے وعدۂ وصل پر بھی اگر زندہ رہے تو تجھے یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم نے تیرے وعدۂ وصل کو جھوٹ جانا۔ اگر اسے جھوٹ نہ جانتے تو یقیناً شادی مرگ ہو جاتے۔

آسی:- (۱) ہم تیرے وعدہ کرنے سے جئے تو تو نے یہ سمجھ کر جھوٹ جانا کہ اگر ہمارے وعدہ کا اعتبار ہوتا تو تجھے شادی مرگ ہو جاتی (۲) متفق

طباطبائی:- (۱) ہم نے جو یہ کہا کہ فقط وعدۂ وصل سُن کے ہم مرنے سے بچ گئے تو تم نے جھوٹ جانا (۲) ہم خیال

۳۔ نازکی:- نزاکت ÷ بودا:- کمزور ÷ استوار:- مضبوط ÷ جانا:- ہم نے جانا۔

ہم نے تمہاری نزاکت سے جان لیا کہ تم نے بودا عہد باندھا ہے اگر وہ مضبوط ہوتا تو تم جیسے نازک شخص سے ہرگز ٹوٹ نہ سکتا۔ کس خوبصورتی سے معشوق کو عہد شکنی کے الزام سے بچا کر اپنے دل کو تسلی دی ہے۔

۴۔ تیرِ نیم کش:- وہ تیر جس کو آدھی کمان کھینچ کر یعنی آہستہ سے چھوڑ دیا جائے۔ مراد تیر مژگان جسے کمانِ چشم سے پورے زور سے نہیں۔ نیم واچشم سے چھوڑا گیا ہے÷ خلش:- چُبھن ÷

وہ تیرِ مژگاں جو تو نے کمال بے پروائی کے ساتھ نیم کش کمانِ چشم سے میرے جگر پر مارا ہے۔ اس کی کیفیت میرے دل سے دریافت کرلے یعنی مجھے اس سے بہت ہی لطف حاصل ہوا ہے۔ اگر تو اسے پورے زور سے چھوڑتا تو وہ جگر کے پار ہو جاتا اور اس طرح میں لذتِ خلش سے محروم رہ جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ کام تمام ہونے میں لطف نہیں خلش میں زیادہ لطف ہے۔ اس لئے تیر نیم کش کی تعریف کی ہے۔

بیخود:- معشوق تیرِ نیم کش سے شرماتا ہے اور مرزا صاحب اس کی تعریف کر کے شرمندگی دور کرتے ہیں۔

طباطبائی جو کا واوٗ وزن سے ساقط ہے اور یہ درست بلکہ فصیح ہے۔ لیکن اس کے ساقط ہو جانے سے دوجیم جمع ہو گئے اور تنافر پیدا ہو گیا۔ یہ خوبیِ مضمون ہے کہ ایسی باتوں کا کوئی خیال نہیں کرتا۔

۵۔ قاعدہ ہے۔ عشق میں نصیحتیں بُری معلوم ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں یہ کیسی دوستی ہے کہ دوست نصیحتیں کرتے ہیں۔ اگر وہ حقیقتاً میرے سچے دوست تھے تو نصیحتوں سے انہیں میرا دماغ پریشان کرنے کی بجائے میرے دکھ کا علاج کرنا چاہیئے تھا۔ ظاہر ہے درد عشق کا علاج وصل محبوب ہے۔

۶۔ رگِ سنگ:- پتھر میں جو لکیریں ہوتی ہیں۔ ان کو رگِ سنگ کہتے ہیں÷ وہ لہو:- خون بکثرت÷

پتھر میں شرارے پوشیدہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر شرارۂ سنگ شرارِ غم کی طرح ہوتا تو رگِ سنگ سے اس قدر لہو جاری ہوتا کہ پھر کسی طرح بند نہ ہوتا یعنی غم ایسی چیز ہے کہ پتھر بھی اسے برداشت نہ کرتا۔ یہ ہمارا ہی جگر ہے کہ ہم غم کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اگر یہ پتھر میں ہوتا تو اس میں سے بھی لہو جاری ہو جاتا اور ایسا لہو جاری ہوتا کہ وہ کسی طرح نہ تھمتا۔

۷۔ جاں گُسل:- جان کو گھلانے والا۔ شاعر کا خیال ہے کہ انسان کا دل رنج وغم کا مرکز ہے اس لئے دل کبھی اس سے خالی نہیں ہوتا۔

اگرچہ غم جان کو گھلانے والا ہے لیکن دل کی ایذا دوستی کہ وجہ سے کوئی اس سے بچ نہیں سکتا اسلیئے اگر غمِ عشق ہمارے دل میں نہ ہوتا تو پھر اس کی جگہ غمِ روزگار ہوتا۔ بہرحال ہمیں غمِ عشق غنیمت ہے۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو ہم دُنیا بھر کے بے شمار غموں میں مبتلا ہوتے۔ اب تو صرف ایک غمِ عشق ہے۔

۸۔ میں کس سے کہوں کہ شبِ غم کیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ شبِ غم بہت ہی بڑی مصیبت ہے۔ اس میں انسان بار بار موت کی تکلیف اُٹھاتا ہے اور پھر بھی نہیں مرتا۔ اگر میں ایک دفعہ مر جاتا تو مجھے اس عذاب سے نجات مِل جاتی۔ شبِ غم کے مصائب کو موت سے زیادہ بتایا ہے۔ جملہ شارحین اس شعر کو حدِ تحسین سے باہر بتاتے ہیں۔

۹۔ ہم زندگی میں تو عشق کہ بدولت بدنام ہی تھے۔ مرنے کے بعد بھی ہم رسوا ہوئے کیونکہ نہ تو کوئی ہمارا جنازہ اُٹھانے والا تھا اور نہ کسی کو مزار بنانے کا خیال تھا اور یہ ہماری رسوائی کی آخری حد تھی۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ ہم دریا میں غرق ہو جاتے کہ جنازہ اُٹھانے اور مزار بنانے کے تکلفات سے ہماری رسوائی نہ ہوتی اور ہماری رسوائی اور بیکسی کی کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ بمقتضائے عشق صادق نشان مزار کو باعثِ رسوائی قرار دیا ہے۔

۱۰۔ یگانہ ویکتا:- خدائے واحد وبے مثال÷ دوئی کی بو:- دُوئی کا شائبہ ÷ دوچار ہوتا:- دکھائی دیتا۔

خدائے بے مثال یگانہ و واحد ہے۔ اس لیے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر اس میں ذرا سی دوئی ہوتی تو کہیں نہ کہیں وہ ضرور دکھائی دیتا۔

سہا:- دیکھنے میں وہی چیزیں آسکتی ہیں جو ابعاد ثلاثۂ زمان و مکان اور اشارات میں مقید ہوں۔ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْئٌ

آسی:- لَوْ کَانَ فِیْہِمَا اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَ تَا یعنی اگر آسمان زمین سوائے خدا کے چند خدا ہوتے تو ضرور فساد ہوتا۔ چونکہ طبیعتیں با اختیارات مجتمع نہیں ہوسکتیں۔ اگر وہ صلح کرنے کی کوشش کریں تو صلح نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ صلح دو برابر والوں میں نہیں ہوسکتی۔ ایک غالب ہوگا اور دوسرا مغلوب ہوگا۔ جو مغلوب ہوگا وہ خدا نہیں۔

۱۱۔ اے غالب تصوف کے دقیق مسائل کو تو نے اس خوبی سے بیان کیا ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں۔ اگر تو بادہ خوار نہ ہوتا تو ہم تجھے ولی سمجھتے۔ کہتے ہیں۔ جب بادشاہ نے یہ مقطع سنا تو فرمایا کہ بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے۔ مرزا نے کہا۔ حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لیے ارشاد ہوا ہے۔ کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔

۲۱

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ۱ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا! ۲ کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا؟
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں ۳ شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا؟
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں ۴ تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ۵ ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟
نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے ۶ تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا؟
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے ۷ غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ۸ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟
محابا کیا ہے، میں ضامن، ادھر دیکھ ۹ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا!
سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن! ۱۰ شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا!

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ ۱۱ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا!
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟ ۱۲ یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا!

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا!

۱۔ نشاط:- اُمنگ ÷ نشاط کار:- کام کرنے کی اُمنگ ÷ کیا کیا:- کس قدر زیادہ۔

حالی:- دُنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے، وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے وہ اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے۔ پس اگر موت نہ آیا کرتی اور ابدالآباد تک زندہ رہنا ہوتا تو جینے میں کوئی مزا نہ ہوتا کیونکہ نہ تو یہ جوش و سرگرمی ہوتی اور نہ دُنیا میں یہ چہل پہل نظر آتی (سعید، حسرت، بیخود)

طباطبائی:- رقیب ابوالہوس کی ہوس کو نشاط کار و لطفِ وصل نگار حاصل ہے، اب ہمارے جینے کا مزا کیا رہا۔ ہوس سے مراد محبت رقیب لیتے ہیں۔ (۲) دُنیا میں انسان کو ہوا و ہوس سے رہائی نہیں۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو اس طرح کے جینے میں کچھ مزا نہ تھا یعنی حاصلِ زندگی مرنا ہے۔

۲۔ تجاہل پیشگی:- جان بوجھ کر انجان بننا ÷ کیا؟ کیا؟:- بار بار ÷ کیا کیا کہنا جیسے کچھ سمجھے نہیں۔

تم جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو اور بار بار کیا کیا کہتے ہو؟ آخر تمہارا اس سے مطلب کیا ہے۔ اے معشوق سراپا ناز، میری ہر بات پر کیا؟ کیا؟ کب تک کہے جاؤ گے یعنی کب تک تجاہل عارفانہ سے مجھے ٹالتے رہو گے اور میری بات نہ سمجھو گے۔

۳۔ نوازشہائے بیجا:- بے محل مہربانیاں رقیب پر ÷ شکایتہائے رنگین:- محبت بھری شکایتیں۔

آپ جو اغیار پر بے محل مہربانیاں کرتے ہیں تو ان کو دیکھ کر میں ازراہِ محبت آپ سے شکایتیں کرتا ہوں۔ آپ مجھ سے ان رنگین شکایتوں کا گلہ کیوں کرتے ہیں۔ ع کرم ہائے تو مارا کرد

گستاخ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تم رقیب پر مہربانیاں صرف کرتے ہو تو میری شکایتوں کا کیوں بُرا مانتے اور ان کا گلہ کیوں کرتے ہو۔

آسیؔ:- (۱) ہم خیال (۲) میں آپ کی نوازشیں جو غیروں پر ہوتی ہیں' دیکھتا ہوں۔ خود ظلم سہتا ہوں پھر اس حال میں اگر آپ میری شکایتیں رنگین الفاظ میں سنتے ہیں تو آپ اُن کا گلہ کیا کرتے ہیں۔

سہاؔ:- آپ کے التفات غیر متوقع کی خوشی میں بھلا میں گزشتہ بے مہروں کی کیا شکایت کروں۔

۴۔ نگاہِ بے محابا:- بے تکلف و بے حجاب ÷ تغافل تمکین آزما:- چشم پوشی جو عاشق کا صبر آزمانے کے لیے کی جائے۔

میں چاہتا ہوں کہ تم میری طرف سے بے تکلفانہ اور بے حجابانہ دیکھو مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم میرے صبر کا امتحان لینے کے لیے تغافل اور چشم پوشی سے کام لیتے ہو۔ آخر یہ کیوں؟ یاد رہے اس طرح میرا جامِ صبر ہرگز نہیں چھلک سکتا۔ میری طرف دیکھو تا کہ میں بیتاب ہوکر تڑپ اُٹھوں۔

۵۔ فروغ:- روشنی ÷ شعلۂ خس:- وہ شعلہ جو تنکا جلنے سے اُٹھتا ہے۔ فوراً ہی بجھ جاتا ہے ÷ یک نفس:- پل بھر' بہت تھوڑی دیر ÷ ہوس:- اہل ہوس یعنی ہوس پرست رقیب۔

اہل ہوس کی محبت شعلۂ خس کی طرح ہے کہ دم بھر سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتی۔ بھلا ایسے لوگوں کو ناموسِ وفا کا کیا پاس ہوسکتا ہے۔ یعنی رقیب کی محبت دو چار دن کی ہے۔ اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ لوگ وفا کی لاج نہیں رکھ سکتے۔

۶۔ نفس:- سانس ÷ محیط بیخودی:- بحرِ بیخودی ÷ تغافل ہائے ساقی:- ساقی کا شراب نہ پلانا۔

جذبۂ عشق کی وجہ سے ہمارا سانس دریائے بیخودی کی موج ہے یعنی ہر سانس کے ساتھ ہم بیخود و مست ہو جاتے۔ ساقی ہماری طرف سے تغافل کرتا ہے اور ہمیں شراب نہیں پلاتا تو ہم کو اس کی تغافل شعاریوں کی کیا شکایت ہوسکتی ہے۔ شراب سے اصل مقصد بیخود ہو جاتا ہے اور ہم پہلے سے مست ہیں۔ پھر ساقی کا گلہ کیا؟

حسرتؔ و طباطبائی:- صورت ہی دیکھ کر مست ہو جاتے ہیں۔ وہ شراب نہ دے تو کیا شکایت۔

بیخودؔ:- (۱) ہم مست الست ہیں (۲) ہم اپنے حال میں مست ہیں' ہمیں دُنیا کے ہست و بود کا کیا غم۔

سعیدؔ میرے اور حسرتؔ کے ہم خیال ہیں۔

۷۔ دماغ نہیں:- برداشت نہیں۔ پسند نہیں ÷ عطرِ پیرہن:- خوشبوئے لباسِ یار۔

اگر صبا پیراہنِ یار کی خوشبو کو چاروں طرف پریشان کرتی پھرتی ہے تو ہمیں اس کا کیا غم ہے۔ غم تو اس وقت ہوتا جب ہم اس سے لطف اندوز ہوسکتے یعنی ہم اسے سونگھ سکتے۔

بیخودؔ:- ہم بوئے یار کو سونگھنے والے ہیں۔ ہمارا دماغ عطر پیراہن یار کی خوشبو جس پر غیروں نے عطر ملا ہے پسند نہیں کرتا' صبا اگر کوچہ رقیب سے عطر پیراہن کی خوشبو لے کر آئی ہے تو ہم اس کو کیا کریں۔ آوارگی کا لفظ بتا رہا ہے کہ صبا کوچہ رقیب سے آئی ہے۔

طباطبائی و آسیؔ:- اگر مجھے پیراہن کے بسانے کا دماغ ہوتا تو صبا کی آوارگی کا غم ہوتا کہ یہ بوئے گل کو پریشان کیوں کرتی پھرتی ہے اگر یہ جمع رہتی تو میرے پیراہن بسانے کے کام آتی۔ جب مجھے پیراہن بسانے کا دماغ ہی نہیں ہے تو صبا کی اس حرکت کا کیا غم کروں۔ گویا جسے ہوس دُنیا نہ ہوا اسے بیوفائی دُنیا کا کیا غم۔

۸۔ دلِ ہر قطرہ:- ہر قطرہ کا دل ÷ ساز:- باجہ ÷ انا البحر:- میں دریا ہوں۔

ہر قطرہ کا دل ساز انا البحر ہے یعنی ہر قطرے کے ساز دل سے انا البحر کا نغمہ نکل رہا ہے۔

اگر چہ قطرہ بہت چھوٹا ہے لیکن جب دریا میں ملتا ہے تو دریا بن جاتا ہے۔ اس لیے ہر ایک قطرہ دریا ہونے کا دعوے دار ہے بالکل اسی طرح ہم بھی اگر چہ جزوِ ضعیف ہیں لیکن اناالحق (میں خدا ہوں) کے مدعی ہیں۔ ہماری شان ملاحظہ ہو کہ قطرہ کی طرح ہمیں بھی اپنے مبداء کے ساتھ عینیت کا دعویٰ ہے۔ کیونکہ ہم بھی اسی بحرِ بیکراں (ہستیِ خدا) کے جز ہیں۔

۹۔ محابا:- خوف ÷ ضامن:- ذمہ دار ÷ خوں بہا:- فدیہ' قیمتِ خون۔

تو بے خوف و خطر میری طرف دیکھ! میں ذمہ دار ہوں۔ اگر میں شہید نگاہ ہوگیا تجھ سے

میرا خوں بہا کوئی طلب نہ کرے گا۔ کیونکہ شہیدانِ نگاہ کا کوئی خوں بہا نہیں ہوا کرتا۔ ''ادھر دیکھ'' نے شعر کو بلند کر دیا ہے۔ یعنی قتل بھی کر اور سُن بھی۔

۱۰۔ غارت گرِ جنسِ وفا:- باوفا عاشقوں کو برباد کرنے والا' مراد معشوق ÷ شکستِ قیمتِ دل :- دل کی قیمت گھٹانا' دل کے توڑنے کی آواز ہو سکتی ہے۔ لیکن قیمتِ دل کے توڑنے میں کوئی صدا نہیں ہوتی۔

اے غارت گرِ جنس وفا! ذرا سُن اور غور سے سُن کہ قیمتِ دل توڑنے میں کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اس لئے تو دل کو نہ توڑ یعنی میرے دل کی بے قدری نہ کر۔ کیونکہ اس کے توڑنے سے کوئی آواز پیدا نہ ہوگی۔ جو تیری سامعہ نوازی کا باعث بنے (حسرت ہم خیال)

طباطبائی:- (۱) تُو جو یہ کہتا ہے کہ ہمیں شکستِ دل کی خبر نہیں۔ تو کہیں شکستِ دل میں آواز ہوتی ہے جو تجھے سُنائی دیتی۔ شکست کو شکست قیمت دل سے تعبیر کر کے جنس و غارت اس کے مناسبات ذکر کئے ہیں۔ (۲) شکستِ دل کی صدا تجھے اچھی معلوم ہوتی ہے تو دل شکنی کیے جا اور سُنے جا' بھلا دل کی صدا اور صدائے شکست دل کی کیا حقیقت ہے' جو تامل کرے (سعید)

بیخود:- جنس وفا جو میرے دل میں تھی وہ گویا قیمت دل تھی یعنی میرا دل اسی وجہ سے قیمتی تھا کہ اس میں جنسِ وفا تھی۔ تو نے دل توڑ کر اسے غارت کر دیا تو اب میری سُن اور مکرر کہتا ہوں کہ میری بات سُن۔ شکستِ دل کی صدا نالہ ہوا کرتا ہے۔ جس سے تُو ڈرتا ہے اور سُننا نہیں چاہتا تو خوف نہ کر کہ تُو نے دل نہیں توڑا بلکہ قیمتِ دل توڑی۔ قیمتِ دل کی شکستگی میں کوئی صدا پیدا نہیں ہوتی۔ اس صورت میں تجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔

آسی:- اے صدائے شکستِ قیمتِ دل کے شائق سُن! مگر شکست قیمتِ دل میں صدا کہاں ہوتی ہے۔ سُن سے دو معنی پیدا ہوتے ہیں کہ آ میری بات سن! یا شکست قیمت دل کی صدا سن جسے تو نہیں سُن سکتا۔ بعض نسخوں میں بجائے قیمت کے شیشہ دیکھا گیا ہے اور وہ زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سُن بطور طنز ہوگا (۲) ہم خیال طباطبائی

۱۱۔ جگرداری:- استقلال۔ صبر ÷ شکیب:- صبر۔ خاطر:- دل ÷

میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ تمہارے بغیر مجھے چین آ جائے گا۔ بھلا عاشق کا یہ دعویٰ

حقیقت ہی کیا رکھتا ہے۔ تم میرے صبر و استقلال کو ایک اشارے سے غارت کر سکتے ہو۔ جگرداری کا دعویٰ کرنے سے جو تمہیں غلط فہمی ہوگئی ہے اس کی بنا پر تم مجھے زیادہ بے چین نہ کرو۔

۱۲۔ یہ قاتل:- اے قاتل ÷ فتنۂ طاقت ربا:- طاقت کو زائل کرنے والا فتنہ ÷

اے قاتل معشوق تو یہ صبر آزما وعدہ کیوں کرتا ہے۔ تیرے نزدیک یہ معمولی سی بات ہے لیکن میرے لئے یہ صبر آزما وعدہ فتنۂ طاقت ربا ہے۔

الفاظ کی نشست سے شعر میں یہ خوبی پیدا ہوگئی ہے کہ قاتل کو صبر آزما کی صفت بھی قرار دے سکتے ہیں۔ بیخود نے یہی معنی لئے ہیں اور کافر کو بھی فتنۂ طاقت ربا کی صفت قرار دیا ہے۔

۱۳۔ کیا عبارت (الفاظ) کیا اشارہ' کیا کنایہ' کیا ناز و انداز غرض محبوب کی ہر بات میرے لئے بلائے جان (سخت مصیبت) ہے۔ جب جذبۂ شوق تیز ہوتا ہے تو محبوب کی ہر بات دل میں ہیجان و بے قراری پیدا کر دیتی ہے۔

۲۲

درخورِ قہروغضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا ۱ پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم ۲ اُلٹے پھر آئے درِکعبہ اگر وا نہ ہوا
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا ۳ روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا
کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں ۴ تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا
سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا ۵ خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ مِلا ۶ کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب ۷ حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل ۸ کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

۱۔ درخور:- قابل ÷ قہروغضب:- عتاب ÷ ہمسا:- ہم جیسا ÷ جب محبوب صرف ہمیں کو قابل قہر و غضب سمجھتا ہے تو پھر اگر ہم یہ کہیں کہ ہم جیسا کوئی اور پیدا نہیں ہوا تو اس میں کونسی غلط

بیانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ آفت زدگی میں ہم لاثانی ہیں۔

۲۔ بندگی:- عبادت÷ آزادہ:- مردِ آزاد منش ÷ خود بین:- وہ شخص جو اپنی بات کا پکا ہو اور دُوسروں کی بات کو اپنی بات سے کم سمجھے ÷ وا:- کھلا ÷

باوجود بندگی و بیچارگی کے میری آزاد روی اور خود بینی کا یہ عالم ہے کہ اگر خانۂ کعبہ کے دروازہ کو بند پاتا ہوں تو واپس چلا آتا ہوں۔ یعنی میں کُنڈی کھٹکھٹا کر دروازہ کُھلوانا اپنی شان آزادی اور خود بینی کے خلاف سمجھتا ہوں۔ جب میری حالت یہ ہے تو بھلا پھر میں کسی اور کے سامنے کیا جھکوں گا؟

ندرتِ بیان اسے کہتے ہیں کہ اپنی خود بینی اور آزادگی کے پردے میں کعبہ کی عظمت کا پہلو بھی نکل آیا کہ وہ ایسی بارگاہ ہے جس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

۳۔ بُتِ آئینہ سیما:- وہ محبوب جس کی پیشانی آئینہ کی طرح روشن ہو÷ روبرو:- مدِ مقابل÷

تیری یکتائی اور عدیم المثالی کا دعویٰ تمام محبوبانِ جہاں تسلیم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی نام نہاد آئینہ سیما محبوب تیرے سامنے نہیں آتا اور تیرا مقابلہ نہیں کرتا۔ چونکہ آئینہ میں آئینہ دیکھنے والے کا عکس نظر آتا ہے اس لئے آئینہ سیما کی صفت بُت کے ساتھ نہایت خوب ہے۔

سُہا:- دنیا کا کوئی حسین تیرا مدِمقابل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ سب کے حُسن میں تیرا ہی جمال پرتو فگن ہے اور یہی انعکاس تیرے دعویٰ یکتائی کی مقبولیت عامہ ہے۔

آسی:- تو وہ بے نظیر ہے کہ تیری یکتائی کوئی نہ مٹا سکا اور کوئی آئینہ سیما معشوق تیرا مدِّ مقابل پیدا نہ کرسکا۔ جب آئینہ مقابل ہوتا ہے تو مدِّ مقابل پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ مسلّمہ یہاں ٹوٹ گیا۔ آئینہ سیما جس میں عکس یعنی مدِّ مقابل پیدا ہوجانے کا پورا احتمال تھا۔ وہ بھی کوئی مقابل پیدا نہ کرسکا۔ وحدت وجود کی طرف اشارہ ہے۔

۴۔ نازش:- فخر÷ ہمنامی چشمِ خوباں:- چشمِ خوباں کو شعرا چشمِ بیمار کہتے ہیں اور عاشق بھی بیمار کہلاتا ہے۔ یہی ہمنامی ہے۔

عاشق بھی بیمار ہے اور تیری آنکھیں بھی بیمار ہیں۔ جب دونوں بیمار کہلائے تو ہمنام

ہوئے۔ پس اگر تیرا بیمار اچھا نہ ہوا تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ اس کے لیے یہی فخر کافی ہے کہ وہ تیری چشم کا ہمنام ہے۔ بقول آسی اس شعر میں انتہائی حسرت ہے۔ عاشق اپنی بدترین حالت کو معشوق کی ایک چیز سے ہم نام پاکر اسی پر صبر بلکہ ناز کرتا ہے۔

۵۔ سینہ کا داغ ہے:- دھبہ ہے۔ ننگ ہے÷ خاک کا رزق ہے:- رائیگاں جاتا ہے۔

جو قطرہ دریا میں مل کر دریا نہیں بن جاتا وہ رائیگاں جاتا ہے اور جو قطرہ زمین پر گرتا ہے وہ زمین میں جذب ہوکر فنا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح وہ نالہ جو دل ہی میں رہ جاتا ہے اور لب تک نہیں آتا، وہ سینے میں داغ بن کر پوشیدہ ہوجاتا ہے (۲) اگر داغ کے معنی ننگ و عار کے لیے جائیں تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ جو نالہ لب تک نہیں آتا اور ضبط کیا جاتا ہے وہ جوشِ عشق پر بدنامی کا دھبہ لگاتا ہے اور وہ قطرہ جو زمین پر گرتا ہے وہیں جذب ہوکر فنا ہوجاتا ہے گویا اسے دریا بننے کا موقع نہیں ملتا۔

طباطبائی اور آسی پہلے معنی لکھتے ہیں اور بیخود۔ حسرت، سعید دوسرے معنی۔

۶۔ میرے نام کا:- میرے حصے کا:- کام:- کاروبار÷

میرے حصے میں وہ دُکھ اور مصیبتیں آئی ہیں جو دُنیا میں کسی پر نازل نہیں ہوئیں اور میرے کاروبار میں اس قسم کے فتنے پیدا ہوئے ہیں جو دنیا میں کبھی اُٹھے ہی نہیں۔ جو مصیبتیں اور فتنے عام طور پر پیش آتے ہوں ان کا تدارک تو ہوسکتا ہے لیکن نئی نئی تکلیفوں اور فتنوں کا کوئی علاج نہیں۔ ظاہر ہے جب روز ایک نئی مصیبت نازل ہوگی تو اس کی روک تھام کیسے ہوسکتی ہے لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ ایک آفت سے دم لینے کی نوبت نہیں آتی کہ دوسری آدھمکتی ہے اور وہ بھی ایسی کہ جو کبھی دیکھی نہ سُنی۔

۷۔ بُنِ مُو:- بال کی جڑ÷ دمِ ذکر:- بیان کرتے وقت حمزہ کا قصّہ:- حضرت حمزہ کی کہانیاں خلاف واقعہ ہیں۔ دل پر کوئی اثر نہیں کرتیں۔ لوگ دلچسپی کے لیے سنتے ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ قصّہ عشق لوگ داستان امیر حمزہ کی طرح دلچسپی سے سُنیں۔ اسے سُن کر رُوئیں رُوئیں سے خوناب ٹپکنا چاہیئے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ سمجھ لو کہ وہ داستان امیر حمزہ ہے۔ عشق کا فسانہ نہیں ہے۔

۸۔ دیدۂ بینا:- نگاہِ عارف ÷ دجلہ:- مراد دریا ÷

نگاہِ عارف کو قطرہ میں دریا اور جزو میں کُل کا تماشہ نظر آتا ہے۔ دیدۂ بینا بچّوں کا کھیل نہیں ہے کہ اسے قطرہ میں دریا، اور جزو میں کُل نہ دکھائی دے۔ مطلب یہ ہے کہ دیدۂ بینا کو لازمی طور پر جزو میں کُل کا تماشہ نظر آتا ہے۔

۹۔ تھی خبر گرم:- زبان زدِ خاص و عام تھا ÷ اُڑیں گے پُرزے:- سخت سزادی جائے گی ÷ تماشہ نہ ہوا:- یعنی سزا نہ دی گئی۔

یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ آج غالبؔ کو اتنی سزادی جائے گی کہ اُس کے پُرزے اُڑ جائیں گے۔ چنانچہ ہم بھی یہ تماشہ دیکھنے کے لئے گئے لیکن افسوس کہ یہ تماشہ نہ ہوا یعنی غالبؔ کو مار مار کر اس کے پُرزے نہ اُڑائے گئے۔

اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ ہماری رسوائی اور مصیبت کو لوگ تماشہ سمجھتے ہیں۔ معشوق کا استغنا بھی دکھایا ہے کہ پُرزے اُڑانے اور قتل کردینے کا وعدہ کر کے پھر گیا۔ بیخودؔ لکھتے ہیں کہ اس سزا سے امتحانِ عشق لینا منظور تھا اور ایسا کرنے سے عاشق امتحانِ عشق میں بغیر امتحان دیے کامیاب ہوگیا۔

۲۳

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں ۱ کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پُشت خار اپنا

۱۔ جنوں جولاں:- وحشی آوارہ ÷ پشت خار:- وہ آلہ خاردار جس سے فقرا پشت کھجایا کرتے ہیں اور ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

اسدؔ ہم ایسے وحشی اور بے سروسامان فقیر ہیں کہ ہمارے پاس پشت خار بھی نہیں ہے جو فقیروں کے پاس عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ اس لیے ہم پشت خار کا کام سر پنجہ مژگان آہو سے لیتے ہیں۔ (۲) عالم وحشت ہم آہو سے بھی آگے نکل گئے ہیں آہو ہمارے پیچھے ہوتا ہے۔ اس لیے پنجہ مژگانِ آہو ہمیں پشت خار کا کام دیتا ہے۔

حسرتؔ:- پنجہ مژگاں کو پشت خار قرار دے کر اپنی نسبتِ وحشت کا اظہار کیا ہے۔ اور بس۔

طباطبائیؔ:- اسدؔ اور آہو کا تقابل تو ظاہر ہے۔ جنون جولاں ہونے سے یہ اشارہ ہے کہ

آہو بھی میرے پیچھے رہ جاتا ہے۔ پشت خار سے پیچھے کھجاتے ہیں۔ گدالفظ پشت خار کی مناسبت کے لیے ہے۔ بے سروپا کہنے سے یہ مقصود ہے کہ پشت خار تک میرے پاس نہیں۔ اگر ہے تو مژگانِ آہو ہے۔ پنجہ میں اور مژگان میں پشت خار میں وجہ شبہ ظاہر ہے یعنی تینوں کی شکل ایک سی ہے۔ مژگان کو پہلے پنجہ سے تشبیہ دی۔ پھر پنجہ کو پشت خار سے۔

۲۴

پئے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا ۱ بخوں غلطیدۂ صدرنگ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو حُسنِ تماشہ دوست رسوا بے وفائی کا ۲ بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکوٰۃ حُسن دے اے جلوۂ بنیش کہ مہر آسا ۳ چراغ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کے بے جرم قاتل تیری گردن پر ۴ رہا مانند خونِ بے گنہ حق آشنائی کا
تمنائے زباں محوسپاس بیزبانی ہے ۵ مِٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے ۶ چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
دہانِ ہر بُتِ پیغارہ جُو زنجیرِ رُسوائی ۷ عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا
نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

۱۔ پئے نذر کرم:- بخشش الٰہی کو نذر کردینے کے لیے ÷ شرمِ نارسائی:- بارگاہِ الٰہی سے دُور رہنے کی شرم ÷ بخون غلطیدہ:- خوں شدہ ÷ صدرنگ:- سو طرح سے ÷

بخشش الٰہی کو نذر کرنے کے واسطے ہمارے پاس صرف شرمِ نارسائی کا تحفہ ہے یعنی وہ دعوئے پارسائی ہے جس کا سینکڑوں قسم کے گناہوں کے ہاتھوں خون ہوچکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری سو بار کی ٹوٹی ہوئی توبہ کو میری شرمِ نارسائی درگاہِ الٰہی میں عفو و معذرت کے لیے پیش کرتی ہے۔

سہاؔ:- رنگ کے معنی شوق کے بھی آتے ہیں۔ اس سے رندی وسیہ کاری بھی مراد ہوسکتی ہے۔

۲۔ حُسن تماشا دوست:- نمائش پسند حُسن ÷ رسوا بیوفائی کا:- بے وفائی کی وجہ سے بدنام ÷ مُہرِ صد نظر:- سو نظروں کی مُہر ÷

محبوب کے نمائش پسند ہونے کی وجہ سے اس پر آوارگی اور بے وفائی کا الزام لگا کر اس کو بدنام نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی تماشہ دوستی سے اسکی پارسائی ثابت ہوتی ہے کیونکہ وہ سو نظریں جو اس پر پڑتی ہیں وہ حقیقتاً سو مہروں کی ایک مہر ہے جو اس کے دعویٰ پارسائی کی تصدیق کرتی ہے۔

طباطبائی نے دوسرا پہلو طعن کا نکالا ہے لیکن اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں تماشہ دوست ہوکر اور اغیار سے تاک جھانک کرکے پارسائی کی اور خیانت و بیوفائی کی بدنامی سے کہاں بچ سکتے ہو۔

بیخود:- ہر جگہ اور ہر چیز میں دوست کے حُسن کا جلوہ ہے، پھر بھی وہ کہیں موجود نہیں۔ کسی جگہ قیام نہیں کرتا۔ بایں ہمہ اس پر بے وفائی کا الزام بھی عاید نہیں ہوسکتا۔ دیکھنے والوں کی سینکڑوں نگاہیں اس مضمون پر مہریں کرتی ہیں کہ ہم اس کے پردے تک بھی رسائی نہیں کر سکے اور یہ پارسائی کی حد ہے۔ پھر دعویٰ پارسائی میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔

۳۔ زکوٰۃ:- مال کا چالیسواں حصہ جو ہر سال خیرات کیا جاتا ہے÷ جلوۂ بینش:- محبوب÷ مہر آسا:- مانند آفتاب÷

اے محبوب! تُو اپنے حُسن کی زکوٰۃ دے تاکہ اسکی تابش سے فقیر (عاشق) کا کاسۂ گدائی ایسا چراغ بن جائے جو سورج کی طرح اسکے گھر کو روشن کردے

بیخود و طباطبائی:- کاسۂ گدائی دل سے استعارہ ہے یعنی اے جلوہ گاہ بینش! میرے کشکول کو زکوٰۃ عرفان دیکر روشن کردے کہ اس فقیر کے لیے وہ چراغ ہوجائے اور آفتاب کی طرح شب تار کی جہالت کو دن کر دے (سہا)

آسی:- (۱) ہم خیال (۲) جلوۂ بینش سے خیال ہوتا ہے کہ کاسہ گدائی کا استعارہ آنکھوں سے ہے۔ یعنی اے جلوۂ بینش! تو اپنا جلوہ دکھا کر میری آنکھوں کو روشن کردے۔ خانہ استعارہ ہے دل سے یعنی تو' اگر تیرا جلوہ آنکھوں میں سما جائے تو میرا دل اس نور سے منوّر ہو جائے۔ حسرت بھی جلوۂ دیدار سے چشم مشتاق کو روشن کرنا مراد لیتے ہیں۔

۴۔ حالی:- تُو نے ایک مشتاقِ قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لیے قتل نہیں کیا کہ خون بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے۔ مگر اس صورت میں تیری گردن پر بجائے خون بے گناہ کے حق آشنائی رہ گیا۔

گویا حق آشنائی یہ تھا کہ تُو مجھ کو قتل کر ڈالتا۔

۵۔ سپاس:- تشکر÷ بے دست و پائی:- مجبوری یعنی بے زبانی÷

زبان کی تمنا بے زبانی کے شکریہ میں محو ہے کہ اس کی بدولت بے دست و پائی کے شکوہ کا تقاضا مٹ گیا۔ مطلب یہ ہے زبان کی تمنا تھی کہ بے دست و پائی کی شکایت کی جائے۔ لیکن بے زبانی کی وجہ سے یہ شکایت نہ کرسکی۔ اس لیے وہ اب بے زبانی کا شکریہ ادا کررہی ہے کہ شکوۂ بے دست و پائی سے اس کی جان بچ گئی۔

حسرت:- زبان کی تمنا متقاضی تھی کہ بے دست و پائی کی شکایت کی جائے لیکن چونکہ مجھ کو بے زبان دیکھ کر ان کو خود بخود رحم آگیا۔ اس لیے تمنائے زبان بے زبانی کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔ کیونکہ بے زبانی ہی کے سبب سے شکوۂ بے دست و پائی کی ضرورت باقی نہ رہی اور ان کو عرض حال و شکایت کے بغیر ہی رحم آگیا (سعید نے دوسرا مفہوم یہی لکھا ہے)

بیخود:- میری تمنا یہ تھی کہ میں تجھ سے ایسی زبان مانگوں' جس کی مدد سے تیری درگاہ میں عرض حال کرسکوں مگر اس درخواست سے پہلے میری زبان محو سپاس بے زبانی ہوگئی یعنی مجھ کو زبان نہ ملنے کا یہ فائدہ پہنچا کہ میں تیری بارگاہ میں شکوۂ بے دست و پائی (بے سروسامانی) پیش نہ کرسکا اور اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھ کو بجائے زبان شکایت کے درجہ تسلیم عطا ہوگیا۔

۶۔ نفس:- سانس÷ نگہتِ گل:- خوشبو سے معطر ہوا÷ چمن کا جلوہ:- فصلِ بہاری÷ رنگیں نوائی:- خوش الحانی÷

میرے نفس اور نگہت گل میں کوئی خاص فرق نہیں' کیونکہ ان دونوں کی علت جلوۂ گل (فصل بہاری) ہے۔ یعنی ادھر بہار آئی اور نگہت گل اڑنی شروع ہوئی اور اُدھر میری رنگیں نوائی شروع ہوئی۔ مطلب یہ ہے میرا نفس نگہت گل سے کم نہیں ہے۔

۷۔ پیغارۂ جو:- طعنہ زن÷ زنجیر رسوائی:- سلسلۂ بدنامی' بہت زیادہ بدنامی۔ دہن کی شکل حلقۂ زنجیر کی سی ہوتی ہے۔ اس لئے بہت سے دہن مل کر ایک زنجیر بن گئی۔ معشوق کے دہن کو شعرا عدم کہتے ہیں۔ لہذا دہن معشوق پر بے وفائی کا چرچا عدم تک پہنچا۔

اے بیوفا! تیری بیوفائی کا ذکر ہر طعنہ زن معشوق کے منہ پر ہے اور اس طرح سے

طعنہ زن معشوقوں کے دہنوں کے حلقوں سے ایک رسوائی کی زنجیر بن گئی ہے اور چونکہ دہن معشوق عدم ہے۔ اس لئے یہ سلسلہ رسوائی عدم تک جا پہنچا ہے۔ یعنی تو اپنی بیوفائی کی وجہ سے نہ صرف معشوقوں میں بدنام ہے بلکہ تیری رسوائی بہت دور تک جا پہنچی ہے۔

۸۔ اے غالب! تو اپنے خط کو زیادہ طُول نہ دے۔ فقط اتنا مختصر کر کے لکھ دے کہ میں تیرے سامنے ستم ہائے جدائی بیان کرنے کی حسرت اپنے دل میں رکھتا ہوں مختصر لکھنے سے خود بخود ظاہر ہوجایگا کہ ستم ہائے جدائی اتنے زیادہ ہیں کہ میں اُنہیں احاطۂ تحریر میں نہیں لاسکتا۔

۲۵

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہوجایگا ۱ بے تکلّف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہوجایگا
زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب ۲ پرتوِ مہتاب سیل خانماں ہوجایگا
لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر ۳ ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہوجایگا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا ۴ یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہوجایگا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تُو راضی ہوا ۵ مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہوجایگا
گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط ۶ شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جایگا
باغ میں مجھ کو نہ لیجا' ورنہ میرے حال پر ۷ ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جایگا
وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو ۸ اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جایگا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے' جی کا زیاں ہوجائے گا

۱۔ اندوہ:- رنج وغم ÷ داغِ ماہ:- چاند کا داغ ÷ مُہرِ دہاں:- مہر خاموشی۔ داغ کی مشابہت مہر سے ظاہر ہے۔

اگر شبِ ہجر کا غم جدائی میں بیان نہ کرسکوں تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ چاند کا داغ میرے دہن کے لئے مہرِ خموشی بن گیا۔

بیخود:- مہرِ دہاں ہوجائے گا۔ یعنی جس طرح چاند کے داغ کو سارا زمانہ دیکھتا ہے اسی طرح تمہاری جدائی کی تکلیفوں کا حال لوگوں پر کھل جائے گا گویا میری خموشی زبان بن کر افشائے راز

محبّت کر دیگی اور تم بدنام ہوجاؤ گے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ تم میری مصیبت کا حال سُن لو تا کہ غم دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے اور راز چھپا رہے۔

۲۔ زہرہ آب ہونا:- پتہ پانی ہونا' بہت زیادہ دہشت وغم ÷ پرتوِ مہتاب:- چاندنی ÷ سیل:-طوفانِ آب ÷ خانماں:-گھر ÷

اگر شبِ جُدائی کی دہشت سے پتہ پانی ہوتا ہے تو کیا تعجب ہے۔ کہ چاندنی کا پتہ بھی پانی ہوجائے اور وہ میرے گھر کے لیے سیلاب بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ چاندنی جس کا منظر لطف پیدا کرتا ہے۔ شبِ ہجر میں میری بربادی کا موجب بن جائے گی۔

۳۔ محبوب بے خبر پڑا سورہا ہے۔ اُس وقت میں اُس کے پاؤں کا بوسہ بہت آسانی سے لے سکتا ہوں۔ لیکن یہ خیال مانع ہے کہ کہیں جاگ اُٹھا تو وہ بدگماں ہوجائے گا اور یہ سمجھنے لگے گا کہ میری محبت بے لوث نہیں ہے

حسرؔت نے ''سوتے میں'' سے یہ مفہوم پیدا کیا ہے کہ اگر محبوب میرے خواب میں آئے اور میں اس کے پاؤں کا بوسہ لے لُوں تو وہ بدگمان ہوکر خواب میں بھی آنا چھوڑ دے گا۔

۴۔ صرفِ وفا:- جو وفاداری کی تمام مہمات کے لئے کافی ہو÷ نذرِ امتحاں ہو جائے گا:- یعنی امتحان ہی میں ختم ہوجائے گا÷

ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا دل تمام عمر کی عشق بازی اور وفاداری کے لیے کافی ہوگا۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ صرف پہلے امتحان کے دوران ہی میں اس کا خاتمہ ہوجائے گا۔

۵۔ دل میں جگہ ہونا:- محبت کرنا÷

چونکہ تجھ کو سبھی پیار کرتے ہیں اور ہر شخص کے دل میں تیری قدر ہے اس لیے اگر تو مجھ سے خوش ہوجائے گا تو تیری محبت کی بدولت کُل زمانہ مجھ پر مہربان ہوجائے گا۔ شاید معشوق کو خدا مان کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خدا مہربان تو سب مہربان۔

۶۔ نگاہِ گرم:- نظرِ عتاب÷ خس:- تنکا÷

اگر تیری نظرِ عتاب اسی طرح مجھ کو ضبطِ محبت کی تعلیم دیتی رہی تو تیری نظرِ عتاب کے خوف سے خُون رگوں کے اندر اس طرح پوشیدہ ہوجائے گا۔ جیسے شعلہ خس میں پنہاں ہوجاتا ہے۔ مطلب

یہ ہے کہ جب ضبط کی وجہ سے خوں فشانی نہ ہو سکے گی تو آخرکار آتشِ عتاب کی گرمی سے رگوں میں خون خشک ہو جائے گا یا جل جائے گا۔

۷۔ حالؔ:۔ حالِ زار÷ گُلِ تر اور چشمِ خوں فشاں میں بوجہ رنگ وتری حسین مشابہت ہے۔

میرا حال ایسا خراب ہے کہ ہر ایک کو میرے حالِ زار پر رونا آتا ہے اس لئے تو مجھے باغ میں نہ لے جا۔ اگر تو مجھے چمن میں لے جائیگا۔ تو میری حالتِ زار دیکھ کر گلوں کی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکنے لگیں گے اور اس طرح سیر باغ سے تجھے بجائے فرحت کے حزن و ملال ہوگا۔

۸۔ میں اس امید پر جی رہا ہوں اور تیرے ظلم برداشت کر رہا ہوں کہ قیامت کے دن میرا اور تیرا انصاف ہو جائے گا اور مجھے میری مظلومی کی دادمل جائے گی۔ اگر روز حشر بھی میرے ساتھ انصاف نہ ہو تو بہت افسوس ہے۔

۹۔ اے اسدؔ! تو عقلمند ہے ذرا سوچ تو سہی تجھے نادان کی دوستی سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ ''نادان کی دوستی اور جی کا زیاں'' بقول بیخودؔ اس طریقے سے دل کو فریب دے کر عشق سے باز رکھنا چاہتے ہیں اور یہ بات عشق کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ جان کے خوف سے عشق کو ترک کر دے۔

۲۶

درد منت کشِ دوا نہ ہوا ۱ میں نہ اچھا ہوا' برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ۲ اک تماشہ ہوا ' گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں ۳ تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ۴ گالیاں کھاکے بدمزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ۵ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ۶ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی ' دی ہوئی اسی کی تھی ۷ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا ' لہو نہ تھا ۸ کام گر رُک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے ۹ لے کے دل دلستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا !

۱۔ منت کش:۔ احسان مند۔ ممنون ÷ اچھا نہ ہوا:۔ صحتیاب نہ ہوا ÷ بُرا نہ ہوا:۔ اچھا ہوا ÷

اگر میں دوا سے صحت یاب نہ ہوا تو کوئی ہرج کی بات نہیں بلکہ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ میرا درد دوا کے احسان سے بچ گیا۔ مطلب یہ ہے کہ میرا درد بھی غیور ہے۔ اسے دوا کا احسان لینا منظور نہیں۔

۲۔ قاعدہ ہے کہ چار آدمیوں کو جمع کر کے جھگڑا چکایا کرتے ہیں تاکہ وہ انصاف کریں۔ لیکن شاعر کو رشک اجازت نہیں دیتا کہ اور لوگ عاشق و معشوق کی گلہ مندیاں سنیں۔ اس لئے معشوق سے کہتا ہے تم گلہ کرنے کے لئے رقیبوں کو کیوں جمع کرتے ہو یہ گلہ ہے یا تماشہ۔ آسی گلہ مند عاشق کو قرار دے کر کہتے ہیں کہ گلہ کرتا ہوں الخ۔

۳۔ جب تم نے ہی قتل کر کے ہماری آرزوئے قتل پوری نہ کی تو پھر ہم اپنے مقدر کو آزمانے کے لئے اور کہاں جائیں۔ یعنی یہ آرزو کہیں اور پوری نہیں ہو سکتی۔

۴۔ تمہارے لبوں میں کتنی شیرینی ہے کہ رقیب کو تم نے گالیاں دیں۔ گالیاں تلخ ہوتی ہیں۔ چونکہ وہ تمہارے لبوں سے نکلیں اس لیے وہ بھی شیریں ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ رقیب باوجود اس کے کہ لذتِ عشق سے محروم تھا۔ پھر بھی وہ تمہاری گالیاں سُن کر ناراض (بے مزہ) نہ ہوا۔ مزہ۔ شیریں مناسب الفاظ ہیں۔ جو بلاارادہ صرف ہو گئے ہیں۔

۵۔ آج ان کے تشریف لانے کی خبر مشہور ہے لیکن ہماری بے سروسامانی کا یہ عالم ہے کہ آج ہمارے گھر میں بوریا بھی نہیں' جو اس پر ان کو بٹھا سکتے۔ ایک طرف ان کے آنے کی خوشی ہے اور دوسری طرف بے سروسامانی کا ماتم ہے۔ طباطبائی مضمون کو سست کہتے ہیں۔ آسی رکیک کہہ کر حسنِ بیان کی تعریف کرتے ہیں۔

۶۔ حالیؔ:۔ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کوئی

فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔ طباطبائی کہتے ہیں کہ غرورِ حُسن کی طرف اشارہ ہے۔

سہا و آسی:- خدا جس کی میں نے عبادت کی' کیا وہ نمرود تھا اور کیا اس کی خدائی نمرود کی خدائی تھی کہ میرا بھلا نہ ہوا؟

۷۔ حق:- (۱) سچ (۲) فرض۔

اگر ہم نے راہِ حق میں جان دی تو کون سا کمال کیا۔ جان اسی کی دی ہوئی تھی۔ ہمارے پاس تو فقط ایک امانت تھی۔ ہم نے واپس کردی۔ امانت کے واپس کرنے میں کون سا احسان یا ایثار ہے۔ اس لئے سچ بات تو یہ ہے کہ ہم فرضِ حق ادا نہیں کر سکے' یعنی جان دینا کوئی بڑی بات نہیں بلکہ انسان پر اور بہت سے فرض ہیں جن کا ادا کرنا واجب ہے۔

۸۔ ہمارا زخم جب باندھ دیا گیا تو پھر بھی لہو جاری رہا۔ حالانکہ زخم کو دبا دینے سے لہو تھم جانا چاہیئے تھا۔ اس کے برخلاف اگر ہمارا کام رک گیا تو پھر چل نہ سکا۔ حالانکہ قاعدے کے مطابق ہونا یہ چاہیئے تھا کہ جس طرح کام رک جانے پر رواں نہیں ہوتا۔ اسی طرح زخم دب جانے سے لہو بھی رواں نہ ہوتا۔ ظاہر یہ کرنا چاہتے ہیں کہ جو بات میرے حق میں مفید ہوتی ہے وہ ہمیشہ اُلٹی پیش آتی ہے۔ اپنی بدنصیبی اور تقدیر کی دگرگونی کا اظہار نہایت عمدہ پیرائے میں کیا ہے۔

۹۔ رہزنی:- راستے میں لوٹنا ÷ دلستانی:- دل لینا ÷

اُنہوں نے راہ چلتے میرا دل چھین لیا۔ بتلائیے کہ یہ رہزنی ہے یا اندازِ دلستانی' یعنی قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ دل لینے کے لیے وہ انداز و ناز دکھاتے۔ لیکن وہ تو رہزنوں کی طرح لوٹ کر چلتے ہوئے۔ اب ڈھونڈتے پھریئے کہ کون تھا۔ اور کہاں گیا؟

آسی و طباطبائی:- قافیہ معمولہ کے عیب نے شعر کو بھدّا کردیا ہے۔ بیخود کہتے ہیں کہ قافیہ نے اور لطف پیدا کردیا ہے۔

۱۰۔ بیخود کا بیان ہے کہ قلعہ میں کسی شہزادہ کے مکان پر مشاعرہ ہوا تھا غالب نے طرح میں غزل نہ لکھی۔ جب اصرار مبالغہ کی حد تک پہنچ گیا تو یہ غیر طرح غزل پڑھ دی۔ مقطع پہلے سے اس مضمون کا کہہ لیا تھا جیسا کہ مقطع کے مضمون سے ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۷

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا ۱ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب ۲ مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی ۳ دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دُنیا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو ۴ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ہنوز محرمیٔ حُسن کو ترستا ہوں ۵ کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے ۶ ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے ۷ مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

۱۔ اضطرابِ شوق اس قدر زیادہ ہے کہ وہ دل میں بھی نہیں سما سکتا حالانکہ دل میں اس قدر وسعت ہے کہ اس میں دونوں جہاں بہت آسانی سے سما سکتے ہیں۔ اس قدر فراخی اور وسعت کے باوجود شوق کو تنگدلی کی شکایت ہے اور یہ شکایت بجا معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اضطراب شوق کو ضرورت کے مطابق جگہ نہ ملنے سے اس کا جوشِ اضطراب ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ گویا دریا کا اضطراب موتی میں سما گیا۔ اصل میں موتی کی آب کو دیکھ کر شاعر کا دماغ اس باریک خیال کی طرف متوجہ ہوا اور اُس نے گوہر کو دل اور اضطرابِ شوق کو اضطراب دریا سے تشبیہ دے کر یہ لطیف معنی پیدا کیے۔

۲۔ پاسخِ مکتوب:- خط کا جواب ÷ ستم زدہ:- مجبور ÷ ذوقِ خامہ فرسا:- لکھنے کا شوق ÷

یہ بات تو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تُو میرے خط کا جواب ہرگز نہیں دیگا۔ لیکن میں کیا کروں کہ خامہ فرسائی کا شوق مجھے مجبور کرتا ہے۔ اس لئے میں تجھے برابر خط لکھے جاتا ہوں۔ گویا میں ذوقِ خامہ فرسا کا ستم زدہ ہوں اور ستم زدہ قابلِ رحم ہوتا ہے۔ اس لئے پے درپے خط پہنچنے پر ناراض نہ ہو۔

۳۔ حنائے پائے خزاں:- خزاں کے پاؤں کی مہندی۔ بہار کو بوجہ رنگینی کہا ہے ÷

دوام- ہمیشہ ÷ کلفتِ خاطر:- ملال دل ÷

اگر بہار کچھ چیز ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ خزاں کے پاؤں کی حنا ہے۔ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ حنا کی رنگینی اور دلفریبی چند روز میں زائل ہو جاتی ہے اور پھر خزاں ہی کا دَور دَورہ رہتا ہے اسی طرح سے دُنیا کا عیش بھی عارضی اور ناپائدار ہے اور ہمیشہ اس کا انجام کلفتِ خاطر اور رنجِ دلی کا باعث ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں عیش و نشاط کا زمانہ قلیل اور مصیبت کا عرصہ طویل ہوتا ہے۔

۴۔ دماغ نہیں:- پسند نہیں ÷ خندہ ہائے بیجا:- خندہ گل کو خندہ بیجا کہنے کی یہ وجہ ہے کہ کچھ سمجھ کر یا ازراہ تعجب نہیں ہنستا۔ اس لئے اس کا خندہ بے محل اور بیجا ہے۔

میں غمِ فراق میں مبتلا ہوں۔ اس لئے مجھ کو سبز باغ کے لئے مجبور نہ کرو۔ غالبؔ رنج وغم میں مجھے پھولوں کی بیجا ہنسی پسند نہیں۔ گویا میں گلوں کے خندہ ہائے بیجا کی تاب نہیں لاسکتا۔

۵۔ محرمی:- رازداری ÷ بُنِ مُو:- بال کی جڑ ÷

اگر چہ میرے ہر ایک رونگٹے کی جڑ چشمِ بینا کا کام کررہی ہے۔ پھر بھی میں حُسنِ ازلی کے دیدار سے محروم ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود ہمہ تن چشمِ شوق اور چشمِ بینا بن جانے کے میں حقیقت کے راز سے واقف نہیں ہوسکا۔

طباطبائی:- ہر بُنِ مُو کو چشمِ بینا کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جب ہر شے آئینۂ ظہور قدرت وصنعت ہے تو اُس میں بُنِ مُو بھی داخل ہے یعنی ہر بُن اس طرح حکمت و صنعت کو دکھارہی ہے۔ جس طرح کوئی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے۔

۶۔ دماغ کہاں:- برداشت یا تاب نہیں ÷ قافیہ کی مجبوری سے ''تقاضا کا'' باندھ دیا ہے ورنہ ''تقاضے کا'' فصیح اور درست ہے۔

پیشتر اس کے کہ وہ نازوانداز دکھاتے اور اس طریقے سے دل مانگنے کا تقاضا کرتے۔ ہم نے اپنا دل پہلے ہی ان کو دیا اور تقاضے کی نوبت نہ آنے دی۔ کیونکہ ہمیں حُسن کے تقاضے کی تاب نہیں (بیخودؔ طباطبائی)

آسیؔ:- مصنف کا مطلب یہ ہے کہ ادا و نازحسن کو ہم دل نہ دیتے۔ تو حُسن ہم سے دل لینے کا تقاضا کرتا مگر ہم نے اسے گوارانہ کیا اور تقاضے کی نوبت نہ آنے دی (سعیدؔ)

۷۔ یہ نہ سمجھو کہ میرا رونا میری حسرتِ دل کے برابر ہے بلکہ میری حسرتِ دل میرے گریہ

سے بہت زیادہ ہے۔ اس لئے کثرت اشک افشانی سے اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ میری آنکھوں سے دریائے اشک جاری ہے لیکن وہ بھی میری حسرتِ دل کے برابر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حسرتِ دل زیادہ ہے اور مقدار گریہ سے اس کا اندازہ ممکن نہیں۔ بیخودؔ نے معشوق کو اور آسیؔ نے ہمدم کو منادیٰ قرار دیا ہے۔

آسیؔ (۱) ہم خیال (۲) میں اس قدر رو چکا ہوں کہ اتنی مجھے حسرت بھی نہ تھی (۳) میری حسرت اتنی گراں پایہ نہ تھی جتنا مجھے رونا پڑا۔

۸۔ اس کو:- معشوق کو÷ اس کی:- فلک کی ÷ کارفرما:- معشوق ÷ ستم شعار÷

جب میں مظلومی کی حالت میں آسمان کو دیکھتا ہوں تو مجھ کو اپنا معشوق یاد آجاتا ہے۔ کیونکہ فلک کی جفا کاری میں مجھے اپنے معشوق کی کارفرمائی کی جھلک نظر آتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ معشوق ہی بانیٔ جورو جفا ہے اور اسی نے فلک کو جفا کاری کا حکم دیا ہے۔ (آسیؔ)

بیخودؔ:- فلک کو دیکھ کر خدا یاد آجاتا ہے۔ اس لئے آسماں جس قدر ظلم وستم مجھ پر کرتا ہے وہ سب اسی کے حکم سے ہیں۔ بغیر حکم الٰہی کے آسمان کچھ نہیں کرسکتا۔

سعیدؔ:- ظلم فلک کو دیکھ کر مجھ کو اپنا معشوق یاد آتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی ایسا ہی ظالم ہے

۲۸

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا ۱ خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا ۲ غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

۱۔ حالت:- خیال تو دقیق نظم کیا گیا ہے لیکن لطف زیادہ نہیں۔ قطرہ جو چمکنے میں بے اختیار ہے افراطِ حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر بوندیں تھم کر رہ گئیں تو پیالے کا خط اس تاگے کی صورت بن گیا جس میں موتی پروئے گئے ہوں۔ (سعیدؔ و بیخودؔ وسہا)

طباطبائی لکھتے ہیں حیرت کی شگرف کاری کا اظہار مقصود ہے لیکن یہ حیرت حسنِ ساقی کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ مضمون مصنف کے ذہن میں رہ گیا۔

حسرتؔ:- جب ساغر مے لب یار سے ملا تو قطرہ ہائے مے بفرط حیرت منجمد ہوکر گویا گوہر بن گئے اور خطِ جام رشتۂ گوہر کے مانند ہوگیا۔

آسیؔ:- قطرۂ مے کا کام حیران کرنا ہے اور وہ حیرت نفس پرور اور روح پرور ہے۔ خطِ جام مے کو اس کی روح پروری نے گوشۂ گوہر بنا دیا ہے۔ اس سے فقط مدحِ شراب مقصود ہے۔

۲۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ سوائے میرے کوئی اور آہ و نالہ نہیں کرتا۔ گویا ان کو میرے عشق کا اعتبار ہو گیا ہے۔ لیکن یہی اعتبار میری تباہی کا باعث ہے۔ وہ اس طرح سے کہ اگر کبھی رقیب آہ و فریاد کرتا ہے تو محبوب سمجھتا ہے کہ یہ میرا ہی کام ہے۔ اس لئے وہ مجھ پر خفا ہوتا ہے (طباطبائی۔ سہاؔ۔ بیخودؔ) ہم خیال ہیں۔

سعیدؔ میرے ہم خیال ہیں مگر خانہ خرابی کی مزید تشریح یہ لکھتے ہیں کہ خانہ خرابی یا تو اس لئے ہے کہ کوئی کرے اور کوئی بھرے یا اس لئے کہ رقیب سمجھا کہ معشوق مجھ سے ناراض ہے اور اس سے خوش۔

آسیؔ:- (۱) ہم خیال (۲) چونکہ اُسے میرے عشق کا اعتبار ہو گیا ہے اس وجہ سے وہ غیر کی ہر تکلیف کو میرے عشق کا نتیجہ سمجھتا ہے اور مجھ پر خفا ہوتا ہے۔ میرے اعتبارِ عشق سے غیر کو تکلیف پہنچنے کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً غیر مجھ کو اپنا حریف سمجھ کر تکلیف اُٹھاتا ہے یا میرا عشق صادق اپنا کوئی حریف دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے غیر کو تکلیف پہنچاتا ہے اور ماسوائے معشوق سب کو فنا کرنا چاہتا ہے (ظاہر ہے یہ مفہوم تاویلی ہے اور اصل مقصد سے بہت دور پہنچ گیا ہے۔)

۲۹

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا ۱ تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا
اہل بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخی ناز ۲ جوہرِ آئینہ کو طوطی بسمل باندھا
یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا ۳ عجز ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضموں غالبؔ!
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

۱۔ محمل:- اونٹ کا کجاوہ÷

جب میری محبوبہ نے سفر کرنے کے لئے محمل تیار کی تو میری تپش شوق نے ریت کے ہر ذرے پر ایک دل باندھ دیا تا کہ محمل یار میرے دل پر قدم رکھتی ہوئی جائے۔ ذرہ کی تابش سے فائدہ

اُٹھا کر اس کو دلِ مضطرب قرار دیا ہے اور یار کے وقت سفر اپنے دل کی بے چینی دکھائی ہے۔

بیخودؔ میرے ہم خیال ہیں۔ مزید تشریح غور طلب ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''ہمارا شوق ہمیں اس کے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس بیقراری کی حالت میں سواری کے چلنے میں جو ذراتِ گرد و غبار کی صورت میں بلند ہوتے تھے، ہم سمجھتے تھے کہ ہر ذرّہ پر ایک دل باندھا ہوا ہے ورنہ ذرّہ میں یہ تڑپ کہاں۔

آسیؔ:- جب یار نے سفر کے لئے محمل باندھا تو میرا دل بیقرار ہوا اور محمل کے ہر ذرّہ یا عام ذرّہ ذرّہ پر شوق نے ایک دل باندھ دیا اور محمل کے ساتھ بھیجدیا۔ یعنی ذرّات محمل میرے دل تپاں تھے۔ ذرّہ کی چمک اور دل کی تپش کا عالم یکساں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے محمل کے ساتھ دل تپاں بھی رخصت ہوا۔

۲۔ اہلِ بینش:- اہلِ نظر۔ دیکھنے والے÷ حیرت کدہ:- مراد آئینہ۔ عکس یار کی وجہ سے آئینہ کو حیرت کدہ کہا ہے۔÷ جوہر آئینہ:- فولادی آئینہ کے جوہر سبز ہوتے ہیں اور پہلو کی طرف سے دیکھنے میں جو ہر سبز متحرک معلوم ہوتے ہیں۔ شوخی ناز کی وجہ سے اسے طوطی بسمل سے مشابہ کیا ہے۔

اہلِ نظر نے فولادی آئینہ کے سبز متحرک جوہر کو طوطی بسمل قرار دیا ہے۔ جو کہ معشوق کی شوخی ناز کو دیکھ کر تڑپ رہی ہے۔ گویا فولادی آئینہ ایک حیرت کدہ ہے جہاں یار کی شوخی ناز سے اُس کے سبز جوہر طوطیٔ بسمل کی مانند تڑپ رہے ہیں۔ بقول حسرتؔ اس میں نازک اشارہ یہ ہے کہ ناز یار کی شوخی ناز ارباب یار کی حیرت کو اضطراب سے بدل دیا کرتی ہے۔

۳۔ عربدہ:- جنگ÷ میدان مانگنا:- جنگ طلب کرنا÷ عجز ہمت:- پست ہمتی÷

دل سائل کو ایک طلسم اور میدانِ عربدہ کو یاس و امید قرار دیا ہے اور اس طلسم کو پست ہمتی کا بانی۔ میری پست ہمتی نے میرے دل کو ایک طلسم میدان بنا رکھا ہے۔ جس میں یاس و امید میں جنگ ہو رہی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پست ہمتی امید و بیم کی جنگ میں مبتلا کر دیتی ہے۔

صرف آسیؔ یہ معنی لکھ کر کہتے ہیں کہ سوال کرنا بہت بُرا ہے اور یہ پست ہمتوں کا کام ہے

جس سے دل طلسم امید و بیم بن جاتا ہے۔ باقی شارحین متفق ہیں۔

۴۔ ذوق سے مراد ذوق سخن ÷ ساحل:- ساحل کی تشنگی مشہور ہے۔ وہ دریا سے ہم آغوشی کے باوجود پیاسا اور خشک رہتا ہے ÷ دِل کھول کر:- مبالغہ سے۔ اچھی طرح۔

اے غالب:- ہم نے اتنا مبالغہ کیا کہ دریا کو بھی ساحل بنا دیا۔ لیکن میرے ذوق سخن کی تشنگی ملاحظہ ہو کہ پھر بھی ذوق سخن کی تشنگی کا مضمون ادا نہ ہو سکا۔

۳۰

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں ۱ گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں ۲ وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

۱۔ تشنہ کام:- پیاسا۔ محروم۔

بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ مجھ جیسا میخوار بزمِ مے نوشی سے بغیر پئے چلا آئے۔ فرض کیا کہ میں نے مے نوشی سے توبہ کر لی تھی، اس لیے میں نے شراب نہ مانگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ساقی کو کیا ہوگیا تھا کہ اُس نے مجھے زبردستی نہ پلائی۔ شراب خوروں کا قاعدہ ہے کہ وہ زبردستی دوسروں کو پلانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہاں ایسا نہ ہوا۔ اس لئے اس واقعہ کو یا تو بدقسمتی سمجھے یا ساقی کی ناراضی اور بے توجہی کا نتیجہ۔

۲۔ تیر:- تیر نظر۔

وہ زمانہ گیا جب دل اپنی جگہ پر آرام سے تھا اور جگر اپنے مقام پر۔ اب تو ان کے ایک تیر نظر نے دونوں کو چھید کر زخمی کر دیا ہے۔

۳۔ درماندگی:- مصیبت- رشتہ:- دھاگہ ÷ درماندگی کو گرہ اور تدبیر کو ناخن گرہ کشا سے استعارہ کیا ہے۔

جب ہم مشکلات اور مصائب کے پھندوں میں پھنسے ہوئے نہ تھے تو اس وقت ہم میں ان پھندوں کے کھولنے اور مصائب کے دُور کرنے کی ہمت اور تدبیر سوچنے کی قوت موجود تھی۔ لیکن اب

وہ بات نہیں رہی۔ اب ہم مصائب میں مبتلا ہیں۔ ایسی حالت میں کچھ بن پڑے اور مشکلات کا دفعیہ ہو سکے تو بات ہے۔ قاعدہ ہے جب انسان مصیبتوں میں پھنس جاتا ہے تو اس کی عقل اور ہمت کچھ کام نہیں کرتی۔

۳۱

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا ۱ بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگی دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے ۲ کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمر ورع، بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا!

۱۔ ہمارا گھر کثرت گریہ سے ویراں ہوگیا ہے۔ خیال یہ ہے کہ اگر ہم نہ روتے تو ہمارا گھر برباد نہ ہوتا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ دریا دریا نہ ہوتا تو اس کی جگہ یقیناً بیابان ہوتا۔ گویا اگر ہمارا گھر رونے سے ویران نہ ہوتا تو پھر کوئی اور آفت آتی۔ غرض ویرانی کسی صورت نہ ٹلتی اور بدنصیبی کسی طرح ضرور ظاہر ہوتی۔

۲۔ میں اپنی تنگی دل کی کیا شکایت کروں۔ یہ کم بخت دل ایسا بُرا واقع ہوا ہے کہ ہر صورت میں اُس کا مصیبتوں میں مبتلا رہنا لازمی ہے۔ اگر یہ تنگ (مبتلائے مصائب) نہ ہوتا تو پھر پریشان ہوتا۔ یعنی اس کی واشدگی پریشانی کے درجہ کو پہنچ جاتی۔ اس لئے اس کی تنگی اور پریشانی ہمارے لیے برابر ہے۔

۳۔ ورع:- پرہیزگاری ÷ بار:- جگہ، اجازتِ داخلہ ÷ رضوان:- بہشت کا دربان ÷

ہم نے تمام عمر محبوب کی پرستش میں صرف کردی۔ لیکن اس کا دربان اس قدر سخت گیر ہے کہ وہ اب بھی ہمیں یار کے مکان میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ کاش کہ اس کا دربان رضوان ہوتا۔ جو ایک عمر عبادت میں گزارنے کے بعد بہشت میں تو داخل ہونے دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ رضوان حسبِ عادت ہماری پرستش کا خیال کر کے ہم کو ضرور اندر جانے دیتا۔

۳۲

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ۱ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا ۲ نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

۱۔ حالی:- بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرعہ کے معنی تو ظاہر دوسرے مصرعہ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیئے کہ میں کیا ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہوتا۔ کیونکہ پہلے مصرعہ میں بیان ہوچکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا (سعید)

طباطبائی:- صوفیہ کے مذاق میں کہا ہے۔ میں کچھ نہ تھا تو خدا تھا۔ اور کچھ ہوکر میں اپنے مبداء سے مغائر ہوگیا اور اس مبداء فیض سے علیحدہ ہوجانا میرے حق میں بُرا ہوا (سب متفق)

۲۔ زانو پر دھرا ہونا:- جب انسان غمگین ہوتا ہے تو سر زانو پر رکھ کر خاموش بیٹھ جاتا ہے۔
میں کثرتِ آلام سے بالکل بے حس ہوگیا ہوں اور مجھے اپنے سر تک کا ہوش نہیں رہا۔ میرا سر کٹ گیا ہے لیکن مجھے بے خودی کی وجہ سے اس کا احساس تک نہیں ہوا۔ اگر میرا سر تن سے جدا نہ ہوتا تو بھی کثرتِ غم سے بے حس و حرکت زانو پر دھرا ہوتا۔ اس لئے سر کے کٹ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ پھر مجھے سر کے کٹ جانے کا غم کیوں ہو۔

۳۔ اگرچہ غالب کو مرے ہوئے ایک مدت ہوگئی ہے مگر وہ اب تک یاد آتا ہے کہ وہ ہر بات پر کمال بے پروائی سے تحقیراً کہا کرتا تھا کہ یوں ہو جاتا تو کیا ہوتا یعنی کچھ نہ ہوتا (آسی و طباطبائی۔ بیخود)

سعید:- اس کی بحث وتمحیص کی عادت بار بار یاد آتی ہے۔

سہا:- وہ ہر بات پر ارمان وتمنا کا اظہار کرتا تھا یعنی یوں ہوتا تو کیسا لطف ہوتا۔

۳۳

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا ۱ یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی ۲ کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل ۳ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے ۴ تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے ۵ پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار ۶ یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا
باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

۱۔ جادہ:- راستہ، بٹیا ÷ فتیلہ:- بتی ÷ داغ:- چراغ سے استعارہ ہے۔ بہار سے باغ میں سبزہ وگل کی اتنی فراوانی ہے کہ زمین کا ایک ذرہ بھی بیکار نہیں رہا۔ یعنی ہر جگہ گل وسبزہ نمودار ہے۔ یہاں تک کہ باغ کی روشیں جن پر بہار کا کوئی اثر نہیں ہوا کرتا اثرِ بہار سے چراغ لالہ کی بتیاں معلوم ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ روشِ باغ بھی باعثِ فروغ باغ ہے۔ اور اس کو لالہ کے ساتھ وہی مناسبت ہے جو فتیلہ و چراغ میں ہوتی ہے۔ (حسرت، سہا، سعید)

آسی و طباطبائی:- (۱) ہم خیال (۲) داغ سے اگر زخم مراد لیں تو فتیلہ وہ بتی ہے جو زخم میں رکھتے ہیں۔ اس صورت میں کثرتِ نشوونما کا اظہار ہے کہ جادہ ایسا باریک پڑگیا ہے جیسے رگِ لالہ ہوتی ہے اور داغِ لالہ کی تخصیص اس لئے ہے کہ کثرتِ گل ہائے رنگین سبزی پر دلالت کرے (بیخود)

۲۔ آشوب:- مصیبت ÷ آگہی:- ہوشیاری، افکار دنیوی ÷ عجزِ حوصلہ:- پست ہمتی ÷ ایاغ:- جام شراب، جس پر شراب ناپنے کے لئے خطوط کھینچے ہوئے ہوں۔
کہتے ہیں۔ جامِ جمشید پر بھی ایسے ہی خطوط تھے۔ چونکہ مصائب و شدائد دنیاوی کو برداشت کرنے سے حوصلہ عاجز ہے۔ اس لئے اس نے آگہی و ہوشیاری پر خطِ ایاغ کھینچ دیا ہے۔ یعنی شراب پی کر آگاہی کو صفحۂ دل پر سے کاٹ دیا ہے تاکہ مستی اور غفلت سے احساس ہوشیاری و آگہی جاتا رہے۔ (آسی۔ طباطبائی)

سعید:- شراب نوشی کے بغیر افکار دنیوی سے نجات نہیں مل سکتی لیکن یہاں ساقی نے ایسی پست ہمتی سے کام لیا کہ جام پر بھی خط کھینچ دیا۔ یعنی پورا ایک پیالہ بھی شراب نہ دی بلکہ خط مقررہ تک بھر دی۔ اگرچہ ضرورت زیادہ تھی۔

حسرتؔ:۔ آگاہی کو آشوب قرار دیا۔ جس کی برداشت کے لئے میکساری لازم ٹھہری اور ظاہر ہے اس غرض کے لئے ایک ساغر سے کیا کام چلتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ساغر بھی لبریز نہ ہو بلکہ صرف خط ساغر تک ہو۔

بیخودؔ:۔ عجز حوصلہ کی وجہ سے ہم نے ساغر پر نشان بنا دیئے ہیں۔ شراب ناپ کر پیتے ہیں اور مقدار روز بروز بڑھاتے ہیں اور آشوب آگہی کی طاقتِ برداشت بقدرِ افزائش مقدار شراب رفتہ رفتہ پیدا ہو جاتی ہے یعنی ذکر و اشغال کی مشق و مہارت روز بروز کرتے جاتے ہیں۔

۳۔ بلبل گلوں کے عشق میں دیوانی ہو رہی ہے اور پھول اس پر ہنس رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے جس چیز کو عشق کہتے ہیں وہ اصل میں خللِ دماغ ہے کیونکہ دیوانوں پر ہی لوگوں کو ہنسی آیا کرتی ہے۔ طباطبائی کہتے ہیں کہ حال زار کی جگہ کاروبار اس لئے استعمال کیا ہے کہ کار بمعنی زراعت اور بار معنی ثمر ہے یہ گل سے مناسبت رکھتا ہے۔ طباطبائیؔ کو ہمیشہ ایسی ہی سوجھتی ہے۔

۴۔ تریاکی قدیم:۔ پرانا افیونی ÷ دودِ چراغ:۔ چراغ کا دھواں۔ چنڈو باز چراغ کی لَو کے ذریعہ سے افیون کا دھواں نال سے پیتے ہیں اور شعراء اکثر رات کو چراغ کے سامنے بیٹھ کر مشقِ سخن کرتے ہیں۔

نشۂ فکرِ سخن کی لت مجھے کچھ نہیں پڑی بلکہ مدتوں سے دودِ چراغ کے سامنے بیٹھ کر فکرِ سخن کرتا ہوں۔ ظاہر ہے دودِ بمعنی فکرِ سخن اور چراغ سے کلام روشن کا استعارہ کیا ہے۔

۵۔ بند:۔ قید ÷ عدو:۔ دشمن ÷ فراغ:۔ آزادی ÷

ہم عشق کی مصیبتوں سے بہت دفعہ آزاد ہوئے مگر کیا کریں ہمارا دل ہی فارغ البال رہنا نہیں چاہتا۔ گویا ہماری آزادی کا دشمن ہے۔ جب ہم آزاد ہوتے ہیں۔ وہ پھر بندِ عشق میں گرفتار کروا دیتا ہے۔ بیخودؔ لکھتے ہیں عشق سے دُنیا کی محبت اور بندِ عشق سے اس میں پھنسا ہوا ہونا مراد ہے یعنی دُنیا میں بغیر شغل و فکر آدمی رہ ہی نہیں سکتا۔

۶۔ میکدہ:۔ مراد آنکھ ÷ مے:۔ یعنی خونِ دل ÷ خراب:۔ ویران ÷ سُراغ:۔ تلاش ÷ موج۔ تارِ نظر، بینائی ÷

اگر میری آنکھوں سے خونِ دل آنسو بن کر نہیں بہتا تو موج نگاہ (بینائی) کے بدلے میری

آنکھوں میں غبار اُڑنے لگتا ہے۔ یعنی مجھے کم نظر آتا ہے اور یہ کیفیت میرے لئے سخت تکلیف کا باعث ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ میکدہ (چشم) شراب (خون دل) کی جستجو میں (خاک بسر) غبار آلود ہے۔ ظاہر ہے بغیر شراب کے میکدہ میں خاک ہی اُڑتی ہے یعنی ویران ہوتا ہے۔ میکدے کے لئے خراب کا لفظ پر لطف ہے۔

۷۔ باغِ شگفتہ:۔ سرسبز و شاداب ÷ بساط:۔ فرش ÷ نشاط:۔ سرور ÷ خمکدہ:۔ میخانہ ÷

ابرِ بہار میری ہستی و نشاط کا باعث نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی اور کے دماغ کا خمکدہ ہوگا۔ یعنی وہ کوئی اور لوگ ہوں گے۔ جو ابر بہار سے مسرور و سرخوش ہوتے ہوں گے۔ میرے سرورِ دل کا باعث تو تیرے حسن کا شگفتہ باغ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چیز میرے دل و دماغ کے لئے مستی کا باعث نہیں ہو سکتی (حسرتؔ، سعیدؔ، بیخودؔ)

طباطبائیؔ:۔ جب شگفتگی باغ سے تجھے نشاط پیدا ہوتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ ابرِ بہار جس نے ساغر کو رنگ شراب رنگ و بو سے لبریز کر دیا۔ کس کے دماغ کا میکدہ ہوا۔ ابرِ بہار بھی تیرے ہی دماغ میں نشہ پیدا کرنے کے لئے ایک خمکدہ ہے۔ بساط و نشاط میں تجنیس خطی ہے۔ آسیؔ دونوں مفہوم لکھتے ہیں۔

۳۴

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا ۱ رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز ۲ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ ۳ اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام ۴ رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا ۵ نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ۶ ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ ۷ دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

۱۔ چینِ جبیں:- تیوری ÷ غمِ پنہاں:- رنجشِ دل ÷ عنوان:- سُرخیٔ پتہ ÷ راز مکتوب:- خط کا مضمون ÷ چینِ جبیں کی تشبیہ بے ربطیٔ عنوان سے ہے اور غمِ پنہاں کا استعارہ راز مکتوب سے ہے۔

میری تیوریوں سے اس نے میرے غمِ پنہاں کو بھانپ لیا۔ گویا عنوان کے بے ربطگی سے وہ خط کے مضمون کو سمجھ گیا گویا اُس نے میری چینِ جبیں سے میرے غمِ پنہاں کا اس طرح پتہ لگا لیا۔ جس طرح پتہ کی بے ربطگی سے خط کا مضمون معلوم ہو جاتا ہے۔

۲۔ غالب:- پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ آئینہ فولاد کے آئینہ سے ہے ورنہ آئینوں میں جو ہر کہاں اور ان کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کروگے بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی۔ اس کو الفِ صیقل کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اُس کے مفہوم کو سمجھئے ع

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یعنی ابتدائے سنِ تمیز سے مشقِ جنوں ہے۔ اب تک کمالِ فن حاصل نہیں ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہوگیا۔ بس وہی ایک لکیر صیقل کی موجود ہے چاک کی صورت بھی الف کی سے ہوتی ہے اور چاک آثارِ جنوں میں سے ہے۔ (اُردوئے معلےٰ)

آسی اور طباطبائی ''بیش نہیں'' پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ فارسی کا ترجمہ ہے۔ لیکن غالب ان چیزوں سے بے نیاز ہیں۔

۳۔ شرح:- کھولنا، یہ لفظ تنگ کی مناسبت سے لائے ہیں ÷ گرفتاریِ خاطر:- گرفتگیٔ دل۔ گرفتاریِ زنداں کی رعایت ملحوظ رہے۔

میری گرفتگیٔ دل کی تفصیل مجھ سے دریافت نہ کرو۔ یوں سمجھ لو کہ میرا دل مصائب و آلام سے اس قدر تنگ ہوا کہ میں اس کو زنداں سمجھنے لگا ہوں۔ لطف یہ ہے کہ زنداں تنگ ہوتا ہے۔

۴۔ نہ چاہا:- گوارا نہ کیا ÷ قطرۂ عرق:- (فکِ اضافت) پسینہ کی بوند ÷ دیدۂ حیراں:- یعنی چشمِ رقیب ÷

میری بدگمانی نے گوارا نہ کیا کہ وہ محوِ خرام رہے۔ کیونکہ چلنے سے اس کے ماتھے پر جو پسینہ آجاتا ہے وہ مجھے دیدۂ حیران (چشمِ رقیب) معلوم ہوتا ہے اور میرا رشک یہ گوارا نہیں کرتا کہ رقیب

کی چشمِ حیران اس کے ماتھے پر جم جائے (طباطبائی۔ بیخود۔ حسرت)

سہا۔ آسی اور سعید:- میرا معشوق مجھ سے اتنا بدگمان ہے کہ گرم خرام ہونا بھی گوارا نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اپنے ہر قطرۂ عرق کو میرا دیدۂ حیران سمجھتا ہے۔

۵۔ اپنے عجز کو حُسن۔ خس کو رگِ نبض اور یار کی بدخوئی کو شعلہ سوزاں سے تشبیہ دی ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں نے اپنا عجز دیکھ کر یہ اندازہ کر لیا کہ معشوق یقیناً بدخو اور تندمزاج ہوگا۔ گویا میں نے تنکے کی نبض دیکھ کر تپشِ شعلہ معلوم کرلی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ اس کی بدخوئی کے مقابلہ میں میرا عجز میری ہلاکت اور تباہی کا باعث ہوگا۔ جب اپنے آپ کو تنکا سمجھے اور معشوق کو شعلہ سوزاں تو نتیجہ یقیناً یہی نکلا کہ معشوق کی آتشِ غضب انہیں اسی طرح جلاکر خاک کر دے گی۔ جس طرح شعلہ گھاس پھونس کو جلا دیتا ہے۔

۶۔ شبستان:- رات بسر ہونے کی جگہ، منزل۔

سفرِ عشق میں جب تھکان بڑھ گئی تو ضعف و کمزوری نے آرام کرنے پر مجبور کیا۔ چونکہ سفر عشق میں آرام کرنے کے لئے کوئی منزل تو ہوتی نہیں، اس لئے میں ہر قدم پر اپنے سایہ کو دیکھ کر یہی سمجھا کہ رات ہوگئی ہے اور منزل آگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انتہائی ناکامی اور مایوسی کے عالم میں انسان یاس اور ناامیدی ہی کو اپنا غمگسار اور مددگار سمجھتا ہے۔

۷۔ مژگانِ یار کو پیکانِ قضا قرار دیا ہے جس سے بچنا ناممکن ہے میرا دل مرتے دم تک مژگانِ یار سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن آخر نہ بچ سکا مژگانِ یار سے گریز کرنا میری نادانی تھی کیونکہ وہ تیرِ قضا تھا اور اس سے بچنا ناممکن تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ دل نے اس ناممکن کام کو اس قدر آسان سمجھ رکھا تھا اور مژگانِ یار کی زد سے بچنے کے لئے متواتر کوششیں کرتا تھا۔

۸۔ کافر میں ایہام ہے کہتے ہیں۔ اے اسدؔ! تم نے اس بیوفا کو وفادار سمجھ کر کیوں اپنا دل دے دیا۔ یہ تمھاری غلطی تھی کہ تم نے ایک کافر کو مسلمان سمجھ لیا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ وفاداری شرطِ اسلام ہے۔ تم نے اپنا دل اس کے حوالے کر دیا۔ یا یہ کہ اس کو وفادار سمجھنا ایسی ہی غلطی ہے جیسے کسی کافر کو مسلمان سمجھ لینا۔

۳۵

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ۱ دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۲ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی ۳ پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل ۴ نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی ۵ کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ۶ گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں ۷ دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال ۸ دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ۹ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

۱۔ دیدۂ تر:- چشم اشک آلود÷ تشنۂ فریاد آیا:- آرزو مند فریاد ہوا۔ آیا فارسی محاورے کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں مروّج نہیں۔

آج مجھے پھر اپنی چشم اشک آلود یاد آگئی اور نتیجہ کے طور پر میرا دل وجگر فریاد کا آرزو مند ہوگیا کہ پھر وہی گریہ وزاری کی لذت حاصل کرے (سعیدؔ حسرتؔ بیخودؔ)۔ بعض لوگ دیدۂ تر سے معشوق کی چشمِ تر مراد لیتے ہیں یعنی مجھے معشوق کی چشم تر یاد آئی اور اس کی وجہ سے میرا دل وجگر آرزو مند فریاد ہوا۔

طباطبائیؔ آسیؔ:- دل جگر تشنۂ فریاد ہوا تو مجھے دیدۂ تر یاد آگیا کہ یہ تشنگی رونے ہی سے بجھے گی۔

۲۔ دم لینا:- ٹھہرنا۔ سکون ہونا÷ قیامت:- اضطراب۔ بےچینی÷

حالیؔ:- دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی وقفہ ہوجاتا ہے۔ اس کو قیامت کے دم لینے

سے "تعبیر کیا ہے" مطلب یہ ہے کہ تیرے چلے جانے کے بعد ابھی میرا دل سکون پذیر نہ ہوا تھا کہ تیرا وقتِ سفر یاد آگیا اور پھر دل میں وہی طلاطم پیدا ہوگیا۔

۳۔ سادگی:- نادانی÷ تمنا:- آرزوئے وصل÷ نیرنگِ نظر:- محبوب پرفن پہلے مصرعہ میں دیکھو محذوف ہے۔

ذرا میری تمنا کی سادگی اور نادانی ملاحظہ ہو کہ مجھے پھر وہی محبوب پرفن یاد آرہا ہے۔ جس کی نیرنگ نظری نے میری زندگی تباہ کردی۔ سادگی یہی ہے کہ معلوم ہے اس سے تمنا پوری نہیں ہوسکتی۔ پھر بھی اس کی طرف ڈھلے جاتے ہیں۔

۴۔ وامندگی:- بےبسی، مجبوری "وامندگی" کے بعد "قبول کر" محذوف ہے۔

دل کی حسرت ہے کہ نالہ کیا جائے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ اے حسرتِ دل میری بےبسی اور مجبوری کا عذر قبول کر میں آہ و نالہ کرنے کے لئے آمادہ تھا مگر مجھے اپنا جگرِ خستہ یاد آگیا۔ کیونکہ اگر میں نالہ کرتا تو میرا جگر شق ہوجاتا اس لئے میں نے نالہ نہ کیا۔

۵۔ ہماری زندگی کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتی۔ ہمیں تیری رہ گزر بیکار یاد آئی۔ کیونکہ تیری رہگزر میں بھی کامگاری اور مرادمندی ممکن نہیں۔ اس لئے اس کا یاد آنا فضول ہے۔

آسیؔ وسعیدؔ:- تیرا رہگزر کیوں یاد آیا کہ اس کو یاد کرکے ہم مرگئے۔ طباطبائیؔ نے اس قدر اور لکھا ہے اور یہ بات اچھی ہوئی کہ میں زندگی سے بیزار تھا لیکن اس کے یاد آنے سے ایسا اندوہ وقلق ہوا۔ کاش کہ نہ یاد آیا ہوتا تو زندگی کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتی۔

۶۔ رضوان:- داروغہ بہشت÷ کیا ہی لڑائی ہوگی:- خوب لڑائی ہوگی÷ جب جنت میں مجھے تیرا گھر یاد آئے گا اور میں اس کی تعریف کرونگا تو رضواں کہے گا بہشت اچھی ہے۔ میں کہوں گا تیرا گھر بہتر ہے۔ اس ردوکد میں رضواں سے خوب لڑائی ہوگی۔

طباطبائیؔ نے دوسرے معنی یہ لکھے ہیں کہ میں خلد سے نکل کر یار کے گھر کی طرف جانا چاہوں گا اور رضوان مجھے روکے گا۔ اس طرح خوب لڑائی ہوگی (بیخودؔ)

۷۔ پہلے جس قدر فریاد کی جرأت میرے دل میں تھی۔ وہ اب نہیں رہی دل کی بےجرأتی اور کم طاقتی سے تنگ آکر میں اپنے جگر کو یاد کرتا ہوں۔ جس میں کبھی فریاد کرنے کی طاقت

دل سے بہت زیادہ تھی۔ لیکن افسوس کہ اب جگر میں بھی وہ طاقت فریاد نہیں رہی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر جگر سلامت ہوتا تو خوب نالے کرتا۔

۸۔ دل گم گشتہ:- کھویا ہوا دل ÷ مگر:- شاید ÷

میرا خیال مجھے پھر تیری گلی کی طرف لے جا رہا ہے۔ شاید وہ کھوئے ہوئے دل کو اُدھر ڈھونڈنے چلا ہے۔ کیونکہ تیرے کوچے ہی میں دل کے کھوئے جانے کا احتمال ہے۔

۹۔ حالی:- اس شعر سے جو معنی صادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔ کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے یعنی خوف معلوم ہوتا ہے مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی۔ مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

۱۰۔ عام طور پر دیوانوں کو بچے پتھر مارا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں بچپن میں میں نے مجنوں کو مارنے کے لئے پتھر اُٹھایا تھا کہ دفعتہً مجھے اپنا سر یاد آ گیا یعنی یہ خیال آیا کہ ممکن ہے کبھی میں بھی دیوانہ ہو جاؤں اور لڑکے مجھے پتھر ماریں اس لئے میں نے پتھر نہ مارا۔ طباطبائی اور آسی لکھتے ہیں۔ یہ سوچ کر پتھر اپنے ہی سر پر مار لیا۔ ظاہر ہے اس مفہوم میں لطف نہیں۔

۳۶

هوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا ۱ آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ ۲ اُس میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں! ۳ کبھی فتراک میں ترے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ۴ ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریٔ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا ۵ بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی ۶ گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا ۷ نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام ۸ ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی ۹ آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ۱۰ آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۱۔ عنان گیر:- روکنے والا ÷

یار کو آنے میں دیر ہوگئی ہے، کہتے ہیں کہ شاید آپ کو کسی (رقیب) نے روک لیا تھا۔ ورنہ دیر سے آنے کا کیا سبب ہے؟

۲۔ خوبیِ تقدیر:- مراد تقدیر کی بُرائی، بطور طنز کہا ہے۔

میری تباہی اور بربادی کے باعث تم نہیں ہو۔ میں تم سے یونہی اپنی تباہی کی شکایت کیا کرتا ہوں۔ اصل میں یہ خرابیاں کچھ میری تقدیر میں ہی لکھی تھیں۔

۳۔ فتراک:- شکار بند ÷ نخچیر:- شکار ÷

اگر تم مجھے بھول گئے ہو تو آؤ تمہیں اپنا اتا پتہ بتلا دوں۔ بھلا یاد کرو کبھی تم نے شکار کر کے اپنے شکار بن میں کچھ باندھا تھا۔ بس میں وہی شکار ہوں۔

۴۔ وحشی:- دیوانۂ محبت ÷

تیرے دیوانۂ الفت کو قید کی حالت میں بھی تیری زلف کی یاد ہر دم رہتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی یاد آیا کرتا ہے کہ کچھ تھوڑی سی تکلیف زنجیر کی گرانباری کی بھی تھی۔ یادِ زلف کے مقابلے میں قیدِ زنجیر کو حقیر ظاہر کیا ہے تاکہ زلف کی گرانباری ظاہر ہو۔

۵۔ لب تشنہ:- آرزو مند ÷

تم بجلی کی طرح میری آنکھوں کے سامنے آئے اور ایک دم چھپ گئے گویا میں اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکا۔ بھلا اس طرح سے میری کیا تسلی ہو سکتی ہے تمہیں چاہیئے تھا کہ اطمینان سے آتے۔ جی بھر کے درشن دیتے اور بات چیت کرتے

۶۔ یوسف:- یوسف اگرچہ حُسن میں بیمثال تھے لیکن بازار میں غلام ہو کر بکے تھے ÷ لائقِ تعزیر:- قابل سزا ÷

میں نے انہیں یوسف کہدیا یعنی غلام سے تشبیہ دے دی۔ لیکن خیریت یہ ہوئی کہ

اُنہوں نے کچھ نہ کہا۔ اگر وہ اس بات پر ناراض ہو جاتے تو بجا تھا اور حقیقتاً اس غلطی پر میں سزا پانے کے قابل تھا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اُس کا حُسن یوسف سے زیادہ ہے۔ یعنی میں نے اسے اس سے کمتر سے تشبیہ دی۔ اس لئے میں قابلِ سزا تھا۔

۷۔ غیر کو دیکھ کر میرا کلیجہ کیوں نہ ٹھنڈا ہو۔ کیونکہ ایک تو وہ نالہ و زاری کرتا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے نالوں میں اثر کا بھی طالب تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بھی میری طرح نامراد تھا۔ اگر وہ طالبِ تاثیر نہ ہوتا۔ تو اس کی مرادمندی ثابت تھی۔ جس سے مجھے تکلیف ہوتی۔

بیخود:- غیر کو دیکھ کر میرا کلیجہ ٹھنڈا کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ میں نالے کرتا تھا اور اپنے نالوں سے تاثیر کا طالب تھا۔ یعنی مجھ پر میرے نالوں کا کچھ اثر ظاہر نہ ہوا تھا۔ اب غیر کو بُری حالت میں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ میری ہی فریاد کا اثر ہے۔

۸۔ جواں میر:- جواں مرگ÷ آشفتہ سر:- عاشق، پریشان حال÷ نام رکھنا:- عیب رکھنا÷ پیشہ میں کوئی عیب نہیں ہے۔ الکاسب حبیب اللہ اس لئے یہ کہہ کر فرہاد پر نام نہ رکھیئے کہ کوہ کنی اس کا پیشہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ کام اس نے اپنے محبوب کی تمنا پوری کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ حقیقتاً وہ جوانمرگ بھی ہم جیسا عاشق پیشہ تھا۔ اس لئے اس کو ہم اپنی جماعت سے خارج نہیں کر سکتے (تمام متفق) بیخود لکھتے کہ ہم بھی عاشق پیشہ ہیں اور میر بھی عشق پیشہ تھا۔

۹۔ ہم مرنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ اگر یار نے ہم کو پاس آ کر قتل کرنا گوارا نہ کیا تو کیا مضائقہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے ترکش میں کوئی تیر بھی نہ تھا کہ ہمیں دُور ہی سے مار دیا ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر پاس آنے میں کسرِ شان تھی تو دُور سے تیر چلا کر قتل کرنے میں کیا پس و پیش تھی۔

۱۰۔ فرشتوں:- کراماً کاتبین جو انسان کے اعمال قلمبند کرتے ہیں۔

قاعدہ ہے جب تک فریقین حاضر نہ ہوں اس وقت تک کسی مقدمہ کا فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ لیکن غالبؔ کہتے ہیں۔ خدا کی عدالت کا قانون بھی عجیب ہے جو کچھ کراماً کاتبین لکھ دیتے ہیں وہی کافی سمجھا جاتا ہے اور فریقِ ثانی کی طرف سے صفائی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی مطلب یہ ہے کہ ہمیں سزا دینے کے لئے محض فرشتوں کی تحریر کافی نہیں ہے بلکہ ہمارا بھی کوئی وکیل یا گواہ وغیرہ ہونا

چاہیے اور ہمیں صفائی پیش کرنے کا موقعہ ملنا چاہیئے۔

۱۱۔ ریختہ:- اُردو کی شاعری÷ میر:- میرتقی میرؔ۔ اُردو شاعری کے مسلم الثبوت اُستاد۔ غالبؔ اُردو شاعری کے تم ہی اُستاد نہیں ہو۔ کہتے ہیں گلے زمانے میں کوئی میر بھی تھے جو اُردو شاعری کے اُستاد کہلاتے تھے۔ اپنے آپ کو میرؔ کا ہم پلہ بتانا چاہتے ہیں۔ طرزِ ادا خوب ہے۔

۳۷

لب خشک در تشنگی مردگاں کا ۱ زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ نا امیدی ہمہ بدگمانی ۲ میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا

۱۔ تشنگی:- شدتِ آرزو و شوق سے استعارہ ہے÷ در تشنگی مردگاں:- وہ لوگ جو آرزو و شوق میں مر گئے÷ مصرعہ اولیٰ "میں ہوں" محذوف ہے÷ لب خشک:- تشنہ آرزومند÷ دل آزردگان:- محروم القسمت، عشاق÷

میں ان لوگوں کا لب خشک ہوں جو آرزوئے تشنگی میں مر گئے اور میں ان لوگوں کی زیارت گاہ ہوں جو دل آزردہ اور محروم القسمت ہیں۔ مطلب یہ ہے میرا رتبہ ان سے بلند ہے۔ اس لئے ان لوگوں کی زیارت گاہ اور مقامِ آرزو ہوں۔

۲۔ ہمہ نا امیدی ہمہ بدگمانی:- سرتاسر نا اُمیدی اور بدگمانی کی تصویر÷ فریب وفا خوردگاں:- وفا کا فریب کھائے ہوئے لوگ÷ میں دل ہوں:- سراپا بدگمانی بن گیا ہوں۔

۳۸

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا ۱ اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے ۲ خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے ۳ آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ۴ میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں ۵ یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک ۶ میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مرے تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

۱۔ اے ستمگر تو آج تک کسی کا دوست نہیں بنا۔ تیرا ظلم صرف مجھ تک محدود نہیں' تو نے اوروں پر اتنے زیادہ ظلم کئے ہیں جو مجھ پر نہیں کئے۔ دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ میں سمجھتا تھا کہ تو صرف مجھ پر ہی ظلم کرتا ہے اور رقیب ان سے محروم ہیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ تو نے رقیبوں پر نئی نئی قسم کے زیادہ ظلم کئے اور مجھے ان سے محروم رکھا۔ رشک کا بالکل نیا ڈھنگ ہے۔ شرکتِ غیر ظلم میں بھی گوارا نہیں۔ یہ مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے کہ مجھ پر ظلم نہ کرنا بر بنائے دوستی نہیں ہے بلکہ غیریت کا سبب ہے۔

۲۔ مہ نخشب:- مصنوعی چاند جسے حکیم ابن عطار (مقنع) نے چند دواؤں سے تیار کیا تھا۔ وہ چاند چاہِ نخشب سے نکلتا تھا۔ اس کی روشنی چار فرسنگ سے زیادہ دُور نہ جاتی تھی۔ وہ اصلی چاند سے کم روشن تھا۔ آخرکار دو مہینے بعد شق ہوگیا÷ برابر نہ ہوا:- ناقص رہا÷ اس کے:- معشوق کے

ہنوز خورشید میرے محبوب کے حسن و جمال کے برابر نہ ہوا تھا۔ یعنی ماہِ نخشب کی طرح ادھورا تھا اور ناقص تھا کہ دستِ قدرت نے اسے اس طرح چھوڑ دیا۔ جس طرح حکیم ابنِ عطار نے ماہِ نخشب کو ناقص دیکھ کر ترک کر دیا تھا مطلب یہ ہے کہ سورج حسنِ معشوق کے مقابلے میں ناقص ہے۔

۳۔ حالی:- دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے۔ اسی کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے۔ اگر اس کی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا۔ موتی بننے پر قانع ہوجاتی تو اس کو جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا (یادگارِ غالب) بلکہ وہ کانوں یا گلے ہی تک پہنچ کر رہ جاتا۔

۴۔ قامت کو قیامت سے تشبیہ دی ہے۔ جب تک میں نے قدِ یار کو نہ دیکھا تھا۔ میں قیامت کا معتقد نہ ہوا تھا لیکن جب سے میں نے قدِ یار کو دیکھا ہے مجھے قیامت پر یقین ہوگیا ہے۔ گویا یار کی محشر خرامی سے مجھے فتنۂ قیامت کا اندازہ ہوگیا ہے۔

۵۔ میری سادہ دلی ملاحظہ فرمایئے کہ میں یار کے رنجیدہ ہوجانے سے خوش ہوں۔ کیونکہ اس حالت میں مجھے سبقِ شوق دہرانے کا مزید موقع ملتا ہے مطلب یہ ہے اگر یار رنجیدہ نہ ہوتا تو مجھے اظہارِ شوق کا مزید موقع نہ ملتا۔ محبت و عشق کے گلے شکووں میں جو لطف ہے۔ اہل دل اس سے

اچھی طرح واقف ہیں اسی لئے شاعر اس موقع پر بھی خوش ہے۔

۶۔ دریائے معاصی:- گناہوں کا دریا÷ تنک آبی:- پانی کم ہونا÷ تر دامن:- گناہگار÷
حالی:- ''گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اتنا فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہوگیا۔ مگر ابھی ہمارے دامن کا پلہ تک نہیں بھیگا''۔

مطلب یہ ہے کہ میں نے اتنے زیادہ گناہ کئے کہ گناہ ختم ہوگئے۔ لیکن پھر بھی میرا دل سیر نہیں ہوا۔

۷۔ سمندر:- ایک کیڑا ہے' اگر آگ بہت مدت تک روشن رہے تو اُس میں پیدا ہوجاتا ہے اور آگ سے باہر نکلتے ہی مرجاتا ہے۔ اپنا سمندر سے اور داغ کا آتشکدہ سے مقابلہ کرکے داغ کو ترجیح دی ہے۔

اے اسدؔ! میں داغِ جگر سے اس وقت سے تحصیل (آتش مزاجی) کر رہا ہوں۔ جبکہ آتشکدہ میں جہاں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے' سمندر پیدا بھی نہ ہوا تھا۔

۳۹

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا ۱ رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا ۲ کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو ۳ دل بدل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا
کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں ۴ جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

۱۔ مجلس افروز:- رونقِ محفل ÷ ناموس:- شرم و حیا' عصمت ÷ رشتۂ شمع:- وہ تاگا جو شمع میں ہوتا ہے۔ بتی÷ کسوت:- لباس ÷ فانوس:- فانوس کے ڈھانچہ پر کپڑا چڑھا دیتے ہیں÷ خار در پیراہن:- فارسی محاورہ ہے÷

رات کو جس وقت محبوب محفلِ راز میں بزم افروز تھا تو اس کے سامنے شمعیں اس قدر بے چین تھیں کہ معلوم ہوتا تھا۔ ان کے تاگے (بتیاں) کسوت فانوس میں خار پیراہن کی طرح چُبھ رہے ہیں مطلب یہ ہے کہ محفلِ ناموس میں شمع کی موجودگی بھی ناموس کے منافی تھی۔ اس لئے وہ خود بے چین ہوئی جاتی تھی

۲۔ مشہد:- شہادت گاہ÷ ہلاکِ حسرت پابوس:- پابوسی کی حالت میں مرگیا÷ کوسوں تک:- دُور دُور تک÷

جس جگہ عاشق شہید ہوا ہے وہاں دُور دُور تک مہندی اُگ آئی ہے۔ مہندی کے اُگنے سے ظاہر ہے کہ اسکی پابوسی کی کس قدر حسرت تھی۔ اس میں رمز یہ ہے کہ اگر جیتے جی پابوسی کی آرزو پُوری نہ ہوئی تو شاید اس طرح پُوری ہو جائے کہ یہ حنا محبوب اپنے پاؤں میں لگا لے۔

۳۔ حاصلِ اُلفت:- نتیجہ محبت ÷ شکستِ آرزو:- آرزو کا خون ہونا۔ دل بدل پیوستہ:- دل سے دل ملنا÷

ہم نے محبت کا نتیجہ سوائے آرزوؤں کے خون ہونے کے کچھ اور نہ دیکھا۔ عاشق و معشوق دونوں کے دل مل کر لبِ افسوس کی صورت پیدا کر دیتے ہیں جن سے ہمیشہ افسوس ہی کا اظہار ہوتا ہے۔

۴۔ بے منت:- بغیر احسان ÷ کیموس:- غذا ہضم ہونے اور خون بننے سے پہلے طبخِ اوّل میں کیلوس کی شکل اختیار کرتی ہے اور آش بن جاتی ہے۔ اس کے بعد طبخِ دوم میں کیموس کی صورت پاکر پانی کی مانند بنجاتی ہے اور خون کی شکل اختیار کرتی ہے۔

میں اپنی بیماریٔ غم کی فارغ البالی کا حال کیا بیان کروں۔ میں جو کچھ کھاتا ہوں وہ بجائے اس کے کہ پہلے کیلوس بنے اور پھر کیموس بن کر خون بنے فوراً خون بن جاتی ہے۔ گویا میں غذا نہیں کھاتا بلکہ خونِ دل پیتا ہوں۔

۴۰

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے ۱ صاحب کو دل نہ دینے میں کتنا غرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے ۲ اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

۱۔ اپنا سا منہ لے کے رہ جانا:- شرمندہ ہونا÷ دل نہ دینا:- عاشق نہ ہونا۔
معشوق سے کہتے ہیں۔ آپ بہت غرور سے کہا کرتے تھے کہ ہم کسی پر عاشق نہیں ہو سکتے۔ لیکن اب وہ غرور کہاں گیا۔ آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر اپنے آپ ہی پر عاشق ہوگئے۔ گویا وہ غرور کس آسانی سے ٹوٹ گیا۔

۲۔ گردن مارنا:- قتل کرنا:-
رشک کی یہ انتہا ہے کہ عاشق معشوق کے ہاتھوں کسی کو قتل ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے کہتا ہے کہ آپ قاصد کو اپنے ہاتھ سے قتل نہ کریں۔ یہ میرا قصور تھا کہ میں نے اس کے ہاتھ تمہیں خط بھیجا۔ اس لئے مجھے قتل کیجئے۔

۴۱

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا ۱ جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے ۲ ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں ۳ شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے ۴ یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن ۵ غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار ۶ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں ۷ حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

۱۔ عرضِ نیازِ عشق:- عشق کی نیازمندی (احتیاج و عاجزی) کا اظہار÷ ناز تھا:- میرا دعویٰ نیازمندی و ناز برادری÷
ہجر و بیوفائی کے صدموں سے میرا دل اس قابل نہیں رہا کہ وہ عشق سے نیاز مندی کا دعویٰ کر سکے۔ حق یہ ہے کہ جس دل پر مجھ کو عاجزی اور نیاز مندی کی وجہ سے فخر حاصل تھا وہ دل نہیں رہا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم عشق کے قابل نہیں رہے کیونکہ اب ہم سے ناز برداریاں نہیں ہو سکتیں۔
۲۔ داغ:- افسوس' آرزو÷ حسرت:- آرزو÷ شمعِ کشتہ:- بجھی ہوئی شمع ÷ درخورِ محفل:- محفل کے لائق۔ محفل کا ہستی سے استعارہ ہے۔
میں دنیا سے جاتا ہوں اور حسرتِ ہستی کا داغ میرے دل پر ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ میں

ایک ایسی بجھی ہوئی شمع ہوں جو بجھنے کے بعد محفل میں رکھنے کے قابل نہیں رہی اور داغ محفل اپنے ساتھ ہی لے گئی۔ لطف یہ ہے کہ شمع جب بجھ جاتی ہے تو اس کی بتی دیر تک چمکتی رہتی ہے۔ اس کیفیت کو داغ حسرت سے تمثیل دی ہے نیز یہ خوبی بھی ہے کہ شمع کشتہ کو محفل سے اور مژدے کو بزمِ ہستی سے اُٹھا دیتے ہیں اور دونوں داغ حسرت وہستی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

۳۔ اور ہی:- کوئی دوسری ÷ شایان :- قابل ÷ قاتل:- مراد محبوب ÷

میری حالت اب ایسی خراب ہوگئی ہے کہ وہ مجھے صیدِ زبوں خیال کرے گا اور کسی صورت سے قتل کرنا پسند نہ کرے گا۔ اس لئے اے دل اب مرنے کی کوئی دوسری تدبیر کرنی چاہئے۔ آسی لکھتے ہیں کہ شاعر نے گراں جانی کا اظہار کیا ہے اس خیال کی تائید شایانِ دست و بازوئے قاتل" سے ہوتی ہے نظیری ۔

آں شکارم من کہ ہم لائق بہ کشتم نیستم   شرم می آید مرازان کس کہ صیادمن است

۴۔ برروئے شش جہت:- سارے زمانے کے لئے شش جہت یعنی زمین آسمان اور شمال وجنوب ومشرق ومغرب÷ یاں:- مراد خانہ آئینہ÷ ناقص و کامل:- عارف و عامی÷

دُنیا ایک آئینہ خانہ ہے اور عارف و عامی دونوں اس آئینہ خانہ میں حیران ہیں۔ یعنی اسرارِ قدرت کسی کی سمجھ میں نہیں آتے (آسی وطباطبائی)

۲۔ جس طرح آئینہ قبولِ عکس میں ناقص و کامل کا کچھ امتیاز نہیں کرتا۔ بلکہ ہر چیز کا عکس قبول کرلیتا ہے۔ اسی طرح زمانہ بھی جو مثال آئینہ خانہ ہے ناقص و کامل کا عکس دکھانے میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ گویا سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتا ہے (سعید) طباطبائی اور بیخود شش جہت سے عارف کا دل روشن مراد لیکر کہتے ہیں کہ دل عارف پر اچھی بُری دونوں کیفیتیں پرتو فگن ہوتی ہیں۔

۵۔ واکر دیئے:- کھول دیئے۔ میرے جذب شوق نے حسن کو بالکل بے نقاب کردیا ہے۔ سب پردے اُٹھ گئے ہیں۔ صرف ایک نگاہ کا پردہ رہ گیا ہے۔ یعنی حسن بے پروا ہے۔ لیکن ہماری نگاہ ہی نہیں دیکھ سکتی۔ گویا اس کے حسن کا جلوہ ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ ہاں چشم دل اگر وا ہو جائے تو اُس کا نظارہ ممکن ہے۔

۶۔ رہین ستم:- مبتلائے مصائب۔ اگر چہ میں ہمیشہ مصائب دُنیا میں مبتلا رہا۔ لیکن پھر

میں تجھے کبھی نہیں بھولا۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیاوی تفکرات سے ہمارے جذبۂ عشق میں کمی نہیں ہوئی۔

۷۔ ہوائے کشتِ وفا:- وفا کی آرزو÷ واں :- کشت وفا میں ÷ حاصل:- پہلے کے معنی نتیجہ اور دوسرے کے معنی پائی ہوئی چیز۔

میرے دل میں سے آرزوئے وفا ہی مٹ گئی۔ کیونکہ وفا کا نتیجہ سوائے حسرت کے کچھ اور حاصل نہ ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ حسرت ہی حاصل وفا ہے اس لئے وفا کی آرزو بھی جاتی رہی۔

۸۔ میں ان تکلیفوں سے نہیں ڈرتا جو عشق میں اُٹھانی پڑتی ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ دل جو مظالمِ عشق برداشت کیا کرتا تھا نہیں رہا۔ لہذا جب مصائبِ عشق برداشت کرنے والا دل نہیں رہا تو اب عشق کے ظلم وستم کون اُٹھائے۔

۴۲

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف ۱ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے ۲ گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلا آشنا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز ۳ ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہئے ۴ میرا زانومونس اور آئینہ تیرا آشنا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے ۵ عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

کوہکن نقاش یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ!
سنگ سے سرمار کر ہووے نہ پیدا آشنا

۱۔ جب میں اس کو غیر سے محبت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو رشک کی وجہ سے مجھے افسوس ہوتا ہے لیکن عقل کہتی ہے کہ یہ رشک و افسوس فضول ہے۔ بھلا وہ بے مہر کسی کا دوست بھی ہوسکتا ہے۔ جس طرح تیرے ساتھ اُس نے بے وفائی کی ہے اُسی طرح غیر کے ساتھ بھی کرے گا۔ اس کی یہ محبت و اخلاص ظاہری ہے۔ کیونکہ قدرت نے محبت کا مادہ اس کی طبیعت میں ودیعت ہی نہیں رکھا۔

۲۔ میخانۂ نیرنگ:- میخانہ طلسم مراد انقلاب و گردش ایّام÷ گردش:- آوارگی÷ چشمک:- اشارۂ چشم÷

جس طرح گردش و آوارگی مجنوں چشم لیلیٰ کے اشاروں کی پابند تھی، بالکل اسی طرح دُنیا کا ہر ذرہ ساغر میخانہ نیرنگ ہے اور نیرنگیِ عالم کا پابند محض آسی کو اس سے اختلاف ہے لکھتے ہیں:۔ دُنیا کا ذرہ ذرہ بوقلمونی اور دگرگونی کے میخانے کا ایک ساغر ہے جو انسان کو بے خود و حیران بنا دیتا ہے جو گردشِ مجنوں کے لئے گردش (تکلیف دہ) ہے۔ وہی گردش لیلیٰ کی آنکھوں میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور اُن کو پیاری ہے۔

۳۔ شوق:۔عشق÷ سامان طراز:۔ سامان مہیا کرنے والا÷ نازش:۔ فخر و ناز:÷ اربابِ عجز:۔ عشاق÷ دستگاہ:۔ قابلیت، وسعت÷

عشاق جن کا پیشہ عجز و انکساری ہے اور جو اپنی انکساری کی وجہ سے ذرہ اور قطرہ سے مشابہ ہیں۔عشق ہی ان کے لئے سرمایۂ نازش و فخر ہے یا ان کے لئے نازش کا سامان عشق ہی مہیا کرتا ہے، کیونکہ عشق ہی کی بدولت ذرّہ میں صحرا کی وسعت اور قطرہ میں دریا کی قابلیّت پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ شکوہ سنج:۔ شاکی÷ ہمدیگر:۔ ایک دوسرے کا

بدگمانی کی وجہ سے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی شکایت نہیں کرنی چاہیئے اس میں بات ہی کونسی ہے۔ زانو میرا ہمدم و مونس ہے۔یعنی ادھر میں تیرے خیال میں ہر وقت سر بزانو رہتا ہوں اور ادھر تیرا رفیق و آشنا آئینہ ہے یعنی تو ہمیشہ زانو پر آئینہ رکھ کر اپنے تئیں دیکھنے میں مصروف رہتا ہے لہٰذا دونوں کی حالت ایک جیسی ہے۔ پھر شکایت کیسی؟ شعرا آئینہ کو زانو سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔

۵۔ میں ہوں اور میرے پہلو میں ایک وحشی دل ہے جو آفت کا پرکالہ ہے یہ سلامتی (عافیت) کا دشمن اور آوارگی کا دوست ہے۔ اس لئے مجھ پر جو بھی آفت آئے وہ کم ہے۔ آفت کا ٹکڑا محاورہ ہے۔

۶۔ کوہکن:۔ فرہاد÷ تمثالِ شیریں:۔ شیریں کی تصویر÷

اے اسد:۔ فرہاد تو محض شیریں کی تصویر بنانے والا سنگتراش تھا۔ گویا عاشق صادق نہ تھا۔ اگر وہ عاشق صادق ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ پتھر سے سر مارتا اور محبوب پیدا نہ ہو جاتا۔

بیخود و سعید کا خیال ہے کہ بھلا کہیں پتھر سے سر پھوڑنے سے معشوق پیدا ہوتے ہیں۔

۴۳

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ۱ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر یارب ۲ آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے، ۳ عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے ۴ بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلاؤں ۵ انگلیاں نگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا ۶ ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی کرلیا ہے دشمن کو ۷ دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

۱۔ ایک تو اُس حسنِ مجسم کا ذکر اور اس پر میری رنگیں بیانی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا رازداں ہی ہمارا رقیب بن گیا (سب شارحین متفق)

آسی:۔ ہمارا رازداں ہمارا رقیب ہوگیا کہ ہمارے معشوق کا ذکر اپنی زبان سے کرتا ہے یعنی ہم کو اتنا رشک ہے کہ اُس کا ذکر اور اس کا نام کسی اور کی زبان سے سننا نہیں چاہتے۔

۲۔ اس شعر میں افسوس اور شکایت کا اظہار ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب نے بزمِ غیر میں حد سے زیادہ شراب اس لئے پی ہے کہ اس کو یہ اندازہ لگانا مقصود تھا کہ وہ کتنی شراب پی سکتا ہے۔ پھر بطرزِ افسوس کہتے ہیں کہ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس کو بزمِ غیر میں آج اپنی عالی ظرفی کا امتحان لینے کی سُوجھی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ امتحانِ مے نوشی بجائے بزمِ غیر کے مری مجلس میں ہوتا تو کیا لطف ہوتا۔

طباطبائی لکھتے ہیں، پی گئے کے مقام پر مصنف نے پیے باندھا ہے جس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ بھلا بزمِ غیر میں وہ کیوں بہت سی شراب پیتے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ آج میرے گھر میں آئے تو بہت سی شراب پی گئے۔

۳۔ اس وقت ہمارا مکان عرش پر واقع ہے اور عرش سے زیادہ بلند کوئی اور مقام نہیں۔ اے کاش ہمارا مکان عرش سے نیچے ہوتا' پھر ہم عرش کو اپنا منظر بنالیتے اور اس کی اچھی طرح سیر کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی حقیقت و ماہیت سے بے خبر ہیں' یا یوں سمجھئے کہ ہم اور آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ لیکن عرش پر مکان ہونے سے یہ آرزو پوری نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ عرش عالمِ بالا کی آخری حد ہے۔

۴۔ حالؔی:- یعنی خوب ہی ہؤا کہ معشوق کے در کا پاسباں ہمارا جانا پہچانا نکلا۔ اب ہمارے لئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلّت دے۔ ہم اس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں اور یہ ظاہر کرتے رہیں گے کہ یہ ہمارا قدیم آشنا ہے اور ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔

۵۔ میں اپنے درد دل کا حال کب تک لکھے جاؤں' داستانِ دردِ دل لکھتے لکھتے میری انگلیاں زخمی ہوگئی ہیں اور قلم سے خون ٹپکنے لگا ہے اس لئے اب لکھا نہیں جاتا۔ لہذا مناسب ہے کہ میں خود ان کے پاس جاؤں اور اپنی حالت دکھاؤں۔ اس طرح سے وہ میری حالت کو سمجھ جائیں گے۔ یادر ہے خامہ خونچکانی اور مضمون خونچکاں انگلیوں کے فگار ہونے کے سبب سے ہے۔

۶۔ عبث:- فضول' ننگ' شرم ÷

اس شرم کی وجہ سے کہ مجھ جیسے ننگِ خلق نے آپ کو سنگِ آستاں پر سجدے کئے ہیں۔ آپ نے اپنے سنگِ آستاں کو فضول تبدیل کیا۔ کیونکہ وہ پتھر تو میرے ننگِ سجدہ سے گھستے گھستے خود بخود مِٹ جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس قدر سجدے کرتا کہ پتھر گھس جاتا۔ اس لئے اُسے تبدیل کرنے کی تکلیف آپ نے برداشت کی۔

۷۔ غمّازی:- چغلی۔ سخن چینی ÷

اس خیال کے ماتحت کہ رقیب یار کے سامنے جاکر میری یہ چغلی نہ کھائے کہ لیجئے وہ بھی آپ کی شکایت کر رہا تھا۔ میں نے یار کی شکایت میں اسے اپنا ہمزبان کرلیا ہے۔ اس طریق کار سے مطلب یہ ہے کہ اب وہ یار کے سامنے میری غمّازی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ایسی صورت میں اس پر بھی برابر کا الزام عائد ہوتا ہے۔

۸۔ حالؔی:- آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں۔ اور اپنی دانائی اور ہنرمندی

کس خوبصورتی سے ثابت کی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آسمان اس شخص کا دشمن ہوتا ہے جو دانا اور ہنرمند ہو۔ پس چونکہ غالبؔ نے آسمان کو اپنا دشمن بتلایا ہے۔ اس لئے ایک طریقے سے اپنے آپ کو دانا اور ہنرمند جتلاتا ہے۔

۴۴

سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے ۱ کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم ۲ تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

۱۔ میں وہ سُرمہ ہوں جس کی کوئی قیمت نہیں اور اگر اس کی کچھ قیمت ہے تو محض یہ ہے کہ چشمِ خریدار پر میرا احسان رہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے کلام کی کوئی قیمت نہیں اور باوجود اس بے قیمتی کے اس کا فیض عام ہے یعنی ہر شخص اس سے بصیرت حاصل کرسکتا ہے۔

۲۔ اے دوست مجھے عشق میں رونے کی اجازت دیدے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے غمِ پنہاں کا اثر تیرے چہرے پر نمایاں نہ ہوجائے یعنی میری پریشانی تیری پشیمانی کا موجب ہو۔ مطلب یہ ہے کہ رونے سے میرے دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ پھر میری بے چینی کا اثر تجھ پر نہیں پڑے گا۔

۴۵

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں ۱ بے شانۂ صبا نہیں طرّۂ گیاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ ۲ صیدِ ز دام جستہ ہے اس دامگاہ کا
رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے ۳ شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے ۴ پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا
جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

۱۔ غافل:- انسانِ غافل ÷ خود آرا:- نازاں ÷ شانہ:- کنگھی ÷ طرّۂ گیاہ:- گھاس ÷

غافل انسان اپنی کاروائی پر نازاں ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کا ہر اچھا فعل اس کی عقل و تدبیر کا نتیجہ ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں ایک طرّۂ گیاہ (گھاس کا تنکا) بھی ایسا نہیں ہے

جس کو صبا بناتی سنوارتی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ بغیر حکمِ الٰہی کے پتا بھی نہیں ہلتا اور جو کچھ ہوتا ہے وہ اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ لیکن انسان غفلت کی بدولت اس کو اپنی حسنِ تدبیر کا نتیجہ خیال کرتا ہے۔ لطفِ الٰہی کو بادِ صبا سے تشبیہ دی ہے۔

۲۔ بزمِ قدح:- بزمِ شراب ÷ رنگ:- عیش عشرت ÷ صیدے ز دام جستہ:- وہ شکار جو جال میں سے نکل بھاگا ÷ دام گاہ:- شکارگاہ ÷

بزمِ مے نوشی سے عیش و عشرت کی تمنا نہ رکھنی چاہیئے کیونکہ عیش ایک ایسا شکار ہے جو اس دام گاہ (محفلِ عیش) سے نکل کر بھاگا ہے اور بھاگنے کا سبب یہ ہے کہ اُس نے محفلِ شراب میں رہنا یا شریں تکلیف خیال کیا ہے اور (بھاگنے کا سبب یہ ہے کہ عمالِ عشرت کو ثبات نہیں۔ اس لئے اس کی تمنا نہیں رکھنی چاہیئے۔

۳۔ کیا بعید ہے:- کیا تعجب ہے ÷

میں اپنے گناہوں کی وجہ سے اس قدر شرمندہ ہوں کہ عذرِ گناہ کی بھی جسارت نہیں کر سکتا۔ کیا عجب ہے کہ رحمتِ کریم اس شرمندگی کو عذرِ گناہ کے عوض قبول کر لے اور میرے گناہ معاف کر دے۔ یعنی اس کی رحمت سے میری شرمندگی ہی عذرِ گناہ ہو جائے۔

۴۔ زخم کو گل سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں میں شوقِ شہادت میں مقتل کی طرف کس طرح خوش خوش چلا ہوں۔ میری نگاہ کا دامن گلہائے زخم سے بھرا ہوا ہے یعنی شوقِ شہادت میں میری نگاہوں کو زخم بھی پھول دکھائی دیتے ہیں۔

۵۔ ہوا:- خواہش ÷ نگہِ گرم:- محبت آمیز نظر ÷ پروانہ:- پتنگا ÷ داد خواہ:- فریادی یعنی اسدؔ ÷

اے محبوب! اسدؔ کی جان تیری ایک نگاہِ کرم کی آرزو مند ہے اور تیرے اس فریادی (اسدؔ) کا وکیل پروانہ بنا ہے۔ یعنی جس طرح پروانہ شمع کی ایک نگاہِ کرم سے جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اسدؔ بھی تیری نگاہِ کرم سے جل جانے کا آرزو مند ہے۔ پروانے کو وکیل اس لئے بنایا ہے۔ کہ شمع کا عاشق ہے اور جل کر جان دے دیتا ہے

۳۶

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا ۱ کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ۲ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ ۳ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ ۴ یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے ۵ آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ ۶ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

۱۔ خیال یہ ہے کہ اگر معشوق چاہے کہ ظلم سے باز آ جائے تو وہ باز نہیں آ سکتا۔ معشوق کہتا ہے کہ اس نے ظلم کرنا ترک کر دیا لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ ظلم سے ہرگز باز نہیں آیا۔ پہلے اور ظلم تھے۔ اب یہ ظلم ہے کہ وہ مجھے اس شرم سے منہ ہی نہیں دکھاتا کہ میں نے تجھ پر بہت ظلم کئے ہیں۔ ظاہر ہے عاشق کے لئے یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ معشوق اسے اپنی شکل نہ دکھائے اس سلوک سے ثابت ہے کہ باوجود توبہ کے وہ ظلم سے باز نہیں آیا۔

۲۔ رات دن ساتوں آسمان گردش میں ہیں اور ان کی گردش سے ہمیشہ انقلاب ہوتا رہتا ہے۔ جب خود بخود حالات بدلتے جاتے ہیں تو ہمیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی گردشِ آسمانی میں ہمارے حالات بھی تبدیل ہو جائیں گے۔ ہمیں فکر و تردد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ مطلب یہ ہے کہ شاکر رہو جو بہتر ہوگا وہی ہوگا۔

۳۔ حالی:- لاگ: دشمنی اور لگاؤ: محبت' یہ مضمون عجیب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو' مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا' اگر باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ باندھا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے اور نہ دوستی۔ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لئے کہ اس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ہم اس کو دوستی سمجھتے۔ لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں

جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو دوچند کر دیا۔

۴۔ ہم نے نامہ بر کو خط دیا کہ یار کو پہنچا دے لیکن پتہ نہیں ہمیں کیا ہو گیا کہ ہم بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اپنی اس محویت پر دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنا ہی تو خط ہے۔ کیا ہم اسے خود ہی پہنچائیں گے۔ یہ تو معیوب سی بات ہے۔ لطفِ بیان تعریف سے بالا ہے۔ رشک و جنون و محویت کا اظہار کیا ہے۔

۵۔ چاہے ہمارے سر سے خون کا دریا کیوں نہ بہہ جائے یعنی ہمیں قتل ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔ ہم آستانِ یار پر سے ہرگز نہ اُٹھیں گے۔ دوسرے مصرعہ میں کیا تحقیر کے لئے لائے ہیں۔ یعنی کیا ہم مرنے سے ڈر کر آستانِ یار سے اُٹھ جائیں۔

۶۔ حالی:- دکھلائیں کیا کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے۔ کہتا ہے۔ عمر بھر تو موت کا انتظار کرتا رہا کہ مرجانے پر کچھ راحت مل جائے گی۔ اب تو مر گئے ہیں۔ دیکھئے خدا کیا دکھاتے ہیں' خوشی ملے گی یا وہی رنج کا رنج۔ آسی لکھتے ہیں۔ تمام عمر ہم نے مرنے کی راہ دیکھی۔ اب دیکھئے مرنے کے بعد ہم کیا رنگ دکھلاتے ہیں۔

۷۔ ہم نے اپنی تمام عمر تو ان کے عشق میں گنوا دی' تعجب ہے کہ ان کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ غالب کون ہے۔ اب کوئی ہمیں یہ بتلائے کہ ان کے اس سوال کا ہم کیا جواب دیں۔

نعمت خان عالی ۔

زمردم یاری پرسد کہ عالی کیست طالع بین
کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

۴۷

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی ۱ چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل ۲ جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

۱۔ لطافت:- نزاہت۔ مجردات ÷ کثافت:- مادیت ÷

قاعدہ ہے کہ لطافت بغیر کثافت کے جلوہ گر نہیں ہوتی۔ یعنی مجردات بغیر مادہ کی آمیزش کے ظاہر نہیں ہوتے۔ مثلاً بادی لطافت ہے۔ اس لئے اس کا جلوہ بھی چمن ہی کے ذریعہ سے نمودار

ہوا۔ کہتا ہے چمن اپنی سبزی کی وجہ سے آئینہ بادِ بہاری کا زنگار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چمن کی کثافت (زنگارِ چمن) کے بغیر لطافت بادِ بہار جلوہ گر نہیں ہو سکی۔ مطلب یہ ہے لطافت و کثافت لازم و ملزوم ہیں۔

۲۔ حریف:- مدِ مقابل ÷ جوششِ دریا:- طغیانی ÷

یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ چل سکتا۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔ اپنے آپ کو ساحل اور ساقی کو جوششِ دریا سے تشبیہ دی ہے ÷

۴۸

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ۱ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد ۲ تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام ۳ مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ ۴ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدّل بدمِ سرد ہوا ۵ باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال ۶ ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا ۷ روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس ۸ کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تا کہ تجھ پہ کھلے اعجازِ ہوائے صیقل ۹ دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب ۱۰ چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

۱۔ قطرہ جب دریا میں جاملتا ہے بظاہر فنا ہو جاتا ہے لیکن حقیقتاً اس کی موت واقع نہیں ہوتی بلکہ وہ مبداء سے جاملتا ہے اور یہی قطرہ کے لیے باعثِ مسرت ہے۔ اسی طرح جب درد حد سے گزر جاتا ہے تو مریض کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ فنا ہو کر مریض کے سب دُکھ دور ہو جاتے ہیں اور وہ بھی اپنے مبداء حقیقی سے جاملتا ہے گویا درد کا حد سے گزرنا ہی اس کے لیے دوا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فنا ہستی کا عین مقصود ہے۔

۲۔ قفل ابجد:۔ ایک قسم کا قفل ہے جس پر بہت سے حروف کندہ ہوتے ہیں۔ قفل بنانے والا ایک لفظ مقرر کر دیتا ہے۔ جب ان حروف کی ترتیب سے وہ لفظ بنتا ہے تو قفل فوراً کھل جاتا ہے۔

غالبؔ نے اپنی قسمت کو اسی قسم کے قفل سے تشبیہ دی ہے۔ کہتا ہے کہ میری قسمت میں یہ لکھا تھا کہ جب قفل ابجد کی طرح بات بن جائے یعنی تجھ سے ملاقات کی تدبیر بن پڑے تو مجھ سے تو فوراً جدا ہو جائے۔

۳۔ چارۂ زحمت:۔ تکلیف کو دور کرنے کی تدبیر÷ تمام ہوا:۔ فنا ہوا÷ عقدہ:۔ گرہ۔ دل کو عقدہ سے تشبیہ دی ہے۔

میرا دل معالجہ کی کشمکش اور علاج کی کوششوں ہی میں تمام ہو گیا۔ گویا میرا دل ایک عقدہ (گرہ) تھا۔ جو کھولنے کی کوشش میں گھس گھس کر رہ گیا اور اس کا کھولنا ناممکن ہو گیا۔ جب گرہ کھولنے کی زیادہ کوشش کی جائے تو وہ اور بھی سخت ہو جاتی ہے اور اکثر اوقات نہ گرہ باقی رہتی ہے نہ ڈورا۔ بس یہی کیفیت عاشق کے عقدۂ دل کی کشائش کی کشمکش میں ہوتی ہے۔

۴۔ اربابِ وفا:۔ عشاق÷ اللہ اللہ:۔ کلمۂ تعجب۔

اللہ اللہ آپ کو اپنے عاشقوں سے کس قدر نفرت ہوئی ہے کہ اب آپ ان پر جفا کرنی بھی گوارا نہیں کرتے۔ پہلے مصرعہ سے دو مفہوم پیدا ہوتے ہیں (۱) پہلے جفا کرتا تھا لیکن اس نے جب دیکھا کہ اسکی جفائیں بھی ہمیں عزیز ہیں تو جفا بھی ترک کر دی (۲) ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم پر عنایات صرف کی جاتی تھیں اور اب یہ حال ہے کہ ہم جفا سے بھی محروم ہیں۔

۵۔ باور آیا:۔ یقین آیا÷ پانی کا ہوا ہو جانا:۔ اس عمل کو مسئلہ استحالہ عناصر کہتے ہیں۔

اب تک ہم مسئلہ استحالہ عناصر کے قائل نہ تھے گویا یہ نہ مانتے تھے کہ پانی بھی ہوا بن جاتا ہے یعنی ایک عنصر دوسرے عنصر میں تبدیل ہو جاتا ہے مگر اب یہ مسئلہ ہماری سمجھ میں آ گیا۔ کیونکہ ہم نے اس کو عملی طور پر دیکھ لیا۔ وہ اس طرح سے کہ جب ہم میں طاقت تھی تو ہم گریہ کیا کرتے تھے لیکن اب ضعف اسقدر بڑھ گیا ہے کہ گریہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے بدلے اب ہم سرد آہیں بھرتے ہیں یعنی پانی (گریہ) نے ہوا (آہ) کی صورت اختیار کر لی ہے۔

۶۔ میرے دل میں سے تیری انگشت حنائی کا خیال مٹنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا دشوار ہے۔ مثل مشہور ہے کہ گوشت سے ناخن کبھی جدا نہیں ہوتا۔

۷۔ حالیؔ:۔ یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا' یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔

حسرتؔ:۔ آسیؔ اور طباطبائی روتے روتے فنا ہو جانے کو باعثِ انبساط کہتے ہیں اور سعیدؔ دونوں مطالب لکھتے ہیں۔

۸۔ نکہتِ گل:۔ پھولوں کی خوشبو÷ گردِ رہ جولانِ صبا:۔ صبا کے راستے کی گرد÷

اگر نکہت گل کو تیرے کوچے میں جانے کی آرزو نہیں تو پھر وہ کیوں صبا کے راستے کی گرد بنا پسند کرتی ہے۔ یعنی کیا سبب ہے کہ وہ بادِ صبا میں شامل ہو جاتی ہے۔ نکہت گل کے صبا میں بس جانے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ ترے کوچے میں جانے کی آرزو رکھتی ہے۔

۹۔ اعجاز:۔ کرشمہ÷ ہوا:۔ آرزو÷ صیقل:۔ جلا۔ چمک÷ آئینہ:۔ مراد فولادی آئینہ جو برسات میں زنگ آلود یعنی سبز ہو جاتا ہے۔

سعیدؔ:۔ آئینۂ فولادی کا سبز (زنگ آلودہ) ہو جانا ایک کرشمہ ہے جس کی تاویل شاعر یوں کرتا ہے۔ ''یہ اس لئے ہے کہ آئینہ کو صیقل پذیر ہونے کی آرزو ہوتی ہے'' شاعر کہتا ہے کہ اس کرشمہ آرزو کو دیکھنا کہ آئینۂ فولادی کی ہیئت بدل جاتی ہے۔

طباطبائیؔ:۔ برسات میں آئینۂ فولادی پر زنگ آ جاتا ہے۔ وہ گویا سبزہ ہے جسے ہوائے صیقل نے پیدا کیا ہے۔ ہوا بمعنی خواہش و شوق ہے حاصل یہ ہے کہ شوق وہ چیز ہے کہ فولاد پر بھی اثر کرتا ہے۔

آسیؔ:۔ اگر تو چاہے کہ ہوا یعنی خواہش اور عشق کے اعجاز کو دیکھے تو برسات میں آئینہ فولادی کو دیکھ اس پر زنگ لگ جاتا ہے۔ یہ زنگ محض جذب عشق صیقل کی وجہ سے ہے کہ زنگ لگے گا تو صیقل ضرور کی جائے گی۔ اس میں آئینہ کو معشوق و عاشق دونوں کہہ سکتے ہیں۔

حسرتؔ:۔ آج کل اعجاز ہوا یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ ہوا (بمعنے خواہش) میں بھی وہی تاثیر اور اعجاز پیدا ہو گیا ہے۔ جو اصلی ہوا میں ہوتا ہے (میرے نزدیک یہ مفہوم سب سے بہتر ہے)

بخود:- آئینہ فولادی پر برسات کی ہوا سے زنگ آجاتا ہے۔ مثال کے طور پر فرماتے ہیں کہ صرف باغ اور صحرا ہی میں ہوا کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ آئینۂ فولاد تک اس سے متاثر ہوتا ہے۔

۱۰۔ جلوۂ گل:- سیرِ گل÷ ذوقِ تماشا:- اشتیاقِ دید÷ وا ہو جانا:- کھل جانا÷

سیرِ گل (مطالعہ قدرت) سے مذاقِ دید پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے انسان کی آنکھ کو ہر کیفیت سے لطف اندوز ہونا چاہیئے تاکہ شوقِ مطالعہ کی تربیت ہوسکے۔ مطلب یہ ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ باغِ جہاں میں ہر رنگ کا لطف اٹھائے تاکہ صانعِ حقیقی کو پہچان سکے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ب

۴۹

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب ۱ دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن ۲ سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے ۳ سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر ۴ موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اُٹھتی ہیں طوفانِ طرب سے ہرسو ۵ موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز ۶ دے ہے تسکیں بہ دمِ آبِ بقا موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر ۷ شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال ۸ ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ ۹ بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل ۱۰ موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل ۱۱ رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب
ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

۱۔ بال کشا ہو:- پر کھولے پرواز کرے÷ وقت:- موسم بہار÷ بطِ مے:- شراب کی صراحی۔ بطخ کی شکل کی صراحی۔

ایران کا قاعدہ ہے کہ انگور سنگِ مرمر کے حوضوں میں بھر دیتے ہیں' جب آفتاب کی گرمی سے ان کا عرق نکلنا شروع ہوتا ہے تو اس وقت انہیں پاؤں سے روندتے ہیں۔ اس کے بعد مٹی کی بند صراحیاں ان حوضوں میں ڈال دیتے ہیں۔ بط اسی صراحی کو کہتے ہیں۔ مسامات کے ذریعہ عرق چھن چھن کر صراحیوں میں بھر جاتا ہے۔

دل و دستِ شنا÷ تیرنے کی قوت اور حوصلہ

پھر وہ وقت یعنی موسم بہار آگیا کہ امواجِ شراب میں طلاطم پیدا ہوا اور موجِ شراب بطِ مے (صراحیِ مے) کو شناوری کی قوت اور حوصلہ دے۔ یعنی شراب کی صراحی گردش میں آئے' مطلب یہ ہے کہ برسات کا موسم آگیا ہے۔ اب ساغر و مینا گردش میں آنا اور شراب نوشی کا دور شروع ہونا چاہیے (سعیدؔ۔ حسرتؔ۔ طباطبائی)

آسیؔ:- پھر وقت آیا کہ بطِ مے یعنی صراحیِ مے جو شکلِ بط ہوتی ہے پرواز کرے اور بطِ مے جو شناوریٔ مے کو دوست رکھتا ہے۔ تیرنے کے لئے شراب کا دریائے امواج عنایت کرے۔

۲۔ سیہ مستی:- بدمستی÷ اربابِ چمن:- درخت پودے وغیرہ÷ تاک:- انگور÷

چمن کے درختوں اور پودوں کی بدمستی کی وجہ نہ پوچھو۔ جب ہوا انگور کی بیلوں کے سائے میں سے گزرتی ہے تو اس میں موجِ شراب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے اثر سے اربابِ چمن سیہ مست ہو کر جھومنے لگتے ہیں۔

۳۔ غرقۂ مے:- شراب میں ڈوبا ہوا۔ مدہوش÷ بختِ رسا:- خوش قسمت÷ بالِ ہما:-

ہما کا پر مشہور ہے کہ ہما جس کے سر پر سے گزر جائے بادشاہ ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں جو شخص شراب کے دریا میں ڈوب گیا۔ سمجھ لو کہ بہت ہی خوش نصیب ہے۔ کیونکہ اگر موجِ شراب سر پر سے بھی گزر جائے (اگر شراب بالکل ہی مدہوش کردے) تو پھر بھی وہ ہ کے سایہ کا اثر رکھتی ہے (آسی۔ طباطبائی)

حسرتؔ لکھتے ہیں" بھی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر شراب کا استعمال باعتدال ہو تو اس ک

کیا کہنا۔ لیکن اس کا نشہ حد سے گزر جائے تب بھی وہ بالِ ہما سے مشابہ ہے۔ سعید و بیخود ہم خیال ہیں۔ طباطبائی نے دوسرے معنی یہ لکھے ہیں کہ اگر ہم میکشی کے پیچھے تباہ ہو جائیں جب بھی موجِ شراب بالِ ہما سے کم نہیں ہے۔

۴۔ موجِ ہستی در ہستی گزران:۔ فیض ہوا:۔ تاثیر آب و ہوا÷

برسات کا موسم وہ موسم ہے کہ اس کی تاثیر سے ہر طرف زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ فیض ہوا سے موجِ ہستی موجِ شراب بن جائے جیسا موسم بہار میں قوتِ نمو میں ایک قسم کا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ پس اس کی تاثیر سے ہر شے کا متکیف ہونا بالکل ممکن ہے شاعر اسی تاثیر سے موجِ ہستی کو موجِ شراب میں تبدیل کرنے کا آرزومند ہے۔

۵۔ چار موج:۔ چار قسم کی موجیں جن کا ذکر مصرعہ ثانی میں ہے÷ طوفانِ طرب:۔ جوش مسرت÷ موجِ گل:۔ یعنی بکثرت پھول÷ موجِ شفق:۔ یعنی آسمان پر شفق کی سرخیاں اُڑنا÷ موجِ صبا:۔ ہوا کے جھونکے÷ موجِ شراب:۔ شراب کا دور یا شراب کی مہک اور لپٹیں÷

جوشِ انبساط سے ہر طرف چار موجیں اُٹھی ہیں۔ یعنی موجِ گل، موجِ شفق، موجِ دریا اور موجِ شراب، مطلب یہ ہے۔ جوشِ مسرت ہر طرف پھوٹا پڑتا ہے۔ تختہ زمین پر رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں۔ آسمان پر شفق کی سرخیاں اُڑ رہی ہیں۔ فضا میں صبا اٹھکیلیاں کرتی پھرتی ہے اور یاروں میں شراب کا دور چل رہا ہے جس کی مہک موجوں کی طرح اُٹھ رہی ہے۔

چار موج بمعنی گرداب۔ دوسرے مصرعہ میں پانی کی موجوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ جو مفہوم ادا کیا گیا ہے اس پر تمام شارحین متفق ہیں۔

۶۔ رُوحِ نباتی:۔ قوت نامیہ÷ جگر تشنہ:۔ تشنہ جگر، شائق÷ ناز:۔ لہلہانا۔ دم:۔ گھونٹ÷ آبِ بقا÷ آبحیات

جس قدر قوت نامیہ ناز و انداز کی شائق ہے یعنی جس قدر سبزہ لہلہاتا ہے اور اٹھکیلیاں کرنا پسند کرتا ہے اسی قدر موجِ شراب آبحیات کے گھونٹ دے دے کر اس کو تسکین اور قوت بخشتی ہے۔ (آسی، سعید، حسرت)

طباطبائی، بیخود:۔ ہم میں شراب سے جو اُمنگ اور جوش پیدا ہوتا ہے وہ قوت نامیہ کی

حرکت ہے یعنی شراب قوتِ نامیہ کے حق میں وہ کام کرتی ہے جو کام کہ بارش نباتات کے حق میں کرتی ہے۔ اور ناز سے یہاں اینڈنا مقصود ہے جو کہ لوازمِ فخر و ناز سے اور نشوونما کے خواص سے ہے۔

۷۔ رگِ تاک:۔ انگور کی بیل کی رگیں÷ شہپر:۔ وہ پر جس کی مدد سے پرندے اُڑتے ہیں÷ رنگ:۔ پتوں کی رنگینی÷ بال کشا:۔ پر کھولنا÷

موجِ شراب انگور کی بیل میں خون بن کر دوڑ رہی ہے یعنی پتوں وغیرہ میں رنگ بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ گویا اس کا دوڑنا پرواز ہے اور اس کی رنگینی پر پرواز کی رنگینی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ موجِ شراب ہی جواں صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

۸۔ موجۂ گل:۔ موجِ گل۔ کثرتِ گل÷ زبس:۔ بہت زیادہ÷

موجِ شراب کو موجِ گل اور ہجومِ گل کو چراغاں سے مشابہ کیا ہے۔ چونکہ میرے تصورات میں موجِ شراب بہت ہی زیادہ جلوہ نما ہے اور شراب اپنی رنگینی کے لحاظ سے موجِ گل سے مشابہت رکھتی ہے اور موجِ گل چراغاں سے مشابہ ہے اس لئے موجِ شراب کی بدولت میرے گزرگاہ خیال میں چراغاں کی سی بہار پیدا ہوگئی ہے۔

۹۔ نشوونما:۔ یعنی نشوونمائے دماغ÷ سر:۔ خیال۔ خواہش۔ سر÷ دماغ کی رعایت سے لائے ہیں۔

موجِ شراب کو دماغ کی نشوونما کا بہت ہی زیادہ خیال ہے اس لئے وہ نشہ کے پردے (صورت) میں دماغ کی نشوونما کا معائنہ کر رہی ہے (سعید، حسرت، طباطبائی)

بیخود:۔ جس طرح خیال ترقی کرتے کرتے بہت بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح شراب کا نشہ دماغ میں پہنچ کر بڑھتا رہتا ہے۔

۱۰۔ طوفانی:۔ جوش و خروش کا اظہار کرنے والے یعنی موجِ سبزہ نوخیز سے لیکر موجِ شراب تک÷ فصل:۔ موسمِ بہار۔ موجِ سبزہ نوخیز سے لے کر موجِ شراب تک سب نے تمام عالم میں ایک طوفان اٹھا رکھا ہے یعنی فصلِ بہار نے بیحد سبزہ و گل پیدا کئے ہیں۔ شراب کے دور چل رہے ہیں۔ گویا سب مستی کے عالم میں ہیں۔

۱۱۔ شرح:۔ مفصل بیان۔

موسمِ گل بھی کیا عجیب چیز ہے۔ لطف یہ ہے موسمِ گل ہنگامۂ ہستی کی شرح ہے یعنی بہار کے لطف بھی چند روزہ ہیں اور ہستی بھی چند روزہ ہے۔ پھر کہتے ہیں موج شراب بھی کیا چیز ہے کہ قطرہ کو دریا سے ملا دیتی ہے یعنی انسان کو بیہوش کر کے اس کی رُوح کو مبداً حقیقی سے ملحق کر دیتی ہے۔

بیخودؔ:- موسمِ گل کا جوش بتا رہا ہے کہ ہنگامۂ ہستی کی گرم بازاری خاص میرے ہی دم سے دُنیا میں قائم ہے' گویا میں ہنگامۂ ہستی کی شرح ہوں اور اسی طرح موج شراب دعوٰی کر رہی ہے کہ میں قطرہ کو دریا تک پہنچانے میں خضرِ راہ کا حکم رکھتی ہوں یعنی جس طرح قطرہ فنا ہو کر دریا میں جاملتا ہے۔ اسی طرح نشۂ شراب رُوح کو بے خودی کے عالم میں اس کے مرجع تک پہنچا دیتا ہے۔

۱۲۔ اے اسدؔ! جلوۂ گل کو دیکھ کر میرے ہوش اُڑے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پھر وہ وقت آ گیا کہ موج شراب حرکت میں آئے۔ یعنی شراب نوشی کا دور چلے۔ ممکن ہے ''دیکھ'' امر کا صیغہ ہو' بال اور اُڑنے میں مناسبت لفظی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ت

۵۰

افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے ۱ جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
کافی ہے نشانی ترے چھلّے کا نہ دینا ۲ خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم ۳ تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

۱۔ دیداں :- جمع الجمع دود کی یعنی کیڑے ÷ عقدِ گہر:- موتیوں کی لڑی ÷ درخور:- قابل لائق ÷

افسوس کا مقام ہے جن لوگوں کی انگلیاں سلکِ گوہر کے قابل تھیں۔ آسمان نے آج انہیں کیڑوں کا رزق بنا دیا۔ یعنی آج مرنے کے بعد انہیں کیڑے کھا رہے ہیں۔ (طباطبائیؔ' آسیؔ' سہاؔ)

حسرتؔ، سعیدؔ:- دیداں کی جگہ ''دندان'' متن قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ جن لوگوں کی انگلیاں سلکِ گوہر کے قابل تھیں افسوس کہ فلک نے انہیں دندان کا رزق بنادیا یعنی وہ لوگ

حسرت سے انگلیاں کاٹ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ صاحبِ کمال مفلسی اور حسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور نااہل چین اور آرام کی۔

۲۔ نشانی کا چھلّہ دینا مشہور بات ہے' کہتے ہیں تو جب مجھ سے جدا ہو کر سفر میں جا رہا تھا تو تُو نے مجھے نشانی کا چھلّہ نہ دیا بلکہ بوقتِ سفر خالی انگلی دکھادی کہ دیکھ لے میرے پاس چھلّا نہیں ہے ورنہ میں تجھے چھلّا ضرور دیتا۔ اے میرے دوست! میرے لئے تیری یہی نشانی کافی ہے کہ تو نے مجھے خالی انگلی دکھادی۔ خالی انگلی دکھانے سے دو باتیں پیدا ہوتی ہیں اوّل یہ کہ اُس نے مجھے شوخی سے انگوٹھا دکھا دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ چھلّا کوئی 'نہیں ملتا' مزے کرو۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ میں یہی بات یاد رکھوں گا کہ تو نے مجھے نشانی نہ دی۔

۳۔ سخنِ گرم:- کلام پُر تاثیر' عمدہ کلام ÷ انگشت رکھنا:- حرف رکھنا' عیب نکالنا۔

مطلب یہ ہے' میں ایسے عمدہ اشعار لکھتا ہوں کہ کوئی شخص میرے کلام میں عیب نہیں نکال سکتا۔ رعایتِ لفظی سے شعر بلند ہو گیا ہے۔ لفظی مفہوم یہ ہے کہ میرا کلام سوزشِ دل کے اثر سے اس قدر گرم ہوتا ہے کہ کوئی اس پر انگلی تک نہیں رکھ سکتا۔

۵۱

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت ۱ پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے عشق خونابہ مشرب ۲ لکھے ہے خداوند نعمت سلامت
علی الرّغم دشمن شہیدِ وفا ہوں ۳ مبارک مبارک سلامت سلامت
نہیں گر سروبرگِ ادراکِ معنے
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

۱۔ اگر کوئی روزِ قیامت تک زندہ رہے تو پھر کیا۔ آخر ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موت سے بچنا ممکن ہے۔ اگر کوئی قیامت تک بھی جئے تو پھر بھی اُسے مرنا پڑے گا۔ مشہور ہے کہ قیامت کے دن پہلے سب مرجائیں گے اور پھر زندہ ہوں گے۔ بیخودؔ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن مرنے میں یہ لطف پیدا ہو گیا ہے کہ روزِ قیامت دوبارہ زندہ ہونے کا دن ہے۔ اس دن کسی شخص کا مرنا لطف سے خالی نہیں۔

۲۔ خونابہ مشرب:- خالص خون پینے کا عادی۔

عشق کا مشرب خون پینا ہے۔ اُس نے میرے خونِ جگر سے پرورش پائی ہے۔ اس احسان کی وجہ سے عشق میرے جگر کو ''خداوندِ نعمت سلامت'' لکھتا ہے۔ ظاہر ہے یہ القاب ولی نعمت کو ہی لکھا جاتا ہے۔

۳۔ علی الرّغم:- برخلاف۔ مقابلے میں:- مبارک سلامت:- کلمات مبارک باد÷

رقیب (دشمن) شہیدِ وفا نہیں۔ بلکہ اس کے مقابلے میں میں شہیدِ وفا ہوں اور محبّت میں شہیدِ وفا ہونا بہت بڑا امتیاز ہے۔ اس امتیاز پر اپنے تئیں مبارک مبارک سلامت سلامت کہکر مبارک باد دیتے ہیں۔ اس تبریک اور امتیاز کی وجہ یہ ہے کہ شہید ہونا باعثِ زندگی جاوید ہے۔

۴۔ سروبرگ:- سامان، قوت ÷ ادراکِ معنی:- دریافت معنی۔ معنی سمجھنا ÷ معنی:- حقیقت÷ صورت:- معنی کی ضد، اجسام ظاہری۔

اگر ہم میں رازِ حقیقت دریافت کرنے کی قوت نہیں تو نہ سہی، اجسامِ ظاہر کا مطالعہ ہی ہمارے لئے کافی ہے کیونکہ مجاز حقیقت کا زینہ ہے۔

۵۲

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ!

یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

۱۔ مُند گئیں:- بند ہوگئیں، موت آگئی ÷ پر:- مگر÷ بالیں پہ:- سرہانے÷

میرے دوست میرے محبوب کو میری بالیں پر کس وقت لائے ہیں کہ میں اُسے پوری طرح دیکھ بھی نہ سکا۔ میں نے انہیں دیکھنے کے لئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن اسی کوشش میں میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ مطلب یہ ہے کہ یاروں نے احسان کیا لیکن بے وقت۔

۵۳

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست ۱ دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر ۲ کون لاسکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجئے ۳ صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے ۴ کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے ۵ دیدۂ پر خوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُس کے ہجر میں ۶ بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوارِ دوست

تا کہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک ۷ مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ ۸ سرکرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر یارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر ۹ ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے ۱۰ یا بیاں کیجئے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ

ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

۱۔ آمدِ خط:- سبزہ آغاز÷ بازار سرد ہوا:- خریدار کم ہوگئے÷ دودِ شمع کشتہ:- بجھی ہوئی شمع کا دھواں، علامت تاریکی، خطِ یار کی بُرائی ہے۔

خط کے آنے سے محبوب کے حُسن کا بازار سرد ہوگیا۔ گویا خطِ رخسارِ دوست بجھی ہوئی شمع کا دھواں تھا جس کے اُٹھتے ہی اجتماعِ عشاق منتشر ہوگیا۔

۲۔ اے دلِ ناعاقبت اندیش تو اپنے شوقِ دیدار کو ضبط کر، بھلا جلوۂ دیدارِ دوست کی کوئی تاب لاسکتا ہے، ممکن ہے مصرعہ ثانی میں واقعہ طور کی طرف اشارہ ہو کہ موسٰی بھی دیدارِ یار کی تاب نہ لاسکے تھے۔

۳۔ خانہ ویراں سازی:- گھر کا ویران کرنا اور اُجاڑنا÷ تماشہ کیجئے:- دیکھئے÷ رفتہ:- وارفتہ، والہ وشیدا÷

ذرا ملاحظہ فرمایئے حیرت نے میرا گھر کس طرح اجاڑا ہے کہ میں نقشِ قدم کی رفتارِ دوست پر شیدا ہوا۔ نقشِ قدم کی خصوصیت یہ ہے کہ قدم کا نشان زمیں پر پڑجاتا ہے اور وہ چشمِ حیرت کی طرح کھلا رہتا ہے۔ یہ نشان بہت قلیل مدت میں مٹ جاتا ہے۔ غالبؔ نے انہیں خصوصیات سے استفادہ کیا ہے اور اپنے تئیں بہ اعتبار حیرانی، پامالی، خانہ بربادی اور ناپائداری نقشِ قدم سے تشبیہ دی

ہے۔

۴۔ میں اگرچہ دوست کا بیمار (عاشق) تھا اور اسی کے عشق کی بیماری میں مجھ کو مرنا چاہئے تھا لیکن افسوس کہ میری موت اس طرح سے واقع نہیں ہوئی بلکہ میں رشکِ دشمن کی بیداد سے مرا۔ افسوس بھی اس بات کا ہے کہ میں کشتۂ بیدادِ دوست نہ ہوسکا۔ کشتۂ بیدادِ رشکِ دشمن ہوا۔ سعید نے بیدادِ رشک کی مزید تشریح یہ کی ہے کہ مجھ کو ازراہِ رشک یہ گوارا نہ ہوسکا کہ تو دشمن پر ظلم کرے اور مجھ کو اس لطف سے محروم رکھے اس لئے اس رشک سے میں مرگیا۔

۵۔ مصرعِ ثانی میں ''ہے'' محذوف ہے اور یہ اچھا معلوم نہیں دیتا۔ دیدہ پُر خون کی رعایت سے ''چشمِ ماروشن'' اور ''چشمِ باروشن'' کے لحاظ سے ''دلشاد'' لائے ہیں۔ ''چشم ماروشن دل ماشاد'' خوشی کے موقعہ پر بولتے ہیں۔

ساغرِ سرشار:- ساغرِ لبریز÷

اگر اس بیدرد کا دل ہماری خونفشانی سے خوش ہے تو ہم بھی خوش ہیں یہ کیا کم ہے کہ ہمارا دیدۂ پُر خوں دوست کے لئے ساغرِ لبریز ہے۔

۶۔ یہ قطعہ ہے۔ اس میں دشمن کے برتاؤ کی تصویر کھینچی ہے۔

پُرسش:- بیمار پُرسی۔ عیادت÷

اس کے ہجر میں رقیب میری اس طرح عیادت کرتا ہے جیسے کوئی بہت بے تکلف دوست کسی دلی دوست کی بیمار پُرسی کیا کرتا ہے۔

۷۔ اور اس پُرسش کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ مجھ پر ظاہر کرے کہ اس کی رسائی یار تک ہے۔ اس لئے مجھے وہ دوست کے وعدۂ دیدار کا پیغام دیتا ہے۔ گویا وہ دوست بن کر میرے دل کو جلاتا اور آتشِ رشک کو بھڑکاتا ہے۔

۸۔ سر کرے ہے:- شروع کرتا ہے÷ حدیث:- بات÷

اس کی اس قسم کی گفتگو سُن کر میں کہتا ہوں۔ ضعفِ دماغ سے مجھ کو باتیں کرنے کا یارا نہیں۔ لہذا اپنا سلسلۂ کلام مختصر کرو۔ یہ سُن کر وہ دوست کی زلفِ عنبریں کی گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ اگرچہ ضعفِ دماغ میں خوشبو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن زلفِ یار کی خوشبو بھلا کسے بُری معلوم

ہوسکتی ہے۔ اس لئے میں اس کو روک بھی نہیں سکتا' اس کی گفتگو جاری رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے رقیب کے سامنے دماغ کا عذر بھی نہیں چلتا اور وہ کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

۹۔ جب رقیب مجھے چپکے چپکے روتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ مجھے خوش کرنے کے لئے یار کی شوخیٔ گفتار کا ذکر ہنس ہنس کر شروع کر دیتا ہے۔ (لیکن میرا حال یہ ہے کہ میں رشک سے مرا جاتا ہوں اور دل ہی دل میں کڑھتا ہوں)

۱۰۔ ایسی حالت میں میں رقیب کی ان مہربانیوں کی شکایت کروں جو وہ میرا دل جلانے کی غرض سے میرے حال پر صرف کرتا ہے یا آزارِ دوست کی لذت کا شکریہ ادا کروں کہ وہ ان کا اس قدر محرمِ راز ہوگیا ہے مہربانی طنزاً استعمال کیا ہے اور شکریہ اس لئے کہ عاشقوں کی آزار رسانی بھی مرغوب ہوتی ہے۔

۱۱۔ مجھے اپنی یہ غزل جی سے پسند ہے کیونکہ اس کے ہر شعر کی ردیف میں بار بار ''دوست'' کا لفظ آیا ہے اور دوست مجھے بہت ہی پیارا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ج

۵۴

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج' ۱ قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ ۲ تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل ۳ سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

۱۔ برنگِ دگر:- بطریقِ دیگر÷ حلقۂ بیرونِ در:- یعنی بیرونِ در کی زنجیر کا حلقہ۔ مراد وہ شخص جس کو اندر آنے کی اجازت نہ ہو۔

آج باغ میں نئی طرز کا انتظام ہے۔ قمری باغ کا پرندہ ہے لیکن آج اس کو بھی باغ کے اندر آنے کی اجازت نہیں گویا نئے انتظام کے ماتحت قمری کے گلے کا طوق حلقۂ بیرونِ در بن گیا ہے (آسی' سعید' طباطبائی)

بیخود:- حلقۂ بیرونِ در سے دروازہ کی محراب مراد ہے۔ گلشن میں بہار آگئی ہے اس لئے دوسرا انتظام کیا گیا ہے۔ حلقۂ بیرون یعنی محرابِ در قمری کا طوق بن گئی ہے۔ آج جو شخص چمن کی

سیر کو آئے گا' قمری کی طرح گرفتارِ چمن ہو جائے گا۔

حسرت:- ہمارا محبوب سیر چمن کو آنے والا ہے اس لئے کسی کو باغ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں' گلوئے قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در بنا ہوا ہے۔

۲۔ آج میری آہ کے ساتھ ایک دل کا ٹکڑا باہر آجاتا ہے۔ شاید آج ہمارے تارِ نفس (آہ) نے اثر کو شکار کرلیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج ہماری آہ میں تاثیر پیدا ہوئی ہے (سوائے حسرت تمام متفق)

حسرت:- تارِ نفس کی کمند نے اثر کو شکار کرلیا ہے یعنی آج ہماری آہ میں اثر پیدا ہوا ہے۔ لیکن اس اثر کا نتیجہ اُلٹا ہے کہ ہر فغاں کے ساتھ ایک پارۂ دل باہر آتا ہے' یعنی اثر آہ سے دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ اثر آہ کے اس اُلٹے نتیجے کے ذکر سے اپنی بدبختی کا اظہار منظور ہے۔

۳۔ کنارہ کر:- علاحدہ ہوجا÷ چل:- رخصت ہو÷ عافیت:- آرام' راحت÷ سیلاب گریہ:- طوفانِ اشک۔

اے آرام و راحت اور اے انتظام! اب میرے مکان سے رخصت ہوجاؤ کیونکہ آج میرے گریہ کا طوفان در و دیوار گرانے کے درپے ہے' مبادا تمہیں بھی نقصان پہنچے۔

۵۵

لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں ۱ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

۱۔ مسیحا:- معشوق÷ کیا علاج:- محاورہ ہے بمعنی سزا۔

دعویٰ یہ ہے کہ مریضِ عشق کسی طرح اچھا نہ ہوگا۔ کہتے ہیں چلو ہم مریضِ عشق کی تیمارداری کرتے ہیں۔ لیکن پہلے یہ بتلادو کہ اگر ہماری اس تیمارداری اور دیکھ بھال کے باوجود مریضِ عشق اچھا نہ ہوا تو پھر مسیحا کی کیا سزا ہے۔ الفاظ سے ظاہر ہے کہ مسیحا کو یہ شکایت ہے کہ بیمار کی تیمارداری صحیح طریقہ سے نہیں ہوتی۔ اس لئے علاج کامیاب نہیں ہوتا اور تیماردار ادھر یہ سمجھے ہوئے ہے کہ مریضِ عشق کبھی اچھا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے وہ تیمارداری کا حصہ لیتا ہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگاتا ہے کہ اگر باوجود تیمارداری کے مریض اچھا نہ ہوا تو مسیحا کا کیا علاج!

☆☆☆☆☆☆☆

چ

۵۶

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ! ۱ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ!
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ! ۲ برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ!
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل ۳ کیا ہے کس نے اشارہ کہ تارِ بستر کھینچ!
تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس ۴ بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ!
بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز ۵ نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ!
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ!

۱۔ مصرعہ اوّل:- ترکِ آرزو نہ کر÷ انتظار کھینچنا:- انتظار کرنا÷

اگر شراب نہیں ہے تو ساغر ہی کا انتظار کر۔ کیونکہ بزمِ آرزو سے کسی حالت میں بھی سانس باہر نہ لینا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ ترکِ آرزو کسی حالت میں بھی درست نہیں۔ دُنیا بہ اُمید قائم۔

۲۔ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید:- دیدارِ یار کی جستجو کی دوڑ دھوپ ÷ برنگ:- مانند÷ آئینہ:- حسرتِ دیدار÷

دیدارِ یار کی جستجو میں میں نے بہت زیادہ دوڑ دھوپ کی۔ اس دوڑ دھوپ میں میں نے حد سے زیادہ کوششیں صرف کیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔ کہتا ہے۔ ان سرگرمیوں کی کیفیت مجھ سے نہ پوچھو۔ میرے آئینہ حسرتِ دیدار میں سے جوہر آئینہ کو خار کی طرح نکال کر دیکھ لو۔ تم کو خود ہی معلوم ہوجائیگا کہ یہ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید میں لگے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ حسرتِ دیدار نے حیران بنایا آئینہ حیران ہوتا ہے اور اس میں جوہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس آئینہ میں بجائے جوہر کے کانٹے لگے ہیں۔

بیخود:- میرے آئینہ کمال کی گرمی و سعی کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ اہلِ نظر کی تلاش و جستجو میں اتنی تکلیفیں اُٹھائی ہیں کہ اب میرے آئینہ کمال کا جوہر میری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا

ہے۔ قدردان کمال کے نہ ملنے سے مایوس ہوکر یہ چاہتا ہوں کہ کوئی شخص ایسا مجھ کو مل جائے جو جوہر کمال کو میرے آئینہ کمال سے کانٹے کی طرح کھینچ لے (سعید)

۳۔ اے دل! بستر پر پڑے پڑے انتظار یار کرنا۔ آرام کرنے کا بہانہ ہے۔ یہ انتظار نہیں ہے۔ ذرا یہ تو بتائیے۔ کس نے اشارتاً کہا ہے کہ تو بستر کے ناز اُٹھا۔ بستر کے ناز اُٹھانا تو راحت طلبی کی علامت ہے۔ اس لئے اُٹھ راحت کو ترک کر۔ ناز بستر سے مختلف مفہوم پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً صحرانوردی کر' جستجوئے معشوق کر' یا اس انتظار کی ایذا اُٹھانے سے مرجانا بہتر ہے۔ (طباطبائی' آسی' سعید)

حسرت:- اے دل! تیری راحت کے لئے سیل خواب اور نازکشی کی بجائے انتظار یار کافی ہے۔

۴۔ اے محبوب! تیری طرف نرگس بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے کہ تو کیوں شراب نہیں پیتا۔ تو اس شرم سے شراب نہیں پیتا کہ وہ تجھے دیکھ رہی ہے۔ لے میں تجھے بتاتا ہوں کہ چشم رقیب اور دل رقیب یعنی چشم و دل نرگس اندھے ہیں۔ اس لئے تو بے تکلف شراب پی اور اس سے نہ شرما۔ نرگس کو رقیب اس لئے کہا ہے وہ یار کی طرف بحسرت دیکھ رہی ہے چونکہ چشم نرگس دیکھ نہیں سکتی اس لئے اسے کور چشم اور کوردل لکھا' نیز نرگس کو ساغر سے بھی مشابہت ہے (آسی' طباطبائی' بیخود)

حسرت:- اگر نرگس تیری طرف بڑی حسرت سے دیکھ رہی ہے تو تجھ کو چاہیئے کہ باغ میں اس طرح بے تکلف شراب نوشی میں مشغول نہ ہو۔

سعید:- نرگس جو تیری طرف بڑی حسرت سے دیکھ رہی ہے اس لئے تو میرے اس رقیب کی کوریٔ دل وچشم کی خواہش میں جامِ شراب پی تاکہ وہ اندھی ہو جائے اور تجھے نظر نہ لگے۔

۵۔ ودیعت:- امانت ÷ نیام:- میان۔ لفظی صنعت یہ ہے کہ اگر ''نیام'' کا الف نکال دیا جائے تو ''نیم'' باقی رہ جاتا ہے۔

میں نے تیرے ناز کے خنجر کو پردۂ زخمِ جگر کی نیام میں امانت رکھا۔ اب تو میری اس

امانتداری کا حق نیم غمزہ سے ادا کر۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے مدّتوں تیرے خنجرِ ناز کو اپنے جگر میں بطور امانت رکھا تو اس خنجر کو میرے جگر سے نکال لے اور مجھے حقِ امانتداری ادا کردے۔ حقِ امانت میں نیم نگاہ طلب کرتے ہیں (حسرتؔ' آسیؔ)

طباطبائی:- نازوادا تجھ میں خدا کی ودیعت ہے۔ اس کا حق ادا کرنے کے لئے ادا کر اور اس طرح خنجرِ ادا کو کھینچ کہ معلوم ہو پردۂ جگرِ عاشق سے کھینچ کر آرہا ہے یعنی ادا تیغ بے نیام ہے۔ اگر اس کے لئے کوئی نیام ہے تو زخمِ جگرِ عاشق ہے۔ طباطبائی کا خیال ہے کہ معنی کا خون ہوگیا ہے۔

سعید:- (شرح ہاشمی از رسالہ اُردو) تو نے جو خنجر جگر میں بھونک دیا ہے۔ اب ناز کا حق ادا کر اور اُسے باہر اس طرح کھینچ لے کہ زخم زیادہ کشادہ اور زخمی کا خاتمہ آسانی سے ہوجائے۔ خنجر بھونکنا۔ غمزۂ کامل کی نشانی تھی اور اب اس طرح کھینچنا یا پردۂ زخم سے نکال لینا نیم غمزہ ہے کہ ناز کا حق ادا کرنے میں جو کسر تھی وہ پوری ہو جائے۔

بیخود:- اداوناز جو تجھ کو اللہ تعالیٰ نے بخشے ہیں وہ گویا اس کی امانت ہے۔ اس امانت کا حق نیم غمزہ سے ادا کر' اگر غمزہ پورا ہوجائے گا تو فوراً عاشق کی جان نکل جائے گی۔ اس لئے تجھ کو لازم ہے کہ نیم غمزہ سے کام لے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر زخمِ جگر میں وار کرنے کے بعد خنجر چھوڑ دیا جائے گا تو بسمل فوراً جاں بحق ہوجائے گا اور اگر وار کرنے کے بعد خنجر زخم میں سے کھینچ لیا جائے گا تو مجروح کے مرنے میں ضرور دیر لگے گی۔ اور شاید جانبر بھی ہوجائے۔ اس لئے نیم غمزے سے کام لینا بہتر ہے۔

۶۔ قدح:- پیالہ' مراد دل ÷ صہبا:- شراب ÷ آتشِ پنہاں:- آتشِ عشق ÷ سفرہ:- دسترخوان ÷ سمندر:- ایک جانور جو آگ میں پیدا ہوتا ہے۔ کھینچ:- یعنی چن دے

میرے پیالے میں آتش پنہاں ہے۔ اس لیے میرے دسترخوان پر سمندر کے دل کے کباب ہونے چاہئیں۔ مطلب یہ ہے جب شراب آتشِ پنہاں کی ہے تو اس کے ساتھ کباب بھی سمندر کے دل کے چاہئیں۔ جو آتشی کیڑا ہے۔ نیز دل بھی باطنی شے ہے اور آتش پنہاں بھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

د

۵۷

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ۱ بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے کوئی بھی قابل نہ رہا ۲ ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے ۳ شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنے ۴ اُنکے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
در خور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا ۵ نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد
ہے جنوں اہلِ جنوں کیلئے آغوشِ وداع ۶ چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق ۷ ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ!
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

۱۔ غمزہ:- چشم و ابرو سے اشارہ کرنا ÷ اہلِ جفا:- معشوق ÷

جب تک میں زندہ رہا۔ حُسن غمزے کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ کیونکہ غمزہ ہر وقت حُسن کو اُکساتا تھا کہ عاشق پر وار کرے۔ میرے مرنے کے بعد یہ کشمکش ختم ہوگئی اور معشوق آرام سے ہوگئے۔ مطلب یہ ہے حُسن و غمزہ کی جفا کاریاں میری زندگی تک تھیں کیونکہ میں ہی اُن کے نازوانداز اُٹھاتا تھا۔ اب نہ کوئی مجھ جیسا عاشق صادق ہوگا اور نہ ان کے ظلم وستم اُٹھائے گا۔

۲۔ منصبِ شیفتگی:- عہدہ عاشقی ÷ معزولی:- معطّل ÷

میرے مرنے کے بعد ایسا کوئی شخص موجود نہیں جو عہدۂ عاشقی کے قابل ہو۔ اس لئے معشوق کے انداز و ناز بھی معطّل ہوگئے۔ منصب اور معزولی مناسب الفاظ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب منصب عاشق نہیں رہا تو انداز و ادا جو اس کے لوازمات میں سے ہیں۔ خود بخود معزول ہوگئے۔

آتش مرحوم کا شعر اس سے بہت بلند ہے۔

ہوگیا سلسلہ مہر و محبت برہم نازنیں بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

۳۔ قاعدہ ہے جب شمع کو بجھاتے ہیں تو اس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے۔ حقیقتاً وہ دُھواں نہیں ہوتا بلکہ وہ شمع کے سوگ میں شعلۂ شمع سیہ پوش ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جب میرے مرنے سے شعلۂ عشق بُجھا تو وہ بھی میرے سوگ میں سیہ پوش ہوگیا۔ خلاصہ شعر یہ ہے کہ میرے مرنے سے عشق کا خاتمہ ہوگیا اور یہی وجہ اس کے سیہ پوش ہونے کی ہوئی۔ سیہ لباس سے سوگ کا اظہار ہوتا ہے۔

۴۔ خاک:- قبر ÷ خون ہے دل:- دل غمگین ہے ÷

میرا دل قبر میں بھی معشوقوں کے حال پر غمگین ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے مرنے سے اُن کے ناخن مہندی کے محتاج ہوگئے ہیں کیونکہ جب تک میں زندہ تھا تو وہ میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرلیا کرتے تھے لیکن اب ان کو آرائش کے لئے مہندی لگانی پڑتی ہے (آسیؔ بیخودؔ سعید)

حسرتؔ طباطبائی:- مجھے احوالِ بتاں پر افسوس آتا ہے کہ میرے بعد میرے سوگ میں اُنہوں نے مہندی لگانا چھوڑ دی۔

۵۔ در خورِ عرض:- اظہار کے قابل ÷ جوہر:- عرض کی رعایت سے لائے ہیں ÷ جا:- جگہ ÷

میرے مرنے کے بعد جوہر بیداد کو اب کوئی مناسب جگہ اپنے تئیں ظاہر کرنے کے لئے نہیں ملتی۔ یعنی کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا۔ جس پر بیداد کی جاسکے۔ اسی لئے اُنہوں نے آنکھوں میں سُرمہ لگانا چھوڑ دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ہی اُن کی سُرگیں آنکھوں کے ظُلم اُٹھانے والا تھا۔ ممکن ہے اس لئے انہوں نے میرے سوگ میں سُرمہ لگانا چھوڑ دیا ہو۔

۶۔ آغوشِ وداع:- رخصت ہوتے وقت بغل گیر ہونا ÷ چاک ہوتا ہے گریباں:- گریباں پھٹتا ہے۔

میرے مرنے کے بعد جنون ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کو اہلِ جنوں کے ساتھ آخری مرتبہ ہم آغوش ہورہا ہے گویا چاک گریباں سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہورہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں رسمِ جنوں میرے بعد باقی نہ رہے گی اور اب کوئی شخص اپنا گریبان چاک نہ کرے گا۔ چاک کا گریبان سے جدا ہونا خوب ہے۔

۷۔ حالیؔ:- اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مرگیا ہوں مئے مردِ افگن عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بُلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا۔ اس لیے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے۔ اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ بھی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں۔ اور اس مصرعہ کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بُلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق؟ یعنی کوئی ہے جو مئے مرد افگن عشق کا حریف ہو۔ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اس مصرعہ کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق! یعنی کوئی نہیں ہوتا اس میں لہجہ اور طرزِ آواز کو بہت دخل ہے کسی کو بُلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے جب اس طرح مصرعہ مذکور کی تکرار کرو گے تو فوراً یہی معنی ذہن نشین ہو جائیں گے۔

۸۔ تعزیت:- ماتم پُرسی ÷

میں اس غم سے مرا جاتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد دُنیا میں کوئی ایسا شخص بھی نظر نہیں آتا جو مہر و وفا کی تعزیت کرنے کا اہل ہو۔ مطلب یہ ہے کہ مہر و وفا کا خاتمہ میرے ساتھ ہو جائے گا اور کوئی ان کا رونے والا نہ ہوگا۔ قاعدہ ہے مُردے پر رونے کے لئے بہت لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ کوئی تعزیت کا بھی اہل نظر نہیں آتا۔ اس لئے مہر و وفا کا مجسمہ اسی غم میں مرا جاتا ہے۔ (بیخودؔ۔ سعیدؔ۔ طباطبائی)

طباطبائی، آسیؔ:- میں اس غم سے مرا جاتا ہوں کہ میرے بعد مہر و وفا کو میرا پرسا بھی دینے والا کوئی نہیں ہے۔

۹۔ سیلابِ بلا:- یعنی عشق ÷

غالبؔ مجھ کو عشق کی بے کسی اور تنہائی پر رونا آتا ہے۔ جب میں مرجاؤں گا تو یہ عشق کس کے گھر جائے گا یعنی کوئی ایسا عاشق نہیں جو میرے بعد عشق کی میزبانی کرے اور اس کی مصیبتیں برداشت کرے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ر

۵۸

۱ بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار — نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

۲ وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ — کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

۳ نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار — گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

۴ ہوئی ہے اس قدر ارزانیِ مئے جلوہ — کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر در و دیوار

۵ جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ — کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

۶ ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے — کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

۷ وہ آرہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے — ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

۸ نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی — ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

۹ نہ پوچھ بیخودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب — کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

۱۔ یہ در و دیوار جو ہماری نگاہِ شوق کو تجھ تک پہنچنے سے روکتے ہیں۔ ہمیں ان کی کوئی پروا نہیں۔ کیونکہ روکنا تو درکنار یہ تو اُلٹا ہماری نگاہِ شوق کو بال و پر کا کام دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ رکاوٹ اور روک تھام سے جذبۂ عشق میں اور بھی زیادہ ترقی ہوتی ہے۔ اس لئے در و دیوار نگاہِ شوق کے لئے بال و پر ہیں۔

۲۔ وفور:- کثرت ÷ کاشانہ:- جھونپڑی ÷ رنگ:- حالت ÷

کثرتِ گریہ نے میرے مکان کا یہ حال کر دیا ہے کہ دیوار کو توڑ کر اس میں در بنا دیا اور دروازہ کے آگے دیوار گر کر ملبہ کا ڈھیر لگ گیا۔ گویا وہ دیوار بن گیا۔ مطلب یہ ہے کہ سیلابِ گریہ سے مکان تہہ و بالا ہو گیا جہاں دیوار تھی وہاں دروازہ بن گیا اور جہاں دروازہ تھا وہاں دیوار بن گئی۔

۳۔ نوید مقام:- تشریف آوری کی خوشخبری۔

فرماتے ہیں یہ درودیوار کا سایہ نہیں ہے بلکہ یار کے آنے کی خوشخبری سُن کر درودیوار مہمان کے استقبال کے لئے چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔

۴۔ ارزانی:- ستا پن÷ مے جلوہ:- شرابِ دیدار÷

تو نے شرابِ دیدار کو کس قدر ارزاں کر دیا ہے کہ تیرے کوچے کے درودیوار تک اس شراب سے مست ہو رہے ہیں۔ شاید یار کی بے حجابی کا ماتم کیا ہے۔

۵۔ سر:- خیال ÷ سودائے انتظار:- متاع وجنس انتظار کی خریداری۔

اگر تجھے جنسِ انتظار کی خریداری منظور ہے تو آ۔ اور دیکھ! کہ عشاق نے اپنی نگاہیں درودیوار پر اس طرح جمائی ہیں کہ درودیوار متاعِ نظر کی دُکان بن گئی ہیں۔

۶۔ جب کبھی میں نے ہجومِ گریہ کا سامان کیا' یعنی دل کھول کر رونے کا بندوبست کیا تو فوراً درودیوار میرے قدموں پر گر پڑے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے رونے کے ارادے میں اس قدر اثر ہے کہ رونے سے پہلے درودیوار گِر پڑتے ہیں۔ ظاہری مفہوم یہ ہے کہ درودیوار نے میری منت و سماجت کی اور قدموں پر سر رکھ دیا کہ رونا نہیں۔ ورنہ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ بہر کیف نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔

۷۔ جب وہ میرے ہمسائے میں آ کر رہا تو میرے درودیوار کا سایہ اس کے درودیوار کے سایہ پر فدا ہوگیا۔ چونکہ ایک دیوار کا سایہ دوسری دیوار کے سایہ سے اکثر مل جاتا ہے۔ اس لئے یہ لطیف خیال پیدا ہوگیا۔

۸۔ جب کوئی چیز آنکھوں میں کھٹکتی ہے تو آنکھوں میں پانی بہنے لگتا ہے۔ کہتے ہیں تیرے بغیر میرے گھر کی آبادی میری آنکھوں میں کھٹکتی ہے (بُری معلوم ہوتی ہے) اس لئے ہم ہمیشہ اپنے گھر کے درودیوار کو دیکھ کر روتے ہیں۔

۹۔ سیلاب کے آنے کی خوشی میں میرے درودیوار جس قدر بے خود و وارفتہ ہیں وہ مجھ سے نہ پوچھ۔ بلکہ یوں سمجھ لے کہ درودیوار کو حال آ جاتا ہے اور وہ سر بسر ناچتے پھرتے ہیں۔ (آسی)

بیخود' سعید' طباطبائی:- سیلاب آنے کے خوشی میں میں ایسا بیخود ہو جاتا ہوں کہ درودیوار

کے گرنے کو رقص سمجھتا ہوں۔

۱۰۔ غالب تو اپنا رازِ محبت کسی سے نہ کہہ کیونکہ دُنیا میں رازِ محبت کوئی نہیں چھپا سکتا اور اگر تو رازِ محبت اپنے تک محدود نہیں رکھ سکتا تو صرف درودیوار سے کہہ' کیونکہ وہ سُن سکتے ہیں۔ لیکن کسی سے کہہ نہیں سکتے۔ ظاہر ہے درودیوار سے باتیں کرنا پاگل پن کی علامت ہے۔ اس لئے حاصل یہ نکلا کہ رازِ محبت مُنہ سے نہ نکالا جائے۔

۵۹

گھر جب بنالیا ترے در پر کہے بغیر ۱ جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن ۲ جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں ۳ لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم ۴ سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑونگا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا ۵ چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام ۶ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۷ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات ۸ سُنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

۱۔ جب کبھی میں آپ سے اپنے گھر آنے کے لئے کہا کرتا تھا تو آپ کہہ دیتے تھے۔ ہم تیرا گھر ہی نہیں جانتے۔ کیونکر آئیں۔ لیجئے میں نے آپ سے بغیر اجازت حاصل کئے آپ کے دروازہ پر ہی اپنا گھر بنالیا ہے۔ فرمائیے اب بھی آپ میرے گھر کو بغیر بتائے نہ جانیں گے؟

۲۔ جب تک مجھ میں حالِ دل بیان کرنے کی قوت تھی' اُس وقت تو کبھی میرا حال پوچھا نہیں لیکن اب جبکہ مجھ میں بات کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی' تو کہتے ہیں کہ میں کسی کے دل کی بات بغیر کہے کیسے جان سکتا ہوں۔ تم بات کرو تو تمہارے دل کی بات میں پوری کروں۔ ستم ظریفی دکھائی ہے۔

۳۔ تقدیر کی بات ہے، میرا معاملہ اس شخص سے پڑا ہے جس کا نام کوئی شخص بغیر ستمگر کہے نہیں لیتا۔ یعنی تمام دنیا اُسے ستمگر کہتی ہے۔ ظاہر ہے ایسے ظالم سے کیسے اُمیدیں پوری ہوں گی۔

۴۔ ہم جو خاموش ہیں اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہم کسی سے ڈرتے ہیں بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دل ہی میں کوئی بات نہیں۔ اگر ہمارے دل میں کوئی بات ہوتی تو ہم کبھی خاموش نہ رہتے۔ سر جاتا یا رہتا۔ ہم ایسے صاف باطن ہیں کہ اپنے دل کی بات کہے بغیر کبھی باز نہ آتے۔

ممکن ہے یہ کہنا چاہتے ہوں کہ ہمیں تو صرف معشوق سے محبت ہے اور کوئی آرزو نہیں، ورنہ ہم اپنا مدعا کہتے اور ضرور کہتے۔

۵۔ میں اُس بُتِ کافر کی پرستش اور عشق ہرگز ترک نہ کرونگا، چاہے خلقِ خدا مجھے کافر ہی کیوں نہ کہے، جو شخص خدا کے سوا کسی اور کو پوجتا ہے اس کو کافر کہا جاتا ہے۔ الفاظ نہایت مناسب ہیں۔

۶۔ ہمارا مقصدِ اصلی غمزہ و ناز ہے مگر کیا کیا جائے۔ گفتگوئے شاعرانہ میں غمزہ و ناز کو دشنہ و خنجر کہے بغیر کام نہیں چلتا۔ مطلب یہ ہے کہ شاعری میں تشبیہ اور استعارہ سے کام لئے بغیر لطفِ سخن پیدا نہیں ہوتا۔ گویا ہم ضرورتِ شعری سے مجبور ہیں۔

۷۔ ہر چند مشاہدہ حق کی گفتگو ہو۔ مگر شاعری میں بادہ و ساغر کے الفاظ ضرور لانے پڑتے ہیں۔

۸۔ دُونا:- دُگنا÷ التفات:- توجہ۔ نظرِ عنایت÷

میں بہرا ہوں اس لئے آپ کو مجھ پر دوگنی مہربانی اور توجہ کرنی چاہئے کیونکہ جب تک کوئی بات باآواز بلند اور مکرر کہی نہ جائے میں سُن ہی نہیں سکتا۔ آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ یہ بات تو ایسی ہے کہ اس کی وجہ سے مجھ پر دوگنی مہربانی ہونی چاہئے۔

۹۔ غالبؔ! تُو اپنا حال بار بار عرض نہ کر، تیرے کہے بغیر ہی اُن کو تیری پوری کیفیت معلوم ہے۔ اپنا حال کس خوبی اور صفائی سے بیان کرتے ہیں۔ مگر سب کچھ کرنے کے بعد بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ کچھ نہیں کہا۔ یہ معنوی خوبی ہے۔

۷۰

۱ کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
۲ آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے — سرگرمِ نالہائے شرر بار دیکھ کر
۳ کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا — رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
۴ آتا ہے میرے قتل کو پُر جوشِ رشک سے — مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
۵ ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
۶ واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر
۷ بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ — لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
۸ زُنّار باندھ سبحۂ صددانہ توڑ ڈال! — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
۹ ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر
۱۰ کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے — طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر
۱۱ گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

۱۔ جلتا ہوں:- رشک سے÷ تابِ رُخ:- جمالِ عالم سوز÷

میں رُخِ یار کا جلوہ دیکھ کیوں نہ جل گیا۔ مجھے ضرور جل جانا چاہئے تھا۔ یہ نہ جلنے کا ہی نتیجہ ہے کہ میں اپنی طاقتِ دیدار کے رشک سے جلا جاتا ہوں

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۲۔ نالہ ہائے شرر بار کی وجہ سے اپنے آپ کو آتش پرست سے مشابہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ چونکہ میں شب و روز آتش بار نالے کرتا ہوں۔ اس لئے عوام مجھے آتش پرست کہنے لگے ہیں۔ آتش پرست دن رات اپنی آگ ہی کے خیال میں رہتے ہیں اور میری بھی یہی کیفیت ہے۔

۳۔ بے سبب آزار:- بے وجہ ستانے والا÷

جفا عاشق صادق کا حق ہے لیکن تم ہوس پرستوں پر بھی جفا کرتے ہو اور یہ خیال نہیں

کرتے۔ جفا عاشق صادق ہی کے لئے مخصوص ہونی چاہیئے اس لئے میں تم سے محبت کرتے ہوئے رکتا ہوں کیونکہ اس طرح میرے عشق کی آبرو کو بٹہ لگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق کا لطف اس وقت ہے جب تم اس کی قدر بھی کرو اور قدر یہی ہے کہ جفا کرو۔

۴۔ وہ مجھے قتل کرنے آتا ہے اس لئے مجھے بہت خوش ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں، میں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر جوشِ رشک سے مرا جاتا ہوں کہ تلوار اتنی خوش قسمت کہاں سے آئی جو اُس کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ گویا وہ خوشی بھی خاک میں مل گئی جو اُس کے ہاتھ سے قتل ہو کر حاصل ہوتی کیونکہ قتل کرنے سے پہلے میں جوشِ رشک سے مرگیا۔ بیخود اور آسی نے ''پُرجوش'' متن قرار دیا ہے۔

۵۔ خوف کے مارے موجِ مے تیری رفتار کو دیکھ کر کانپ رہی ہے موجِ مے کے لرزنے اور کانپنے کی وجہ یہ ہے کہ خونِ خلق تیری مستانہ رفتار سے ہوا اور تیری مستی کا باعث تیری مے نوشی ہوئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خونِ خلق گردنِ مینا پر ثابت ہوا، کیونکہ اسی میں وہ شراب تھی جو خونِ خلق کا باعث ہوئی۔ پس اسی بنا پر اب شراب صراحی میں لرز رہی ہے۔

۶۔ واحسرتا:- افسوس÷ ہاتھ کھینچنا:- دست بردار ہونا÷ حریص:- بے حد خواہشمند÷

جب یار نے مجھے لذّتِ آزار کا بیحد خواہشمند پایا تو افسوس صد افسوس کہ اس نے جفا کاری ترک کردی یعنی اب ہم جفا سے بھی محروم رہ گئے۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ   اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہوجانا

۷۔ عیار:- کسوٹی÷ متاع:- جنس÷ بِک جاتے ہیں:- غلام یا قدردان ہوجاتے ہیں۔

ہم اپنے متاعِ سخن کے خریدار کے ہاتھ بک جاتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ خریدار شعر کو پرکھنے والا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص میرے کلام کی قدر جانتا ہے۔ میں بھی اس کی قدر کرتا ہوں۔

۸۔ سبحۂ صد دانہ:- سَو دانوں کی تسبیح÷

دانوں کی وجہ سے تسبیح میں نشیب و فراز پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن زنّار ہموار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں دانے نہیں ہوتے۔ تسبیح و زنّار دونوں ایک منزل پر پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ لیکن

فرق یہ ہے کہ زنّار کا راستہ ہموار ہے اور تسبیح کی راہ میں سو نشیب و فراز ہیں، اس لئے ہر مقام پر ٹھوکر لگتی ہے۔ کہتے ہیں۔ زنّار باندھ لے اور سو دانوں والی تسبیح توڑ ڈال۔ کیونکہ مسافر ہمیشہ سیدھے اور صاف راستے ہی پر چلا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کفر کا راستہ آسان اور صاف ہے۔

۹۔ آبلوں کی طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں کہ میں ان پاؤں کے آبلوں سے گھبرا گیا تھا۔ لیکن راستوں کو پُرخار دیکھ کر جی خوش ہوگیا ہے کہ کانٹے لگ کر یہ آبلے پھوٹیں گے اور زیادہ تکلیف ہوگی۔ عشق میں انسان اذیّت کو پسند کرنے لگتا ہے۔

۱۰۔ میرا دوست مجھ سے کس قدر بدگمان ہوگیا ہے کہ میرے آئینۂ دل میں جو زنگ لگا ہے اور جو نتیجہ ہے افسردگی کا وہ اس کو زنگِ افسردگی خیال نہیں کرتا بلکہ ازراہِ بدگمانی یہ خیال کرتا ہے کہ یہ کسی طوطی کا عکس ہے جس سے مجھے اس کی بجائے محبت ہوگئی ہے۔ زنگار اور طوطی میں سبزہ کی وجہ سے مشابہت ہے۔ نیز طوطی و آئینہ میں وہی نسبت ہے جو گل و بلبل میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو اب یہ بدگمانی ہوگئی ہے کہ میرا عاشق طوطی سے اپنا دل بہلانے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے دل سے میرا عشق جاتا رہے گا

۱۱۔ حالی:- اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ''ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اُٹھا لیا''۔ میرزا فرماتے ہیں ''برقِ تجلّی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کہ کوہِ طور اس لئے کہ شراب خور کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق اس کو شراب دی جاتی ہے پس کوہ طور جو منجملہ جمادات کے ہے۔ وہ کیونکر تجلّی الٰہی کا متحمل ہوسکتا ہے''۔ یہ خیال مع اس تمثیل کے جو بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال ہے۔

۱۲۔ تیری دیوار دیکھ کر مجھے غالب شوریدہ حال کا سر پھوڑنا یاد آگیا ''شوریدہ حال'' سے سر پھوڑنے کا سبب ظاہر اور لفظ ''وہ'' سے تمام سابقہ واقعات کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔

۶۱

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر ۱ میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی ۲ سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اس زمانے سے ۳ کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے ۴ بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ اُلفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا ۵ کہ پشتِ چشم سے جس کی نہ ہووے مہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا ۶ کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا ۷ قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اُس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

۱۔ مہرِ درخشاں:- چمکتا ہوا سورج ÷ زحمت:- تکلیف ÷
شبنم کے چمکنے کو لرزنے سے تعبیر کیا ہے۔ میں ایک ایسا قطرۂ شبنم ہوں جو خارِ بیاباں کی نوک پر آویزاں ہے۔ آفتاب مجھے جذب کر لینے کے لئے کیسی کیسی سرگرمیاں دکھا رہا ہے۔ کہاں میں اور کہاں آفتاب، نوک پر خار ہونے کی وجہ سے میری فنا تو ویسے ہی بہت قریب ہے، اس لئے آفتاب کی تکلیف فرمائی پر میرا دل لرزتا ہے کہ وہ اتنی سی بات کے لئے کس قدر کوشش کر رہا ہے۔

۲۔ سفیدی میں ایہام ہے۔ ایک تو آنکھ کی سفیدی یعنی نور۔ دُوسرے قلعی جو دیواروں پر آرائش کے لئے پھیرتے ہیں۔

قید میں تو حضرت یوسف کو خانہ آرائی چھوڑ دینا چاہئے تھا۔ لیکن اُنھوں نے آرائش کو وہاں بھی ترک نہ کیا۔ یہ حُسن کسی حال میں بھی ترکِ آرائش نہیں کرتا۔ دیکھ لو چشمِ یعقوب کی سفیدی (آنکھوں کا نور) قید خانے کی دیواروں پر آرائش کے لئے پھرتی تھی۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ حضرت یعقوب کی آنکھوں کا نور قید خانے میں حضرت یوسف کو تلاش کرتا تھا۔ کیونکہ وہ حضرت یوسف کے فراق میں روتے روتے اندھے ہو گئے تھے۔ گویا ان کی آنکھوں کا نور آنکھوں سے نکل کر دیوارِ زنداں پر آ گیا تھا

۳۔ لام الف یعنی لا بمعنی فنا، شاعر نے الف بے کے بدلے یہ حروف انتخاب کئے ہیں جن سے شعر کا مرتبہ بلند ہو گیا ہے۔ میں اس زمانہ سے سبقِ بیخودی میں فنا ہوں، جبکہ مجنوں عام

بچوں کی طرح مدرسے کی دیواروں پر لام الف لکھتا پھرتا تھا۔ گویا اس کو ان حروف کے معنی بھی معلوم نہ تھے۔ لیکن میں اس وقت درسِ بیخودی میں فنا ہو چکا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ مجنوں میرے آگے کا بچہ ہے۔

۴۔ اگر میرے پارہ ہائے دل نمک لگانے پر راضی ہو جاتے تو مجھے مرہم تلاش کرنے میں مطلق تشویش نہ ہوتی۔ مطلب یہ ہے۔ نمک سے زخموں کو تکلیف ہوتی ہے لہذا وہ عشاق کو مرغوب ہے۔ اس کے علاوہ عاشقِ صادق کے لئے مرہم تلاش کرنا باعثِ عار ہے (بیخود، سعید، آسی)

طباطبائی:- پارہ ہائے دل کو نمک چھڑکنے سے وہ لذّت حاصل ہوتی ہے کہ باہم نزاع کرتے ہیں۔ اس سبب سے میں چاہتا ہوں کہ بلا سے میں مرہم لگاؤں اور ان سب کو اس لذّت سے محروم کردوں (۲) ہم خیال۔

۵۔ طومار:- دفتر ÷ پشتِ چشم:- کنایہ از غمزہ و اغماض، چشم پوشی ÷ اقلیم:- دیار ÷
دیارِ الفت میں کوئی دفترِ ناز ایسا نہیں ملے گا۔ جس کے عنوان پر معشوقوں کے غمزہ و اغماض کی مُہریں ثبت نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ادھر دل لیتے ہیں ادھر آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ لفظ عنوان سے ظاہر ہے کہ ابتدا ہی میں ایسی فریب کاری روا رکھی جاتی ہے۔

۶۔ مجھے آسمان پر ابرِ شفق آلودہ دیکھ کر ایک بات یاد آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب میں محبوب سے جدا تھا تو یہی ابرِ شفق آلودہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تیری فرقت میں آسمان سے گلستان پر آگ برستی تھی۔

۷۔ خیال یہ ہے کہ قیامت کے دن مُردے اُٹھیں گے۔ فرماتے ہیں روزِ قیامت تیرے شہیدوں میں سوائے پروازِ شوقِ ناز کے اور باقی ہی کیا رہا ہوگا۔ جو قیامت اُنہیں دوبارہ زندہ کر دے گی۔ ان کے لئے تو قیامت ایک تیز وتند ہوا ہے جو خاکِ شہیداں کو اور زیادہ پریشان کر دے گی۔ خاکِ شہیداں کو زیادہ پریشان کرنے کا مفہوم صاف ہے کیونکہ ان کی خاک پہلے ہی سے شوقِ ناز میں اُڑتی پھرتی ہے۔

۸۔ اپنے دل سے کہتے ہیں اگر ناصح نے زیادتی کی ہے تو اس سے نہ لڑ۔ "ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر" اس کو پھاڑ ڈالیں گے۔ کیا گریبان پھاڑنے سے تسکین نہ ہوگی؟ ناصح

کی شدّت کا بدلہ کس طور پر اور کس انداز سے لینا چاہتے ہیں اور اس میں مجبوری اور بے بسی کا کیا عمدہ پہلو نکالا ہے۔ خوب شعر ہے۔

۹۲

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور ۱ کرتے ہیں محبّت تو گزرتا ہے گماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات ۲ دے اور دل انکو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ابرو سے ہے کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند ۳ ہے تیر مقرر مگر اُس کی ہے کماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے ۴ لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور
ہر چند سبکدست ہوئے بُت شکنی میں ۵ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور
ہے خونِ جگر جوش میں' دل کھول کے روتا ۶ ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے ۷ جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا ۸ ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین ۹ کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے ۱۰ رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

۱۔ چونکہ ہر اشارے میں ایک نئی بات پائی جاتی ہے اس لئے اگر وہ حقیقتاً محبّت بھی کرتے ہیں تو ہم کو یقین نہیں آتا۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ فریب ہے۔

حسرت:- یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ اظہارِ محبّت اس لئے کرتے ہیں کہ ہماری فریفتگی اور عشق کا حال دریافت کرلیں۔ جب ان کو ہمارے عشق کا یقین ہوجائیگا تو محبّت کی بجائے نازِ معشوقانہ شروع کردیں گے۔

۲۔ وہ میری بات نہ اب تک سمجھے ہیں اور نہ آئندہ امید ہے کہ سمجھیں گے اے خدا! اگر تو میری زبان کو ایسی قوتِ بیان نہیں دیتا جو انہیں اپنا مدعا سمجھا سکوں تو اُنہیں کو ایسا دل عنایت کردے کہ میرا مطلب سمجھ جائیں۔ (سعید۔ آسی)

طباطبائی و بیخود:- سوالِ وصل میں کُھل کر نہیں کرسکتا اور وہ سادہ دلی سے بغیر صاف صاف کہے سمجھ نہیں سکتے (اس لئے دُعا مانگتے ہیں)۔

حالی:- میرزا صاحب نے در پردہ ان لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہا کرتے تھے۔

۳۔ پیوند:- علاقہ۔ تعلق۔ جوڑ÷ مقرر:- یقیناً۔ مقرر:- قرار دیا گیا÷

نگہِ ناز کو تیر قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کمان ابرو کو نگاہِ ناز سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ نگاہِ ناز تیر تو ضرور ہے مگر اس کی کمان ابرو نہیں۔ بلکہ اس کی کمان کچھ اور ہی ہے۔

طباطبائی:- سعید اور آسی کہتے ہیں کہ یہ حُسن کی کمان ہے۔ بیخود لکھتے ہیں۔ یہ نگاہِ ناز کا تیر دلی ارادہ کی کمان سے نشانے پر لگا کرتا ہے اسی لئے اس کے زخم مختلف صورتوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کہیں وہ خوشی کا پہلو اختیار کرکے عاشق کو تڑپاتا ہے۔ کہیں غصّہ کے پیکان سے قتل کرتا ہے۔

حسرت کا خیال ہے کہ یہ کمال دلربائی ہے کہ مثل کمانِ قضا اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔

۴۔ جب تک تم شہر میں موجود ہو۔ ہمیں دل و جان کا کچھ غم نہیں۔ اگر تم ہمارا دل چھین لوگے اور جان لے لوگے تو ہم بازار سے دل و جان اور خرید لیں گے۔ تمہارے عہد میں دلفروشی اور جاں فروشی کا بازار گرم ہے۔ کیونکہ ہر شخص دل و جان سے تنگ ہے۔ اس لئے وہ بہت سستے داموں ہمارے ہاتھ دل و جان بیچ ڈالے گا۔

۵۔ سبکدست:- مشاق÷ ہم:- ہماری ذات یا ہستی÷

حالی:- اس شعر میں سارا زور ''ہم'' کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اس وقت تک راہ معرفتِ الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِّ راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بُت توڑنے میں سبکدستی حاصل ہے تو کیا فائدہ یہ بڑا بھاری بُت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔

۶۔ اس وقت میرا خون جوش مار رہا ہے۔ اے کاش! میری بہت سی آنکھیں ہوتیں تو میں خوب دل کھول کر رولیتا اور حسبِ حسرت خونابہ فشانی کرتا مطلب یہ ہے کہ خونابہ فشانی اور خونِ جگر کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لئے وہ آنکھیں کافی نہیں۔

نہ کہہ کہ گریہ بہ اندازِ حسرتِ دل ہے ‏ مری نظر میں ہے سب جمع خرچ دریا کا

۷۔ ہر چند کہ میرا دل ہی کیوں نہ اُڑ جائے لیکن مجھے مطلق پروا نہیں میں تو اس آواز پر مرتا ہوں'' کہ وہ جلاد سے بار بار کہتا ہے'' ہاں اور دراز کر' ہاں ایک اور ہاتھ مار''۔

۸۔ میرے سینے میں بہت سے داغ ہیں۔ میں ان داغوں میں سے ایک داغِ نہاں کو ہر روز لوگوں کو دکھا دیتا ہوں اور وہ دھوکے سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آفتاب عالمتاب ہے جو ہر روز افقِ مشرق سے طلوع ہوتا ہے ۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا　　طلوع صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

۹۔ غالب:- یہ بہت لطیف تقریر ہے۔ لیتا کو ربط ہے چین سے' کرنا مربوط ہے آہ وفغاں سے' عربی میں تعقیدِ لفظی اور معنوی دونوں معیوب ہیں۔

فارسی میں تعقیدِ معنوی عیب اور تعقیدِ لفظی جائز ہے بلکہ فصیح و بلیغ ہے ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرعین یہ ہے کہ اگر دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا اور اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا۔

۱۰۔ حالی:- نالے یعنی ندی نالے' نہ آہ و نالہ' مثال کس قدر مثل لہٗ کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رُکتی ہے اُسی قدر راہ پڑتی ہے۔ خصوصاً جو مضمون اس وقت وہ اپنے حسبِ حال لکھتا ہے وہ نہایت مؤثر اور دردانگیز ہوتا ہے۔

۱۱۔ ویسے تو دُنیا میں اور بھی شاعر بہت اچھے اچھے ہیں' لیکن یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ غالب کا اندازِ بیان سب سے الگ ہے۔

۶۳

صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر　۱　تغیّر آبِ بر جاماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی　۲　ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

۱۔ آب بر جا ماندہ:- پانی جو ایک جگہ پر ٹھہر جاتا ہے÷ آئینہ کو پانی سے اور پانی کی کائی کو زنگ آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔

پانی جو ایک جگہ ٹھہرا رہے اس کا رنگ تبدیل ہوجاتا ہے اور اس پر کائی جم جاتی ہے۔ اسی

طرح آئینے کی صفائے حیرت ہی سے آئینے میں زنگ پیدا ہوجاتا ہے' اسی طرح وہ لوگ بھی تباہ حال ہوتے ہیں' جن کا آئینہ دل صاف ہوتا ہے اور اُن کی روانی رُک جاتی ہے۔

۲۔ سامانِ عیش و جاہ سے میری وحشت مزاجی کا علاج نہ ہوسکا۔ بلکہ جامِ زمردیں بھی میرے لئے داغِ پشتِ پلنگ بن گیا۔ جس سے میری وحشت میں مزید اضافہ ہوا۔ جامِ زمردیں سامانِ عیش ہے اور داغ پشت پلنگ سبب وحشت و پریشانی ۔

۶۴

جنوں کی دستگیری کس سے ہو' گر ہو نہ عریانی　۱　گریباں چاک کا حق ہوگیا ہے میری گردن پر

برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی　۲　ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے　۳　متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے　۴　شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت پر　۵　فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

۱۔ گریبان چاک:- اضافتِ مقلوب' یعنی چاکِ گریبان۔ پھٹا ہوا گریبان÷ حق:- احسان÷

عریانی جنون کی علامت اور اس کی مددگار ہے۔ اس لئے پھٹے ہوئے گریبان کا میری گردن پر احسان ہوگیا ہے کیونکہ اسی نے مجھے عریاں کیا ہے اور عریاں کر کے میرے جنوں کی دستگیری کی ہے ورنہ جنوں کیسے ظاہر ہوتا (آسی' سعید' بیخود)

حسرت و طباطبائی گریبان کو' منادیٰ سمجھے ہیں۔ یعنی اے گریبان چونکہ تو نے عریاں کر کے میرے جنوں کی دستگیری کی ہے۔ اس لئے چاک کا میری گردن پر حق ہوگیا ہے۔

۲۔ برنگ:- مثل÷ نیرنگ:- شعبدہ÷ بال تپیدن:- تڑپنا۔ میرا شعبدۂ بیتابی کاغذِ آتش زدہ کی طرح یک بال تپیدن پر ہزار آئینہ باندھتا ہے یعنی جس طرح جلتے ہوئے کاغذ میں سینکڑوں نقاط روشن نمودار ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح شعبدۂ بیتابی نے ہزاروں آئینے میرے دل پر

طرح آئینے کی صفائے حیرت ہی سے آئینے میں زنگ پیدا ہوجاتا ہے' اسی طرح وہ لوگ بھی تباہ حال ہوتے ہیں' جن کا آئینہ دل صاف ہوتا ہے اور اُن کی روانی رُک جاتی ہے۔

۲۔ سامانِ عیش و جاہ سے میری وحشت مزاجی کا علاج نہ ہوسکا۔ بلکہ جامِ زمردیں بھی میرے لئے داغ پشت پلنگ بن گیا۔ جس سے میری وحشت میں مزید اضافہ ہوا۔ جامِ زمردیں سامانِ عیش ہے اور داغ پشت پلنگ سبب وحشت و پریشانی۔

۶۳

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی ۱ گریباں چاک کا حق ہوگیا ہے میری گردن پر
برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگ بیتابی ۲ ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے ۳ متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے ۴ شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت پر ۵ فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر
اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

۱۔ گریبان چاک:- اضافت مقلوب' یعنی چاک گریبان۔ پھٹا ہوا گریبان÷ حق:- احسان÷

عریانی جنون کی علامت اور اس کی مددگار ہے۔ اس لئے پھٹے ہوئے گریبان کا میری گردن پر احسان ہوگیا ہے کیونکہ اسی نے مجھے عریاں کیا ہے اور عریاں کرکے میرے جنوں کی دستگیری کی ہے ورنہ جنوں کیسے ظاہر ہوتا (آسیؔ' سعیدؔ' بیخودؔ)

حسرتؔ و طباطبائیؔ گریبان کو' منادیٰ سمجھے ہیں۔ یعنی اے گریبان چونکہ تو نے عریاں کرکے میرے جنوں کی دستگیری کی ہے۔ اس لئے چاک کا میری گردن پر حق ہوگیا ہے۔

۲۔ برنگ:- مثل÷ نیرنگ:- شعبدہ÷ بالِ تپیدن:- تڑپنا۔ میرا شعبدۂ بیتابی کاغذِ آتشزدہ کی طرح یک بالِ تپیدن پر ہزار آئینہ باندھتا ہے یعنی جس طرح جلتے ہوئے کاغذ میں سینکڑوں نقاط روشن نمودار ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح شعبدۂ بیتابی نے ہزاروں آئینے میرے دل پر

باندھ دیئے ہیں' جو ایک چمک کے ساتھ چمکنے لگتے ہیں۔ گویا بالِ یک تپیدن کو کاغذِ آتش زدہ سے اور اس کے روشن نقاط کو ہزار دلوں سے تعبیر کیا ہے (حسرتؔ' بیخودؔ' آسیؔ)

طباطبائیؔ:- نیرنگ بیتابی مثلِ کاغذِ آتش زدہ ہے کہ دل نے ایک بالِ تپیدن پر ہزار ہزار آئینے باندھے ہیں۔ اس شعر میں آئینہ متحرک کی تڑپ کو اس شعلہ سے تشبیہ دی ہے جو کاغذ آتش زدہ سے بلند ہو۔

سعیدؔ نے سیدؔ ہاشمی کی یہ شرح رسالہ اُردو سے نقل کی ہے۔ "یہاں باندھنے سے مراد ڈھارس باندھنا یا امید دلانا ہے۔ کاغذِ آتش زدہ میں سکڑنے اور سمٹنے کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بیتابی کو تشبیہ دی ہے اور ایسے کاغذ میں جو روشن نقطے نمودار ہوجاتے ہیں۔ ان کی مناسبت سے ہزار آئینہ کا لفظ کہا ہے۔ مگر ان تکلفات کے پردوں میں مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف و بے قراری میں اگر کوئی شے موجبِ تسکین ہوسکتی ہے تو وہ تڑپنا اور لوٹنا ہے۔

۳۔ عیشِ رفتہ:- زمانہ ماضی کا عیش÷ متاعِ بردہ:- لُوٹا ہوا مال÷

حالیؔ:- یہ مضمون بالکل وقوعیات میں سے ہے۔ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہوجاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم وستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور آخر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کر آئے گا (یادگارِ غالبؔ)

حاصل یہ ہے کہ انقلابِ آسمانی سے جو زمانہ عیش جاتا رہے۔ پھر اس کے واپس آنے کی امید فضول ہے۔ اس لئے آسمان سے اس کی بار بار درخواست کرنا ایسا ہی ہے جیسے لٹے ہوئے مال و متاع کو رہزن پر قرض خیال کرلینا اور اس کی واپسی کی امید رکھنا۔ بھلا رہزن کہیں مال واپس کیا کرتا ہے۔

۴۔ بے سبب رنج:- بلاوجہ رنجیدہ ہونے والا÷ آشنا دشمن:- دوستوں کا دشمن۔

ہمارا ایسے محبوب سے پالا پڑا ہے جو بلاوجہ رنجیدہ ہونے والا ہے۔ اور اُنہی کا دشمن ہے جو اس کی دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ نیز وہ ایسا بدگمان ہے کہ سورج کی کرن جو روزنِ دیوار میں سے آتی ہے۔ اسے تارِ نظر سمجھ کر چشم زدن پر جھانکنے کی تہمت لگاتا ہے۔ (حسرتؔ' سعیدؔ)

طباطبائیؔ' آسیؔ' بیخودؔ:- روزن میں جو شعاع آتی ہے' اُسے دیکھ کر مجھ سے لڑتا ہے کہ یہ تیری نگاہ تھی۔ تو جھانکا ہوگا۔

باندھ دیئے ہیں' جو ایک چمک کے ساتھ چمکنے لگتے ہیں۔ گویا بال یک تپیدن کو کاغذ آتش زدہ سے اور اس کے روشن نقاط کو ہزار دلوں سے تعبیر کیا ہے۔ (حسرت' بیخود' آسی)

طباطبائی:- نیرنگ بیتابی مثل کاغذ آتش زدہ ہے کہ دل نے ایک بال تپیدن پر ہزار ہزار آئینے باندھے ہیں۔ اس شعر میں آئینہ متحرک کی تڑپ کو اس شعلہ سے تشبیہ دی ہے جو کاغذ آتش زدہ سے بلند ہو۔

سعیدؔ نے سیدؔ ہاشمی کی یہ شرح رسالہ اُردو سے نقل کی ہے۔ ''یہاں باندھنے سے مراد ڈھارس باندھنا یا امید دلانا ہے۔ کاغذ آتش زدہ میں سکڑنے اور سمٹنے کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بیتابی کو تشبیہ دی ہے اور ایسے کاغذ میں جو روشن نقطے نمودار ہوجاتے ہیں۔ ان کی مناسبت سے ہزار آئینہ کا لفظ کہا ہے۔ مگر ان تکلفات کے پردوں میں مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف و بےقراری میں اگر کوئی شے موجب تسکین ہوسکتی ہے تو وہ تڑپنا اور لوٹنا ہے۔

۳۔ عیش رفتہ:- زمانہ ماضی کا عیش ÷ متاع بردہ:- لوٹا ہوا مال ÷

حالی:- یہ مضمون بالکل وقوعیات میں سے ہے۔ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہوجاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم وستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور آخر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کر آئے گا (یادگار غالب)

حاصل یہ ہے کہ انقلاب آسمانی سے جو زمانہ عیش جاتا رہے۔ پھر اس کے واپس آنے کی امید فضول ہے۔ اس لئے آسمان سے اس کی بار بار درخواست کرنا ایسا ہی ہے جیسے لٹے ہوئے مال و متاع کو رہزن پر قرض خیال کرلینا اور اس کی واپسی کی امید رکھنا۔ بھلا رہزن کہیں مال واپس کیا کرتا ہے۔

۴۔ بےسبب رنج:- بلاوجہ رنجیدہ ہونے والا ÷ آشنا دشمن:- دوستوں کا دشمن۔

ہمارا ایسے محبوب سے پالا پڑا ہے جو بلاوجہ رنجیدہ ہونے والا ہے۔ اور انہی کا دشمن ہے جو اس کی دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ نیز وہ ایسا بدگمان ہے کہ سورج کی کرن جو روزنِ دیوار میں سے آتی ہے۔ اسے تارِ نظر سمجھ کر چشم زدن پر جھانکنے کی تہمت لگاتا ہے۔ (حسرت' سعید)

طباطبائی' آسی' بیخود:- روزن میں جو شعاع آتی ہے' اُسے دیکھ کر مجھ سے لڑتا ہے کہ یہ تیری نگاہ تھی۔ تو جھانکا ہوگا۔

۵۔ فروغِ طالع:- خوش قسمتی ÷ خاشاکِ:- گھاس پھونس ÷ گلخن:- بھاڑ بھٹی ÷

اگر تو اپنی حقیقت کو دیکھنے کا مشتاق ہے تو فنا ہوجا کیونکہ گھاس پھونس کا نصیبہ اسی وقت چمکتا ہے جب اُسے بھاڑ میں ڈالا جاتا ہے (جب گھاس پھونس جلتی ہے تو شعلہ اُٹھتا ہے اور وہی اس کا فروغ طالع ہے) مطلب یہ ہے کہ فنافی اللہ ہوکر انوار معرفت حاصل کر۔ بغیر فنا ہوئے یہ مرتبہ نہیں مل سکتا۔

۶۔ اسدؔ بھی عجیب قسم کا بسمل ہے۔ وہ قاتل سے کہتا ہے کہ تو مشق ناز جاری رکھ اور خونِ ناحق کے خوف سے مشق ناز ترک مت کر۔ اگر تجھے یہ خوف ہے تو خونِ دو عالم ہم اپنی گردن پر لیتے ہیں۔ اب تو کوئی خوف کی بات نہیں رہی روزِ قیامت تجھ سے باز پُرس ہوگی' نہ یہاں کوئی تیرے خلاف خون کا دعوٰی کریگا۔ کیونکہ دونوں جہان کی ذمہ داری ہم نے اپنے سر لے لی ہے۔

۶۵

ستم گر مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں ۱ تکلف برطرف مِل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

خوباں:- حسین ÷ تجھ سا رقیب:- وہ حسین جو تجھ پر عاشق ہو۔

میں جو تیرے ظلم اُٹھاتا ہوں تو اُس میں بھی ایک مصلحت ہے اور وہ یہ ہے کہ تجھ پر بہت سے حسین عاشق ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے مجھے کوئی تجھ جیسا خوبصورت رقیب مِل جائے اور میں اس سے دل لگالوں۔

۶۶

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور ۱ تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا ۲ ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں ۳ مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے ۴ کیا خوب' قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف ۵ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور!
تم ماہِ شب چار دہم تھے مرے گھر کے ۶ پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم کون سے ایسے تھے کھرے داد وستد کے ۷ کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیرّ سے لڑائی ۸ بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہر حال یہ مدّت خوش و ناخوش ۹ کرنا تھا جوانمرگ گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

۱۔ یہ غزل بطور مرثیہ لکھی ہے۔ زین العابدین خاں عارفؔ مرزا صاحب کے سالے تھے ور انہیں بہت عزیز تھے۔ جب اُنہوں نے عین شباب میں انتقال کیا تو مرزا صاحب کو سخت صدمہ ہُوا۔ اسی غم کا ان اشعار دردخیز میں اظہار کیا ہے۔

عارفؔ! تم کو چاہیئے تھا کہ میرے ساتھ جاتے اور میری روانگی (موت) کا انتظار کرتے۔ تم نے جانے میں اس قدر جلدی کی۔ لہذا اب تم دوسری دُنیا میں تنہا رہو۔ نہ تم تنہا جاتے نہ وہاں تمہیں تنہا رہنا پڑتا۔ اپنے سے پہلے مر جانے پر تادیب اور تاسف کا ایک نیا ڈھنگ نکالا ہے۔

۲۔ ناصیہ فرسا:- ماتھا رگڑنے والا۔ سر ٹکرانا÷ پتھر اور درد سے مراد سنگِ مزار اور قبر ہے۔

میری ناصیہ فرسائی اور سر ٹکرانا تیرے مزار پر چند دن اور ہے گویا تھوڑے دنوں میں یا تو تیرا سنگ مزار گھس جائیگا یا ناصیہ فرسائی سے میرا سر ہی باقی نہ رہے گا۔

۳۔ ابھی کل کی بات ہے کہ تم اس دُنیا میں آئے اور آج کہتے ہو کہ میں جاتا ہوں۔ یہ بات ہم مانتے ہیں کہ جانا ضرور ہے اور تم یہاں ہمیشہ نہیں رہ سکتے لیکن کچھ دن تو اور ٹھہرتے' حاصل یہ کہ مرنے کی ایسی کیا جلدی ہے۔

۴۔ تم (دُنیا سے) رخصت ہوتے ہوئے کہتے ہو کہ اب ہم قیامت کے دن ملیں گے' بہت خوب' کیا قیامت کا کوئی اور دن ہوگا۔ ہمارے لئے تمہاری دوامی جدائی سے آج ہی قیامت کا دن ہے۔

۵۔ آسمان سے شکایت کرتے ہیں' اے فلکِ پیر! عارفؔ ابھی جوان تھا اور اس نے باغ جہاں میں آکر کچھ بھی نہ دیکھا۔ اگر وہ کوئی دن اور نہ مرتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔ الفاظ بہت مناسب اور دردانگیز ہیں۔

۶۔ ماہِ شبِ چہار ہم:- چودھویں رات کا چاند۔ ماہ کامل۔

اے عارفؔ! تم میرے گھر کے چودھویں کے چاند تھے اور چودھویں کے چاند کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ تھوڑا تھوڑا گھٹ گھٹ کر غائب ہوتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم ماہ چہار دہم ہوتے ہوئے ایک دم چھپ گئے اور میرے گھر کا وہ نقشہ (رونق) کوئی دن اور کیوں نہ قائم رہا۔

۷۔ داد و ستد:- لین دین۔

تم لین دین کے ایسے کہاں کے کھرے تھے کہ تم نے ملک الموت کے ایک ہی تقاضے میں جان دے دی۔ کچھ دن اسے اور تقاضا کرنے دیتے یعنی کچھ دنوں اور جیتے۔

۸۔ نیرّ:- نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرّ غالبؔ کے عزیز شاگرد تھے۔

میں مانتا ہوں کہ مجھ سے تمہیں نفرت تھی اور نیرّ سے تمہاری لڑائی تھی۔ بھلا بچّوں نے کیا قصور کیا تھا۔ ان کی بہاریں تو کچھ دنوں اور دیکھی ہوتیں!

آسیؔ اور سعیدؔ لکھتے ہیں کہ مرزا کو نیرّ سے بہت محبت تھی اور وہ عارفؔ کو گوارا نہیں تھی۔ ممکن ہے اس معاملہ پر نیرّ و عارف میں کچھ باہم چشمک ہو اور یہاں اس کی طرف اشارہ ہو۔

۹۔ اتنی عمر آخر تم نے رنج و راحت سے گزار ہی دی۔ اے جوانمرگ اسی صورت سے کچھ دن اور گزار لیتے!

۱۰۔ تم لوگ نادان ہو جو یہ کہتے ہو کہ عارفؔ کی جوان موت کے بعد اے غالبؔ! تم کیوں زندہ ہو' یعنی مر کیوں نہ گئے؟ میرا جواب یہ ہے "میں اسلئے نہیں مرتا کہ میری قسمت میں ابھی چند دن مرنے کی تمنا کرنی اور لکھی ہے۔ پھر مروں کیوں کر"۔

☆☆☆☆☆☆☆

ز

۶۷

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح مہر ۱ ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز
ہے نازِ مفلسانِ زرازدست رفتہ پر ۲ ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز
میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں ۳ خمیازہ کھینچے ہے بُتِ بیدادفن ہنوز

۱۔ جیب کفن کو صبح اور داغ عشق کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے' یہ نہ سمجھ کہ مرنے کے بعد میں غمِ عشق سے فارغ ہوگیا ہوں۔ مجھے مرنے کے بعد بھی غمِ عشق سے فراغت نہیں بلکہ صبحِ مہر کے مانند داغِ عشق میری جیبِ کفن کی زینت کا باعث ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ داغِ عشق میری جیب کفن پر اسی صورت سے چمکتا ہے جیسے چاک گریبانِ صبح میں آفتاب روشن ہوتا ہے۔

طباطبائی کی تشریح قابلِ غور ہے:- صبح استعارہ ہے شب کے گزر جانے سے اور جیب کفن کو بھی گریبانِ صبح سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مطلب وہی ہے کہ مرنے پر بھی میں عشق سے خالی نہیں ہوں۔

۲۔ زراز دست رفتہ:- وہ شخص جو اپنی دولت کھو بیٹھا ہو÷

جیسے ایک مفلس اپنی کھوئی ہوئی دولت پر ناز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کبھی میں اس قدر فارغ البال اور امیر تھا۔ اسی طرح میں بھی اپنے داغ ہائے کہن کو یاد کرکے ناز کیا کرتا ہوں۔ (حسرت' بیخود' سعید)

سعید:- جس طریقہ سے ایک مفلس اپنی گئی ہوئی دولت پر اور گل فروش اپنے بکے ہوئے پھولوں پر ناز کرتا ہے اسی طرح میں اپنے داغ کہن پر ناز کرتا ہوں۔

طباطبائی:- داغ عشق اب نہیں ہے تو میں اس کا تذکرہ ہی کیا کرتا ہوں۔ داغ کو اشرفی سے زوالِ عشق کو دولت از دست رفتہ سے تشبیہ دی ہے۔

۳۔ خاک بھی نہیں:- خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ÷ خمیازہ کھینچے ہے:- انگڑائیاں لیتا ہے یعنی اور شراب طلب کرتا ہے۔

میرے مے خانہ جگر میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا۔ خاک اُڑ رہی ہے۔ لیکن وہ بُتِ بیدادگر اب تک انگڑائیاں لے رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی اسے اور خون پینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا نشہ پورا نہیں ہوا۔ بت بیدادفن اس لئے کہا ہے کہ بجائے شراب کے خون پیتا ہے۔

۶۸

حریف مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز ۱ دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود ۲ ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں ۳ کہ دیجئے آئینہ انتظار کو پرواز

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست ۴ گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالب

جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے اک خاک انداز

۱۔ حریف:- دوست، فسونِ نیاز:- عجز و نیاز کا جادو' منتر÷

حالی:- ایک نئی شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی۔ کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا۔ لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو۔ یعنی ایسی چیز طلب کرینگے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو۔

۲۔ ہرزہ:- بیہودگی÷ وجود:- مسئلہ وحدت الوجود÷ وہم:- نشیب و فراز:- بلند و پست۔ مراد ناقص۔

وہم وجود کے بیابان میں تو بیکار ٹھوکریں نہ کھا۔ ابھی تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں یعنی ہنوز تیرا تصور ناقص ہے اس لئے وہ تیرے خیال میں نہیں آسکتا (سعید)

حسرت:- بہرزہ یعنی بیکار تیرے تصور میں نشیب و فراز یعنی تیرا تصور ناتمام اور قاصر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وحدت الوجود کا عقیدہ اختیار کرنا چاہئے تاکہ وجودِ اشیائے عالم کے متعلق تمام اوہام سے نجات حاصل ہو۔

طباطبائی:- وجود سے وجود ماسوی اللہ مراد ہے اور نشیب و فراز کا یہی سبب ہے کہ تو وجود کے لئے مراتب سمجھے ہوئے ہے جس کا مرتبہ اعلیٰ وخوب ہے اور مرتبہ ادنیٰ امکان ہے اور امکان میں بھی قیام بذات و قیام بغیرہٖ جو ہر و عرض کے لئے وجود میں پستی و بلندی رکھتا ہے یعنی جادۂ مستقیم یہ ہے کہ ہر شے کا موجود بوجود سمجھ اور وجود کے لئے اقسام نہ نکال کہ یہ راستہ بھیڑ کا ہے۔

بیخود:- وجود ماسوی اللہ میں تو بیکار ٹھوکریں کیوں کھاتا پھرتا ہے معلوم ہوا ابھی تک تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ابھی تک تیرا تصور ناتمام اور ناقص ہے۔

آسی:- (۱) صوفیہ وغیرہ پر طنز ہے۔ مطلب یہ کہ تو اپنے وہم میں وحدت وجود یعنی توحید

وعرفان کا راستہ طے کرنا چاہتا ہے اور اس میں تو نے مراتب مقرر کئے ہیں کہ پہلے فنائی الشیخ ہو۔ پھر فنائی الرسول' پھر فنا فی اللہ و دیگر مقامات کا خیال اگر تیرے دل میں ہے اور تو ان خیالات میں محو ہے تو اس راستے کا طے کرنا ایک فضول اور بیہودہ کام ہے' اس صورت سے تو ہرگز منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ (۲) تو نے ماسوی اللہ کا کچھ وجود سمجھ رکھا ہے۔ اسی وہم کے چنگل کو تیرا خیال ظاہر کر رہا ہے اور باوجود اس کے سینکڑوں انقلاب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے۔ مگر پھر بھی تیری نظر میں نشیب و فراز کی وقعت ہے حالانکہ وجود ماسوی اللہ اور نشیب و فراز کچھ چیز نہیں ہیں اور یہ محض تیرا وہم ہی وہم ہے۔

مولوی مہدی صاحب از رسالہ اردو:- تو وجود ماسوائے اللہ کے وہم میں مت پڑ۔ جب تک تو یہ سمجھتا رہے گا کہ وجود کی قسمیں اور مراتب ہیں مثلاً وجود اور امکان وغیرہ تو اس وقت تک تیرا خیال ناقص اور ناکمل رہے گا حاصل یہ ہے کہ ایک ہستی واجب کے سوا دوسری ہستی نہ سمجھ (سعید)

۳۔ جلوہ تماشا:- جلوۂ حسن کا تماشا دکھانے والا ہے÷ دماغ:- طاقت۔ برداشت÷ پرواز:- آرائش' جلا' صیقل÷

یہ بات ہم مانتے ہیں کہ وصالِ یار جلوۂ حُسن کا تماشا دکھا دیتا ہے یعنی انتظار کے بعد جلوۂ وصل ممکن ہے۔ لیکن یہ طاقت کس میں ہے کہ بیٹھا آئینۂ انتظار کو صیقل کیا کرے۔ بالفاظ دیگر انتظار یار کیا کرے۔

۴۔ خاک ہوئے پر:- یعنی مرکر÷ ہوائے جلوہ- آرزوئے جلوہ÷

مرنے کے بعد بھی عاشق کی آرزوئے جلوۂ ناز فنا نہیں ہوئی۔ دیکھ لو۔ اس کی خاک کا ہر ذرہ آفتاب پرست ہے۔ ذرات آفتاب کی روشنی میں چمکتے ہیں۔ ان کی چمک ہی سے یہ لطیف مضمون سوجھا ہے۔

۵۔ خاک انداز:- وہ برتن جس میں کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں÷ میخانۂ جنوں۔ یعنی صحرائے جنوں÷

صحرائے جنوں کی وسعت دریافت نہ کرو۔ یہ سمجھ لو کہ وہاں کا سے گردوں کوڑا کرکٹ پھینکنے کا ایک برتن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صحرائے جنوں آسمان سے بے اندازہ بڑا ہے گویا آسمان اس کے

مقابلہ میں ایک خاک انداز ہے۔

۶۹

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتا سر خاک ۱ گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہر بار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت ۲ نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

۱۔ کرم:- سخاوت÷ سرتا سرِ خاک:- تمام رُوئے زمین پر÷

ذرا ابرِ کرم کی کوششِ کرم کی وسعت دیکھ کر وہ باوجود آبلہ پائی کے تمام روئے زمین پر گہر باری کرتا ہوا گزرتا ہے۔ قطراتِ باراں کی وجہ سے ابر کو آبلہ پا کہا ہے۔ بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ سعی کرم میں ابر کے پاؤں میں چھالے پڑگئے ہیں لیکن پھر بھی وہ سخاوت میں کمی نہیں کرتا۔ حاصل شعر یہ ہے کہ کریم سخاوت کرنے میں تکلیف کا احساس نہیں کرتا۔

۲۔ یک قلم:- یک سر۔ سربسر÷ قلم' کاغذ' صفحہ الفاظ وغیرہ مناسب الفاظ ہیں۔

میری گرمیِ رفتار کی تپش میرے نقشِ پا میں ابھی تک اتنی زیادہ باقی ہے کہ اس کے اثر سے تمام صفحۂ دشت کاغذِ آتش زدہ کی طرح جل رہا ہے اور پیچ وتاب کھا رہا ہے۔

۷۰

کیونکر اس بُت سے رکھوں جان عزیز ۱ کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے ۲ ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ ۳ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

۱۔ حالیؔ:- اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں تو وہ ایمان لے لیگا۔ اس لئے جان کو عزیز نہیں رکھتا (ایمان کو عزیز رکھتا ہوں) اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس بُت پر جان قربان کرنا عین ایمان ہے تو پھر اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جاسکتی ہے۔

۲۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ تیرے تیر کا پیکان میرے دل سے نکل گیا لیکن درحقیقت وہ میرے دل سے نہیں نکلا۔ یعنی اس کی محبت ابھی تک دل میں باقی ہے یہی وجہ ہے کہ تیرے تیر کا پیکان مجھے بہت ہی عزیز ہے۔

۳۔ تاب لائے ہی بنے گی÷ صبر کرنا ہی پڑے گا۔

غالبؔ اب تو صبر کرنا ہی پڑیگا کیونکہ واقعہ بہت سخت ہے اور اس کی سختی کا تقاضا یہ ہے کہ جان دیدی جائے۔ مگر کیا کیا جائے کہ جان بھی پیاری ہے اس لئے اس حادثہ کو برداشت ہی کرنا پڑے گا۔

۷۱

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ۱ میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل ۲ میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی ۳ ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہاں گرفتارِ الفتِ صیاد ۴ ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے ۵ ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں ۶ جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گل باز
اے ترا غمزہ یک قلم انگیز ۷ اے ترا ظلم سر بسر انداز
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو ۸ ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا ۹ میں غریب اور تو غریب نواز

اسدؔ اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

۱۔ گلِ نغمہ:- کلیا نک۔

نہ تو میں کلیا نک ہوں اور نہ پردہ ساز ہوں بلکہ میں اپنی شکست کی آواز ہوں جو سراپا درد ہے۔ گویا خوشی کے نغموں سے مجھے کوئی واسطہ نہیں۔ میری آواز میرے دل کے ٹوٹنے کی آواز ہے۔

۲۔ خمِ کاکل:- زلف کا پیچ ÷ آرائش:- سنگار ÷ اندیشہ:- خیال ÷

تو تو اپنی زلفیں بنانے سنوارنے میں مصروف ہے اور ادھر میں دور دراز کے وہموں میں کھو ہوں۔ سوال یہ ہے کہ یہ اندیشہ ہائے دور دراز کیا ہیں۔ حسرتؔ لکھتے ہیں۔ مثلاً یہ اندیشہ ہے تیری آرائش میرے کمالِ محبت سے بدگمانی کا باعث ہے یعنی تو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے گرفتارِ وفا رکھنے کے لئے ہنوز آرائشِ ظاہری کی ضرورت باقی ہے۔ حالانکہ میری محبت اس سے مستغنی ہے۔

طباطبائی:- دیکھئے اب کون کون عاشق ہوتا ہے یا کس کس عاشق کو یہ بناؤ دکھایا جاتا ہے۔

بیخودؔ:- دیکھئے کتنے نئے عاشق پیدا ہوتے ہیں اور کس قدر رقیبوں کا ہجوم مجھ پر ہوتا ہے۔

آسیؔ:- یہ آرائش مجھ پر کیا کیا ستم کرے گی۔ یہ آرائش کر کے تو کہاں جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ لاف:- شیخی ÷ تمکین:- وقار، ضبط ÷ سادہ دلی:- سادہ لوحی ÷

عشق میں تمکین و وقار کی شیخیاں زیب نہیں دیتیں۔ یقیناً یہ ہماری سادہ لوحی کے فریب ہیں۔ ورنہ عشق میں کب ممکن ہے کہ کوئی صبر و تمکین کے وعدے نبھا سکے۔ ہمارے سینے میں ایسے سینہ گداز راز بھرے ہوئے ہیں جن کا چھپانا ناممکن ہے۔ جب یہ راز ظاہر ہو جائیں گے تو لافِ تمکین کہاں باقی رہے گی (حسرتؔ، بیخودؔ، سعیدؔ)

طباطبائی:- اے لافِ سادہ دلی تیرا وصف تو یہ مشہور ہے کہ تو تمکین فریب ہے تو کچھ خبر لے کہ میرے دل میں ایسے راز ہیں جو سینہ گداز ہیں یعنی انہیں فاش کر دے کہ ان کا بوجھ میرے دل پر سے ہٹ جائے حاصل یہ ہے کہ سادہ لوحی سے اپنے ضبط و تمکین کی شکایت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ سادہ لوحی کا مقتضی افشائے راز اور تمکین و وقار کی شان اخفائے راز ہے۔

آسیؔ:- (۱) میرے ہم خیال (۲) ہم خیال طباطبائی (۳) اے لافِ تمکین تو نے میری سادہ دلی کا فریب کھایا ہے اور اس پر مطمئن ہے کہ ہمارا حال کسی پر کھل نہیں سکتا۔ حالانکہ ہمارے سینے کے اندر جو راز ہیں وہ ہرگز چھپ نہیں سکتے اور وہ سینہ گداز ہیں (۴) ہم کبھی تمکین کی شیخیاں مارتے ہیں اور کبھی اپنی سادہ لوحی کا لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب ان راز ہائے سینہ گداز کا اثر ہے جو ہمارے سینے میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں یعنی لوگ ہمارے تمکین کی لاف اور ہماری سادہ دلی کے فریب کے وجوہات سے واقف ہو گئے ہیں۔ (۵) ہماری تسکین کا دعویٰ لاف اور ہماری سادہ لوحی کا ادعا فریب سمجھا گیا ہے اور اس کا سبب، راز ہائے سینہ گداز ہیں۔

حکیم امتیاز الدین از رسالہ اردو:- کسی جگہ اضافت نہیں۔ سادہ دل سے یہاں مراد ہے دل کا اثر سے خالی ہونا اور شاعر کہتا ہے کہ ایسے راز ہائے سینہ گداز کے ہوتے ہوئے تمکین کا دعویٰ کیا جائے تو وہ بیہودہ ادعا ہے اور اگر دل کو غیر متاثر سمجھا جائے تو یہ بھی غلطی یا دھوکا ہے (سعیدؔ)

۴۔ میں صیاد کی محبت میں گرفتار ہوں۔ اس لئے نہیں اُڑتا۔ ورنہ مجھ میں ابھی طاقتِ پرواز موجود ہے۔ طباطبائی و بیخود اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تعلقاتِ دنیا نے اپنا اسیر کرلیا ہے ورنہ چاہیں تو آزاد ہوسکتے ہیں۔

۵۔ اب تک میں اس کے ناز اُٹھانے کی حسرت اپنے دل میں رکھتا ہوں خدا وہ دن کرے کہ میں بجائے حسرتِ ناز کے حقیقتاً اس کے ناز اُٹھاؤں یعنی خدا کرے میری حسرت پوری ہوجائے۔

۶۔ گلبازی:- پھولوں سے کھیلنا۔ گلباز سے مراد مسرور۔ میرے دل میں اب ایسا کوئی خون کا قطرہ باقی نہیں رہا۔ جس سے میری پلکوں نے گلبازی نہ کی ہو۔ گویا میرے دل کے تمام قطراتِ خون سے پلکوں نے گلبازی کی ہے یعنی خوشی خوشی ان کو بہایا ہے۔

۷۔ انگیز:- انگیختن سے امر÷ انداز:- انداختن سے امر÷

اے کا منادیٰ نازنین ہے ÷ **یک قلم**:- سراسر÷

اے نازنین تیرا غمزہ سراسر انگیز ہے۔ یعنی ایک دم زندہ کردیتا ہے اور تیرا ظلم سربسر انداز ہے یعنی دفعتہً مار ڈالتا ہے گویا تجھ میں زندہ کردینے اور مار ڈالنے کی متضاد صفتیں موجود ہیں۔

۸۔ ریزشِ سجدہ:- سجدہ کرنا÷

تو جلوہ افروز ہوا۔ میری جبینِ نیاز کے پے در پے سجدے مبارک ہوں (طباطبائی۔ سعیدؔ۔ بیخودؔ)

آسیؔ:- تو آگیا۔ اب مجھے تیرے لئے بہت سے سجدے کرنا مبارک ہو۔

۹۔ ''کچھ غضب نہ ہوا''۔ کثیر المعنی ہے' مثلاً کوئی بیجا بات نہیں ہوئی۔ شکایت کا اظہار ہے یا طنز ہے بطور تشکر نہیں کہا۔ اگر تو نے مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا کیونکہ میں تیری اس مہربانی کا مستحق تھا۔ دُنیا کا قاعدہ یہی ہے کہ غریب نواز غریبوں کی خبر گیری کیا کرتے ہیں۔ پس میں غریب ہوں اور تو غریب نواز ہے۔ اس لئے اگر تو نے غریب نوازی کی تو اس میں کون سا کمال ہوگیا۔

۱۰۔ تمام ہوا:- مرگیا÷ دریغا:- ہائے افسوس÷ شاہد باز:- معشوق پرست÷

اسد اللہ خاں مرگیا۔ ہائے افسوس! وہ رندِ حسن پرست کیا خوب آدمی تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

س

۷۲

مژدہ اے شوق اسیری کہ نظر آتا ہے ۱ دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا ۲ جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے ۳ خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے ۴ دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل! ۵ نہ کھڑے ہوجئے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے ۶ خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مرگیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

۱۔ پرندے پکڑنے کے لئے جال لگا کر اس کے قریب اس جانور کو پنجرے میں بند کرکے رکھ دیتے ہیں' جس کے ہم جنس پرندوں کو جال میں پھنسانا مقصود ہوتا ہے۔ جب پنجرے والا پرندہ بولتا ہے تو جنگل میں سے اس کے ہم جنس پرندے اس کے قریب آجاتے ہیں اور آتے ہی جال میں گرفتار ہوجاتے ہیں کہتے ہیں۔ اے ذوقِ اسیر تجھ کو مژدہ ہو کہ تیری آرزو پوری ہوگئی۔ کیونکہ مرغِ گرفتار کے پاس جو قفس میں بند ہے۔ ایک خالی جال بھی نظر آرہا ہے۔ اب چلو اور اُس میں گرفتار ہوجاؤ۔

۲۔ تشنۂ آزار:- آزار کا خواہشمند÷ تسلی نہ ہوا:- اس کی تسلی نہ ہوئی ۔

نہ تسلی ہوا دلِ بے تاب نہ تھا چشمِ تر سے خونِ ناب

بُن:- جڑ÷

باوجود اس کے کہ ہم نے ہر کانٹے کی جڑ کے پاس ایک خون کی نہر بہادی لیکن پھر بھی ہمارے ایذا دوست جگر کی تسلی نہ ہوئی۔

سب متفق ہیں کہ یہ خون کی ندیاں صحرانوردی میں تلوؤں میں کانٹے چبھنے سے رواں ہوئیں۔

۳۔ تم اچھے وقت میرے پاس آئے کہ حسرتِ دیدار بھی پوری نہ ہوسکی۔ میں نے تمہیں دیکھنے کے لئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن آنکھیں کھولتے ہی کھولتے ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ اسی مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا ہے ؎

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ　　یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت؟

۴۔ دشنہ:- خنجر÷

غمخوار مجھے ہر وقت ملامت کرتا ہے' طعنے دیتا ہے اس لئے ہر وقت میری جان پر بنی رہتی ہے۔ اگر اس کے پاس زبانِ طعن کے بدلے ایک تیز خنجر ہوتا تو میں اس طرح سسک سسک کر نہ مرتا۔ بلکہ وہ مجھے ایک دم ہلاک کردیتا۔

آسیؔ:- غمخوار کو بوجہ غمخوار ہونے کے' جان دینا پسند کیا ہے مگر نصیحت اور ملامت سُننا پسند نہیں اور یہ شانِ کمالِ عشق ہے۔

۵۔ دل کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ دہنِ شیر میں جا بیٹھئے۔ یعنی اپنی جان سخت ترین خطرے میں ڈال دیجئے اور لقمۂ اجل بن جائیے لیکن معشوق دل آزار کے پاس جا کر بھی کھڑے نہ ہوجائیے۔ یعنی دل لگانے سے مرنا بہتر ہے۔ بیٹھنے اور کھڑے ہونے کا مقابلہ لطف خیز ہے۔

۶۔ نمو کرنا:- بڑھنا۔ بالیدگی÷

تجھ کو دیکھ کر چمن میں اس قدر بالیدگی ہوتی ہے کہ گل تیرے گوشۂ دستار کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے دیدار سے ہر شے میں ولولۂ شوق پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ ہائے افسوس کہ غالبؔ وحشی سر پھوڑ کر مر گیا۔ اب ہمیں اس کا تیری دیوار کے پاس شوقِ دیدار میں یا سر پھوڑنے کے لئے آکر بیٹھنا یاد آتا ہے۔ ایک اور جگہ کہا ہے ؎

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا　　یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

☆☆☆☆☆☆☆

ش

۴۷

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے　۱　لگادے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق　۲　نہ نکلے شمع کے پاس سے نکالے گر نہ خار آتش

۱۔ خسِ جوہر:- خس جوہر آئینہ یعنی جوہر آئینہ، طراوت:- نمی÷ نگار:- محبوب÷

گر خسِ جوہر آئینہ سبزۂ خط سے طراوت حاصل نہ کرے تو یقیناً خانۂ آئینہ میں یار کے آتشین رُخ کے عکس سے آگ لگ جائے۔ مطلب یہ ہے۔ شعلۂ حسن کا اثر سبزۂ خط کی نمی کی وجہ سے آئینہ کے خسِ جوہر کو نہیں جلاتا۔ اگر سبزۂ خط کی نمی نہ ہو تو خسِ جوہر جل کر خاک ہوجائے۔

۲۔ شمع کی بتی کو خار کہا ہے' آتش کو فروغِ حسن شمع کو خار شمع سے تشبیہ دی ہے اور اس خار کو نکالنے والا شعلۂ شمع قرار دیا ہے۔ جب شمع روشن ہوتی ہے تو رشتۂ شمع جل جاتا ہے۔ رشتۂ شمع پائے شمع میں خار ہے۔ اس کے جلنے سے گویا شمع کے پاؤں میں سے خار نکل جاتا ہے۔ ظاہر ہے خارِ پا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے اس کے نکل جانے سے شمع (عاشق) کی مشکل حل ہوجاتی ہے اسی طرح معشوق کے فروغِ حسن سے عاشق کی مشکل حل ہوتی ہے جو شمع کی طرح جلتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ع

۴۷

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

جادۂ راہ:- بٹیا۔ جس سرزمین پر سے لوگ گزرتے ہیں وہاں قدموں کے اثر سے ایک لکیر پڑ جاتی ہے۔ اسے لیک بھی کہتے ہیں۔ خور:- خورشید÷ تارِ شعاع:- وہ سفید خط جو غروبِ آفتاب کے بعد اور طلوعِ آفتاب سے پہلے آسمان پر چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اُس کو قرنی الشمس کہا جاتا ہے۔

شام کے وقت جب آفتاب رخصت ہوتا ہے تو تارِ شعاع اس کے لئے جادۂ راہ (جانے کا راستہ) بن جاتا ہے اور آسمان ماہِ نو کے ذریعہ سے اپنی آغوشِ وداع کو اسے رخصت کے لئے وا کردیتا ہے۔ ماہِ نو کی صورت بجنسہٖ ایسی ہوتی ہے۔ جیسے کوئی بغلگیر ہونے کو اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دے۔ مطلب یہ ہے کہ وقتِ شام آفتاب آمادۂ سفر ہے اور آسمان اسے رخصت کرنے کو تیار۔

آسی:- وقتِ شام آفتاب جو آسمان سے رخصت ہوتا ہے اور اُس پر ہلال نمودار ہوتا ہے تو وہی شعاع اس کے واسطے جادۂ راہ ہے اور ماہِ نو وہ آغوشِ کشادہ ہے جو آسمان نے سورج کو رخصت کرنے کے لئے کھولی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ شام کے وقت آسمان آفتاب کو رخصت کر دیتا ہے۔

آسی شعاع کے معنی وہ نہیں لیتے جو باقی شارحین نے لئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ شعاع کے یہ معنی خلافِ قیاس ہیں۔

۷۵

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع ۱ ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع!
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی ۲ یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع
کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام ۳ بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع!
غم اُس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ ۴ ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع
ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے ۵ بجلوہ ریزیٔ باد و بہ پر فشانیٔ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ ۶ شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیٔ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو ۷ نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

۱۔ سوزِ جاودانی:- سوزِ دائمی ÷ آتشِ گل:- رشکِ آتشِ گل ÷ آبِ زندگانی:- آبِ حیات ÷ آتشِ گل:- سُرخیِ گل یعنی سرخیِ رخسار ÷

معشوق کے رُخِ انوار کو دیکھ کر شمع رشک کی وجہ سے سوزِ دائمی میں مبتلا ہوگئی۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کے رخساروں کی سرخی جو آتشِ گل سے مشابہ ہے شمع کے لئے آبِ حیات بن گئی ہے گویا وہ رشکِ رخسار سے ہمیشہ جلتی ہے۔ اور جلتی رہے گی شعراء بجھی ہوئی شمع کو شمعِ کشتہ کہتے ہیں۔ شاعر نے اسی خیال کے ماتحت روشن شمع کو زندہ فرض کرلیا اور یہ مضمون پیدا کیا۔

۲۔ یہ بات:- یعنی اہلِ زبان مرگ کو خاموشی کہتے ہیں ÷ روشن ہوئی:- ظاہر ہوئی۔ اہلِ زبان کے محاورے میں خاموشی مرگ کے مترادف ہے اور یہی بات شمع کی زبانی بزم میں بھی ظاہر ہوگئی۔ مطلب یہ ہے کہ جب شمع بُجھ جاتی ہے تو اُس کو شمعِ کشتہ یا مردہ کہتے ہیں یا شمع کی لو کو زبان شمع کہا جاتا ہے شمع کا خاموش ہوجانا اس کا فنا ہوجانا ہے۔ اس لئے وہ زبانِ حال سے اس نکتہ کو ظاہر

کرتی ہے کہ اہلِ زبان کا خاموش رہنا ان کی موت ہے۔

۳۔ ایما:- اشارہ ÷ قصہ تمام کرنا:- زندگی ختم کرنا یعنی جل بُجھنا۔

شمع صرف شعلہ کے اشارے سے اپنی زندگی کا قصہ تمام کرلیتی ہے یعنی شعلہ کی محبت میں جل بجھتی ہے۔ گویا شمع کی فسانہ خوانی اہلِ فنا کی طرح ہے جو شعلۂ عشقِ الٰہی سے لو لگا کر فنا ہوجاتے ہیں۔ (طباطبائی۔ سعید۔ بیخود)

آسی:- شمع کی فسانہ خوانی اور اپنا قصہ سُنانا اس طرح ہے جیسے کہ عارف اپنا حال اشاروں میں ظاہر کرتے ہیں۔ شمع کے شعلہ کی جنبش کو اشارہ اور جل بجھنے کو قصہ کا تمام کرنا فرض کیا ہے۔ اہلِ فنا کے جل بجھنے کو فسانہ خوانی نہیں کہہ سکتے۔ اگر چہ جل بجھنے سے قصہ تمام ضرور ہوجاتا ہے گویا دوسرے معنوں میں فسانہ خوانی بیکار ہوجاتی ہے۔

مولوی مہدی از رسالہ اردو:- شمع کی فسانہ خوانی ان لوگوں کی طرح ہے جو اپنی ذات میں فنا ہوکر خودی کو ترک کردیتے ہیں۔ فسانہ خوانی سے فنا ہونا مراد ہے اور جس کے ایما سے شمع اپنا قصہ تمام کرتی ہے یعنی فنا ہوتی ہے وہ شعلہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے لو لگا کر اپنی ہستی کو مٹا دیتی ہے۔ (سعید)

۴۔ اے شعلے تیرے لرزنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمع حسرتِ پروانہ کے غم میں ناتواں ہوگئی ہے۔ گویا شمع کی لو کا لرزنا شمع کی ناتوانی کی نشانی ہے اور یہ لرزنا اس وجہ سے ہے کہ وہ حسرت و ناکامیٔ پروانہ کے غم میں گھلے جاتی ہے۔

۵۔ اہتزاز:- خوش ہوکر جھومنا ÷ بجلوہ میں بائے قسمیہ ہے ÷ جلوہ ریزیٔ باد:- ہوا کا چلنا ÷ پرفشانیٔ شمع:- شمع کا جھلملانا ÷

قسم ہے مجھ کو شمع کے جھلملانے اور ہوا کی جلوہ ریزی کی کہ تیرے خیال سے میری رُوح میں فرطِ انبساط سے جنبش ہوتی ہے۔ (آسی، سعید، طباطبائی)

حسرت، بیخود:- تیرے خیال سے رُوحِ عاشق کو ایک جنبشِ سرور حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح ہوا چلنے سے شعلۂ شمع کو حرکت پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح تیرے خیال سے مستی سرور پیدا ہوجاتی ہے۔

ظاہر ہے "ب" کو بائے قسمیہ قرار دینے میں جس قدر لطف ہے۔ وہ بائے تشبیہ مقرر کرنے میں نہیں۔

۶۔ شہید:۔ کُشتہ ÷ خزانی:۔ خزاں زدہ ÷ شہید:۔ عاشق؛ مٹی ہوئی۔

گل میں ایہام ہے۔ غم عشق کی داغ کی خوشی کی بہار کا حال مجھ سے نہ پوچھ بلکہ یوں سمجھ لے کہ شگفتگی اور بہار۔ شمع کے گلِ خزاں زدہ پر ہزار جان سے مٹی پڑی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غمِ عشق کے کمہلائے ہوئے داغ میں وہ بہار ہے جس پر شگفتگی نثار ہے۔

۷۔ شمع بالینِ یار پر مجھ کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر جلتی ہے۔ اس جلنے سے ظاہر ہے کہ وہ میری رقیب ہے۔ جب وہ رقیب ٹھہری تو پھر وہ اس بدگمانی کا داغ میرے دل پر کیوں نہ ہو یعنی پھر میں کیوں نہ اس سے بدگمان ہوجاؤں رقیب سے بدگمان ہوجانا عاشق کا عمومی دستور ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ف

۷۶

بیم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش　　مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے　　اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

۱۔ وداعِ ہوش کرنا:۔ بیخود ہونا ÷ بیم:۔ خوف ÷

رقیب کے خوف کے مارے ہم بیخود ہونا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ ہماری بیخودی سے فائدہ اُٹھالے گا۔ یا ہمارے رازِ عشق سے واقف ہوجائیگا۔ اے اختیار تجھ پر افسوس ہے۔ اب ہم اس حد تک مجبور اور بے اختیار ہوگئے ہیں کہ وداعِ ہوش بھی نہیں کرسکتے۔

۲۔ اے آہ شعلہ بار تیری ناتمامی پر افسوس ہے کہ کیوں تو نے ہمیں ایک دم جلا کر خاک نہ کردیا۔ تُو ہمیں آہستہ آہستہ جلارہی ہے اور اس بات سے میرا دل کڑھتا ہے۔ اس شعر میں ایک طب کا مسئلہ ہے جو میرزا صاحب نے پہلے بھی بیان کیا ہے یعنی ہر سانس کے ساتھ جو ہوا جسم میں داخل ہوتی ہے وہ ترویجِ قلب بھی کرتی ہے اور حرارتِ غریزی کو برانگیختہ بھی اور یہی حرارت فنا و بقا کا باعث ہے۔

ک

۷۷

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک　۱　کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل　۲　ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہوجیو　۳　نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج　۴　گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ وا　۵　یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے　۶　دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیرِ درد　۷　زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سرتا پا نمک

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

۱۔ دیوانے کو بچے پتھر مار کر ستایا کرتے ہیں۔ غالبؔ اپنے آپ کو دیوانہ تصور کرتے ہیں اور ان بچوں کی شکایت کرتے ہیں کہ یہ بے پروا بچے میرے زخموں پر نمک کہاں چھڑکتے ہیں (یعنی نہیں چھڑکتے) اگر ان پتھروں میں جو وہ مارتے ہیں نمک ہوتا تو کیا لطف آتا۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے دوگنی لذت حاصل ہوتی یعنی پتھر بھی لگتے اور زخموں پر نمک بھی۔

۲۔ یوں تو دُنیا میں نمک بہت پیدا ہوتا ہے اور جس قدر ہم چاہیں اپنے زخموں پر چھڑکنے کے لئے بہم پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن میرے زخمِ دل کے لئے تو راہِ یار کی گرد سامانِ فخر و ناز ہے۔ اس خیال میں نزاکت یہ ہے کہ نمک ابتدا میں واقعی بہت تکلیف دیتا ہے مگر آخر کار زخم کو بھر دیتا ہے۔ برخلاف اس کے گرد سے زخم اور زیادہ خراب ہوتا ہے۔ اسی لئے گرد کو نمک پر ترجیح دی ہے۔ طباطبائی نے ایک یہ معنی بھی پیدا کئے ہیں کہ دُنیا میں نمک اتنا کہاں ممکن ہے جس پر میرا زخمِ جگر ناز کرے۔

۳۔ ارزانی رہے:۔ مبارک ہو ÷ اس شعر میں لف و نشر مرتب ہے
مجھے نالۂ بلبل کا درد ارزانی رہے اور تجھے خندۂ گل کا نمک مبارک ہو۔

آسی:- تجھے حُسن نے گل کی طرح خندۂ نمکین عطا کیا ہے اور اس خندۂ نمکین نے مجھے نالۂ ردرد بلبل دیا ہے اس لئے دونوں قابلِ مبارک باد ہیں۔ وہ نمک تیرے لئے باعثِ فخر اور یہ درد یرے لئے مایۂ ناز ہے۔

طباطبائی ہوجیو کو مکروہ قرار دیتے ہیں اور آسی لکھتے ہیں کہ اس عہد میں یہ متروک نہ تھا۔

۴۔ جولاں:- گھوڑے کا دوڑانا ÷ شور:- دریا کی صفت۔ ویسے شور کے معنے نمک کے بھی یں۔

آج دریا کے کنارے کس نے اپنے توسنِ ناز کو جولانی دی ہے کہ اس کے شورِ جولان سے گردِ ساحل نمک بن کر موجِ دریا کے زخموں پر چھڑکتی ہے گویا گردِ ساحل رشک سے نمک بن گئی ہے۔ جہ رشک یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں دریا کے زور شور کی کچھ حقیقت نہ رہی۔

اصلی خیال یہ ہے کہ میرے محبوب کا توسن موجِ دریا سے بھی زیادہ تیز خرام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی لٹائی ہوئی گرد نے موجِ دریا کے زخموں پر نمک چھڑکا یعنی اس کو رشک پیدا ہوگیا۔ کیونکہ دریا کی رفتار میں یہ زور شور اور روانی نہیں۔

۵۔ داد دینا:- تعریف کرنا ÷

میرا محبوب میرے زخموں کا ایسا زبردست قدردان ہے کہ وہ جہاں کہیں نمک دیکھتا ہے مجھے اد کرتا ہے یعنی بے اختیار اسے میرے زخم یاد آجاتے ہیں۔ طباطبائی یاد کرنے کے معنی بلانے کے لیتے ہیں یعنی پھر وہ مجھے بُلا کر میرے زخموں پر نمک چھڑکتا ہے۔

۶۔ اے محبوب عاشق کو زخمی چھوڑ کر چلے جانا افسوس کی بات ہے۔ ایسے وقت میں تیرا ٹھہرنا نروری ہے۔ کیونکہ اس کا دل اس بات کا آرزومند ہے کہ تو اس کے زخموں پر نمک چھڑک کر لذتِ رد میں اضافہ کرے۔

۷۔ منّت کھینچنا:- احسان اُٹھانا ÷ توقیرِ درد:- درد زیادہ کرنا ÷

خندۂ قاتل کو بوجہ حسنِ ملیح نمک کہا ہے۔ خندۂ زخم ایک عام استعارہ ہے۔ درد کو زیادہ رنے کے لئے میں معشوق کے علاوہ کسی غیر کا احسان ہرگز نہ اُٹھاؤں گا۔ یعنی میں کسی اور سے رخواست نہ کروں گا کہ وہ میرے زخموں پر نمک چھڑکے۔ اگر معشوق نہیں چھڑکتا تو کچھ مضائقہ

نہیں۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ جس طرح خندۂ معشوق نمکین ہے۔ اسی طرح میرا زخم بھی خندہ ہے اور اس کے خندۂ نمکین کے اثر سے میرا زخم سرتاسر نمک بنا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے مجھے نمک کے لئے منّتِ غیر اُٹھانے کی کیا ضرورت' میرا زخم اس کے خندۂ نمکین سے نمک کی کان بنا ہوا ہے۔

۸۔ یہ عورتوں کا عقیدہ ہے کہ اگر نمک زمین پر گرجائے تو اسے پلکوں سے اُٹھانا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ نمک کا گرنا گناہ ہے اور یہ بھی زبان زدِ خاص و عام ہے کہ اگر کسی سے نمک گرجائے تو قیامت کے دن وہ نمک اُسے پلکوں سے چُننا پڑتا ہے اس لئے عموماً بہت احتیاط کی جاتی ہے۔ کہ نمک گرنے نہ پائے۔

کہتے ہیں غالب! تمہیں وہ دن یاد نہیں رہے۔ جب زخم سے نمک گرجاتا تھا تو تم فرطِ شوق سے اسے اپنی پلکوں سے چنتے تھے یعنی تم وہ اپنی ایذا دوستی کا زمانہ بھول گئے؟

ممکن ہے کہ محض مذکورہ بالاقدیم الاعتقاد کی طرف اشارہ کیا ہو اور درد کا پہلو خود بہ خود نمایاں ہوگیا ہو۔

۷۸

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک	۱	کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ	۲	دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب	۳	دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن	۴	خاک ہوجائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم	۵	میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل	۶	گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ایک عمر:- مدّتِ دراز ÷ سر ہونا:- (۱) سمجھنا۔ باخبر ہونا۔ (۲) مہم سر ہونا۔

آہ کو اثر پیدا کرنے کے ایک مدّتِ دراز درکار ہے۔ جب تک آہ میں اثر پیدا ہوگا اور تیری زلف ہمارے حالِ زار سے باخبر ہوگی۔ اس وقت تک ہمارا خاتمہ ہوجائے گا (سعید)

۲۔ کام:- دہن÷ نہنگ:- مگر مچھ÷

ہر موج ایک جال ہے اور اس کے جال کا ایک ایک حلقہ "صد کام نہنگ" کا بنا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک ایک موج میں سینکڑوں مگر مچھ منہ پھاڑے ہوئے ہیں۔ ایسی خطرناک حالت میں دیکھئے قطرہ کے موتی بننے تک کی مدت میں اس پر کیا کیا آفتیں آتیں ہیں۔ بقول حالی مطلب صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ رنگ:- حال' علاج' تدبیر÷ عاشقی صبر طلب:- عشق میں صبر سے کام چلتا ہے۔ بے صبری معاملات کو بگاڑ دیتی ہے۔

کہتے ہیں عاشقی میں صبر کرنا پڑتا ہے کیونکہ بغیر صبر کے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ لیکن تمنا مجھے بیتاب کررہی ہے کہ حصولِ مطلب میں جلدی کر۔ اس طرح سے میں عجیب کشمکش میں پھنس گیا ہوں۔ ایسی حالت میں جب تک جگر خون ہوکر عشق میں پختگی اور اثر پیدا ہو میں دل کی کیا تدبیر کروں۔ گویا میں اسے کیونکر سنبھالوں۔

۴۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تم ہماری طرف سے تغافل نہ کروگے اور ہماری جلدی خبر لوگے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ جتنی دیر میں تمہیں ہماری خراب حالت کی خبر پہنچے گی اتنی دیر میں ہمارا کام تمام ہوجائیگا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ سوزِ دل کو برداشت کرسکیں۔

۵۔ پرتوِ خور:- تمازت آفتاب' دھوپ۔

حکماء کا قول ہے کہ شبنم تمازت آفتاب ہی سے پیدا ہوتی ہے اور تمازت آفتاب ہی اسے جذب کرلیتی ہے۔ کہتے ہیں جس طرح دھوپ شبنم کو فنا کی تعلیم دیتی اور اسے فنا کردیتی ہے بجنسہٖ یہی میری حالت ہے گویا آپ آفتاب ہیں اور میں شبنم کا قطرہ ہوں۔ اس لئے میری زندگی محض آپ کی ایک محبت بھری نظر تک ہے۔ جب آپ آفتاب کی طرح مجھ پر اپنا پرتو ڈالیں گے تو میں قطرۂ شبنم کی طرح فنا ہوجاؤں گا اور اس طرح سے تعلیم فنا حاصل کروں گا۔

۶۔ اے غافل انسان! زندگی کی فرصت اتنی قلیل ہے کہ تو بمشکل دنیا کو ایک نظر دیکھ سکتا ہے۔ یوں سمجھ لے کہ بزمِ دنیا کی رونق اتنی دیر تک قائم رہتی ہے جتنی دیر میں ایک چنگاری رقص کرکے بجھ جاتی ہے۔ ذوق لکھتے ہیں ۔

کیا اعتبار ہستی ناپائدار کا — چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

۷۔ اے اسدؔ! غمِ زندگی کا علاج موت کے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا دیکھو! چاہے محفلِ غم ہو یا بزمِ نشاط۔ شمع کو ہر صورت میں صبح تک جلنا ہی پڑتا ہے۔ قاعدہ ہے۔ جب تک صبح نہیں ہوتی یا شمع ختم نہیں ہوجاتی ہے جلایا جاتا ہے اور اس کو جلنا پڑتا ہے۔ بجنسہٖ یہی حالت انسان کی ہے جب تک اسے موت نہیں آتی۔ اس کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوتا اور اسے خوش و ناخوش زندگی کے اوقات پورے کرنے پڑتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

گ

۷۹

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ ۱ یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد ۲ مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

۱۔ اجابت:- قبول÷ بغیر:- سوائے÷

اگر تجھ کو اپنی دعا کے قبول ہونے کا یقین ہے تو کوئی اور دُعا نہ مانگ یعنی صرف دُعا مانگ کہ تجھ کو دلِ بے مدعا مل جائے۔ جب تجھے دلِ بے مدعا مل جائیگا تو کسی اور چیز کے لئے دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

آسی:- اگر تجھ کو اپنی دُعا کے قبول ہوجانے کی بھی اُمید ہے تو تب بھی دُعا نہ کر' اپنے دل کو بے مدعا رکھ اور ہمیشہ اسی خواہش میں رہ کہ دل میں کوئی مدعا پیدا نہ ہو۔ نہ دل میں کوئی خواہش پیدا ہوگی' نہ دُعا مانگنے کی ضرورت پڑے گی۔

۲۔ حالیؔ:- اس شعر میں ایک نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے بظاہر شاعر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ اور درپردہ الزام دیتا ہے۔ گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں وہ شمار میں اس قدر ہیں کہ جب ان کو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تُو نے دُنیا میں دیئے ہیں اور جو شمار میں اس کثرت سے ہیں۔ جس کثرت سے میرے گناہ

ہیں ان کی گنتی یاد نہیں آتی۔ گناہ اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدمِ استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کرسکا۔ کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میسّر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کئے ہیں۔ اتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

ل

۸۰

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل! ۱ بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف ۲ ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مرگیا ۳ اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل
خوشحال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو ۴ رکھتا ہو مثلِ سایۂ گُل سر بپائے گُل
ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لئے بہار ۵ میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گُل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے ۶ مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل
سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی ۷ خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل
تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک ۸ بے اختیار دوڑے ہے گُل درقفائے گُل

غالبؔ مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

۱۔ بلبل فریب وفائے گل پر کس قدر مٹی ہوئی ہے کہ گل بھی اس کی حماقت پر ہنستے ہیں یعنی بلبل اس دھوکے میں مری جاتی ہے کہ رنگِ گل میں وفاوثبات ہے اور پھول اس بناء پر ہنستے ہیں کہ اُس نے خوب دھوکا کھایا۔

بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

۲۔ ہوائے گل:- مراد بوئے گل۔

گل شگفتہ کو ٹوٹا ہوا حلقۂ دام کہا ہے اور وہ اس لئے کہ اس میں بوئے گل مقید تھی۔ غنچوں کے کھل جانے سے بوئے گل کے دام کے حلقے ٹوٹ گئے ہیں اور حلقہ ہائے دام ٹوٹ جانے سے بوئے گل آزاد ہوگئی ہے لہذا بوئے گل (نسیم) کو آزادی مبارک ہو۔

۳۔ تمام لوگ موجِ رنگ کے دھوکے میں آگئے اور اس پر مفتون ہو گئے۔ درحقیقت وہ موج رنگ نہ تھی بلکہ وہ گل کی نوائے خونیں اور نالہ خونچکاں تھا۔

آسیؔ نے اس سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ پھول کا گریۂ خونیں کس قدر بے اثر تھا۔

سعید:- چمن میں جو کوئی پھول تھا۔ وہ موجِ رنگ کے دھوکے میں مرگیا۔ یعنی اس دھوکے میں کہ اس نے اس رنگ کو مستقل اور پائیدار سمجھا۔ گرچہ وہ بالکل بے ثبات تھا۔ افسوس ہے کہ اب وہ پھول دھوکے میں آنے پر بڑی غمناک اور دل سوز آواز میں نالہ کر رہے ہیں۔ اور ان کی حالت قابلِ افسوس ہے۔

۴۔ حریف:- مراد عاشق ÷ گُل:- مراد معشوق ÷

وہ بدمست عاشق کس قدر خوش نصیب ہے۔ جس کا سرمایہ گل کی طرح محبوب کے پاؤں پر رکھا ہو۔ سیہ مست عاشق کو سایہ گل سے اور معشوق کو گل سے تشبیہ دی ہے اور ہماری شاعری میں یہ تشبیہ نادرات سے ہے۔

۵۔ ایجاد کرنا:- وجود میں لانا۔ پیدا کرنا ÷ نفسِ عطر سائے گل:- نگہتِ معطر ÷

بہار پھولوں کو تیرے لئے پیدا کرتی ہے تاکہ تو انہیں کام میں لائے یعنی تو ان کے ہار بنا کر گلے میں ڈالے۔ اپنے بستر کو ان سے زینت دے ان کے ساتھ گلبازی کرے وغیرہ وغیرہ' یہ باتیں ایسی ہیں جو موجب رشک ہیں اس لئے نفسِ عطر سائے گل (نگہتِ معطر) میری رقیب ٹھہری۔

۶۔ مینا:- شیشۂ شراب ÷ ہوائے گل:- آرزوئے گل ÷

موسمِ بہار میں شیشے میں شراب اور دل میں آرزوئے سیرِ گل ضرور ہونی چاہئے چونکہ میرا شیشہ شراب سے اور دل ہوائے سیرِ گل سے خالی ہے۔ اس لئے میں ہمیشہ موسمِ بہار سے شرمندہ رہتا ہوں (آسیؔ۔ بیخودؔ)

طباطبائی:- سعید:- یہ شعر ایک سوال مقدر کا جواب ہے یعنی میرا شراب پینا اور باغوں کی

سیر کرنا لوگ بُرا سمجھتے ہیں۔ مگر میں ایسا نہ کروں تو تجھے بادِ بہاری سے شرمندگی ہوتی ہے۔

۷۔ سطوت:- رعب دبدبہ÷ خوں ہے:- ناپسند ہے÷

تیرا حسن غیرت والا ہے اور اسے اس بات کی تاب نہیں کہ اس کا عاشق اس کے سوا کسی اور چیز کو محبّت کی نظر سے دیکھے۔ چنانچہ تیرے رعب حسن کی وجہ سے میری نظروں میں رنگِ ادائے گل خون بن گیا ہے۔ یعنی میں گل کی دل فریبی اور اداؤں کو پسند نہیں کرتا۔

۸۔ قفا:- پیچھے۔ گل درقفائے گُل:- پھول کے بعد پھول÷

ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک اس دھوکے میں تو جلوہ گر ہوا ہے۔ پھول ایک دوسرے کے پیچھے بے اختیار دوڑے چلے آتے ہیں کہ تیرا جلوہ دیکھیں مطلب یہ ہے کہ پھول اس دھوکے میں کہ صحنِ چمن میں تو جلوہ گر ہے۔ ایک دوسرے کے بعد کھلتے چلے جاتے ہیں۔

بیخود:- جب کوئی پھول کھلتا ہے تو کلیاں یہ سمجھ کر کہ تو پھول کے پردے میں جلوہ گر ہوا ہے۔ پھول بن کر سلسلہ وار کھلنی شروع ہوجاتی ہیں اور اس سلسلہ کو دیکھ کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک پھول کے پیچھے دوسرا پھول بھاگتا آرہا ہے۔

۹۔ ہم آغوشیِ آرزو:- یعنی آرزوئے ہم آغوشی۔ وصل÷ جیبِ قبا:- گریبان÷

غالبؔ مجھے اس شاہدِ حقیقی سے ہم آغوشی کی آرزو ہے کہ جس کے خیال سے گُل نے اپنے گریبان کو زینت دی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

م

۸۱

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس ۱ برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال ۲ ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم
باوجودیک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں ۳ ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو ۴ ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پُر خوں کو زنداں خانہ ہم

۱۔ بیش از یک نفس:- دم بھر سے زیادہ

ہم آزاد ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ آزادوں کو دُنیا میں ایک دم بھر سے زیادہ غم نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے غمکدہ کی شمع کو برق سے روشن کرتے ہیں جیسے برق کی چشمک دم بھر سے زیادہ نہیں جلتی اسی طرح ہم آزاد لوگوں کے غم والم بھی بیش از یک نفس نہیں رہتے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہمارے ماتم خانہ میں غم دم بھر سے زیادہ نہیں رہتا تو روشنی بھی دم بھر سے زیادہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم چشمکِ برق کو کام میں لاتے ہیں۔

۲۔ گنجفہ کھیلنے والے پتوں کو بار بار انگلیوں میں پھیلا پھیلا کر دیکھتے ہیں اور تمام بازیوں کے ورق شمار کرتے ہیں ورق گردانی:- گردانی میں یٔ زائد ہے۔ ورق گردان یعنی ورق گردانندہ۔ گنجفہ اور ورق میں رعایتِ لفظی ہے۔

ہمارا خیال ہر وقت ان محفلوں کی یاد کو تازہ کرتا ہے جو برہم ہوچکی ہیں۔ گویا ہم ان گزری ہوئی صحبتوں کے ورق گرداں ہیں جن کو ہم نیرنگ بت خانہ سمجھتے ہیں۔ گنجفہ کی ورق گردانی سے محفلِ نشاط کی برہمی کو تشبیہ دی ہے۔

۳۔ یک جہاں ہنگامہ:- بہت زیادہ ہنگامہ اور جوش وخروش÷ پیدائی:- ظہور÷

باوجود اس کے کہ ہماری ہستی بہت ہی ہنگامہ خیز ہے لیکن بایں ہمہ شوراشوری ہم اس چراغاں سے مشابہ ہیں جو پروانوں کے دل میں ہوتا ہے مطلب یہ کہ ہنگامہ ہستی بہت ہے لیکن حقیقت میں اس کا وجود نہیں۔

۴۔ ہمتِ مردانہ قناعت پر تکیہ کرتی ہے' لیکن ہم نے جو ترکِ جستجو یعنی قناعت کی ہے وہ قناعت کی وجہ سے نہیں بلکہ ضعف وکمزوری کی بنا پر ہے۔ اس لئے ہم ہمتِ مردانہ کی تکیہ گاہ کے لئے وبالِ جان ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ہمت کو اپنا تکیہ گاہ بناتے ہیں۔ لیکن ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس لئے تکیہ گاہ ہمتِ مردانہ کو خیال کرتی ہے۔

۵۔ دائم الحبس:- ہمیشہ کے لئے قید÷

میرے دل میں لاکھوں آرزوئیں ہمیشہ کے لئے قید ہیں' اس لئے میں اپنے دلِ پُرخوں کو زنداں خانہ خیال کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری آرزوئیں لاکھوں ایسی ہیں جو کبھی پوری نہ ہوں گی۔

۸۲

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر   متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

دل بستگی:۔ تعلق خاطر۔ اس کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے÷ متاع:۔ دولت۔ سرمایہ÷ صدا:۔ آواز زنجیر یعنی نالۂ زنجیر÷

جس طرح خانۂ زنجیر کا اثاث البیت سوائے صدائے زنجیر کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس طرح دل بستگی کا مال و منال بھی نالہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے اگر تجھے دل بستگی درکار ہے تو حاصلِ دل بستگی یعنی نالہ و بکا کو فراہم کر' مطلب ہے کہ دل بستگی کے لئے نالہ کشی اختیار کرنی چاہئے کیونکہ حاصلِ دل بستگی نالہ ہے۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ اس بیان سے تعلقاتِ دنیا کی مذمت مقصود ہے۔

۸۳

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور ۱ رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا ۲ رکھ لیجو میرے دعویٔ وارستگی کی شرم

۱۔ حالی:۔ پردیس میں مرنا جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس پر خدا کا شکر اس لئے کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور وکفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اس واسطے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور کس رتبے کا آدمی تھا۔ لیکن وطن میں جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو مگر خریدار و غمخوار ایک بھی نہ ہو۔ وہاں مُردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلّت کی بات تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اُس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے۔ لیکن فی الحقیقت سراسر اہلِ وطن کی شکایت ہے۔ جس کو ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔

۲۔ کمیں:۔ گھات÷ وارستگی:۔ آزادی÷

اے خدا! دامِ زلف کے حلقے بہت بُری طرح میری گھات میں ہیں اور ادھر میں آزادی کا دعوے دار ہوں۔ اگر میں اس دام کے حلقوں میں گرفتار ہوگیا تو میری آزادی کا دعویٰ باطل ہو جائے گا۔ اس لئے میرے دعوئے آزادی کی شرم رکھ لینا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ن

۸۴

لُوں دام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

دام:۔ اُدھار' قرض÷ خوابِ خوش:۔ خوابِ شیریں÷

میں اپنے بختِ خفتہ سے ایک خوابِ شیریں قرض تو لے لُوں لیکن مجھے خوف یہ ہے کہ میں اس قرض کو ادا کیسے کروں گا۔ اس کی ادائیگی تو اس صورت میں ممکن تھی کہ مجھے نیند آتی۔ جب نیند نہیں آتی تو پھر خوابِ شیریں کہاں سے آئے گا۔ کہ میں اسے ادا کر سکوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ تقدیر سو رہی ہے اور میں بے خواب ہوں۔ خوب شعر ہے۔

۸۵

وہ فراق اور وہ وصال کہاں ۱ وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ۲ ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا ۳ شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے ۴ اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا' ۵ دل میں طاقت' جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق' ۶ واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دُنیا میں سر کھپاتا ہوں' ۷ میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہوگئے قویٰ غالبؔ!
وہ عناصر میں اعتدال کہاں!

۱۔ یہ ساری غزل زمانۂ ماضی کی یاد میں ہے۔ کہتے ہیں۔ وہ فراق وصال کے لطف خواب و خیال ہوگئے۔ نہ وہ راتیں رہیں نہ دن رہے۔ غرض وہ دن وہ راتیں' وہ مہینے اور سال سب رخصت ہوگئے۔ اب زمانۂ ماضی کی باتیں خواب اور خیال معلوم ہوتی ہیں۔

۲۔ شوق بمعنی عشق۔اب عشق و عاشقی کے کاروبار کی کسے فرصت ہے۔وہ زمانہ ہی گزر گیا۔یہاں تک کہ نظارۂ جمال کا ذوق بھی دل میں باقی نہیں رہا۔

۳۔ دل کا تو ذکر ہی کیا ہے' اب وہ پہلے جیسا دماغ نہیں رہا۔ جب یہ صورت ہے تو پھر جنونِ عشق کیوں کر باقی رہ سکتا ہے۔

۴۔ شخص سے مراد معشوق ہے۔معشوق کا لفظ اس لئے استعمال نہیں کیا کہ عشق و عاشقی کے خیالات محو ہو چکے ہیں÷ رعنائیِ خیال:- شوخی و رنگینی خیال۔

ہمارے خیال میں جس قدر رعنائیاں اور رنگینیاں تھیں' وہ سب ایک شخص کے تصور اور محبت کی وجہ سے تھیں۔ چونکہ اب وہ تصور دل سے مٹ گیا۔ اس لئے وہ شوخیاں بھی جاتی رہیں۔ تصور کا لفظ عشق کی جگہ لائے ہیں اور یہ بھی شخص کی طرح سے مقتضائے مقام ہے۔

۵۔لہو رونا:- اشک خونی بہانا ÷ حال:- وقت

لہو کے آنسو بہانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے دل و جگر میں بڑی طاقت چاہئے۔ چونکہ ہماری تمام طاقت سلب ہو چکی ہے یعنی ہم بہت زیادہ خون کے آنسو بہا چکے ہیں' اس لئے اب ہمارے دل وجگر میں خون کے آنسو رونے کی طاقت باقی نہیں رہی۔

۶۔قمار خانہ:- جُوئے خانہ÷

ہم سے قمار خانۂ عشق ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔اب ہم وہاں کس برتے پر جائیں۔ کیوں کہ گرہ میں مال نہیں رہا۔مطلب یہ ہے کہ ہم نقدِ دل تو پہلے ہی ہار چکے ہیں۔ اب وہاں جا کر کس چیز پر داؤ لگائیں گے۔

طباطبائی اور آسی:- مال سے نقدِ دل اور اشرفی داغ مراد لیتے ہیں۔ اور سعید و مجنوں نقدِ دل اور دولت صبر وغیرہ۔

۷۔ وبال:- مصیبت یعنی فکرِ دُنیا۔

میں تو ایک آزاد اور بے فکر انسان تھا۔ لیکن اب ہر وقت تفکراتِ دُنیا سے پریشان رہتا ہوں۔ ظاہر ہے میرا اس وبال سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۸۔ غالب میرے اعضاء و قویٰ کمزور ہوگئے اور وہ اعتدالِ عناصر جو زمانۂ شباب میں تھا

اب باقی نہیں رہا۔حکماء کا خیال ہے جب تک عناصرِ زندگی میں اعتدال رہے۔تندرستی قائم رہتی ہے۔ جب ان میں سے کوئی ایک عنصر کم یا زیادہ ہوجائے تو انسان مضمحل ہوتے ہوتے لقمۂ اجل ہوجاتا ہے۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ اعتدالِ عناصر سے شباب مراد ہے۔ مطلب وہی ہے کیونکہ زمانہ شباب میں اعتدال عناصر کی وجہ سے اعضاؤ قویٰ توانا و تندرست رہتے ہیں۔

۸۶

کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں ۱ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے ۲ کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو ۳ جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصتِ غش سے ۴ اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود ۵ قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے ۶ خارِرہ کو ترے ہم مہرِ گیا کہتے ہیں
ایک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا ۷ آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
دیکھئے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ ۸ اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت وشیفتہ اب مرثیہ کہدیں شاید
مرگیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

۱۔ اگر محبوب ہم سے وفا کرتا ہے تو اغیار کہتے ہیں کہ یہ وفا نہیں جفا ہے' اس نکتہ چینی پر عاشق کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے۔کہ کہیں سچ مچ محبوب جفا پیشہ نہ بن جائے۔ اس لئے اس سے کہتا ہے کہ کچھ مضائقہ نہیں دُنیا کا دستور یہی ہے۔ اہلِ دُنیا اچھو ں کو بُرا ہی کہا کرتے ہیں۔ اس لئے تم ان کی باتوں کی پروانہ کرو اور ہمارے ساتھ یہی سلوک جاری رکھو۔

۲۔ آج ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ان کے پاس جا کر اپنی پریشانیِ دل کا اظہار کریں گے۔ ہم نے ارادہ تو کیا ہے لیکن اس پر عمل پیرا ہونا بہت مشکل ہے کیونکہ انہیں دیکھ کر ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں اور ایسی محویت کا عالم طاری ہوجاتا ہے کہ ہم کہنا کچھ چاہتے ہیں اور مُنہ سے کچھ نکلتا ہے۔

اس لئے دیکھنا چاہئے کہ ہمارا یہ ارادہ پورا بھی ہوتا ہے یا نہیں ''پر دیکھیے کیا کہتے ہیں'' سے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ دیکھیے وہ ہماری پریشانیِ دل کا حال سُن کر کیا فرماتے ہیں۔ طباطبائی لکھتے ہیں کہ پہلی صورت کثیر المعنی ہے اور بہتر ہے

۳۔ اندوہ رُبا:۔غم کو دُور کرنے والا÷

اگلے زمانے کے سیدھے سادے اور بھولے بھالے بزرگوں کا خیال ہے کہ شراب ونغمہ سے غم غلط ہوجاتا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ شراب ونغمہ سے گزشتہ زمانے کے عیش و نشاط کے مناظر سامنے آجاتے ہیں اور ان کے یاد آنے سے دل کو اور تکلیف ہوتی ہے اس لئے حقیقتاً شراب ونغمہ اندوہ ربا نہیں بلکہ اندوہ افزا ہیں۔ کہتا ہے جو لوگ اگلے زمانے کے سادہ دل بزرگوں کی طرح اب تک شراب ونغمہ کی حقیقت سے واقف نہیں ان پر حرف گیری نہ کرو۔ بہتر ہے۔ کہ شراب و نغمہ کے متعلق ان کا یہی حسنِ ظن قائم رہے (سعید۔ بیخود)

طباطبائی:۔ اندوہ رُبا ہونے کے انکار سے یا تو اندوہ فزا ہونا مقصود ہے یا مراد ہے کہ اندوہ ایسی چیز ہے کہ کسی طرح بھلائے نہیں بھولتا۔

آسی:۔ مے ونغمہ کو پُرانے آدمی کہتے ہیں کہ اندوہ رُبا اور غم غلط ہے اور آج کل کے زمانے میں اس میں یہ صفت باقی نہیں رہی ہے کہ اندوہ وغم اس سے کم ہوجائے سو ان لوگوں سے اس بناء پر جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔ شراب ونغمہ میں پہلے یہ خاصیت ہوگی' جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں' اگرچہ آج نہیں ہے۔

۴۔ عاشق فراقِ یار میں لگاتار نالے کررہا ہے گویا اس کوشش میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح نالہ یار تک جاپہنچے۔ چنانچہ جب نالہ یار تک جاپہنچتا ہے تو وہ خاموش ہوجاتا ہے۔ یہ خاموشی بے ہوشی ہے جو لگاتار کوشش اور محنت کا نتیجہ ہے اور اس کامیابی کی علامت ہے کہ نالہ رسا ہوگیا۔ چنانچہ جب ہوش ٹھکانے آتے ہیں تو دل میں خیال آتا ہے کہ اگر نالہ کی رسائی اس کو نہیں کہتے تو پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں۔

بیخود:۔ جب مجھے غش سے افاقت حاصل ہوتی ہے تو میرا معشوق میرے دل میں آجاتا ہے اور یہ میرے نالہ کے اثر سے ہوتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اور کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں۔ اس

سے زیادہ رسائی نالہ کو کیا ہوگی کہ فوراً ہی معشوق کو کھینچ کر دل میں لے آتا ہے (سعید)

طباطبائی:۔ نالہ رسا وہ ہے کہ اثر تک جس کی رسائی ہو لیکن شاعر نے یہاں استفہام کرکے یہ بات ظاہر کی ہے کہ اس کے نالے کو کبھی اثر تک رسائی نہیں ہوئی۔ یہ جانتا ہی نہیں کہ نالۂ رسا اسے کہتے ہیں جس کی پہنچ اثر تک ہو۔ کیوں کہ یہ رسائی نالہ اس کو سمجھتا ہے کہ غش سے چونکا اور نالۂ دل میں آموجود ہوا۔ (سعید۔ آسی)

۵۔ ادراک:۔عقل÷ مسجود:۔ جس کو سجدہ کیا جائے۔ معبود÷ اہلِ نظر:۔ حقیقت بیں، قبلہ:۔ وہ سمت جس طرف منہ کرکے عبادت کی جاتی ہے۔

جو لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ تم قبلہ کو پوجتے ہو یعنی خانہ کعبہ کی اینٹ پتھر تمہارے مسجود ہیں۔ ان کو معلوم ہو کہ ہمارا مسجود خانہ کعبہ نہیں ہے بلکہ ہمارا مسجود وہ ہے جو جہات سے منزّہ اور مبرّا ہے اور اس کا دریافت کرنا عقل کے بس کی بات نہیں کیونکہ وہ سرحدِ ادراک سے بالا تر ہے۔ ہم نے اپنے مسجود کو سجدہ کرنے کے لیے ایک سمت مقرر کرلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ نظر جہتِ قبلہ کو خدا نہیں کہتے بلکہ خدا نما کہتے ہیں اور جو جاہل ہیں وہ خانہ کعبہ ہی کو مسجود سمجھتے تھے۔

۶۔ مہر گیا:۔ایک بُوٹی ہے۔ کہتے ہیں جو شخص اسے اپنے پاس رکھے اُس پر سب مہربان ہوجاتے ہیں۔

ہمارے زخمی پاؤں پر جب سے تجھے رحم آیا ہے۔ ہم خارِ راہ کو جن سے ہمارے پاؤں زخمی ہوئے ہیں' کانٹا نہیں سمجھتے بلکہ ہم انہیں مہرِ گیا کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے تو ہم پر مہربان ہوا ہے۔

۷۔ شرر سے روحِ حیوانی اور ہوا سے مراد سانس۔ ہمارے دل میں روحِ حیوانی کا ایک شرر ہے۔ اس سے ہم کیا گھبرائیں کیونکہ یہ تو اُصولِ فطرت ہے کہ سانس لینے سے حرارتِ غریزی میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور اسی اشتعال کی بدولت ہماری زندگی قائم رہتی ہے گویا ہمارا سانس لینا محض حرارتِ عزیزی کو اشتعال دینے کی غرض سے ہے۔

ہمارے دل میں آتشِ عشق کا ایک شرارہ ہے۔ بھلا ہم اس شرارہ سے کیا گھبرائیں گے۔ حقیقتاً ہمیں شرارہ کی ضرورت نہیں بلکہ ہمیں آگ مطلوب ہے اور اسی لئے ہم بے چین ہیں لیکن عوام کا

یہ خیال ہے کہ ہم اس شرارہ سے گھبرا کر ہوا طلب کرتے ہیں یعنی آہیں بھرتے ہیں۔

سعید:- ہمارے دل میں آتشِ عشق کا صرف ایک شرارہ ہے جس سے ہم کو کوئی گھبراہٹ اور پریشانی نہیں۔ اس لئے ہم اس کو ہوا یعنی ہیچ کہتے ہیں کیوں کہ ہمارے حوصلے کے مطابق نہیں۔ ہم کو تو آگ مطلوب ہے شرر ہمارے لئے کم ہے۔

آسی:- لوگ ہم کو طعنہ دیتے ہیں کہ دل کی آتشِ غم سے گھبرا کر ہم کو ہوا کھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ ہم گھبرا کر گرمی کے مٹانے کے لئے ہوا نہیں کھاتے بلکہ آگ کے بھڑکانے کے لئے ہوا کھاتے ہیں یعنی سانس لیتے ہیں۔

حسرت:- ہم لوگ کہ ہوا سے آگ مراد لیتے ہیں۔ بھلا ہم دل کے ایک شرر سے کیا گھبرائیں گے۔

۸۔ نام خدا کہنا:- ماشاءاللہ تعریف کرنا ÷ نخوت:- غرور تکبر ÷

محبوب کی ہر بات پر ہم ماشاءاللہ، بہت خوب، چشمِ بددُور وغیرہ کہتے ہیں۔ ہماری اس تعریف سے اس کا غرور اور تکبر بہت بڑھ گیا ہے۔ دیکھئے آخر کار ان کا غرور کیا رنگ لاتا ہے۔

۹۔ وحشت غلام علی خاں۔ شیفتہ نواب مصطفےٰ خاں۔ لوگ کہتے ہیں کہ غالب آشفتہ نوا مر گیا ہے۔ اب شاید اس کے مرنے پر وحشت اور شیفتہ مرثیہ لکھیں۔ یہ دونوں حضرات غالب کے عزیز دوست تھے اس لئے ان سے توقع ظاہر کی ہے کہ وہ اپنے رنجِ دلی کا اظہار مرثیہ لکھ کر کریں گے۔

۸۷

آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں ۱ ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں ۲ رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب ۳ ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کی روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے ۴ پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے ۵ انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن ۶ غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

بس کہ ہم ہیں اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے ۷ جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا ۸ خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری ۹ موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود ۱۰ قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں!

۱۔ کہتے ہیں جس طرح اس پھول کی کچھ بھی آبرو نہیں ہوتی جو گلشن میں نہ ہو۔ اسی طرح وہ گریبان بھی پیراہن کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے جو دامن میں نہیں ہوتا اور گریبان اس وقت تک دامن میں پہنچتا ہے، جب وہ چاک ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ عشق کے نزدیک چاک دامنی باعثِ فخر و عزت ہے۔

بیخود و طباطبائی:- گریبان چاک ہو کر گل سے مشابہت پیدا کرتا ہے اور دامن کو صحنِ گلشن بنا دیتا ہے۔

۲۔ اے گریہ ضعف و نقاہت سے اب میرے جسم میں کچھ باقی نہیں رہا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس قدر خون کے آنسو بہا چکا ہوں کہ میرا سارا خون دامن پر آ چکا ہے۔ وہ قطراتِ خون جو سوئے اتفاق سے میرے جسم میں رہ گئے تھے اور قطراتِ اشک بن کر نہ نکل سکے، وہ میرا رنگ بن کر اُڑ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ضعف میں رنگ اُڑ جاتا ہے۔ گویا خون کی کمی سے رنگ پیلا پڑ جاتا ہے۔

۳۔ اگر کسی روزن میں سے دھوپ آئے تو دھوپ کے ساتھ لاتعداد ذرّات آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس واقعہ کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں کہ اس کے گھر کی دیواروں کے روزنوں میں سے جو ذرّات اس کے مکان کے اندر آ رہے ہیں۔ یہ ذرّات نہیں ہیں بلکہ نگاہِ آفتاب کے اجزاء ہیں جو محبوب کے دیکھنے کے لئے ہجوم کر کے آ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آفتاب تک کو تجھے دیکھنے کا شوق ہے۔ اسی لئے وہ روزنِ دیوار میں سے جھانکتا ہے۔

۴۔ اس زندانِ غم کی تاریکی کا حال کیا بیان کروں، اس میں اس قدر تاریکی ہے کہ اگر اس

کے روزن میں روئی کا پنبہ رکھ دیا جائے تو بجائے اس کے کہ روزن بند ہو کر وہاں تاریکی میں اضافہ ہو وہ سفیدۂ سحر کی طرح چمکتا ہے۔ قاعدہ ہے جہاں بہت زیادہ اندھیرا ہو وہاں ذرا سی سفیدی بہت پھیل جاتی ہے۔ یہی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ زندانِ غم اس قدر زیادہ تاریک ہے کہ اس میں رُوئی کی سفیدی سے روشنی ہو جاتی ہے۔

۵۔ حالیؔ:- یعنی تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے خواہ زن و فرزند کی محبت ہو، خواہ مال و دولت کی، خواہ ملک و ملت کی۔ خواہ کسی اور چیز کی۔ پس اگر خرمن میں یہ برق نہیں یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس انجمن کی ہے جس میں شمع کی روشنی نہیں۔

مولانا سعیدؔ ہاشمی از رسالہ اُردو:- حقیقت میں مرزا نے اس میں فلسفہ رواقیہ کا یہ عقیدہ بیان کیا ہے کہ خود ہستی کا مقتضیٰ اور لازمہ فنا یا نیستی ہے (سعیدؔ)

۶۔ زخم سلوانا:- زخموں میں ٹانکے لگوانا ÷ چارہ جوئی:- علاجِ معالجہ ÷ سوزن:- سُوئی ÷

میں نے زخموں میں ٹانکے لگوائے ہیں۔ اس پر غیر مجھے یہ طعنہ دیتا ہے کہ میں عاشقِ صادق نہیں۔ کیونکہ میں نے اپنے زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش کی ہے اور واقعی یہ بات طریقِ عشق کے خلاف ہے لیکن اس کم بخت کو یہ خبر نہیں کہ میں نے زخموں میں ٹانکے انہیں درست کرنے کے لئے نہیں لگوائے بلکہ میرا مقصد اس معالجہ سے یہ تھا کہ میں زخمِ سوزن کی لذّت حاصل کروں۔ لذّت سے مراد تکلیف ہے جو عشّاق کو مرغوب ہے۔ اسی لئے اسے لذّت کہا ہے۔ غالبؔ ؎

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذّت زخمِ سوزن کی   سمجھنا مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

۷۔ بہارِ ناز:- مرادِ معشوق ÷ بس کہ:- بہت زیادہ ÷

چونکہ ہم کو ایک بہارِ ناز (معشوق) نے قتل کیا ہے اس لئے ہماری قبر میں خاک بالکل نہیں بلکہ ہر طرف جلوۂ گل ہے اور یہ اس بہارِ ناز کا اثر ہے۔

طباطبائی لکھتے ہیں۔ جلوۂ گل اس کے تصور سے ہے۔ آسیؔ نے دوسرا پہلو یہ نکالا ہے۔

"چونکہ ہم شہید ہوئے تھے اس لئے اس کے ثواب میں ہماری قبر میں جنت موجود ہے"۔

۸۔ ہیولیٰ:- مادہ ÷ نئے ناسور:- مرادِ زخم ÷

میرے خون کا ہر قطرہ مادۂ ناسور رکھتا ہے۔ گویا جہاں کوئی قطرہ گرتا ہے وہیں ناسور بن جاتا

ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے جسم کے خون میں لذّتِ درد بدرجہ اتم موجود ہے۔

۹۔ نخوت:- غرور و تکبر ÷ قلزم آشامی:- سمندر کے سمندر شراب کے پی جانا ÷ رگِ گردن:- غرور کی نشانی ہے۔

ساقی کو اس بات پر بہت غرور تھا کہ وہ شراب پلانے میں بڑا فیاض ہے لیکن میں اس قدر قلزم آشام نکلا کہ میری بلانوشی سے اُس کا غرور ٹوٹ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی صراحی مے میں موجِ شراب کی رگِ گردن بھی کہ غرور و تکبر کی نشانی تھی۔ آج نظر نہیں آتی۔ گویا ساقی کے غرور کے ساتھ شیشے کا غرور بھی ٹوٹ گیا۔

۱۰۔ فشار:- چاروں طرف سے دبانا۔ غلبہ۔

ضعف نے مجھے ہر طرف سے دبا رکھا ہے۔ ایسی حالت میں میں ناتوانی کو بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔ قد کا جھکنا ضعف کی علامت ہے لیکن میں اس سے بھی معذور ہوں کیونکہ فشارِ ضعف میں مبتلا ہوں۔ اس لئے میرے جسم میں قد کے جھکنے کی بھی گنجائش نہیں پھر اظہارِ ناتوانی ہو تو کیوں کر ہو۔

۱۱۔ غربت:- مسافری ÷ بے تکلف:- بلا مبالغہ ÷ گلخن:- بھاڑ۔ بھٹی ÷ مشتِ خس:- گھاس پھونس۔ مٹھی بھر ÷

حالیؔ:- اپنے تئیں مشتِ خس اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا تھا کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا۔ اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔

سید ہاشمی رسالہ اُردو:- راقم الحروف کو ان معنی میں کلام ہے۔ شاعر کا اصلی مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیس پردیس میں کہیں بھی میرے مخفی جوہر ظاہر نہ ہو سکے اور دونوں جگہ میں ایسا ہی ناکارہ سمجھا گیا۔ جیسا کہ گھاس پھونس کا ایک ڈھیر جو بھٹی میں نہ ڈالا جائے تو محض کوڑا ہے اور بادی النظر میں بالکل بیکار اور بے حقیقت شے ہے حالاں کہ اگر وہ اپنے موزوں مقام یعنی گلخن میں ہوتا تو اُس کے کمالات ظاہر ہوتے اور وہ روشن اور منور ہو جاتا۔ خس اور گلخن کے اس نادر مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور شعر میں بھی تحریر کیا ہے ؎

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

طباطبائی (۱) ظاہر ہے مشتِ خس اگر اپنے وطن میں ہے تو خارزار میں ہے اور اگر وطن سے باہر نکل کر کہیں قدم رکھا تو جاروب کشوں نے نکال باہر کیا۔ وطن میں اذیّت اور غربت میں ذلّت کا سامنا ہے۔ اس کے لئے اگر فروغ اور شان ہے تو گلخن میں ہے (آسی) (۲) اس شعر میں مذاقِ تصوف ہے۔ یعنی جس طرح ہر شے آگ میں گر کر آگ ہوجاتی ہے اسی طرح عارف کو شاہدِ حقیقی کے ساتھ اتصال ہوجاتا ہے اور نہیں تو ایک مشتِ خس ہے جس کا وطن عدم اور غربت امکان ہے۔ اور امکان پر جس طرح عدم سابق ہے اسی طرح عدم لاحق بھی ہے کہ امکان وجود بین العدمین کا نام ہے جو ممکن عدم سے آیا ہے وہ عدم میں چلا بھی جائیگا۔ پس حیاتِ ابدی اس میں ہے کہ واجب الوجود سے ملحق ہوجائے اور فنانی الذات ہوکر ترانہ انالا غیری کو بلند کرے۔

۸۸

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا ۱ گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل ۲ ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں!
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش ۳ تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ ۴ ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

۱۔ ادا اور قضا میں رعایتِ لفظی ہے۔ ان کے ناز کی جتنی تعریف کرنی چاہیئے تھی اتنی تعریف میں نہیں کرسکا اور اس کوتاہی کا سبب یہ ہے کہ اس کی ایک ادا نہیں بلکہ ہزاروں ادائیں ہیں جو قابلِ تعریف ہیں۔ اگر ایک ادا ہوتی تو مدحِ ناز سے میں یہ کہہ کر عہدہ برآ ہوجاتا کہ وہ میری قضا ہے یعنی اس ادا پر میری جان جاتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہاں تو ہزاروں ادائیں ہیں۔ شاعر ادا کو اپنی قضا کہنا بہترین تعریف سمجھتا ہے۔ چونکہ یہ تعریف ہر ادا پر صادق آتی ہے اس لئے پریشان ہے۔ تعریف کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خاص کو عام سے ممیّز کرے لیکن یہاں مشکل یہ آپڑی ہے کہ یہ تعریف ہر ادا میں موجود ہے اس لئے اپنی ناقابلیت کو تسلیم کرتا ہے۔

۲۔ حلقے یعنی حلقہائے زلف' گھونگر÷ ہیں چشم کشادہ تاک میں ہیں÷

تیری زلفوں کے حلقے میرے دل کی طرف تاک لگائے ہوئے ہیں یعنی تیری زلفوں کے گھونگر آنکھوں کے حلقے ہیں جو میرا دل اڑانے کے لیے تاک میں بیٹھے ہیں۔ اس لئے اگر میں ہر تارِ زلف کو ان زلفوں کی آنکھوں کی نگاہ سُرمگیں کہوں تو بے جا نہیں۔ ظاہر ہے حلقہ ہائے زلف کو چشم اور تارِ زلف کو نگاہِ سُرمہ سا قرار دیا ہے اور آنکھ کے لئے نگاہ لازم ہے۔

۳۔ **نوا**:- نالہ÷

میں تو لاکھوں جگر خراش نالے کرتا ہوں مگر تو ہے کہ سنتا ہی نہیں۔ عجب اندھیر ہے۔

آسی لکھتے ہیں۔ کیا کہوں سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ تو سنتا نہیں۔ اس لئے مجھے خاموش ہونا پڑتا ہے اور یوں ''کیا کہوں'' ایک تمام محاورہ ہے۔

۴۔ **منفعل**:-شرمندہ÷ **خدا نہ کردہ**:- خدانخواستہ۔ خدا نہ کرے۔ توبہ توبہ۔

ظاہر ہے کہ عاشق اور اس کے دل میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ دل کہتا ہے کہ محبوب بے وفا ہے عاشق کہتا ہے وہ باوفا ہے۔ اس کشمکش میں عاشق محبوب سے کہتا ہے کہ اے ظالم! مجھے میرے گمان سے شرمندہ نہ کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے ظلم و ستم مجھے مجبور کردیں اور خدا نخواستہ میں بے وفا کہنے لگوں (تمام متفق)

حسرت لکھتے ہیں۔ مجھ کو میرے گمان سے شرمندہ نہ کر۔ بھلا میں اور تجھ کو بے وفا خیال کروں۔

۸۹

مہرباں ہوکے بُلالو مجھے چاہو جس وقت ۱ میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے ۲ بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ ۳ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

۱۔ اگر میری اور تمہاری رنجش ہوگئی تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں نے تمہارا عشق ترک کردیا ہے بلکہ جب بھی تم مجھے محبت سے بلاؤ گے۔ میں حاضر ہوں۔ میں گیا وقت نہیں ہوں کہ واپس نہ آسکوں۔ مطلب یہ ہے کہ میرا آنا اور نہ آنا تمہارے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ باہمی رنجیدگی سے جذبۂ عشق محو نہیں ہوسکتا۔

٢۔ خیال یہ ہے کہ طعنۂ اغیار برداشت کرنا بہت مشکل ہے لیکن ناچاری یہ آپڑی ہے کہ عاشق کو ضعف نے بے حال کردیا ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ حالتِ ضعف میں طعنۂ اغیار کا بھی کوئی شکوہ نہیں رہا۔ کیونکہ طعنۂ اغیار سر نہیں ہے کہ میں حالتِ ضعف میں اُسے اُٹھا نہیں سکتا۔ اس لئے سب کچھ گوارا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حالتِ ضعف میں ''بات اُٹھانا'' اس قدر دشوار نہیں۔ جس قدر سر کا اُٹھانا مشکل ہے۔ انتہائی ضعف کا اظہار ہے۔

٣۔ حالی:- جب کہتے ہیں کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کو اس کام کے کرنے سے انکار ہے۔ بس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیوں کر کھا سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اس کو کھا نہ سکوں۔ مگر چوں کہ وہ ملتا نہیں۔ اس لئے نہیں کھا سکتا۔

آسی اور طباطبائی لکھتے ہیں۔ آخری مصرعہ میں تین کاف جمع ہونے سے تنافر پیدا ہوگیا ہے۔

٩٠

ہم سے کُھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن ١ ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو ٢ اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں ٣ رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے ٤ بے صدا ہوجائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوانہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

١۔ کُھل جاؤ:- بے تکلف ہوجاؤ÷ مے پرستی:- شراب نوشی÷ عذر:- بہانہ÷
کسی دن ہم سے شراب نوشی کے دوران میں بے تکلف ہوجاؤ۔ اگر تم ایسا نہ کروگے تو ہم نشہ کا بہانہ کرکے تم سے بے تکلفی پیدا کرلیں گے۔ چونکہ ایسا نشہ کی حالت میں ہوگا اس لئے تم ہم سے اس بے تکلفی کی شکایت بھی نہ کرسکوگے بجائے اس کے کہ ہم یہ صورت اختیار کریں تم خود ہی ہم سے کُھل جاؤ۔ اور یہاں تک نوبت نہ آنے دو۔

٢۔ غرّہ:- مغرور÷ اوج:- بلندی÷ بنا۔ بنیاد مراد عمارت÷ عالمِ امکان:- فانی دُنیا÷
دُنیائے فانی کی بلندی پر مغرور نہ ہو۔ کیوں کہ اس بلندی کے نصیبوں میں ایک دن پستی یعنی فنا ہونا لکھا ہے۔ عقل مند آدمی کو ایسی بات پر غرور زیب نہیں دیتا جو فانی ہو۔ اس لئے دنیاوی عروج پر مغرور ہونا حماقت ہے۔

٣۔ ایک دفعہ مرزا بہت مقروض ہوگئے۔ قرض خواہوں نے نالش کردی۔ مرزا صاحب جواب دہی میں طلب ہوئے۔ انہوں نے یہ رقم شراب نوشی اور اس کے لوازمات میں صرف کی تھی۔ مفتی صدرالدین احمد خاں مفتی تھے۔ مرزا صاحب نے جواب دعویٰ کے طور پر یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر پڑھا۔ مفتی صاحب سمجھ گئے اور اُنہوں نے ازراہِ قدردانی اور سخن شناسی تمام رقم اپنے پاس سے ادا کرکے مرزا صاحب کو رخصت کیا۔

ہم قرض شراب لیتے تھے اور پی جاتے تھے لیکن اس بات سے غافل نہ تھے کہ ایک دن شراب فروش سے جھگڑا ہوگا۔ دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ ہم پیسے قرض لے کر شراب پیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ شراب نوشی ایک دن ضرور رنگ لائے گی۔

٤۔ نغمہ ہائے غم:- نالہ ہائے درد
اے دل! اگر نغمہ ہائے شادی نہیں تو نغمۂ غم ہی کو غنیمت جان۔ کیوں کہ عنقریب ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ سازِ ہستی بے صدا ہوئے گا اس لئے وقت کی قدر کرو۔

نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

٥۔ اس سراپا ناز کا شیوہ دھول دھپّا نہ تھا۔ ہمیں نے ایک دن پہل کی تھی۔ اس دن سے اس کو دست درازی کی عادت پڑگئی ہے۔ اب برداشت کیجئے۔ شکایت کیسی؟

٩١

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں ١ اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا ٢ پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز' ستم گر کو ہم عزیز ٣ نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں' نہ دیجئے دشنام ہی سہی ٤ آخر زباں تو رکھتے ہو تم' گر دہاں نہیں

ہر چند جانگدازیٔ قہر و عتاب ہے ۵ ہر چند پُشت گرمیٔ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مّزید ہے ۶ لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دونیم ۷ دل میں چُھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو ۸ ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب ۹ سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سر نوشت میں ۱۰ گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی ۱۱ رُوح القدس اگر چہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

۱۔ ہمارا محبوب ہماری وفاداری اور ہمارے عشق کی پائداری پر اس قدر بھروسہ رکھتا ہے کہ اس کو پورا پورا یقین ہے کہ ہم اس کی جفاؤں سے ڈر کر ہرگز ترکِ وفا نہ کریں گے' گویا اس کی جفائیں صرف ہمیں چھیڑنے کی غرض سے ہیں ورنہ ان جفاؤں سے اُنہیں ہمارا امتحانِ وفا لینا مقصود نہیں ہے۔

۲۔لطفِ خاص:- مراد اشارہ و کنایہ÷ پائے سخن:- سلسلۂ گفتگو÷

محبوب کے اس لطفِ خاص کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں کہ وہ اشاروں کناؤں سے میرا حال دریافت کرتا ہے اور پائے سخن درمیان نہیں لاتا۔ ظاہر ہے معشوق کے کنائے عاشق کے لئے خاص لطف رکھتے ہیں بلکہ لطفِ خاص کی نشانی ہیں۔

اگر یہ شعر حمد میں ہے تو پھر اُس کی شرح یہ ہوگی کہ میں خدا کی حمد کس زبان سے ادا کروں کہ وہ بغیر سلسلۂ گفتگو اپنے بندوں کی خبر رکھتا ہے۔

۳۔ ہم کو ستم عزیز ہے اور وہ ہم پر ستم کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ستم گر ہم کو عزیز رکھتا ہے۔ اگر ہم کو عزیز نہ رکھتا تو ہم پر ستم ہرگز نہ کرتا کیونکہ ستم ہمیں عزیز ہے وہ ہم کو وہی چیز دیتا ہے جو ہم کو عزیز ہے اس لئے ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس ستم گر کو عزیز ہیں۔ اس سلوک خاص سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ستم گر اگر ہم پر مہربان نہیں ہے تو نامہربان بھی نہیں ہے کیونکہ اگر وہ

نامہرباں ہوتا تو ہماری آرزوئے ستم پوری نہ کرتا (سعیدؔ۔ حسرتؔ)

بیخودؔ:- ہم کو ستمگر اس لئے عزیز ہے کہ اس کا ستم ہماری قوتِ برداشت کے موافق ہوتا ہے۔ ایسا ظلم وہ نہیں کرتا جس سے ہم جاں بلب ہوجائیں۔ اس واسطے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی اس ستمگر کو عزیز ہیں۔ اگر عزیز نہ ہوتے تو ستم سے وہ ہماری جان لے لیتا۔ اس بیان سے دُوسرے مصرعہ کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔

آسیؔ:- (۱) ہم کو اس کا ستم عزیز ہے اور تختۂ مشقِ جفا بنانے کے لئے وہ ہم کو عزیز رکھتا ہے۔ بہر حال نامہربانی سے اس کی مہربانی کا ایک پہلو نکلتا ہے (۲) وہ ہم کو پیارا ہے کہ ہم پر ظلم کرتا ہے اور ہم اس کو پیارے ہیں کہ ہم ستم سہتے ہیں۔ اس کا ہم سے کام نکلتا ہے اور ہمارا اس سے۔ تو اگر وہ مہربان نہیں ہے تو نامہربان بھی نہیں (۳) ہم خیال مؤلف۔

۴۔بوسہ نہ دینے کا عذر تو تمہیں یہ ہاتھ آیا ہے کہ تمہارا دہن نہیں ہے۔ خیر آپ بوسہ نہ دیجئے۔ لیکن گالی دینے میں کیا مضائقہ ہے آخر آپ زبان تو رکھتے ہیں۔ کس خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے کہ معشوق کا دہن نہیں ہوتا۔

۵۔قہر و عتاب:- غصہ÷ جانگداز:- جان کو گھلا دینے والا÷ پشت گرمی÷ سہارا۔ قوت÷ قطعہ بند ہے' کہتے ہیں۔ ہر چند اس کا قہر و عتاب جان کو گھلانے والا ہے اور ہماری قوت برداشت نے جواب دے دیا ہے لیکن پھر بھی۔

۶۔ مطرب:- گانے والا÷ ہل من مزید:- کچھ اور زیادہ÷ پردہ سنج:- نغمہ سنج÷ زمزمہ ترانہ:- گیت÷ الامان:- پناہ۔ الحذر÷

ہم اس کے قہر سے پناہ نہیں مانگتے اور زبان پر الامان کا لفظ نہیں لاتے۔ بلکہ میری جان ترانہ ہل من مزید گاتی ہے۔ یعنی عتاب مزید کی خواہاں ہے۔

۷۔ دونیم:- دو ٹکڑے۔ دو پارہ÷

اگر تیرا دل دو پارہ نہ ہو تو پھر تُو اپنا سینہ خنجر سے چیر ڈال' تا کہ تیرا دل زخمی ہو جائے اور اگر تیری مژگاں خونچکانی سے محروم ہوں تو اپنے دل میں چھری گھونپ کر مژگاں میں خونچکانی کی صفت پیدا کر' کیونکہ:-

۸۔ آذر فشاں:- آتش فشاں÷

وہ دل سینے کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے جو آتشِ عشق سے آتش کدہ نہ بن گیا ہو اور اسی طرح وہ سانس دل کے لئے باعثِ شرم ہے۔ جو شرربار نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سینہ ہی کیا جس میں آتش نہ ہو اور وہ دل ہی کیا' جس میں سے نفسِ آتش فشاں نہ نکلے۔

۹۔ اگر جنوں سے میرا گھر برباد ہوتا ہے تو مجھے کچھ نقصان نہیں کیوں کہ میرے گھر میں بہت ہوگی تو سوگز زمین ہوگی۔ جنوں کی بدولت مجھے سوگز زمین کے بدلے ایک پورا بیابان ملتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کچھ مہنگا سودا نہیں۔

۱۰۔ سرنوشت:- تقدیر جبیں:- ماتھا

وہ فرماتے ہیں کہ تری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ ذرا ستم ظریفی اور سادگی ملا خطہ ہو۔ میرے ماتھے پر تو بتوں کو سجدے کرتے کرتے گٹا پڑ گیا ہے اور یہی میرا نوشتہ تقدیر ہے۔ پھر چترا چترا کر نوشتہ تقدیر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری سرنوشت میری پیشانی سے ظاہر ہے۔

۱۱۔ رُوح القدس:- حضرت جبرائیل÷

حالؔی:- یہاں ''ہم زبان'' کے لفظ میں ایہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہوسکتی اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ ''جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں''۔ لیکن پھر بھی اپنے کلام کی داد مجھے اس سے ملی ہے۔ یہ بھی مطلب ممکن ہے کہ میرا کلام سراسر الہام ہے۔

۱۲۔ بہا:- قیمت÷

اس کے ایک بوسے کی قیمت جان ہے۔ لیکن ابھی وہ کیوں کہے گا کہ جان دے کر بوسہ لے لو۔ کیوں کہ ابھی تو مجھ میں جان باقی ہے۔ جب مجھ میں پوری جان نہ رہے گی اور میں نیم جان ہوجاؤں گا تو اُس وقت کہے گا کہ جان دے اور بوسہ لے۔ ظاہر ہے۔ نیم جان پوری جان کہاں سے لائے گا جو بوسے کا طالب ہوگا۔

۹۲

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ۱ ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں ۲ جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے ۳ جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو ۴ خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہوجائے ۵ لذّتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے ۶ کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
''آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں''

حالؔی:- چکّر:- پھرنے کی دھت÷ کہتے ہیں کہ اس کے پاؤں میں چکّر ہے یعنی اس کو پھرنے کی دھت ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی تدبیر مجھے دشت نوردی سے روک نہیں سکتی۔ پس زنجیر جو اس غرض سے میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے اسے زنجیر نہ سمجھو بلکہ چکّر سمجھو۔

۲۔ میرا شوق جنوں مجھے اس دشت میں دوڑاتا ہے جہاں راستہ اس طرح معدوم ہے جیسے دیدۂ تصویر میں نگہ معدوم ہوتی ہے۔ تمام متفق۔

آسی دوسرے معنی یہ لکھتے ہیں:- جیسے کہ دیدۂ تصویر حیرت میں ہے۔ اسی طرح وہاں اگر کوئی جادہ ہے تو جادۂ حیرت ہے اور کچھ نہیں۔ (سعیدؔ)

حسرت کے دوسرے معنی ملاحظہ ہوں:- شوق مجھ کو اس دشت میں لئے جاتا ہے جہاں ہر شخص مثلِ تصویر محوِ حیرت ہوجاتا ہے۔

۳۔ جادہ یعنی بٹیا کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار اور تکلیف میں جو لذّت ہے' جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذّت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں۔ مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے اس لئے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذّتِ آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے۔

۴۔ نومیدیٔ جاوید:- دائمی مایوسی÷ زبونی کش:- ذلیل۔ مراد احسان مند۔

خدا کرے مجھے ہمیشہ دائمی مایوسی اور ناامیدی گوارا رہے۔ میں اس حالت سے بہت خوش ہوں کیونکہ اس حالت سے میرے نالے تاثیر کے احسان کی ذلّت اُٹھانے سے محفوظ رہتے ہیں۔

۵۔ سر کھجانا:- سر میں کھجلی ہونا' محاورہ میں شامت آنا۔ پٹنے کی خواہش پیدا ہونا÷ جہاں:- جس وقت÷ باندازۂ تقریر نہیں:- بیان نہیں ہوسکتا۔

جس وقت میرا زخم سر اچھا ہوجاتا ہے تو میرا سر کھجاتا ہے۔ گویا جی چاہتا ہے کہ لڑکے بالے مجھے اور پتھر ماریں اور زخم لگائیں اور پتھر کھانے میں کچھ ایسا لطف ہے جو احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ مرزا نے سر کھجانے کا محاورہ خوب صرف کیا ہے۔ بقول بیخود اندمال زخم کے بعد زخم میں جو کھجلی ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو میرزا نے دوبارہ زخم کھانے کے شوق سے تعبیر کیا ہے۔

۶۔ رُخصت:- اجازت÷ تقصیر:- قصور÷ خجالتِ تقصیر:- ارتکابِ قصور سے جھجکنا۔

جب یار کی مہربانیاں گستاخی کرنے کی اجازت دیں تو اس وقت جھجکنا اور شرم کرنا سب سے بڑا قصور ہے۔

۷۔ بے بہرہ:- بدنصیب÷

غالبؔ بقول ناسخ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص میرؔ کو پیغمبرِ سخن نہیں مانتا اور شاعری میں ان کی پیروی نہیں کرتا وہ بے بہرہ اور بدنصیب ہے۔

۹۳

مت مردُمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ۱ ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

مردمکِ دیدہ:- آنکھ کی پتلی۔ سویدا: دل کا سیاہ نقطہ

طباطبائی:- جس طرح آنکھ میں تل ہوتا ہے اسی طرح دل میں ایک سیاہ نقطہ ہوتا ہے۔ اسے سویدا کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میری آنکھ کے تل میں یہ نگاہیں نہیں ہیں بلکہ آنکھ کے دل میں آہیں ہیں یعنی میری آنکھ اور نگاہ حسرت آلود ہے۔ اس شعر میں انتہا کا تصنع ہے اور دل یہاں بمعنی وسط ہے۔

آسیؔ و سہاؔ:- سویدا اور مردمک اور دیدۂ دل اور تارِ نگاہ اور آہوں میں تشبیہ ہے۔ یعنی پتلی میں نگاہیں نہیں ہیں بلکہ سویدا میں آہیں ہیں۔

۹۴

برشگالِ گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہئے ۱ کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

الفتِ گل سے غلط ہے دعویٰ وارستگی ۲ سرو ہے باوصف آزادی گرفتارِ چمن

برشگال:- برسات÷ کھل گئی:- شق ہوگئی÷

یہ گریۂ عاشق کی برسات ہے۔ دیکھا چاہیئے کہ کیا رنگ لاتی ہے اس برسات سے دیوارِ چمن گل کی طرح سو جگہ سے کھل گئی ہے۔ ظاہر ہے جب دیوارِ چمن کا یہ عالم ہے تو دیکھا چاہئے چمن میں کس قدر پھول کھلتے ہیں۔

۲۔ دعویٰ وارستگی:- دعویٰ آزادی۔

الفتِ گل سے کوئی وارستہ اور آزاد نہیں ہے۔ یہاں دعوئے وارستگی و آزادی بالکل غلط ہے۔ سرو کو دیکھ لو کہ آزاد کہلاتا ہے۔ مگر درحقیقت الفتِ گل میں گرفتار ہے۔ کیا مجال کہ چمن سے باہر جاسکے بس یہی ہے اس کو آزادی کا دعویٰ؟ حاصل شعر یہ ہے۔ کوئی کیسا ہی آزاد منش کیوں نہ ہو لیکن وہ دُنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔

۹۵

عشق تاثیر سے نومید نہیں ۱ جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے ۲ جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلّی تری سامانِ وجودؔ ۳ ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہوجائے ۴ ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے ۵ غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ ۶ ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

جاں سپاری:- جان دینا۔ جانبازی÷ شجرِ بید:- بید کے درخت میں کوئی پھل نہیں لگتا۔

عشق تاثیر سے نا اُمید نہیں ہے یعنی اس میں تاثیر ضرور ہوتی ہے۔ جان دینے کا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور ملتا ہے۔ جاں سپاری شجرِ بید نہیں ہے کہ اس میں کوئی پھل ہی نہ آئے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق میں جانبازی ضرور کچھ نتیجہ یا اثر دکھاتی ہے۔

۲۔ خاتم:- نگینہ۔ انگوٹھی۔ عام طور پر نگینہ پر نام کھدا ہوا ہوتا ہے۔ جامِ مے کی سلطنت جمشید سے رندوں کو دست بدست ملی ہے۔ یہ جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں ہے کہ صرف جمشید ہی کے

ہاتھ کے لئے مخصوص ہو اور دوسرے اس سے محروم رہیں۔

صرف سعیدؔ کو جزوی اختلاف ہے۔ لکھتے ہیں۔ سلطنت اور جام کو مرادف قرار نہیں دینا چاہئے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سلطنت واسطہ بواسطہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جامِ مے خاتمِ جم یا سلطنت جم نہیں کہ صرف ایک شخص کے لئے مخصوص ہو اور اسی کی ذات پر ختم ہوجائے۔

۳۔ تیری تجلی وجودِ عالم کا سبب ہے۔ جس طرح ذرّہ بغیر پرتوِ خورشید کے نمایاں نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح تمام موجوداتِ عالم تیری ذات کے پرتو کے بغیر ظاہر نہیں ہوسکتے۔ غالبؔ ؎

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

۴۔ حالیؔ:۔ ''بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں خواہ پوشیدہ مصلحت ہو، خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر مرجانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت ہوجاتے''۔

مطلب یہ ہے کہ میرے مرجانے میں کوئی پوشیدہ قباحت نہیں ہے۔ صرف خوف ہے تو اتنا ہے کہ کہیں میرے مرجانے سے رازِ عشق فاش نہ ہو جائے۔ گویا عاشق کا بتانا معشوق کی رسوائی کا باعث نہ ہو۔ راز اور بھید میں رعایتِ لفظی ہے۔

۵۔ مجھے محرومیِ جاوید کا غم نہیں ہے، کیونکہ محرومیِ جاوید کی حالت میں ہمیشہ ایک سی حالت رہے گی۔ برخلاف اس کے عیش ونشاط کی کیفیت ہمیشہ نہیں رہتی۔ اس حالت میں ہمیشہ گردشِ ایّام کا خوف لگا رہتا ہے اور فطرتِ انسان یہ ہے کہ راحت کے بعد رنج اُسے بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کیفیتوں کو دیکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ رنگِ طرب سے نومیدیِ جاوید بہتر ہے کیونکہ اس میں کسی قسم کے انقلاب کا خوف نہیں۔

حسرتؔ کے دوسرے معنی:۔ گردشِ طرب سے اس لئے ڈر ہے کہ محرومی کی حالت میں طرب کی جھلک سے رنجِ محرومی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔

سعیدؔ کے دوسرے معنی:۔ رنگِ طرب کی تبدیلیاں دیکھ کر مجھ کو یہ ڈر ہے کہ محرومی بھی ہمیشہ نہ رہ سکے گی۔ اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ محرومیِ جاوید کا جو غم میں حاصل کرنا چاہتا تھا وہ نہ ہوا۔

آسیؔ (۱) میرے ہم خیال (۲) اے وہ شخص کہ تجھ کو زمانۂ عیش کے زوال کا دھڑکا لگا ہوا

ہے اور یہ کھٹکا تجھے کھائے جاتا ہے تو اس سے نہیں ڈرتا اور ان لوگوں کا تجھے خیال ہے جو محرومِ جاوید ہیں (طباطبائی)

(۳) یہ غم نہیں کہ ایک وہ زمانہ بھی آنے والا ہے کہ جب تو ہمیشہ کے لئے عیش وعشرت سے محروم کردیا جائے گا اور اس خیالِ زوالِ عیش تک سے محروم ہوجائے گا۔ مراد ہے زمانۂ اجل سے۔

۶۔ (۱) مثل مشہور ہے کہ دنیا بامید قائم۔ لیکن ہم ایسے شخص ہیں کہ ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں (۲) اُمید ہی سے زندگی ہے۔ جب کوئی اُمید نہیں تو زندگی سے ناامید ہونا لازمی ہے (۳) جب ہم کو جینے کی بھی امید نہیں تو پھر ہم کس اُمید پر جیتے ہیں۔ بقولِ حالی یہ شعر ممتنع ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

۹۶

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں ۱ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے ۲ سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں!
ترے سروقامت سے اک قدِ آدم ۳ قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری ۴ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
سُراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے ۵ کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۱۔ خیابان:۔ پھولوں کی کیاری ÷ ارم:۔ باغِ ارم، باغِ جنت ÷ خیاباں خیاباں:۔ بمعنی بکثرت خیاباں ÷

یار کے نقشِ قدم کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ جہاں کہیں ہم تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں تو ہم کو تیرا ہر نقشِ قدم ایک خیابانِ ارم دکھلائی دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تو قدم رکھتا ہے وہاں باغِ ارم کے سرسبز وشاداب تختے نظر آتے ہیں۔

۲۔ وہ لوگ جو تیرے خالِ دہن پر عاشق ہیں، اپنے سویدائے دل میں عدم کی سیر کررہے

ہیں۔ اس میں رمز یہ ہے کہ سویدائے دل۔ خالِ دہن معشوق سے مشابہ ہے اور دہنِ معشوق عدم یعنی معدوم ہے۔

۳۔ حالیؔ:- اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ سروقامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے۔ اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ تیرا قد اسی سے بنایا گیا ہے۔ اس لئے وہ ایک قدِ آدم کم ہوگیا ہے۔ اور تیرا قد فتنۂ قیامت سے ایک قد بھر اور بڑھ گیا ہے۔

۴۔ تماشا کر:- دیکھ تماشا کردن کا ترجمہ ہے۔ آئینہ میں اپنے جمال کو دیکھ کر کیا محو ہورہے ہو۔ ذرا ادھر تو دیکھو کہ ہم تمہیں کس حسرت سے دیکھ رہے ہیں (تمام متفق)

آسیؔ نے ایک پہلو یہ نکالا ہے کہ اے محوِ آئینہ داری آئینہ کو چھوڑ' ہم کو دیکھ کر تیری اس حالت آئینہ داری کے دیکھنے سے ہم آئینہ سے بھی کچھ زیادہ حیرت زدہ بن گئے ہیں۔ چونکہ تجھ کو آئینہ اور آئینہ داری کا شوق ہے لہذا تو ہم کو دیکھ۔

۵۔ سُراغ:- کھوج' پتہ÷ تفِ نالہ:- نالہ کی حدّت و گرمی÷ شب رَو:- رات کا چلنے والا۔ مسافرِ شب۔

نالۂ دل کو شب رَو کہا ہے۔ کیوں کہ نالہ اکثر رات کو بلند کیا جاتا ہے اور داغِ دل کو اس کا نقشِ قدم قرار دیا ہے۔ جس طرح رات کو چلنے والے کا کھوج صبح کو اس کے نقشِ قدم سے نکالتے ہیں۔ کہ وہ کس طرف سے آیا اور کس طرف گیا۔ اسی طرح تو بھی میرے داغِ دل سے (جو شب رو کے نقشِ قدم سے مشابہ ہے) میرے نالۂ شب کی گرمی کا سُراغ لگا۔

۶۔ ہم فقیر نہیں ہیں۔ لیکن اہلِ کرم کا اندازِ کرم دیکھنے کے لیے ہم نے فقیروں کا بھیس بدل لیا ہے۔

۹۷

ملتی ہے خوئے یار سے نارالتہاب میں ۱ کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں ۲ شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر ۳ آنے کا عہد کرگئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں ۴ میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ۵ ساقی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں
جو منکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے ۶ کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ۷ ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ وتاب میں
میں اور حظِّ وصل خدا ساز بات ہے ۸ جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
تیوری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے ۹ ہے اک شکن پڑی ہوئی اندر نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا ۱۰ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے ۱۱ جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعاطلبی میں نہ کام آئے ۱۲ جس سحر سے سفینہ رواں ہو سُراب میں

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ماہتاب میں

۱۔ نار:- آگ÷ التہاب:- گرمی' طپش÷

شعلہ زنی' آگ بگولا ہونا' مجھے جلانا' بات بات پر افروختہ ہونا خوئے یار ہے اور آگ میں یہی صفات موجود ہیں۔ اس مشابہت کی وجہ سے مجھ کو عذابِ نار میں بھی راحت ملتی ہے اور اس حقیقت سے میں انکار نہیں کرسکتا اگر انکار کروں تو کافر ہوں۔

۲۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اس جہانِ خراب میں کب سے زندگی بسر کررہا ہوں۔ معمولی سا اندازہ یہ کہ جدائی کی ایک ایک رات ہزار ہزار سال کے برابر تھی۔ خدا جانے کتنی جدائی کی راتیں گزر گئیں اور کتنے ہزار سال مجھے اس جہانِ خراب میں آئے ہوئے ہوگئے۔ اگر میں شب ہائے ہجر کو حساب میں لگاؤں تو نہیں معلوم میری عمر کس قدر طویل ثابت ہو۔

۳۔ میں اس کا انتظار کرتے کرتے سوگیا۔ لیکن اس شوخ کو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں انتظار کرتے کرتے سوجاؤں اور خواب ہی میں ان کو دیکھ لوں۔ اس دوگونہ لطف سے مجھے محروم کرنے کے لئے وہ میرے خواب میں آئے اور آنے کا وعدہ کرگئے تاکہ پھر انتظار میں مجھ کو عمر بھر نیند نہ آئے۔ گویا اب انتظار میں نہ مجھے نیند آئے گی اور نہ وہ خواب میں آئیں گے' خوب شعر ہے۔

۴۔ جب تک قاصد واپس آئے اُس وقت تک میں ایک اور خط لکھ لوں۔ کیونکہ جو کچھ وہ

جواب میں لکھیں گے، وہ مجھے معلوم ہی ہے۔ اس لئے انتظارِ قاصد فضول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے کچھ نہیں لکھیں گے۔ انکار لکھیں گے یا خط لکھنے سے روکیں گے۔

۵۔ حالی:- اس شعر میں پہلے مصرعہ کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے (پھر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے) اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کردیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہے اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہیں محسنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے"۔

ان کی بزم میں دورِ جام مجھ تک کب آتا تھا۔ پھر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے تو کیا تعجب ہے کہ ساقی نے شراب میں زہر ملِا دیا ہو۔ کیونکہ ان کی بزم کا ساقی بھی میرا رقیب ہے۔

۶۔منکرِ وفا:- جو شخص وفا سے انکار کرتا ہو یا کسی کی وفاداری کا اعتبار نہ کرتا ہو÷ دشمن:- رقیب÷ دوست:-محبوب÷

جو شخص کہ سرے ہی سے منکرِ وفا ہو اس پر کسی کا فریبِ محبت کارگر نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں خواہ مخواہ دوست سے بدگماں کیوں ہوں۔ اور یہ خیال کروں کہ وہ رقیب کے فریبِ وفا میں آگیا ہے۔ بھلا منکرِ وفا کا اس فریب میں آنا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف　　　عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

۷۔ معشوق سے کہتے ہیں۔ میں تو وصل میں خوف رقیب کی وجہ سے پریشان ہوں کہ وہ کم بخت عین موقع پر ہی نہ آن دھمکے اور رنگ میں بھنگ نہ ڈال دے۔ لیکن یہ بتلایئے کہ آپ کو وہم نے کس پیچ وتاب میں ڈالا ہے۔

وہم کی تشریح غور طلب ہے۔ نجوؔ، حسرؔت و طباطبائی لکھتے ہیں۔ تم کو یہ وہم ہے کہ میں کسی دوسرے معشوق سے چھپ کر آیا ہوں۔ اس لئے مضطرب ہوں۔

سعیؔد:- تمہارا یہ خیال ہے کہ میں کسی دوسرے معشوق کے خیال سے بے چین ہوں۔

آسیؔ:- اگر معشوق کہے کہ جیسے تجھے رقیب کا خوف ہے۔ ویسے ہی مجھے بھی ہے تو اُس سے کہا جائے کہ آپ تو کہتے تھے مجھے کسی کا خوف نہیں کیونکہ میں کسی سے ملتا ہی نہیں پھر کس بات کا

وہم ہے۔ معلوم ہوا کہ آپ کی وہ سب باتیں غلط تھیں۔ مصنف نے خوف کا لفظ اپنے لئے وہم کا لفظ محبوب کے لئے استعمال کیا ہے۔ خوف اس لئے کہ رقیب عاشق کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور معشوق کا وہم اس لئے کہ اُس کا نقصان کا اندیشہ ایک وہم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا"۔

۸۔ مجھے اور حظِ ولطفِ وصل حاصل ہو۔ یہ ایک خدا ساز بات ہے ورنہ میں اس قابل کب تھا۔ مجھے اس موقع پر اپنی جان قربان کر دینی چاہئے تھی۔ باقی شارحین حظِ وصل کا مفہوم بہتر خیال کرتے ہیں۔

۹۔ عاشق پر محبوب کی برہمی مزاج کا ایسا اثر ہوا کہ جب وہ نقاب میں شکن پڑی ہوئی دیکھتا ہے تو فوراً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ محبوب کا مزاج برہم ہے۔ برہمی کی وجہ سے اس کے ماتھے پر بل پڑے ہیں اور اس کا اثر نقاب پر ظاہر ہے۔ یعنی تیوری کے مقام پر شکن پیدا ہوگئی ہے۔

۱۰۔ حالؔی:- یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اس کا التفات اور میلانِ طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف اور اس کے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہلِ ممتنع ہے۔اگر الفاظ کی طرف دیکھئے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیوں کر ایسے دو ہم پلہ مصرعے بہم پہنچ گئے جن میں حسن ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجئے تو ہر ایک مصرعہ میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا جو فی الواقع عاشق ومعشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے مگر اس کا آنکھ چرانا جو لگاوٹ کی قید ہے۔ وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب و دل آویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بیشک دوبالا ہوجاتا ہے مگر اس کا غصہ میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں۔ اس کی اصل خوبی وجدانی ہے جس کو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ایک روز مولانا آزردہؔ مرحوم کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا۔ چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے۔ اس لئے مرزا کے کلام کو سنکر اکثر اُلجھتے تھے اور ان کی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے مگر اُس روز اس شعر کو سن کر وجد کرنے لگے اور متعجب ہوکر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے۔ کہا گیا میرزا غالبؔ کا۔

چونکہ وہ میرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہ کرتے تھے اور اُس روز لاعلمی میں بیساختہ ان کے منہ سے تعریف نکل گئی تھی۔ غالبؔ کا نام سُن کر بطور مزاح کے جیسی کہ ان کی عادت تھی فرمایا۔ اس میں میرزا کی کیا تعریف ہے۔ یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ شعر بھی معناً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ میرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے یہ اسلوب بیان آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

۱۱۔ خس کے برابر:- تھوڑا سا' ذرہ بھر۔

تعجب ہے میرا وہ نالہ جس سے آفتاب شق ہوجاتا ہے۔معشوق کے دل پر کچھ بھی اثر نہیں کرتا۔

۱۲۔ مدّعا طلبی:- مطلب براری ÷ سحر:- جادو ÷ سراب:- چمکنے والی ریت جس کو دُور سے دیکھ کر پانی کا دھوکا ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ اس جادو سے بھی میری مطلب براری نہ ہو۔ جس کے زور سے دریائے سُراب میں کشتی رواں ہوجاتی ہے۔

۱۳۔ میں نے شراب پینی چھوڑدی ہے۔ لیکن کیا کروں۔ چاندنی راتوں اور ابر کے دنوں میں نہیں رہا جاتا۔

۹۸

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں ۱ یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ۲ گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع ۳ گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے ۴ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے ۵ جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ۶ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر ۷ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ۸ ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز ۹ پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ۱۰ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بو تراب میں

۱۔ کل:- مراد فردائے قیامت ÷ خست:- کنجوسی۔ بُخل ÷ سوئے ظن:- بدگمانی ÷ ساقیِ کوثر:- کوثر حوضِ بہشت ہے اور حضرت علی علیہ اسلام ساقیِ کوثر ہیں۔

ساقی کل کے لئے شراب بچانی چاہتا ہے اس لئے دل کھول کر شراب نہیں پلاتا۔ کہتے ہیں اے ساقی! تو کل کا خیال کرکے آج شراب پلانے میں کنجوسی نہ کر۔ جس قدر پلاسکتا ہے آج ہی پلادے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ساقیِ کوثر کی شان میں بدگمانی اور گستاخی ہوتی ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کل یعنی روزِ قیامت ساقیِ کوثر دل بھر کر نہ چھکائیں۔ پھر تجھے خست کرنے سے کیا حاصل ہے (آسیؔ)

بیخودؔ:- کل یعنی فردائے قیامت کے لئے آج شراب دینے میں خست نہ کر (مشہور ہے کہ دُنیا میں جو شراب پئے گا وہ آخرت میں شراب طہوریٰ سے محروم رہے گا) یہ سمجھنا کہ ساقیِ کوثر طہوریٰ نہ دیں گے۔ ساقیِ کوثر کی فیاضی پر سوئے ظن ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا' وہاں بھی ضرور ملے گی۔

آسیؔ:- (۱) روزِ قیامت کے خوف سے شراب دینے میں خست نہ کر۔ کیونکہ اس سے ساقیِ کوثر کی شان میں سوئے ظن پیدا ہوتا ہے۔ اگر شراب بُری ہوتی تو ساقیِ کوثر کو یہ کام کیوں سپرد ہوتا۔ (۲) میرے ہم خیال۔

سعیدؔ:- اے ساقی! تو کل قیامت کے خیال سے شراب پلانے میں آج خِست نہ کر۔ کیونکہ ایسا کرنا ساقیِ کوثر کی شان میں گستاخی کرنا ہے۔ بھلا یہ ان کے کب شایانِ شان ہے کہ اگر تو آج شراب زیادہ پلادے گا تو وہ کل اس کو منہا کرلیں گے۔

۲۔ حالیؔ:- اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اُس کو گوارا نہ ہوتی اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے

گرادیا گیا ہے۔ دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں حضرت آدم اور فرشتوں کے اس قصہ کی طرف اشارہ ہے' جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا۔ کیا تو دینا میں اُس شخص یعنی اس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں اور پھر آدم سے ان کو زِک دلوائی اور حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ آج ہم دُنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں۔ کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔

(بیخودؔ' سعیدؔ) آسیؔ اور طباطبائیؔ نے دوسرا مفہوم لکھا ہے۔

۳۔ دمِ سماع:- سماع کے وقت' سماع بمعنی سُننا۔ صوفیائے کرام ان اشعار کے سننے کو جو حمد وثنا میں گائے جاتے ہیں' سماع کہتے ہیں۔ چنگ و رباب:- آلاتِ موسیقی۔

اگر خدا کی آواز چنگ و رباب میں سمائی ہوئی ہے تو پھر ان کے نغموں کو سُن کر رُوح میں بالیدگی پیدا ہونی چاہئے۔ لیکن یہ اس کا اُلٹا اثر کیسا ہے کہ سماع کے وقت ہمارے جسم سے جان نکلنے لگتی ہے۔

۴۔ رخش:- گھوڑا۔

حالیؔ:- سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اس کے اختیار سے باہر ہونا چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہوسکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینی حسنِ شبہ کا حق ادا کردینا ہے"۔

میرا توسنِ عمر بگٹٹ اُڑا چلا جاتا ہے۔ میری حالت تو یہ ہے کہ نہ تو ہاتھ میں باگ ہے اور نہ پاؤں رکاب میں ہے۔ بالکل بے اختیار اس پر سوار ہوں۔ دیکھئے' وہ کہاں جاکر تھمتا ہے یا کتنی دُور جاکر مجھے اپنی پُشت پر سے گراتا ہے۔ آزادؔ ؎

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں　　سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

۵۔ حالیؔ:- غیر سے یہاں ماسوائے اللہ مراد ہے' جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے اس لئے کہ وہ وجود واحد کے سوائے سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے جس قدر وجود ماسوا کے وہم سے رات دن پیچ و تاب میں رہتا ہوں' اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجود سے دُور ہوں۔ اپنی ذات

سے بھی دُور ہوں یعنی ماسویٰ اللہ ہر ایک سے علیحدہ ہوں۔ وہ اپنی ذات ہو یا کوئی اور ہو (۲) ہم خیال حالیؔ۔

طباطبائیؔ:- جس قدر غیر کو سمجھتا ہوں اتنا ہی اپنے سے بیگانہ ہوں پس عارف ذہنی وہ ہے جسے غیر کے آئینہ رخسار میں اپنا منہ نظر آئے۔

۶۔ شہود جمع شاہد کی' حاضر ہونا' جب سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آتا ہے تو اس کیفیت کو شہود کہتے ہیں۔

شاہد:- محبوب۔ لفظی معنی دیکھنے والا ÷ مشہود:- جس کو دیکھا جائے ÷

شہود' شاہد اور مشہود کی اصل ایک ہے اس لئے مجھے حیرت ہے کہ جب یہ تینوں چیزیں ایک ہی ہیں تو پھر مشاہدہ کیا چیز ہے۔ کیونکہ مشاہدہ' شاہد اور مشہود کے وجود کو علیحدہ علیحدہ چاہتا ہے۔

۷۔ حالیؔ:- وحدت وجود اور کثرتِ موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورہ میں اس طرح ادا کرنا کہ یہاں کیا دھرا ہے۔ منتہائے بلاغت ہے (سعیدؔ۔ بیخودؔ)

آسیؔ:- قطرہ و موج و حباب کی ہستی کوئی ہستی نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب صورتیں دریا کی بدولت نظر آرہی ہیں اور ان صورتوں کے ظاہر ہونے سے بحر کا پتہ چلتا ہے یعنی ہستی موجودات وجود واجب کے ضمن میں ہے۔ باقی کچھ نہیں ہے (طباطبائیؔ)

۸۔ حسرتؔ:- ان کا حجاب میں رہنا ہی ان کی بے حجابی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ پردے میں رہ کر وہ اپنے سے نہیں شرماتے حالانکہ شرم جو ایک ادائے ناز ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ خود اپنی ذات سے بھی حیا آئے۔ یا یہ مطلب ہوگا کہ ان کا حجاب کرنا بھی ایک طرح کی بے حجابی ہے (تمام متفق) ؎

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی　　وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

۹۔ ہر محبوب بناؤ سنگار اس لئے کرتا ہے کہ لوگ اسے دیکھیں اور اس پر عاشق ہوجائیں۔ چنانچہ ہمارے محبوب نے بھی خوب بناؤ سنگار کئے اور اپنے اس مطلب میں کامیاب ہوا۔ جب سارا جہان اس پر عاشق ہوگیا۔ تو اُس نے آتشِ اشتیاقِ دید کو مشتعل کرنے کے لئے اپنے چہرے پر

نقاب ڈال لی۔ نقاب ڈالنے کا اصلی مدعا یہ ہے کہ کوئی شخص اسے نہ دیکھے۔ جب کوئی اُسے دیکھتا نہیں تو پھر آرائشِ جمال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن ہمارے محبوب کو جمال آرائی کا اس قدر شوق ہے کہ باوجود نقاب ڈالنے کے اسے آرائشِ جمال سے فراغت حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ پردے میں بھی آرائشِ جمال کے لئے ہر وقت آئینہ پیشِ نظر رکھتا ہے (سعید' آسی)

طباطبائی:- نقاب استعارہ ہے حجاب قدس کا اور آئینہ اس میں ''علم ما یکون و ما کان'' کا حکم رکھتا ہے اور آرائشِ جمال سے فارغ ہونا تفسیر ہے ''کل یوم ہو فی شان'' کی (بیخود)

۱۰۔ سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آئے تو اس کو شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبہ احدیت ذات ہے جو عقلی و ادراک و بصیرت سے ورالورا ہے۔ کہتا ہے جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور ہم اس کو غلطی سے شہود سمجھتے ہیں۔ ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لئے مثال نہیں ہو سکتی (بیخود' حسرت' سعید)

آسی:- جن کو ہم شہود یعنی ظاہر باتیں سمجھے ہیں یہ سب غیب الغیب ہیں اور اس غیب الغیب کو شہود سمجھنے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی حالتِ خواب میں سمجھے کہ ہم جاگتے ہیں مگر دراصل وہ خواب میں ہے۔

طباطبائی:- یعنی خواب میں خواب دیکھ رہے ہیں تو یہ غیب میں غیب ہے۔

۱۱۔ ندیم:- مقرب' ہم نشین÷ خدا کو دوست اور حضرت علیؓ کو ندیم دوست قرار دیا ہے÷

بوتراب:- حضرت علی کی کنیت ہے۔

چونکہ دوست کے ہم نشین (یعنی حضرت علی) کے جسم سے مجھے بوئے دوست (یعنی بوئے خدا) آتی ہے۔ اس لئے میں بندگی' ہم نشین (عبادتِ علی) کو عبادتِ خدا خیال کرتا ہوں اور انہی کی عبادت میں مشغول ہوں۔

۹۹

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں ۱ مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ۲ ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار ۳ اے کاش جانتا نہ تیری رہگزر کو میں!
ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے ۴ کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں!
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے ۵ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ ۶ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار ۷ کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں
پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار ۸ جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں!
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا ۹ سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں
غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

۱۔ نوحہ گر:- بین کرنے والا' عزا کرنے والا۔

میرے دل و جگر دونوں فنا ہوگئے ہیں۔ اب میں حیران ہوں۔ دل کو روؤں کہ جگر کو پیٹوں۔ بیک وقت دونوں کا ماتم کیسے کرسکتا ہوں۔ اگر مجھے مقدور ہوتا تو میں کسی نوحہ گر کی خدمات حاصل کرلیتا۔ پھر یہ حیرانی اور پریشانی نہ ہوتی۔ وہ جگر کا ماتم کرتا۔ میں دل کو رو لیتا۔ اس طرح سے دونوں کا ماتم ہوجاتا۔

بیخود لکھتے ہیں' وہ عزیز مرنے والوں کا ماتم دار ایک شخص ہو تو مرنے والوں کی کسرِ شان ہے' اس لئے نوحہ گر کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔

۲۔ رشک کے مارے میری یہ حالت ہے کہ تیرے گھر کا پتہ بھی کسی سے دریافت نہیں کرسکتا۔ مقامِ رشک یہ ہے کہ کوئی تیرا نام سُنے گا تو میرا رقیب بن جائیگا۔ اس لئے میں ہر ایک سے اتنا پوچھتا ہوں کہ میں کدھر جاؤں بھلا اس طرح معشوق کا پتہ چلتا ہے؟ لیکن رشک کا کیا کیا جائے۔ ظاہر ہے پتہ نہ ملنے سے کس قدر بے چینی اور اضطراب بڑھتا ہے۔ یہی کیفیت دکھانی مقصود ہے

(تمام متفق)

سعیدؔ لکھتے ہیں کہ مجھ کو اپنی زبان پر رشک آتا ہے۔ اس لئے معشوق کا نام نہیں لیتا بلکہ یہ پوچھتا ہوں کہ کدھر جاؤں۔

٣۔ چونکہ تو عام طور پر رقیب کے گھر میں رہتا ہے اس لئے مجھے اس کے گھر پر ہزار بار جانا پڑا۔ ظاہر ہے رقیب کے گھر پر جانا عاشق کے لئے باعثِ ذلّت ہے۔ اس لئے کہتے ہیں۔ اے کاش! مجھے تیرے گھر کا پتہ ہی نہ ہوتا تو میں اس ذلت سے بچ جاتا۔ مومنؔ

اس نقشِ پا کے سجدے نے یاں تک کیا ذلیل   میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

٤۔ ہے کیا:- یعنی کچھ نہیں ÷ کمر کسنا:- مستعد ہونا۔ ہمّت باندھنا۔

شاعروں کے نزدیک معشوق کی کمر نہیں ہوتی۔ اس لئے جو مجھے یہ دھمکی دیتے ہو کہ ہم نے تجھے قتل کرنے کے لئے کمر باندھ لی ہے تو تمہاری اس دھمکی سے میری بلا ڈرتی ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے کمر ہی نہیں تو کسوگے کیا؟ گویا میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ سب دھمکیاں ہی دھمکیاں ہیں۔

٥۔ لیجئے ملاحظہ فرمایئے۔ جن کے لئے ہم نے اپنا گھر بار لٹا دیا اور تباہ ہوگئے وہی فرماتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ وہ یہ طعنہ دیں گے تو ہم اپنے گھر کو لٹا کر آج یہ بات نہ سُنتے۔

٦۔ حالیؔ:- طالبِ راہِ خُدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اس کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اوّل اوّل جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد یا سماع وجوش وخروش دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعاقب کرتا ہے۔ وہلم' جرا' اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔"

طباطبائی:- ایک گم کردہ راہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ کہتے ہیں۔ میں منزل کا راستہ نہیں جانتا۔ راہبر کو نہیں پہچانتا۔ تلاشِ منزل میں سرگرداں اور حیران ہوں۔ آرزو یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح منزل پر پہنچ جاؤں۔ جس شخص کو تیز رفتار دیکھتا ہوں۔ سمجھتا ہوں کہ یہ منزل کا پتہ جانتا ہے اس

لئے اسی کے ساتھ ہو جاتا ہوں۔ آگے بڑھ کر کسی اور کو تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اسی کو راہبر خیال کرکے اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو جاتا ہوں۔ گویا تلاشِ منزل میں دیوانہ ہو رہا ہوں (آسیؔ، طباطبائی)

٧۔ احمق لوگ خواہش کو پرستش قرار دیتے ہیں۔ بھلا خواہش اور پرستش ایک چیز کیسے ہوسکتی ہے۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ میں اس بُتِ بیدادگر کی پرستش کرتا ہوں۔ حالانکہ امرِواقعہ اس کے بالکل برعکس ہے مجھے تو محض اس کی خواہش اور آرزو ہے۔ میں اس کا پجاری نہیں۔ (سعیدؔ۔ آسیؔ)

بیخودؔ و طباطبائی:- معنی باریک اس شعر میں یہ ہیں کہ شاعر حیران ہوکر پوچھتا ہے کہ کیا میں اسے پوجتا ہوں اسے خبر نہیں کہ معشوق کے سامنے جاکر اظہار نیاز پرستش کی حد تک پہنچ جاتا ہے یا خواہش کی حد تک رہتا ہے اور حیرت کے علاوہ دوسرا پہلو تشنیع کا بھی ہے۔ اُسی نے پرستش اور خواہش میں یہ فرق نکالا ہے کہ جب پرستش کی جائے گی تو وہ خواہش دل ہی سے ہوگی۔ خواہ اس میں کسی قدر استغراق کیوں ہو اور جس امر میں خواہش دل شامل ہے وہ عبادت نہیں ہوسکتی تو ثابت ہوا کہ عبادتِ حق کوئی بجا نہیں لاسکتا۔ صرف دُنیا پابندانِ خواہش کو عابد کا خطاب دیتی ہے۔

٨۔ میں کوچہ یار میں گیا تھا وہاں جاکر ایسا بیخود ہوا کہ اپنے آپ کو وہیں بھول گیا۔ جب سے وہاں سے آیا ہوں بیخود اور فراموش ہوں۔ اس بیخودی میں اس کی گلی کا راستہ بھی بھول گیا۔ اگر میرے ہوش و حواس درست ہوتے تو ایک دن اس کی گلی میں اپنی خبر لینے کے لئے جاتا کہ وہاں مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔

طباطبائی:- یعنی آپے سے جو میں باہر ہوگیا ہوں تو کہیں اور تھوڑی گیا ہوا ہوں۔ کوئے یار ہی میں گیا ہوں گا۔ وہی جگہ ایسی دلکش ہے کہ کوئی وہاں جاکر نہیں پلٹتا۔ میں بھی وہیں ہوں۔ اسی سبب سے آپ میں نہیں آتا۔ اور آپ میں نہ ہونے کے سبب سے راہ بھی بھول گیا۔ نہیں تو اپنی خبر کو ایک دن وہاں جاتا (بیخودؔ۔ سعیدؔ)

آسیؔ:- میں اپنے حواس اس گلی میں چھوڑ آیا تھا۔ جب سے وہاں سے آیا ہوں۔ بیخود ہوں۔ لہٰذا اس کی گلی کا راستہ بھی بھول گیا ہوں اور اس لئے اب جان و دل اور ہوش و حواس کی خبر

بھی نہیں لاسکتا کہ وہاں ان پر کیا گزری اور اب وہ کس حال میں ہیں۔

۹۔ جیسا میں خود ہوں' ویسا ہی اہلِ دُنیا کو سمجھتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ میں متاعِ ہُنر کا قدردان ہوں۔ اسی طرح اہلِ دہر کو بھی ہنر کا قدردان خیال کرتا ہوں۔ لیکن امر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ اہلِ دہر میری طرح متاعِ ہُنر کو دلپذیر خیال نہیں کرتے اور نہ اس کی قدر کرتے ہیں۔ گویا عوام کے نزدیک ہُنر متاع کا سد ہے۔

۱۰۔ سمندِ ناز:- وہ گھوڑا جو ناز و انداز سے قدم اُٹھائے۔

اے غالبؔ! خدا کرے کہ عالی گہر علی بہادر کو میں سمندِ ناز پر سوار دیکھوں'

۱۰۰

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں ۱ غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق ۲ مژدۂ قتل مقدّر ہے جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم ۳ لوگ کہتے ہیں کہ ہے' پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ۴ ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی ۵ عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ ہم آینگے قیامت میں تمہیں ۶ کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو' ۷ تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
صاف دردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ ۸ وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوی پہ یہ حجّت ہے کہ مشہور نہیں

۱۔ اُنہیں مجھ سے اس قدر نفرت ہوگئی ہے کہ اگر غیر ان کے سامنے میری بدی کرنا چاہتا ہے تو وہ اُسے بھی سُننا گوارا نہیں کرتے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ غیر کو میری بدیاں کرنے کی عادت ہے' کیا عجب ہے کہ اس بنا پر وہ اس سے ناراض ہو جائیں۔ کیونکہ وہ میری بُرائیاں کرنے سے باز نہیں آسکتا۔ غالبؔ

دشمنی نے میری کھویا غیر کو کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہئے

۲۔ مقدّر:- پوشیدہ مطلب۔

میرے شوق کا نصیبہ جاگ اُٹھا کہ اس نے مجھ سے گلستاں میں سیر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس وعدہ میں مژدۂ قتل بھی پوشیدہ ہے۔ جس کا اُس نے ذکر نہیں کیا۔ کاش کہ ایسا ہی ہو (آسی)

بیخودؔ:- وہ پھولوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھے گا اور میں اُن کو رقیب سمجھ کر رشک سے قتل ہو جاؤں گا۔

سعیدؔ:- سیرِ گلستاں سے اس کی مراد یہ ہے کہ وہ میرا خون بہے جو مثل لالہ وگل کے ہے۔

۳۔ حسرتؔ:- غالبؔ دُنیا کے موہوم ہونے کو بہ غلو بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ عالم شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے۔ اور اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ جس طرح شاہد کی کمر نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے وجودِ عالم بھی موہوم ہے۔ لیکن ہم کو یہ منظور نہیں ہے۔ کیونکہ جب کہتے ہیں کہ عالم شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے''۔ تو اگر چہ اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ عالم معدوم ہے' لیکن ''ہے'' کا لفظ ہم ایک شے معدوم کے لئے کسی طرح استعمال نہیں کرسکتے۔ (سعیدؔ۔ آسیؔ)

طباطبائیؔ:- عالم کو ہستی کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ کمر کو معشوق کے ساتھ' کہ اس کا نام ہی نام سنتے ہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔ مصنّف نے لفظ منظور کو یہاں مبصر اور مرئی کے معنی پر استعمال کیا ہے محاورہ اس کے مساعد نہیں (بیخودؔ)

۴۔ میں وہ قطرہ ہوں جو حقیقت میں دریا ہے۔ یعنی فنافی البحر ہے۔ گویا میں فنافی الذات کا مرتبہ رکھتا ہوں۔ لیکن میں منصور کی طرح کم ظرف نہیں ہوں کہ انا الحق کا دعویٰ کر بیٹھوں اور اس طرح اپنی تنگ ظرفی کا ثبوت بنوں۔ اس لئے منصور کی تقلید نہیں کرتا۔ حقیقت کا لفظ قابلِ تعریف ہے۔

۵۔ عشقِ پُر عربدہ:- جنگجو عشق ÷ گوں:- قابل۔ ڈھب ÷

ذوقِ بربادی وخرابی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تباہ و برباد ہونے کی حسرت میرے دل ہی میں رہ گئی اور وہ اس وجہ سے کہ میرے تن رنجور و کمزور میں پہلے جیسی طاقت نہیں رہی' جو میں جنگجو عشق کا مقابلہ کرتا۔ ظاہر ہے جب جنگجو عشق ان میں مقابلہ کی طاقت پاتا تو ان کو اچھی طرح تباہ کرتا۔ اب وہ مرے ہوئے کو کیا مارے گا۔ ایک طرح سے اپنی کمزوری کا اظہار کیا ہے۔

۶۔ رعونت:- غرور٭

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جنّت میں حوریں ملیں گی۔ شاعر خیال کرتا ہے کہ یہ حسین ہی جنّت میں حوریں بن جائیں گے۔ ان خیالات کے ماتحت وہ جب معشوق سے کہتا ہے کہ اچھا تم ہم سے نہیں ملتے تو نہ ملو۔ جنّت میں چل کر دیکھا جائے گا۔ قیامت کے دن جب ہمیں اختیار ہوگا کہ جس حور کو ہم چاہیں پسند کرلیں' اس دن تم کیا کروگے۔ وہ ازراہِ شوخی جواب دیتا ہے کہ جناب ہم حور نہیں ہیں جو آپ کو قیامت کے دن مل جائیں گے۔ اسی خیال کو اس طرح بھی ادا کیا ہے

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے اگر حوریں یہی واں ہوگئیں

۷۔ اگر تجھے مجھ پر لطف وکرم کرنے میں دریغ ہے تو ظلم ہی کر۔ مہربانی نہ سہی لیکن تغافل نہ کر۔ کیونکہ یہ تو محض نا آشنائی کی دلیل ہے۔ اس لئے مجھے یہ کیونکر گوارا ہوسکتا ہے (حسرتؔ۔ طباطبائی)

بیخودؔ لکھتے ہیں تغافل تو اس حالت میں زیبا تھا کہ جب تو ظلم کرنے سے معذور ہوتا۔ سعیدؔ کا خیال ہے۔ کیونکہ یہ (ظلم) بھی تغافل کی جو کہ تیرا شعار ہے ایک ادا ہے اور تو تغافل کی ہر ایک ادا پر قادر ہے۔

آسیؔ:- (۱) اگر لطف نہیں کرتا تو ظلم کر کیونکہ حالتِ تغافل میں یہ دونوں باتیں تو کرسکتا ہے مگر محض تغافل میں تو معذور نہیں رکھا جاسکتا۔ کیونکہ ہر کوئی تجھے مجھ سے غافل سمجھ کر یہ بھی قیاس کرسکتا ہے کہ یہ عاشق پر جور وجفا کر رہا ہے اور یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اب یہ اپنے دل دادہ پر مہرباں ہوگا کہ اس نے ظلم کرنا چھوڑ دیا (۲) عاشق ومعشوق حسنِ اتفاق سے ملے ہیں۔ مصرعہ اولیٰ کا مضمون عاشق اس کے سامنے ادا کرتا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ لوگ مجھے اس بات کا طعنہ دیں گے کہ یہ اس سے ملا ہوا ہے تو عاشق اس کو اپنے اوپر مہربان کرنے کا حیلہ بتاتا ہے کہ یہ تغافل جو تُو نے اختیار کیا ہے اس کو چھوڑ دے۔ مجھ پر ظلم کیا کر۔ تو اس میں میرا کام بھی ہوجائے گا کہ تو مجھ پر کم سے کم اس قدر تو مہربان ہوا کہ ظلم کیا اور لوگ بھی کہیں گے ۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی   تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ بھی ہے کہ تغافل اختیار کرکے کچھ تو معذور اور کمزور تو نہیں ہوگیا ہے۔ بہرصورت تجھے اب بھی ظلم ومہربانی کا اختیار باقی ہے۔ جب چاہے اس کو چھوڑ کر یہ اختیار کرے (ظاہر ہے کہ یہ معنی بہت دور کے ہیں)

۸۔ دُردی کش:- تلچھٹ پینے والے٭

صاف اور دُرد میں رعایت ہے شرابِ انگور جمشید کی ایجاد ہے کہتے ہیں کہ شراب نوشی میں ہم جمشید کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ بات تقلیدِ جمشید کے خلاف ہے کہ ہم ادنیٰ درجہ کی شراب پئیں۔ پس ہم کو اس شراب پر افسوس ہے جو شراب انگوری نہ ہو۔

۹۔ خفا اور ظہور میں تقابل و تضاد ہے۔ خفا بمعنی مخفی و گمنام ظہوری بمعنی مشہور و معروف' مرزا صاحب ظہوریؔ کا کلام بہت زیادہ پسند فرماتے اور اس کی تقلید پر فخر کیا کرتے تھے۔ پس کہتے ہیں۔ چونکہ میں مشہور نہیں ہوں اس لئے ظہوریؔ کے مقابلہ میں خفائی ہوں اور میرا مشہور نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ میں ظہوریؔ کا مدِ مقابل ہوں۔

۱۰۱

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں ۱ ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدورئ عشرت گہِ خسرو کیا خوب ۲ ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم ۳ دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب ۴ لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں
وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا ۵ جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے ۶ گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں
سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں ۷ مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیّاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا ۸ دی ہے جائے دہن اُس کو دمِ ایجاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت ۹ یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

۱۔ اے ستم ایجاد محبوب! نالہ و بکا سے میرا یہ مدعا نہیں کہ میں تیرے ظلم و ستم کا شکوہ و شکایت کروں بلکہ اس نالہ کشی سے میرا مقصد تقاضائے جفا کے لئے حسنِ طلب ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم یوں تو ہم پر جور و جفا کرتے نہیں لیکن میرے نالوں سے تنگ آ کر خفا ہو گے اور خفا ہو گے تو ظلم کرو گے، اسی کو حسن طلب کہتے ہیں۔ غالب ؎

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو　　شکوۂ جور سے بے مہر خفا ہوتا ہے

۲۔ عشرت گہ:- عشرت گاہ۔ محل÷ نکونامی:- نیک نامی÷

مشہور ہے کہ فرہاد سے خسرو نے کہا کہ اگر تو کوہِ بے ستون کاٹے اور اس میں سے جوئے شیر نکالے تو پھر شیریں سے وصال ہو سکے گا۔ فرہاد نے یہ شرط منظور کی اور جوئے شیر لانے میں مصروف ہو گیا۔ جب خسرو نے دیکھا کہ فرہاد وصلِ شیریں کی شرط پوری کرنے کے قریب ہے تو اس نے ایک اور چال چلی۔ ایک بڑھیا کو سکھا بجھا کر فرہاد کے پاس بھیجا اس نے فرہاد سے کہا کہ شیریں تو مر گئی اور تیری محبت اکارت گئی۔ یہ سنتے ہی فرہاد اپنا سر پھوڑ کر مر گیا۔ اس سے خسرو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ شاعر اس واقعہ کو مدِ نظر رکھ کر فرہاد پر طعن کرتا ہے اور کہتا ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فرہاد نے عشق کی لاج رکھ لی اور اتنا بڑا کام کر دکھایا۔ لیکن ہمیں اس میں فرہاد کی کوئی نیک نامی کی صورت نظر نہیں آتی۔ اس لئے ہم اس کی نیک نامی کو تسلیم نہیں کرتے۔ کہتا ہے۔ عشقِ صادق اور رقیب کے عشرت کدہ کی مزدوری دونوں متضاد چیزیں ہیں گویا عاشقِ صادق کے لئے رقیب کے عشرت کدہ جوئے شیر سے زینت دینا باعثِ نیک نامی نہیں۔ باعثِ بدنامی ہے۔

۳۔ خرابی:- ویرانی÷

میرا گھر خرابی اور ویرانی میں جنگل سے کسی طرح کم نہیں، لیکن اس میں جنگل جتنی وسعت نہیں ہے۔ میں دیوانہ ہوں۔ مجھے آرام کرنے کے لئے بہت وسیع مکان چاہئے۔ یہی وجہ ہے جنگل میں مجھے وہ عیش و آرام حاصل ہے کہ گھر کبھی یاد ہی نہیں آتا۔

۴۔ اہلِ بینش:- عقلمند۔ اہلِ نظر÷ لطمہ موج:- موج کا تھپیڑا۔ یعنی طوفانِ حوادث÷ سیلی:- طمانچہ، تھپیڑ÷

جو لوگ اہلِ نظر ہیں، طوفانِ حوادث کو مکتب خیال کرتے ہیں اور امواج کے تھپیڑوں کو اُستاد

کا تھپڑ سمجھتے ہیں۔ گویا طوفانِ حوادث ان کے لئے سبق آموز ہے۔ وہ اُس سے درسِ عبرت حاصل کرتے ہیں۔

۵۔ تسلیم:- صبر و رضا÷ بدا:- بہت بُرا÷

ہم تسلیم و رضا اور وفاداری کے خیال سے خاموش ہیں اور نالہ و فریاد نہیں کرتے ہیں۔ لیکن وہ سمجھتا ہے ہم میں طاقت فریاد نہیں۔ اس لئے ہم خاموش ہیں۔ کس قدر افسوس ہے ہماری خوئے تسلیم و وفا پر کہ وہ ضبطِ فریاد اور خاموشی کی داد سے بھی محروم ہے۔

۶۔ تمکین:- خودداری÷ چراغاں سرِ راہ گزرِ باد:- وہ چراغ جو ہوا کے راستے میں رکھا ہؤ جلد تر بجھ جاتا ہے۔ مراد بے ثبات چیز÷

اگر گل و لالہ ہوا کی راہ گزر کے چراغ نہیں تو ان کا رنگ تمکین و خودداری اس قدر جلدی کیوں فنا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گل و لالہ بے ثبات ہیں، تشبیہ نہایت حسین اور اچھوتی ہے۔

۷۔ سبدِ گل:- پھولوں کی ٹوکری۔ جس میں گلچیں پھول توڑ کر جمع کرتے ہیں۔

اے مرغِ چمن تجھے مژدہ ہو کہ باغ میں صیاد موجود نہیں ہے جو تجھ کو گرفتار کر کے چمن سے باہر لے جاتا اور قفس میں قید کرتا۔ اس وقت باغ میں گلچیں ہے۔ اس کے پاس دامِ قفس نہیں کہ وہ تجھے پکڑ کر پھولوں کی ٹوکری کے نیچے بند کر دے گا۔ پھولوں کی ٹوکری کے نیچے قید ہونے میں لطف یہ ہے کہ پھولوں سے اور بھی زیادہ قرب حاصل ہوگا اور یہی مرغِ چمن کا اصلی مدعا ہے۔

آسی اور بیخود:- اے مرغ سے مراد مرغِ گرفتار لیتے ہیں۔ سعید و حسرت میرے ہم خیال ہیں۔

۸۔ نفی:- نہیں، انکار÷ اثبات:- ہاں، ثبوت÷ تراوش:- ٹپکنا۔ ظاہر ہونا÷

معشوق ہر بات پر "نہیں" "نہیں" کرتا ہے۔ اس کے "نہیں" "نہیں" کہنے سے اس کے دہن کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ اگر اس کے دہن نہ ہوتا تو وہ "نہیں" بھی نہ کہتا (سعید۔ حسرت) غالب نے یہاں اثبات کو مونث باندھا ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے ؎

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

گویا ضلع کا لفظ ہے اور خوب آیا ہے۔

آسی:- اس کو بجائے دہن کے "نہیں" ملی ہے یا اس کو دہن تو ملا نہیں "نہیں" ملی ہے کہ ہر بات پر وہ "نہیں" کہتا ہے اور اس "نہیں" سے اثبات کی تراوش ہوتی ہے یعنی کوئی چیز ضرور ہے جس سے وہ اس لفظ کو ادا کرتا ہے۔ پہلی صورت میں دوسرے مصرعہ کے یہ معنی ہوں گے کہ اگر نہیں بجائے دہن کے اس کو ملی ہے مگر ملی ضرور ہے (بیخود۔ طباطبائی)

۹۔ بہشت جلوہ گری میں تیرے کوچے سے کم نہیں ہے یعنی ایسی ہی جلوہ گری بہشت میں بھی ہے اور اس کا نقشہ بھی بالکل ایسا ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ وہ (بہشت) تیرے کوچے جتنی آباد نہیں ہے۔ یہاں پر ہر وقت ہجوم رہتا ہے لیکن وہاں یہ بات نہیں۔ شاید یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ تیرے عاشق زیادہ ہیں۔ خدا کے عاشق اتنے زیادہ نہیں ورنہ دیدار خدا کے لئے بہشت میں بھی خوب ہجوم ہوتا۔ عام شعراء کے خلاف اس شعر میں کوچہ یار کو جنت سے تشبیہ دینے کی بجائے جنت کو کوچہ یار سے تشبیہ دی ہے اور اس کو بہشت سے بڑھ کر ثابت کیا ہے۔

۱۰۔ غربت:- مسافری۔

تم کس برتے پر غربت کی کس مپرسی کی شکایت کرتے ہو۔ کیا تمہیں یارانِ وطن کی بے مہریاں یاد نہیں رہیں؛ جب اپنے اہلِ وطن اس قدر بے مہر اور دل آزار ہیں تو پھر غیروں کی شکایت کیا۔

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس جو گلخن میں نہیں

۱۰۲

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا ۱
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے ۲
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم ۳
ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں

۱۔ حالی:- اپنی فراخ حوصلگی اور اس کے ساتھ شرافتِ نفس کا اظہار ہے یعنی میں جو دونوں جہان لے کر خاموش رہا اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع تھا بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی۔ اس لئے خاموشی اختیار کی۔

۲۔ مقام یعنی مقامِ سلوک و معرفت فرماتے ہیں۔ بہت سے لوگ مقاماتِ سلوک و معرفت طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی مقامِ معرفت تک نہیں پہنچتا۔ کوئی ابتدائی

منزلوں میں مایوس ہو جاتا ہے کوئی درمیانی مقامات میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ یہ مضمون اس طرح ادا کرتے ہیں کہ تیری جلوہ گاہ تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ کوئی کسی منزل پر تھک کر رہ گیا۔ کوئی کسی مقام پر مایوس ہو کر بیٹھ رہا۔ غرض کوئی بھی مقام معرفت تک نہ پہنچا۔ ٹھیک ہے' تیرا پتہ تو کہیں ملتا نہیں۔ وہ بیچارے ناچار ہو کر ترک جستجو نہ کریں تو کیا کریں۔ مجبور ہیں دو چار ناچار کے ضلع کا لفظ از خود آ گیا ہے۔

۳۔ ہوا خواہ:- ہمدرد غمخوار۔

شمع کا ذکر بطور تمثیل ہے۔ غرض اپنے حال سے ہے۔ کیا اہل بزم شمع کے غمخوار نہیں ہیں" مطلب یہ ہے کہ ضرور ہیں۔ لیکن جب غم ہی جان کو پگھلانے والا ہو تو بیچارے غمخوار کیا کر سکتے ہیں۔ مجبوری ہے کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا

۱۰۳

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

معشوق پر رقیب کی جادو بیانی اور شیریں کلامی کا جادو چل گیا ہے گویا وہ غیر کو عاشق صادق سمجھنے لگا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم بے زبان ہیں۔ کیونکہ ہم اپنی زبان سے اپنے عشق کا یقین نہیں دلا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو ہمارے عشق کا یقین نہیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہم اس کے عاشق صادق ہیں۔

۱۰۴

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا ۱
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں
دل نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

۱۔ معشوق کا دل موم کرنے کے لئے اس کو لیلے مجنوں کا قصہ سُنایا اور یہ بتایا' مجنوں کے عشق کا یہ اثر ہوا کہ لیلیٰ بیتاب اور بے حجاب ہو کر دشتِ قیس میں آ گئی۔ یہ قصہ سُنکر بجائے اس کے کہ وہ جذب عشق سے ڈرتا اور ہم پر مہربان ہوتا کہ معشوق عاشق کے پیچھے پیچھے اسے ڈھونڈتا پھرے۔

مطلب صرف اس قدر ہے کہ معشوق کا عاشق کی خبر گیری کرنا خلافِ معشوقیت خیال کرتا ہے۔

۲۔ معشوق کی آزمائش عاشق کی محبت کی قدردانی پر منحصر ہے۔ پس اس کا امتحان اس طریقے سے ہوسکتا ہے کہ عاشق اپنے آپ کو ہلاک کردے۔ اگر معشوق عاشق کی ہلاکت سے ملول اور غمگین ہو تو ثابت ہوجائے گا کہ معشوق عاشق کا قدردان ہے۔ اس مضمون کو ایک دوسرے شخص کی زبان سے کہلوانے میں لطف دوچند ہوگیا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ عاشق یہ سخت امتحان لینے پر آمادہ یعنی اپنی جان پر کھیلنے کو تیار ہے۔ لیکن دیکھنے والے اسے معشوق کی نازک دلی کا واسطہ دے کر باز رکھتے ہیں۔

۱۰۵

دل لگا کر آگیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا ۱ بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی دادیاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام ۲ مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ بادیاں

۱۔ جب سے اُنہوں نے کسی سے دل لگایا ہے وہ تنہا بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ ہماری بے کسی کا صبر پڑا ہے۔ جس طرح ہم ان کے عشق میں خلوت پسند تھے وہ بھی ہوگئے۔ پس یہی ہماری بے کسی کی داد ہے جو ان کے کسی پر عاشق ہونے سے ہم کو ملی ہے۔

۲۔ زوال:- آمادۂ زوال ÷ اجزا آفرینش کے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ ÷ چراغِ رہگزارِ باد:- وہ چراغ جو ہوا کے راستے میں روشن ہو۔ بہت جلد بجھ جاتا ہے۔ گویا وہ آمادۂ زوال ہے۔
کائنات کا ہر ذرّہ آمادۂ زوال ہے۔ یہاں تک کہ خورشید بھی ایک ایسا چراغ ہے جو ہوا کے راستے میں روشن ہے اور اس کا آمادۂ زوال ہونا ظاہر ہے۔ کیا پتہ کونسا جھونکا اسے فنا کردے۔

۱۰۶

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں ۱ کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ۲ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو ۳ یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں ۴ ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

۱۔ بادِ صبا ہر جگہ بغیر روک ٹوک کے آتی جاتی ہے اس لئے شعراء اس سے پیغامبر کا کام

لیتے ہیں اور جب کوئی شخص کسی کے انتظار میں ہوتا ہے تو وہ بے چین ہوکر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ کہتے ہیں۔ ہجر میں ہم جو کبھی دیوار کو دیکھتے ہیں اور کبھی ہماری نظر دروازے پر جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کبھی ہمیں یہ خیال آتا ہے کہ کہیں بادِ صبا پیغامِ یار نہ لائی ہو اور دروازے کو بار بار دیکھنے کی یہ وجہ ہے کہ ہمیں قاصد کے آنے کا انتظار ہے۔ ظاہر ہے بادِ صبا دیوار پر سے اور قاصد دروازے میں سے آئے گا۔

۲۔ حالیؔ:- اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے دوسرے مصرعہ میں اُس کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہو۔ سبحان اللہ! میری ایسی قسمت کہاں تھی۔

۳۔ معشوق نے میرے جگر پر بہت کاری زخم لگایا ہے۔ عاشق کے جگر پر کاری زخم لگانا نا قابلِ تحسین و آفرین ہے کیونکہ معشوق کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے یہ بات ناممکن ہے، اس لئے جو شخص بھی زخم کو دیکھتا ہے معشوق کے دست و بازو کی تعریف کرتا ہے۔ کہتے ہیں میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں اس کے دست و بازو کو نظر نہ لگ جائے اور اُن کی ناوک افگنی اور قدراندازی کو نقصان پہنچے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ یہ لوگ میرے زخمِ جگر کو نہ دیکھیں۔ نہ دیکھیں گے۔ نہ تعریف کریں گے اور نہ نظر لگے گی۔ یہ شعر مرزا کے لاجواب شعروں میں سے ایک شعر ہے۔

۴۔ طرف کلہ:- ٹوپی کا پہلو یا سرا ÷ اوجِ طالع:- نصیبے کی بلندی، خوش قسمتی ÷
ہم ان جواہرات کو کیا دیکھیں جو تُو نے اپنی کلاہ پر ٹانکے ہیں۔ ہم تو لعل و گوہر کے نصیبے کی بلندی اور خوش قسمتی کو دیکھتے ہیں کہ یہ سنگریزے تیری کلاہ میں ٹنک کر کس مرتبۂ بلند کو پہنچے ہیں۔

۱۰۷

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں ۱ شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے ۲ بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں ۳ جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں ۴ کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب ۵ گدائے کوچہ مے خانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم وشادی بہم ہمیں کیا کام ۶ دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

۱۔ روزِ جزا:- روزِ قیامت÷

یہ بات نہیں کہ مجھے قیامت پر اعتقاد نہیں ہے۔ میں قیامت پر ایمان رکھتا ہوں۔ صرف بات اتنی ہے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ عذاب قیامت شبِ فراق کے عذاب سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ گویا میرے نزدیک شبِ ہجر کی سختیاں اور شدائدِ عذابِ قیامت سے بڑھ کر ہیں۔

۲۔شراب پینے والے روز ابر اور شبِ ماہ میں شراب نوشی کرنا پسند کرتے ہیں۔ غالبؔ نے ایک اور جگہ بھی لکھا ہے ۔

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

کہتے ہیں سوئے اتفاق سے آج روزِ ابر نہیں' اس لئے شراب نوشی کا کچھ لطف نہیں۔ پھر اپنے دل کو اس طرح تسلی دیتے ہیں کہ کیا ہوگیا اگر ابر نہیں تو شب ماہتاب تو ہے۔ پھر کون سی بُرائی ہے۔ چاندنی رات میں مے نوشی کا خوب لُطف آئے گا۔

۳۔ معشوق کی بے التفاتی کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں "وہ میری طرف سے اس قدر بے پروا ہیں کہ جب میں اس کی خدمت میں جاتا ہوں تو کبھی اس کے منہ سے خوش آمدید کے کلمات نہیں نکلتے اور جب میں اس سے رُخصت ہوتا ہوں تو اُس وقت بھی الوداعی الفاظ نہیں کہتا ورنہ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی غیر بھی آتا ہے تو مرحبا' خوش آمدید وغیرہ کہتے ہیں اور رخصت کرتے وقت خیر باد' خدا حافظ' اللہ نگہبان کہا جاتا ہے۔

۴۔ اول تو مجھے کبھی وہ اپنی بزم میں یاد ہی نہیں کرتے اور کبھی یاد آتا ہوں تو وہ بھی اس طرح کہ وہ حاضرین بزم سے دریافت کرتے ہیں کیا بات ہے آج بزم میں کچھ فتنہ وفساد نہیں' گویا مجھے وہ فتنہ پرداز اور فسادی خیال کرتے ہیں۔ غور فرمایئے یہ ہے ہمیں یاد کرنے کا طریقہ!

بیخودؔ لکھتے ہیں کہ فسادی اور فتنہ پرواز کہنے کا سبب یہ ہے کہ میں بات بات پر رشک کی بدولت اہل بزم سے اُلجھتا ہوں۔

۵۔ عام طور پر عید کے دن محتاجوں اور فقیروں کو ہر جگہ خیرات دی جاتی ہے کہتے ہیں یہ دستور مے خانہ کا نہیں ہے کہ وہاں بھی عید ہی کے دن مے خانہ کے گداؤں کو شراب تقسیم کی جائے۔ وہاں تو عید کے علاوہ اور دنوں میں بھی شراب خیرات کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گدائے کوچہ مے خانہ نامراد نہیں' گویا ساقیِ میخانہ کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ سعیدؔ کوچہ سے کوچہ یار مراد لے کر شرح لکھتے ہیں۔

۶۔لوگوں کا خیال ہے کہ شادی وغم تو عام ہیں یعنی غم اور خوشی ساتھ ساتھ ہیں کبھی خوشی ہے کبھی غم ہے۔غرض اسی طرح زندگی بسر ہوجاتی ہے کہتے ہیں دُنیا میں شادی وغم بہم ہی ہوں گے' لیکن ہمارے ساتھ تو یہ بات نہیں۔ خدا نے ایسا دل دیا ہے جس کو خوشی کبھی نصیب ہی نہیں ہوتی۔ ہمیشہ غم ہی میں مبتلا رہتا ہے۔

طباطبائیؔ کی شرح لطف سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں۔ غم و شادی کا بہم ہونا اس مقام پر ذکر کرتے ہیں جہاں دُنیا کے سرور وخوشی سے نفرت ظاہر کرنا ہو۔ اس شعر میں مصنّف نے تازگی یہ پیدا کی ہے کہ غم اور شادی کے بہم ہونے پر حسرت ظاہر کی ہے۔ شادی مخلوط بغم کی حسرت سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ شاعر کو انتہا کی غمزدگی ہے کہ ایسی ہیچ و ناکارہ خوشی کی تمنا رکھتا ہے اور یہی وجہِ بلاغت ہے۔

۷۔ معشوق کی وعدہ خلافی اور بدعہدی کے مضمون کو خوب آب و رنگ دیا ہے کہتے ہیں' غالبؔ! تم انہی کا وعدہ یاد نہ دلاؤ۔ بھلا یہ کیا کہ تم کہو کہ آپ نے وعدہ کیا تھا اور وہ کہیں کہ ہمیں تو یاد نہیں کہ ہم نے وعدہ کیا تھا مطلب یہ ہے خواہ مخواہ جھوٹے نہ بنو اور ناحق کا صدمہ نہ اُٹھاؤ۔

بیخودؔ لکھتے ہیں کہ تم ان سے یہ کہوگے کہ تم نے ہم سے وعدہ خلافی کی' وہ کہیں گے تم جھوٹے ہو' ہمیں اپنا وعدہ یاد نہیں' باہم دگر تکرار ہوگی' تکرار سے رنج نکلے گا۔

۱۰۸

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں ۱ ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ۲ ہم بھی اِک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر ۳ برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں
قید ہستی سے رہائی معلوم ۴ اشک کو بے سرو پا بندھتے ہیں

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل ۵ مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامین مت پوچھ! ۶ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں ۷ آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ!
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں!

۱۔ توسن:۔ گھوڑا÷ ہوا باندھنا:۔ رُعب بٹھانا÷

ہم تیرے گھوڑے کو بادِ صبا سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس نادر تشبیہ سے ہمارے مضمون کی ہوا بندھ جاتی ہے۔

۲۔ ہم آہ کر کے اس کے دل پر اپنا رعب بٹھاتے ہیں کہ شاید وہ اثرِ آہ کے خوف سے رام ہوجائے۔ ورنہ اثرِ آہ کی حقیقت ہمیں معلوم ہے کہ وہ کوئی اثر نہیں رکھتی۔

۳۔ پابہ حنا:۔ ست رفتار۔ جس کے پاؤں میں مہندی لگی ہو وہ چل نہیں سکتا ہے۔ اگر چلتا ہے تو بچ بچ کر پنجوں کے بل، ایڑیوں پر۔

اے عمر تو اس قدی تیز رفتار ہے کہ تیرے مقابلے میں ہم بجلی کو پابہ حنا باندھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عمر کی رفتار چشمکِ برق سے بھی زیادہ تیز ہے اسی لئے تیرے مقابلے میں ہم اسے ست رفتار اور پابہ حنا کہتے ہیں۔

۴۔ انسان قیدِ ہستی سے کسی صورت بھی آزاد نہیں ہوسکتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اشک کو دیکھو وہ بے سروپا ہے۔ لیکن شعراء پھر بھی اسے رسنِ نظم سے باندھے بغیر نہیں چھوڑتے۔ دوسرے اشک کے لفظ کو شعراء باندھتے ہیں۔ چونکہ باندھنے کے معنی قید کرنے کے بھی ہیں اس لئے یہ مضمون پیدا ہوگیا۔

طباطبائیؔ:۔ لطف یہ ہے کہ ممکن پر عدم سابق بھی ہے اور عدم لاحق بھی تو اشک کی طرح انسان بھی تو بے سروپا ہے اور اشک کو باوجود بے سروپا ہونے کے باندھتے ہیں اور کسی کے باندھنے سے بندھ جانا فرع ہے ہستی کی، غرض یہ کہ ہم ہستی کی قید میں ضرور رہیں گے اور مرتبۂ فنا جو عین آزادی ہے حاصل نہیں ہوگا (بیخودؔ)

۵۔ واشدِ گل:۔ پھول کا کھلنا÷

پھول نشۂ رنگ سے مست ہیں اور یہی نشہ اُن کی شگفتگی کا سبب ہے کیونکہ مست لوگ اپنی قبا کے بند کب باندھا کرتے ہیں۔ گویا پھولوں کے بندہائے قبانشۂ رنگ کے اثر سے کھلے ہوئے ہیں۔

۶۔ مضامین:۔ مضامین شعر÷ لوگ:۔ شعراء÷

کہتے ہیں شعراء کے مضامین کی غلطیاں مجھ سے نہ دریافت کر، معمولی سی غلطی یہ ہے کہ یہ لوگ نالے کو رسا لکھتے ہیں۔ حالانکہ نالہ کبھی رسا ہوتا تو باندھتے کیسے۔ اس کا بندھ جانا ہی نارسائی کی دلیل ہے۔

۷۔ وامندگی:۔ پیچھے رہ جانا۔ یہاں مراد حماقت÷

کہتے ہیں ذرا اہلِ تدبیر کی حماقت ملاحظہ ہو کہ وہ آبلوں پر حنا باندھتے ہیں چاہیے تو یہ تھا کہ کوئی ایسی تدبیر کرتے جس سے چلنے پھرنے میں معذوری نہ ہوتی اور باوجود آبلوں کے خوب بھاگا دوڑا جاتا لیکن اُنہوں نے آبلوں پر حنا باندھ کر چلنے پھرنے سے بالکل ہی معذور کردیا۔

بیخودؔ، سعیدؔ، طباطبائیؔ ان معنوں پر یہ اضافہ کرتے ہیں ''اس کے مقابلے میں اہلِ جنوں کی ستائش مقصود ہے کہ وہ پائے پُر آبلہ سے دشتِ پرخار پر دوڑتے ہیں۔

۸۔ سادہ:۔ سیدھے سادے÷ پُرکار:۔ ہوشیار، مکّار÷

معشوق ظاہر میں تو بہت سیدھے سادے ہیں مگر دراصل بڑے ہوشیار ہیں اور کسی کے ساتھ بھی نہیں، ہم جیسے تجربہ کار اور جہاں دیدہ شخص کے ساتھ وہ پیمانِ وفا باندھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے پیمانِ وفا پر یقین کرلیں گے۔

سادہ اس لئے کہا ہے کہ وہ ازراہِ سادگی اس خیال میں ہے اور پُرکار اس وجہ سے کہ وہ ہم جیسے ہوشیار شخص کو دھوکا دینے کے فکر میں ہیں۔ ''ہم'' کو اگر زور دے کر پڑھا جائے تو یہ معنی ظاہر ہوتے ہیں کہ کوئی اور نہیں بلکہ ہم سے۔

۱۰۹

زمانہ سخت کم آزار بجانِ اسدؔ وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

سخت کم آزار:- بہت کم آزار÷ بجانِ اسد:- اسدؔ کی جان÷

اسدؔ کی جان پر زمانہ بہت ہی کم ظلم و ستم کرتا ہے ورنہ ہمیں تو اس پر بیحد و حساب مصائب و آلام نازل ہونے کی توقع ہے (سعیدؔ آسیؔ)

طباطبائی:- بیخودؔ قسم کھا کے کہتے ہیں کہ زمانہ کے ہاتھ سے جس قدر آزار پہنچتا ہے یہ بہت ہی کم ہے ورنہ ہم اس سے زیادہ ستم سہنے کی آرزو رکھتے ہیں۔

۱۱۰

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں ۱ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل! ۲ انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے! ۳ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے ۴ آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے ۵ لعل و زمرّد و زروگوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ! ۶ رتبے میں مہروماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منع قدمبوس کس لئے! ۷ کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دوشاہ کو دُعا!
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

۱۔ مکان کے دروازہ کے آگے عموماً پتھر رکھ دیا کرتے ہیں کہ اُترنے چڑھنے میں تکلیف نہ ہو' کہتے ہیں پتھر تیرے دروازے پر ہمیشہ پڑا رہتا ہے لیکن میرے نصیب پتھر جیسے بھی نہیں کہ میں تیرے دروازے پر ہمیشہ پڑا رہتا۔ ایسی زندگی پر افسوس ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کاش میں تیرے سنگِ در کی طرح ہمیشہ تیرے در پر پڑا رہتا۔ (بیخودؔ' آسیؔ' حسرتؔ)

سعیدؔ:- میں تیرے در پر پتھر کی طرح پڑا رہتا ہوں لیکن پھر بھی مطلب براری نہیں ہوتی (کبھی مطلب براری نہ ہونے کی وجہ سے اُکتا کر کہتے ہیں کہ) میں پتھر نہیں ہوں کہ اس طرح ہمیشہ تیرے در پر پڑا رہوں۔

طباطبائی:- اس زندگی سے پتھر ہونا بہتر تھا کہ شاید تیرا سنگِ در ہوتا اور اس بات کی

طرف بھی اشارہ ہے کہ ہمیشہ پتھر کی طرح پڑا رہتا ہوں لیکن دریار سے دُور ہوں کہ اس طرح پڑا رہنا گوارا کروں۔

آسیؔ نے چار مفہوم لکھے ہیں چوتھا یہ کہ ہمیشہ میں تیرے دروازہ پر پڑا ہوا نہیں ہوں' ایسی بے حیائی کی زندگی کس کام کی کہ لوگ مجھ پر آوازیں کسیں اور طعنے دیں اور میں برابر سُنا کروں۔ میں آدمی ہوں پتھر تو نہیں ہوں۔

۲۔ دائمی گردش سے میرا دل کیوں نہ گھبرا جائے' آخر میں انسان ہوں' پیالہ و ساغر نہیں ہوں۔ پیالہ و ساغر بے جان ہیں۔ اگر وہ ہمیشہ گردش میں رہیں تو انہیں کچھ تکلیف نہیں ہوتی۔ لیکن انسان حساس ہے' وہ ساغر کی طرح شب و روز کی گردش برداشت نہیں کرسکتا (بیخودؔ' آسیؔ' سعیدؔ)

آسیؔ نے دوسرے معنی یہ لکھے ہیں کہ اس پریشان کن زندگی سے دل کیوں نہ گھبرا جائے۔ افسوس کہ میں انسان ہوں' پیالہ و ساغر نہیں ہوں' کاش وہی ہوتا!

طباطبائی:- جو لوگ شراب مدام رکھتے ہیں۔ ان کا ساغر ہمیشہ دور میں رہتا ہے تو وہ تباہی ہے۔ اسی واسطے میں انسان ہوں۔ میرے لئے یہ گردشِ مدام کیسی ہے۔

۳۔ لوح:- تختی ÷ حرف مکرر:- وہ لفظ جو مکرر لکھ دیا جائے زائد ہوتا ہے اس لئے مٹا دیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں' اے خدا! میری ہستی لوحِ جہاں پر لفظِ مکرر نہیں ہے کہ زمانہ اُسے زائد سمجھ کر مٹا دیتا ہے آخر مجھے مٹانے کی کیا وجہ ہے؟

۴۔ عقوبت:- سزا' عذاب۔

ہر گناہ کی سزا کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس لئے میرے گناہ کی سزا کی بھی ایک حد مقرر ہونی چاہئے۔ آخر میں گناہگار ہوں۔ کافر نہیں ہوں۔ کہ جس کی سزا کی کوئی حد ہی نہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ روزِ قیامت کافر عذابِ دائمی میں مبتلا رہیں گے لیکن مسلمانوں کے گناہوں کی سزا مقرر ہوگی۔ جب وہ پوری ہوجائے گی تو ان کی نجات ہوجائے گی۔ اسی بنا پر کہتے ہیں میں کافر نہیں ہوں کہ مجھ کو برابر سزا دی جارہی ہے۔

۵۔ میں لعل' زر' زمرد یا گوہر نہیں ہوں کہ آپ کو مجھ سے نفرت ہے۔ طباطبائی اور سعید

لکھتے ہیں کہ ان تین شعروں میں رسولِ مقبول کی طرف اشارہ ہے۔ یہ غلط ہے صاف ظاہر ہے کہ یہ اشعار بادشاہ کی مدح میں ہیں۔

۶۔ جب آپ نے مہر و ماہ کو شرف قدمبوسی بخشنے میں دریغ نہیں فرمایا تو پھر حضور میری آنکھوں پر قدم رکھنے سے کیوں دریغ فرماتے ہیں میں رُتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں۔

۷۔ آپ نے آسمان کو قدمبوسی کا اعزاز بخشا۔ پھر میرے لئے قدمبوسی سے کیوں انکار ہے۔ کیا میں آسمان کے برابر بھی مرتبہ نہیں رکھتا؟

۸۔ (۱) غالبؔ تم بادشاہ کے وظیفہ خوار ہو۔ بادشاہ کو دُعائیں دو۔ وہ دن گئے جب تم بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ میں کسی کا نوکر نہیں ہوں۔ (۲) شکر کرو کہ تم نوکر ہوگئے اور غم روزگار سے آزاد ہوگئے ادائے شکر کا نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ الفاظ اور طرزِ بیان سے ظاہر ہے کہ غالبؔ کو اُستادِ شاہ بننے کی بڑی آرزو تھی۔



سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں ۱ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں ۲ لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں ۳ شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر ۴ لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے ۵ ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق ۶ میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دوفروزاں ہوگئیں

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام ۷ قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں!

نیند اسکی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں ۸ تیری زلفیں جسکے شانوں پہ پریشاں ہوگئیں!

میں چمن میں کیا گیا' گویا دبستاں کھل گیا! ۹ بلبلیں سُنکر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار ۱۰ جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے ۱۱ میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں!

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب ۱۲ یاد تھیں جتنی دُعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا ۱۳ سب لکیریں ہاتھ کی گویارگِ جاں ہوگئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ۱۴ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج ۱۵ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

۱۔ خیال یہ ہے کہ پھول حسینوں کی خاک سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ نیز جیسا حسین ہوتا ہے ویسے ہی خوبصورت پھول اس کی خاک سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے لالہ وگل کو دیکھ کر افسوس کے لہجہ میں کہتے ہیں کہ خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے حسین خاک میں مل کر خاک ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک حسینوں کی صورتیں تو لالہ وگل کی صورت میں ظاہر ہوگئی ہیں۔ باقی کا کہیں پتہ نہیں۔ بہترین شعر ہے۔

۲۔ رنگارنگ:۔ رنگ برنگ کی÷ نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں:۔ ہم بھول گئے÷

اربابِ شوق کی بزم آرائیاں دیکھ کر کمالِ حسرت سے کہتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب ہم بھی بزم آرائیاں کیا کرتے تھے۔ وہ وقت گزر گیا' بزم آرائیاں ختم ہوگئیں مگر ان کی یاد مدّتوں دل کو بے چین کرتی رہی۔ اب ایسا زمانہ آیا ہے کہ ان بزم آرائیوں کی یاد بھی باقی نہیں رہی۔ گویا وہ بزم آرائیاں طاقِ نسیاں کی زینت بن گئی۔ (آسیؔ)

طباطبائیؔ، بیخودؔ اور سعیدؔ:۔ تمہیں ہمارا حال دیکھ کر عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ شباب کو قیام نہیں۔

۳۔ بنات النعش:۔ شمال کی طرف سات ستارے نکلا کرتے ہیں' عورتیں انہیں سات سہیلیوں کا جھمکا اور سات سہیلیاں بھی کہتی ہیں۔ نیز چار ستاروں کو جنازہ اور تین کو جنازہ اُٹھانے والے کہا جاتا ہے۔

میرزا صاحب نے بنات کے لفظ سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ جس کے معنی لڑکیاں ہیں۔ لیکن اہلِ عرب کے محاورہ میں بنات ابن کی جمع ہے مثلاً ابن العرس کی جمع بنات العرس ہے۔ چوں کہ دن کے وقت ستارے نظر نہیں آتے اس لئے کہتے ہیں کہ آسمان کی سات سہیلیاں دن کے وقت پردے

میں چھپی ہوئی تھیں لیکن خدا جانے رات کو ان کے دل میں کیا آئی کہ وہ بے پردہ ہوگئیں۔

آسیؔ:- (۱) اپنے معشوق کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ بنات النعش بڑی پردہ دار تھیں۔ دن کو منہ چھپائے رہیں مگر شب کا وقت آیا تو اپنا پردہ اُٹھادیا۔ تم ایسے ہو کہ شبِ وصل میں بھی مجھ سے شرمائے جاتے ہو حالاں کہ یہ کوئی محل نہیں ہے (۲) ایک عاشقانہ چال ہے۔ معشوق سے کہتا ہے تم کہتے ہو معشوق کا کام عریاں ہونے کا نہیں ہے۔ دیکھنا بنات النعش دن کو کیسی چھپی ہوئی تھیں۔ آخر شب کو بے پردہ ہوئیں۔ پھر اگر رات بے پردہ ہونے کا محل نہیں تو وہ بے پردہ کیوں ہوگئیں۔

۴۔ روزنِ دیوارِ زنداں:- بے نور÷

حالیؔ:- یعقوبؑ کی آنکھوں کو روزنِ دیوارِ زنداں قرار دیا ہے۔ کس واسطے کہ روزنِ زنداں ہر وقت یوسفؑ پر کشادہ رہتا تھا۔ اسی طرح یعقوبؑ کی آنکھیں شب وروز یوسف کی طرف نگراں رہتی تھیں۔

بیخودؔ:- ایک طرف روزنِ دیوارِ زنداں ہونے سے مراد آنکھوں کا بے نور ہونا ہے اور دوسری طرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگرچہ ظاہرہ طور پر یعقوب نے یوسف کی خبر نہ لی۔ لیکن درحقیقت ان کی آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو کر ہر وقت حضرت یوسف کو دیکھتی تھیں۔ روزن اور نابینا آنکھوں کی مشابہت خوب ہے۔ جب آنکھوں کا نور زائل ہوجاتا ہے تو وہ سفید ہوجاتی ہیں اور روزن کے ساتھ مشابہت تامہ رکھتی ہیں۔ روزن کبھی بند نہیں ہوتا۔ نابینا آنکھیں بھی اسی طرح کھلی رہتی ہیں۔ روزن سے اندھیرے میں روشنی آتی ہے' اس لئے یعقوب کی آنکھوں کے روزن بننے سے یہ بھی مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ یوسف زنداں کی تاریکی میں نہ گھبرائے۔ یہ شعر غالبؔ کے بہترین اشعار میں سے ہے اور کمالِ جذبِ عشق کو ظاہر کرتا ہے۔

۵۔ ماہِ کنعاں:- حضرت یوسف' وہ کنعان میں رہتے تھے۔

زلیخا پر زنانِ مصر آوازے کستی تھیں کہ تم ایک غلام پر عاشق ہوگئیں۔ تم نے اس میں کیا خوبی اور رعنائی دیکھی ہے؟ آخر کار زلیخا نے تنگ آکر بہت سی عورتوں کو جمع کیا' اُن کے ایک ہاتھ میں چھری' دوسرے میں ترنج دے دئے۔ اور کہا کہ جب یوسف تمہارے سامنے آئے تو ترنج کو کاٹنا۔ جب سب اس اسلوب سے بیٹھ گئیں تو یوسف کو بلایا' تمام عورتوں نے حسب الحکم ترنج کاٹے

لیکن وہ یوسف کے نظارہ میں اس قدر محو ہوگئیں کہ بجائے ترنج کے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ عورتوں کی یہ بیخودی دیکھ کر زلیخا بہت خوش ہوئی۔ اس واقعہ کو پیش نظر رکھ کر غالبؔ کہتے ہیں۔

دنیا کا قاعدہ ہے عاشق اپنے رقیبوں سے جلتے ہیں لیکن زلیخا میں یہ بات نہیں' وہ اپنے رقیبوں سے عام عادت کے خلاف خوش ہے کہ وہ بھی اس کی طرح یوسف پر عاشق ہوگئیں۔ دراصل زلیخا کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ اب یہ عورتیں مجھے یوسف پر عاشق ہونے کا طعنہ نہ دیں گی۔ لیکن شاعر نے اس سے ایک نیا پہلو نکال لیا۔

۶۔ جوئے خوں:- اشک خونیں÷ فروزاں:- روشن÷

ہجر کی اندھیری رات ہے اور میں تعبِ ہجر سے بے چین ہو کر اشکِ خونی بہا رہا ہوں۔ اے میرے ہمدرد! تم مجھے رونے سے نہ روکو میری آنکھوں سے جوئے خون بہنے دو۔ آج شامِ فراق ہے' میں جس قدر بھی رووں کم ہے۔ ہجر کی تاریک شب میں جو میری آنکھوں سے اشکِ خونیں مسلسل بہیں گے' میں اُنہیں دو روشن شمعیں خیال کروں گا۔ اندھیرے میں تاریکی باعثِ تسکین ہے اس لئے اشکِ خونیں سے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی ان کی روشنی سے میرا غمکدہ بھی روشن ہوگا۔ بے مثال شعر کہا ہے۔

۷۔ عقیدہ یہ ہے کہ جنت میں حوریں بطور کنیزوں کے ملیں گی۔ کہتے ہیں یہاں تو یہ پریزاد ہم پر خوب ظلم وستم کرتے ہیں۔ اگر قدرتِ حق نے انہیں جنت کی حوریں بنا دیا تو مزہ آجائے گا۔ ہم ان کے ظلم وستم کا گِن گِن کر بدلہ لیں گے۔ حوریں بننے کے بعد یہ پریزاد ہمارے کسی ایک حکم کی سرتابی نہیں کرسکیں گے۔

۸۔ مرزا کا یہ شعر بیت الغزل اور نشتر کہلاتا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ کہتا ہے کہ جس کے ساتھ تُو ہم خواب ہوا اور جوشِ اختلاط میں' جس کے شانوں پر تیری عنبریں زلفیں پریشان ہوئیں' اس کے دماغ کے کیا کہنے ہیں۔ نیند اس کی قابلِ رشک ہے۔ راتیں اس خوش قسمت شخص کی صحیح معنوں میں راتیں کہلانے کی مستحق ہیں اور جسے یہ لطف حاصل نہیں' نہ اُس کا دماغ ہے' نہ نیند ہے' نہ راتیں ہیں۔

۹۔ دبستاں:- مدرسہ' مکتب÷

اُستاد کی غیر حاضری میں طلبا سبق یاد نہیں کیا کرتے۔ لیکن جب اُستاد کو آتا دیکھتے ہیں یا اس کی آواز سُن پاتے ہیں تو بہت جوش وخروش سے اپنا سبق دہرانے لگتے ہیں۔ میرا چمن میں جانا تھا کہ ایک مکتب کا سماں پیدا ہوگیا۔ بلبلیں میرے نالوں کو سُنتے ہی اپنے اپنے نغمے نہایت جوش وخروش سے دہرانے لگیں۔ گویا میں اُن کا اُستاد تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بلبل دلکش آواز سُن کر نغمہ سنجی شروع کردیتی ہے۔

آسی نے بلبل کی غزل خوانی کے مختلف وجوہ بیان کئے ہیں۔ مثلاً (۱) ہم جنس کے ملنے کی خوشی (۲) مجھ کو دیوانہ سمجھ کر جوشِ مسرت کو وہ نہیں روک سکتی (۳) میں ایسا فصیح بیان ہوں کہ میری غزلیں سُن کر وہ نغمہ سنجی شروع کردیتی ہیں۔ ان معنوں پر سب متفق ہیں۔

۱۰۔ مژگاں ہوگئیں:- آنکھوں کا اتنا بند ہونا کہ پلکیں تقریباً آپس میں مل جائیں۔ یہ حالت دو موقعوں پر ہوتی ہے۔ بعض اوقات جوشِ مسرت سے آنکھیں بند ہوجاتی ہیں اور محض اتنی کُھلی رہتی ہیں کہ ان میں سے تھوڑا تھوڑا نظر آتا ہے۔ کبھی کسی چیز کو غور سے دیکھنے یا تغافل آمیز اور شرمیلی نگاہیں ڈالنے سے بھی یہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔

یارب وہ نگاہیں جو میری بدقسمتی سے مژگاں بن گئی ہیں وہ میرے دل کے پار کیوں ہوئی جاتی ہیں۔ دل کے پار تو اُس وقت ہوسکتی تھیں جب وہ مژگاں نہ بنتیں یا وہ تلوار یا تیر ہوتیں۔ یہ میری کوتاہ قسمتی ہے کہ وہ باوجود کوتاہ ہونے کے میرے دل کے پار ہوئی جاتی ہیں۔

حالی:- نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم کے سبب سے اُوپر نہیں اُٹھتیں بلکہ پلکوں کی طرح ہروقت نیچے کو جھکی رہی ہیں۔ (بیخود، سعید، حسرت)

طباطبائی:- نگاہوں کے مژگاں ہونے کو نگاہوں کا کوتاہ ہونا قرار دیتے ہیں اور اس کا کوئی سبب نہیں لکھتے۔

آسی لکھتے ہیں کہ میری کوتاہی قسمت (بدقسمتی) نے تلوار جیسی نگاہوں کو میری جانب سے اتنا کوتاہ کیا کہ مژگاں بنادیا اس لئے ہروقت ایک کھٹک سی میرے دل میں رہتی ہے مگر اب میں خیال کرتا ہوں کہ وہ دل کے پار ہوئی جاتی ہیں اور میں مرا جاتا ہوں۔ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ وہ اس قدر چھوٹی ہیں اور پھر بھی تیر کا کام دے رہی ہیں۔

۱۱۔ میں نے اپنی آہوں کو جس قدر زیادہ روکا، اتنی ہی وہ میرے سینے میں بار بار اُبھریں، گویا میری آہیں بھی بخیہ چاک گریباں ہوگئیں۔ قاعدہ ہے۔ کہ بخیہ کرتے ہوئے تاگہ بار بار اُبھرتا ہے۔ اور پھر نیچے دباؤ میں آجاتا ہے۔ بخیہ اور چاک گریباں کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آہ کے بار بار اُبھرنے اور بار بار ضبط کرنے کو بخیہ کے تاگے سے تشبیہ دی ہے نیز سینے اور بخیے میں ضلع بھی لطف سے خالی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی آہوں کو ضبط کیا۔ گویا چاک گریباں کو بخیہ کرلیا۔ لیکن پھر بھی بخیہ کے تاگے کی طرح وہ بار بار اُبھرتی رہیں۔ طباطبائی اس شعر کو بے معنی لکھتے ہیں۔

۱۲۔ حالی:- یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں، دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اِس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے۔ اس واسطے وہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ ان کی گالیوں کا کیا جواب دُوں گا جب کہ دُعائیں سب نبڑ چکیں۔

۱۳۔ شراب جانفزا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں جامِ شراب آجاتا ہے، اس کے ہاتھ کی تمام لکیریں گویا رگِ جان بن جاتی ہیں یعنی شراب بغیر پینے کے رگ وپے میں قوت پیدا کردیتی ہے۔

سعید نے اس موقعہ پر غالب کے ایک خط میں سے یہ اقتباس پیش کیا ہے۔ سردی کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "آگ میں گرمی سہی لیکن وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پئے فوراً رگ وپے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا۔ دماغ روشن ہوگیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا"۔

طباطبائی:- گویا کا لفظ اکثر اشعار میں بھرتی کا ہوا کرتا ہے لیکن اس شعر میں ایسا نہیں۔ اگر یہاں یہ لفظ نکال ڈالا جائے تو مبالغہ حدِ امکان سے تجاوز کرجائے۔

۱۴۔ موحد:- توحید کے قائل ÷ کیش:- مذہب ÷

حالی:- تمام ملتوں اور مذہبوں کو مُنجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے۔ جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بن جاتی ہیں (بیخود۔ سعید)

حسرت:- جب ترکِ رسومِ مذہب پایا تو جتنی ملّتیں مٹتی جاتی ہیں وہ گویا اجزائے ایمان بنتی جاتی ہیں۔

۱۵۔ جب انسان رنج کا خوگر اور عادی ہو جاتا ہے تو رنج کا احساس جاتا رہتا ہے۔ چنانچہ مجھ پر اتنی مشکلیں اور مصیبتیں آئیں، جس کی کوئی حد نہیں۔ لیکن اس نظریہ کے مطابق کہ ''رنج سے خوگر ہوکر رنج نہیں معلوم ہوتا''۔ وہ خود بخود آسان ہوتی چلی گئیں۔ یعنی میں خوگرِ آلام ہوگیا تھا اس لئے انہیں ہنسی خوشی روزانہ کی ایک معمولی بات سمجھ کر برداشت کرلیا۔

۱۶۔ (۱) بہت خوب شعر ہے، کہتے ہیں کہ اگر غالب اسی طرح روتا رہا تو تم دیکھنا کہ اس کے رونے کی وجہ سے یہ بستیاں چند دن میں ویران ہو جائیں گی۔ گویا غالب کا لگاتار رونا بہت تباہ کن ثابت ہوگا اس لئے اسے رونے سے روکنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہئے (۲) سننے والوں سے اس کے نالے سُنے نہ جائیں گے اور وہ اپنے مکان چھوڑ کر کسی اور دیار میں جا رہیں گے۔ (۳) غالب کا سیلابِ اشک مکانوں کو ڈھا دے گا اور بستیوں کو ویران کردے گا۔

۱۱۲

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں ۱ یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے ۲ دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے ۳ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں ۴ طاقت بقدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش ۵ صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف ۶ یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان ۷ آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں
دل میں ہے یار کے صفِ مژگاں سے روکشی ۸ حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا! ۹ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

۱۔ عاشق کا مذہب صنم پرستی ہے اور صنم پرستوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ زنّار پہنا کرتے ہیں۔ کہتا ہے دیوانگی کی وجہ سے ہمارے دوش پر زنّار بھی نہیں، گویا جوشِ دیوانگی میں ہم نے اپنا گریبان اس بُری طرح پھاڑا ہے کہ ایک تار بھی جسم پر باقی نہیں رہا کہ وہی زنّار کا کام دیتا۔ یاد رہے زنّار کا نہ ہونا مذہبِ صنم پرستی کے خلاف ہے۔

۲۔ جب ہم نے اپنے دل کو حسرتِ دیدار کی نظر کر دیا یعنی تمنائے دید میں مٹا دیا تو ہم کو احساس ہوا کہ ہم میں تو طاقتِ دیدار بھی نہ تھی۔ بیکار دل کو خاک میں ملایا (سعیدؔ)

بیخودؔ:- غور کرنے سے معلوم ہوا کہ دل کے مٹ جانے سے طاقتِ دیدار کو بھی مٹا دیا۔ اب اگر وہ جلوہ دکھائے تو دیدار کی طاقت نہیں۔ (آسی، طباطبائی)۔

۳۔ حالیؔ:- ایک فیکٹ (واقع) کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہوجانا، عجیب اتفاق ہے۔ اس مضمون کو حقیقت کی طرف لے جاؤ۔ اور چاہو مذاح پر محمول کرو۔ دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ ہوتی اس لئے کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں، اسی طرح دشوار بھی نہیں اور اس لئے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی (سعیدؔ، بیخودؔ)

حسرتؔ (۱) تحصیل دشوار آسان نہیں ہوتی مگر ممکن ہوتی ہے، اور تحصیل محال سرے سے ممکن ہی نہیں ہوتی۔ شاعر کہتا ہے کہ ملنا تیرا آسان نہ ہو یعنی دشوار ہو۔ تاہم سہل ہے۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ دشوار بھی نہیں، محال ہے، جس میں میرا کسی طرح قابو نہیں، محض مجبور ہوں (۲) تیرا ملنا اگر سب کے لئے مشکل ہو تو مجھ کو بھی صبر آجائے۔ مشکل یہ ہے کہ اغیار کے لئے آسان ہے اور میرے لئے دشوار ہے (آسیؔ) وحسرتؔ، طباطبائی کی پہلی شرح سے متفق ہیں۔

۴۔ عمر بغیر عشق کے کٹ نہیں سکتی اور عشق میں آزار اور تکلیفیں ضرور پہنچتی ہیں مگر ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ ذرا آزار برداشت کرسکیں۔ بڑی مشکل آپڑی ہے کیسے بنے گی۔

۵۔ شوریدگی:- جنوں ÷ وبال:- مصیبت ÷ دوش:- کندھا ÷

عاشق محبت میں دیوانہ ہوگیا ہے۔ صحرا میں مارا مارا پھرتا ہے۔ شدّت جنوں نے اس کی

ایسی حالت بنادی ہے کہ سر بھی کندھوں پر وبال معلوم ہوتا ہے۔ اس بوجھ سے پریشان ہوکر کہتا ہے کہ اے خدا میں کیا کروں۔ کہ صحرا میں تو کوئی دیوار بھی نہیں کہ میں اس سے اپنا سر پھوڑ ڈالوں اور اس بارِ دوش یعنی سر سے نجات پاؤں ۔غالبؔ

کہاں تک روؤں اُسکے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی!

۶۔ ضعف سے دل بالکل کمزور ہوگیا ہے اور وہ کسی قسم کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ ہوسِ یار میں تو کوئی بوجھ نہیں ہوتا لیکن ہمارا ضعفِ دل ایسا ہے کہ ہوسِ یار کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا۔ جب حالت ایسی نازک ہے تو گنجائشِ عداوتِ اغیار کیسے ہوسکتی ہے۔ حسنِ خیال یہ ہے کہ آرزوئے یار ہمیشہ خوش آیند ہوتی ہے' لیکن یاں وہ بھی ناگوار ہے۔ پھر عداوتِ اغیار کا کیا ذکر وہ تو سراسر بوجھ ہے (طباطبائی۔ سعیدؔ)

آسیؔ:- مطلب یہ ہے کہ اب دل سے آرزوئے وصالِ یار برداشت نہیں ہوسکتی اور وہ اتنی زیادہ ہے کہ میرے دل میں سما نہیں سکتی یا یوں کہیئے کہ اب ہم تارک ہیں۔

بیخودؔ:- عشق و ہوس کا زمانہ گزر جانے کے بعد یہاں یار سے بھی دلی لگاؤ باقی نہیں رہا۔

۷۔ میرے نالہائے زار سے ڈر:- خدا کا خوف کر۔ میرے نالے مرغِ گرفتار کے نالوں کی طرح بے اثر نہیں ہیں۔ اُن کا اثر ہوگا اور ضرور ہوگا۔

۸۔ روکشی:- مقابلہ÷

اگر چہ ضعف ونقاہت نے میرا ایسا حال بنایا ہے کہ مجھ میں کانٹے کی کھٹک برداشت کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ پھر بھی میرے دل میں یہ بات سمائی ہے کہ میں مژگانِ یار کی فوج کا مقابلہ کروں۔

۹۔ اے خدا! ان کی سادگی پر کون نہ مرجائے کہ وہ لڑتے ہیں مگر ان کے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

بیخودؔ طباطبائی:- لڑنے سے اختلاط میں ہاتھا پائی کرنا مراد ہے
آسیؔ:- گویا یہ سادگی بجائے تلوار کے ہے۔

۱۰۔ ہم نے اسدؔ کو خلوت اور جلوت دونوں حالتوں میں دیکھا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ دیوانہ نہیں۔ معاف کیجئے اگر وہ دیوانہ نہیں تو ہشیار بھی نہیں ہے۔

۱۱۴

نہیں ہے زخم کوئی بخیئے کے درخور مرے تن میں ۱ ہؤا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشہ خانہ ویرانی ۲ کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں ۳ نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی ۴ شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں
نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی ۵ ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں
ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے' ۶ پر افشاں جو ہر آئینہ میں مثلِ ذرّہ روزن میں
نہ جانوں نیک ہوں یا بدہوں پر صحبت مخالف ہے ۷ جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو' ۸ سیہ ہوکر سویدا ہوگیا ہر قطرہ خوں تن میں

اسدؔ زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہوگیا ہے طوق گردن میں

۱۔ درخور:- قابل÷ چشمِ سوزن:- سُوئی کا ناکہ÷ رشتہ:- تاگہ÷

رشتۂ سوزن کو تارِ اشکِ یاس کہا ہے۔ میرے جسم پر کوئی زخم ایسا نہیں جو ٹانکے لگانے یا سینے کے قابل ہؤ اس لئے تاگہ چشمِ سوزن میں مایوسی کی وجہ سے تارِ اشکِ یاس بن گیا ہے گویا سُوئی اس ناامیدی کے سبب سے روتی ہے اور اس غم میں چشمِ سوزن سے آنسوؤں کا تار جاری ہے۔

۲۔ کفِ سیلاب:- سیلاب کے جھاگ÷ پنبہ:- رُوئی÷

میں اشکوں کا سیلاب اس لئے لایا تھا کہ میرا گھر تباہ و برباد ہوجائے اور پھر میں درودیوار کے روزنوں میں سے اپنی خانہ ویرانی کا تماشا دیکھوں لیکن افسوس کہ یہ ذوقِ تماشا پورا نہ ہوسکا میری خانہ ویرانی ہی ذوقِ تماشا کو مانع آئی۔ کیونکہ سیلاب کے جھاگوں نے درودیوار کے روزنوں کو رُوئی کے پنبہ کی طرح بند کردیا ہے اور جھانکا نہیں جاسکتا۔ یہ پنبہ اسی سیلابِ اشک کا کف ہے جس سے گھر ویران ہوا ہے۔

۳۔ ودیعت خانہ:- امانت خانہ÷ شاہد:- معشوق÷

میرے جسم کا ہر ایک قطرۂ خون ایک نگینہ ہے جس پر مژگانِ یار نے نہایت بیدردی سے اپنا نام (معشوق کا نام) کھودا ہے اس لئے میں ان نگینوں (یعنی مژگانِ یار کی کاوشوں کے ظلم) کا امانت خانہ بن گیا ہوں۔ قاعدہ ہے کہ امانت پر مہر لگادی جاتی ہے۔ اسی طرح میرے خون کے ہر قطرہ پر کاوشِ مژگاں کے ظلم و ستم کی مہریں لگی ہوئی ہیں غالبؔ ؎

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب   خونِ جگر امانتِ مژگانِ یار تھا

۴۔ شبستان:- خوابگاہ میرے سیاہ خانہ کی تاریکی کا حال کوئی بیان نہیں کرسکتا۔ اس کی تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کی دیواروں کے روزن میں پنبہ رکھ دیں تو یہ معلوم ہو کہ چاندنی رات ہے۔ جہاں تاریکی زیادہ ہوتی ہے وہاں ہر سفید چیز چمکتی ہے۔ چنانچہ روزن میں روئی رکھنے سے بجائے تاریکی بڑھنے کے اس قدر روشنی ہوجاتی ہے کہ شبِ ماہ معلوم ہوتی ہے۔ غالبؔ ؎

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے   پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

احباب نے میرے جوشِ جنوں اور بے ربطی کو دیکھ کر مجھے ملامت کی اور وہ میرے پاگل پن پر ہنسے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خندۂ احباب سے بچنے کے لئے میں جیب و دامن کو چاک کرنے سے باز رہا۔ گویا خندۂ احباب میرے چاکِ گریبان کا بخیہ بن گیا۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ خندہ سے خندۂ دنداں نما مقصود ہے تا کہ اسے بخیہ سے مناسبت ہوجائے۔

۶۔ مہروش:- خورشید جمال÷ جلوۂ تمثال:- عکسِ رُخ÷ پرافشاں:- اُڑنے کے لئے پر پھڑ پھڑانا۔ یہاں مراد اُڑنا÷

جس طرح روزن پر آفتاب کی روشنی پڑنے سے ذرّات پرافشاں اور متحرک ہوجاتے ہیں اسی طرح اُس مہروش کے عکسِ رُخ کے سامنے آئینے کے جوہر اُڑنے لگتے ہیں گویا اس کے عکس رخ کے سامنے آئینہ ماند پڑجاتا ہے۔

۷۔ گلخن:- بھاڑ÷ خس:- گھاس پھوس وغیرہ۔

یہ تو میں جانتا نہیں کہ میں اچھا ہوں یا بُرا ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میری صحبت

مخالف ہے یعنی اگر میں گل ہوں تو میری صحبت گلخن سے ہے۔ ظاہر ہے کہ گل کی صحبت گلشن سے اور خس کی صحبت گلخن سے مناسب ہے۔ گل اگر گلخن میں ہے تو بیکار ہے اور اگر خس گلشن میں ہے تو بار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صحیح صحبت ہر شخص اور چیز کے جوہروں کو چمکاتی ہے اور اسی سے شاعر محروم ہے۔

۸۔ جوشِ جنونِ عشق سے میرا ہر قطرۂ خوں سیاہ ہوکر سویدا بن گیا ہے۔ خالِ سویدا دل میں ہوتا ہے۔ گویا جنون کے فیض سے ہم کو ہزاروں دل مل گئے۔ مطلب یہ نکلا کہ فیضِ عشق سے ہزاروں دل مل گئے پہلے ایک دل کو معشوق کی یاد تڑپاتی تھی اب ہزاروں دل اس کی یاد میں تڑپا کریں گے۔

۹۔ زندانی:- قیدی÷

اسدؔ میں حسینوں کی تاثیرِ محبّت کا قیدی ہوں۔ انہوں نے کمال مہربانی سے میرے گلے میں جو باہیں ڈالی ہیں وہ میری گردن کے لئے طوق بن گئی ہیں۔ گویا میں اسیرِ محبّت ہوگیا ہوں۔

۱۱۴

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں   ۱   سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہوئے پر ہوا اُڑا لے جائے   ۲   وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں!
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟   ۳   کہ غیر جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں
بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا!   ۴   اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں!
خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش   ۵   شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ   ۶   سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

۱۔ خاک نہیں:- ہیچ ہیں، کچھ نہیں۔

دُنیا کے تمام لطف اور لذّتیں میری نظروں میں ہیچ ہیں، ہاں خونِ جگر پینے میں مجھے مزہ آیا کرتا تھا تو اب جگر میں بھی کچھ باقی نہیں رہا۔ گویا اس لطف سے بھی محروم ہوگیا۔

۲۔ مگر:۔ شاید۔

میرے بال و پر میں اتنی طاقت نہیں کہ میں اُڑ کر وہاں تک جاؤں شاید یہ ہوسکتا ہے کہ میں فنا ہوکر خاک ہو جاؤں اور ہوا میرا غبار اُڑا کر وہاں لے جائے۔ غبار و خاک کا تناسب پُر لطف ہے وہاں سے مُراد کوچہ یار یا چمن ہوسکتا ہے۔

بہشت شمائل:۔ بہشت خصلت یا فردوس منظر۔ مراد معشوق۔

کہتے ہیں آج کس بہشت خصلت معشوق کی آمد آمد ہے کہ راستے پھولوں سے پٹے پڑے ہیں اور خاک کہیں نام کو نہیں۔ گویا معشوق کی آمد آمد سے عالمِ خاک عالمِ فردوس بن گیا ہے۔

۴۔ نفس:۔ آہ و نالہ۔

اگر اسے میرے حالِ زار پر رحم نہ آیا تھا تو خود مجھی کو اپنی حالت پر رحم آنا چاہئے تھا یعنی اپنے اوپر رحم کرکے میں نالہ کشی سے باز آجاتا۔ پس معلوم ہوگیا کہ میری آہ میں خاک اثر نہیں۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ نفس کو بے اثر کہہ کر پھر کہنا کہ اثر نہیں بہ اعتبار معنی کے اس کی تاویل مشکل ہے لیکن محاورہ میں ٹھیک ہے۔

۵۔ شراب خانے کے دیوارودر میں تو کچھ باقی نہیں۔ اب اس سے میخوار کیا مست ہوں گے، وہ تو جلوۂ گل (فصلِ بہار) کے خیال میں مست ہیں (سعید)

طباطبائی:۔ نشے کی کرامات سے آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے، ورنہ شراب خانے میں کیا دھرا ہے۔ بیخود و طباطبائی یہ مطلب نکالتے ہیں کہ زندگی کو پُر لطف بنانے والی شے محبّتِ الٰہی ہے، ورنہ اس ناپائدار دُنیا میں کیا رکھا ہے۔

آسی نے ہر دو متذکرہ معنی لکھے ہیں۔ تیسرا مفہوم یہ لکھتے ہیں کہ فصلِ بہار آرہی ہے اور یہ خیال کہ اس موسم میں بغیر شراب کے کیونکر گزارہ ہوگا ان کو خراب کئے ہوئے ہے اور حال یہ ہے کہ مے خانہ میں کچھ بھی باقی نہیں وہ بالکل تباہ ہوچکا ہے۔

۶۔ غارتگری:۔ لوٹ مار۔ حسرتِ تعمیر:۔ مکان بنانے کی آرزو۔

میں عشق کی غارت گری اور لوٹ مار سے بہت ہی شرمندہ ہوں، اس نے مجھے ایسا برباد کیا کہ میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اگر ہے تو حسرتِ تعمیر ہے۔ عشق اسے کیا لوٹے گا۔ گویا میں

شرمندہ اس لئے ہوں۔ کہ عشق سے لُٹوانے کے لئے میرے پاس خاک بھی نہیں۔

سعید لکھتے ہیں کہ میرزا پچاس برس دہلی میں رہے لیکن ہمیشہ کرائے کے مکان میں۔ اپنا مکان بنانے کی حسرت دل ہی میں رہی۔ اس شعر میں اسی کا اظہار کیا ہے۔

۷۔ لوگ ہمارے اشعار کو تفریحِ طبع اور دل لگی کا سامان سمجھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے شعر کہنے اور اظہارِ ہنر سے کچھ فائدہ نہیں۔ کیونکہ لوگ ہمارے فن کی قدر کرتے ہیں، نہ ہمارے اشعار کو سمجھتے ہیں۔

بیخود:۔ ہم صرف دل بہلانے کی غرض سے شعر کہا کرتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہوگیا ہے کہ اظہارِ کمال میں خاک بھی فائدہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب نہ لوگ خوش گوئی کی قدر کرتے ہیں اور نہ شعر کی خوبی سمجھتے ہیں۔

۱۱۵

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں ۱ روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں
دَیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں ۲ بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں
جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز ۳ آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں
دشنۂ غمزہ جانستاں، ناوکِ ناز بے پناہ ۴ تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں
قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں ۵ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم ۶ اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟
واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع ۷ راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں؟
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی ۸ جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

۱۔ سنگ و خشت:۔ اینٹ پتھر۔

معلوم ہوتا ہے معشوق عاشق کو رونے سے روکتا ہے اور عاشق کو ضبطِ گریہ کا یارا نہیں۔ وہ مظلومانہ انداز سے کہتا ہے کہ ہمارا دل ہے اینٹ پتھر تو نہیں کہ تم ستائے جاؤ اور ہم برداشت کئے

جائیں۔ اب ہمارے دل سے صبر نہیں ہوتا۔ ہاں ہاں ہم ہزار بار روئیں گے، کوئی ہمیں کیوں ستائے۔ کوئی کا لفظ قابلِ تعریف ہے۔ اس طرح عام طور پر خفگی کے موقع پر بولتے ہیں۔

٢۔ دَیر:- بُت خانہ ÷ حرم:- خانہ کعبہ۔

اس شعر کو تعریف سے مستغنی خیال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں، ہم سرِ راہ بیٹھے ہیں اور راستہ کسی کی ملکیت نہیں۔ ہر شخص اسے استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہ بُت خانہ یا کعبہ نہیں کہ کوئی ہمیں وہاں سے نکال دے۔ نہ یہ کسی کی دہلیز یا دروازہ ہے کہ ہمیں یہاں سے اُٹھا دیا جائے۔ پھر رقیب ہمیں یہاں سے اُٹھ جانے کے لئے کیوں مجبور کرتا ہے۔

٣۔ جمالِ دلفروز:- دل کو روشن کرنے والا جمال ÷ مہرِ نیم روز:- دوپہر کے وقت سُورج پوری طرح چمکتا ہے اور کوئی اس کی طرف دیکھ نہیں سکتا ÷

نظارہ سوز:- نظروں کو جلا دینے والا۔ وُہ حُسن جس کا نظارہ نہ ہو سکے ÷

جب وُہ جمالِ دلفروز دوپہر کے سُورج کی طرح نظارہ سوز ہے، یعنی کوئی اس کو دیکھ نہیں سکتا تو پھر وہ اپنا چہرہ پردے میں کیوں چھپاتا ہے۔ اسے چاہئے کہ بے نقاب رہے (آسی، سعید)

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ پردے میں چھپا ہوا نہیں بلکہ آشکارا ہے مگر باوجود آشکار ہونے کے مہرِ نیمروز کی طرح کوئی اُسے دیکھ نہیں سکتا کیونکہ کثرتِ نور سے نگاہیں اُسے دیکھنے سے قاصر ہیں (طباطبائی، بیخود)

٤۔ دشنہ:- خنجر ÷ غمزہ:- ناز و ادا ÷ جانستاں:- جان لیوا۔ مہلک ÷ ناوک:- تیر ÷

تیرے ناز کے خنجر جان لینے والے ہیں اور تیری اداؤں کے تیر بے پناہ ہیں۔ کسی کو ان سے امان نہیں مل سکتی۔ جب تیرے ناز و ادا کی جانستانی کا یہ عالم ہے تو جب عکسِ رُخ تیرے سامنے پڑے گا، اُس کو بھی گزند پہنچے گا۔ (سعید۔ آسی)

طباطبائی:- سبب یہ ہے کہ تیرے سامنے بھی کسی کا آنا اچھا نہیں۔ کوئی غیر آیا تو مارا پڑا۔ خود عکس تیرا اگر آئینہ میں بھی دشنہ و ناوک لئے ہوئے تیرے سامنے آیا تیرا کیا حال ہوگا؟ (بیخود)

٥۔ حیات و غم کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قیدِ حیات اور بندِ غم دونوں ایک ہیں۔ ان میں کسی قسم کا فرق نہیں، جو آدمی زندگی کی قید میں رہتا ہے، وہ بھی ہمیشہ مصائب و آلام میں مبتلا رہتا

ہے اور جو شخص مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے، وہ بھی رنج و غم میں پھنسا رہتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے اس کو غم سے نجات نہیں مل سکتی ہاں جب موت آجائے گی تو غم بھی نہ رہے گا مومن خاں اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی   ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

٦۔ غالب اس شعر کی شرح ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''حُسنِ عارض اور حُسنِ ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو اپنی نسبت ہے کہ میرا مارا کبھی بچتا نہیں اور میرا تیرِ غمزہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ پس جب اس کو ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے۔ اس حُسنِ ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی، ورنہ رقیب عاشقِ صادق نہ تھا۔ اگر پائے امتحان درمیان آتا۔ تو حقیقت کُھل جاتی۔

٧۔ اس شعر میں لف و نشر مرتب ہے، کہتے ہیں محبوب سے ہم راستے میں اس لئے نہیں ملتے کہ ہم کو اپنی وضعداری کا خیال ہے۔ نیز غیرت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس سے سرِ راہ باتیں کریں۔ ادھر وہ مجھے اپنی محفل میں آنے کی اجازت اس لئے نہیں دیتے۔ کہ مدعو کرنے میں ان کے عز و ناز میں فرق آتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں ان سے ملاقات ہو تو کیونکر ہو۔

٨۔ طباطبائی نے اس شعر کو بیت الغزل قرار دیا ہے۔ ہمدرد لوگ عاشق کو سمجھاتے ہیں کہ تیرا معشوق بہت بے وفا اور کافر ہے۔ اس کے عشق سے توبہ کرو اور ایسے شخص کے لئے اپنے دین و دل کو خراب نہ کرو۔ عاشق یہ سُن کر بگڑ جاتا ہے اور کہتا ہے، جاؤ وہ بے وفا اور کافر ہی سہی، جس کو اپنا دین و دل پیارا ہو وہ اس کی گلی میں نہ جائے۔ گویا تمہیں اپنا دین و دل پیارا ہے۔ تم اس سے عشق نہ کرو۔ ہم تو ضرور جائیں گے اور اس کا عشق ہرگز ترک نہ کریں گے۔

٩۔ غالب مرگئے ہیں، احباب اُن کے غم میں زار زار رو رہے ہیں اور ہائے ہائے کر رہے ہیں۔ احباب کو تسکین دینے کے لئے کہا جاتا ہے کہ غالبِ خستہ کے مرجانے سے تمہارے کون سے کام بند ہوگئے ہیں۔ تم اس طرح زار زار روتے ہو۔ مطلب یہ ہے اس کی ذات سے تو کسی کو کچھ خاص فائدہ نہ تھا۔ پھر رونے سے کیا حاصل۔

۱۱۶

غنچۂ نا شگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں ۱ بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے ۲ اسکے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے ۳ آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے! ۴ سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اُس کے رُوبرُو کیوں نہ خموش بیٹھیے ۵ اُس کی خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غیر سے تہی ۶ سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح ۷ دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی ۸ آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال ۹ موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی؟

گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سُنا کہ یوں

۱۔ غنچہ ناشگفتہ:۔ دہن تنگ۔

میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ بوسہ کس طرح لیا جاتا ہے۔ تو وہ دُور سے اپنا منہ جو غنچۂ ناشگفتہ کی مانند ہے مجھے بنا کر دکھاتے ہیں کہ دیکھ بوسہ اس طرح لیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں یہ طریقہ درست نہیں ۔ یہ کیا کہ دُور سے بتا دیا۔ قریب آکر بتاؤ کہ بوسہ لینے کی یہ صورت ہے۔

بیخود و طباطبائی لکھتے ہیں کہ پاس آکر اپنے منہ سے لیکر بتاؤ کہ بوسہ یوں لیتے ہیں۔ (آسی، سعید)

آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے کہ میں نے تم سے بوسہ لینے کی صورت دریافت کی تو اس پر خاموش کیوں کھڑے ہو۔ یعنی خموشی دہن کو غنچۂ ناشگفتہ کہا ہے۔

۲۔ طرزِ دلبری:۔ دل لینے کا طریقہ۔

میں ان سے دل لینے کا طریقہ کیا پوچھوں۔ بغیر دریافت کئے پتہ چل رہا ہے۔ کیونکہ ان کا ہر ایک اشارہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ دل اس طرح اُڑایا جاتا ہے۔

۳۔ خدا کرے وہ رات کو خوب شراب پئے اور میرے گھر میں آئے لیکن خدا نہ کرے کہ وہ شراب پئے رقیب کو اپنے ساتھ لئے ہوئے میرے پاس آئے۔

۴۔ کیا بنی:۔ کیا گزری۔

میں نے جو اُن سے پوچھا کہ کہئے حضرت! غیر کے ساتھ رات کیسی گزری؟

اس سوال کا جواب انہوں نے اس طرح دیا کہ وہ میرے سامنے آن بیٹھے گویا یہ بتلایا کہ ہم اور غیر یوں بیٹھے رہے (بیخود۔ آسی)

طباطبائی:۔ (۱) میرے سامنے آبیٹھنا اور غصے کی نگاہ سے مری طرف دیکھنا دیکھئے کہ یوں تم گستاخی کرنے لگے (سعید) (۲) میرے سوال پر ذرا دیکھنا اس کا سامنے آبیٹھنا کہ یوں ڈھٹائی سے سامنے آن بیٹھنا۔

آسی کا دُوسرا مفہوم:۔ اس سوال کے سُنتے ہی وہ غُصے سے میرے سامنے آبیٹھا اور کہا کہ اب ہم آپ کے پاس آگئے ہیں تو آپ یوں چھیڑ نکالیں گے اور یوں گستاخی کریں گے۔

۵۔ کیسے ہوسکتا ہے کہ بزم میں اس کے سامنے ہم خاموش ہوکر نہ بیٹھیں۔ اس کے چپ چاپ رہنے کا مدعا یہی ہے کہ ہماری طرح تم بھی خاموش بیٹھے رہو۔

۶۔ تہی:۔ خالی ÷ ستم ظریف:۔ وہ شخص جس کی ظرافت میں ستم کی آمیزش ہو۔

میں نے اُن سے کہا کہ بزمِ ناز میں کوئی غیر شخص نہیں ہونا چاہئے اور غیر سے میرا مدعا رقیب تھا۔ اس ستم ظریف معشوق نے یہ سن کر مجھی کو بزم سے نکال دیا اور کہا کہ یہی تمہارا مطلب ہے نا۔ یعنی اب تو محفل غیر سے خالی ہوگئی۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی نگاہوں میں میں ہی "غیر" تھا۔ حسرت لکھتے ہیں کہ یہ شعر لفظ ستم ظریف کے مفہوم کی تشریح کرتا ہے۔

۷۔ جب یار نے مجھ سے دریافت کیا کہ ہوش کس طرح اُڑتے ہیں؟ تو میری بیخودی کا یہ عالم دیکھتے ہی ہوا چلنے لگی کہ دیکھ ہوش اس طرح اُڑا کرتے ہیں۔ جب عالمِ سرخوشی میں ہوا لگتی ہے تو نشہ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ مندرجہ بالا مفہوم کے علاوہ آسی نے یہ نکتے اور نکالے ہیں (۱) میری ہر شے دشمن ہے میں اس کے سوال کا جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ ہوا نے پہلے سے جواب دے دیا (۲) ہر شے میرے دردِ دل سے واقف ہے اور ہر شے میری حالت پر گواہ ہے (۳) اس کی ہر چیز

مطیع ہے اور اس کے سوال کے جواب کے لئے تیار ہے۔

۸۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کوچۂ یار میں کیونکر رہا جاتا ہے۔ حیرتِ نقشِ پا نے اپنی افتادگی اور حیرانی کی مثال پیش کر کے مجھے کوئے یار میں رہنے کا طریقہ سکھا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ نقشِ پا نے مجھے بتا دیا کہ اس طرح خاک میں مل کر اور جلوۂ یار سے حیرت زدہ ہو کر کوچۂ معشوق میں رہنا چاہئے۔

۹۔ اگر تیرے دل میں یہ خیال ہے کہ وصل سے عشق میں کیونکر کمی ہو جاتی ہے تو موجِ بحر کو دیکھ' وہ زبانِ حال سے بتا رہی ہے کہ وصل سے شوق اس طرح زوال پذیر ہوتا ہے یعنی موج کے تموّج اور تلاطم سے معلوم ہوتا ہے کہ موج وصلِ بحر سے دل سیر ہوگئی ہے اور وہ واپس کنارے پر آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے (حسرتؔ' سعیدؔ)

طباطبائیؔ:- اگر تجھے یہ خیال ہو کہ مبداءِ حقیقی تک پہنچ کر کیونکر زوالِ شوق ہو جائے گا اور کس طرح اتحاد پیدا ہو جائے گا تو موجِ محیط کو دیکھ' وہ بتا رہی ہے کہ اس طرح دست و پا مارتے مارتے آخر اتحاد ہو جاتا ہے جو کہ مرتبۂ اطمینان و سکون ہے (بیخودؔ)

آسیؔ:- اگر تیرے دل میں یہ خیال ہے کہ وصل سے شوق میں زوال آجاتا ہے تو موجِ دریا کو دیکھ' وہ اپنا سر پٹک رہی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ وصل سے شوق زوال پذیر نہیں ہوتا یعنی عاشق کو اگر معشوق سے وصال نصیب بھی ہو جاتا ہے تو اضطراب کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھ جاتا ہے۔ قطرات جب تک دریا سے نہ ملے تھے ان کو سکون حاصل تھا۔ دریا سے ملنے پر ان کی یہ صورت ہوئی کہ بصورت امواج سر پٹکتے اور بزبانِ حال کہتے ہیں کہ کیا وصال سے زوالِ شوق ہوا کرتا ہے یعنی نہیں ہوتا۔

۱۰۔ جو شخص یہ کہے کہ فارسی شاعری سے اردو شاعری کیونکر بہتر ہے تو اُس کو ایک مرتبہ غالبؔ کا اُردو کلام پڑھ کر سُنا اور یہ بتا کہ دیکھ! اس طرح سے اُردو شاعری فارسی شاعری کے لئے قابلِ رشک ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

و

۱۱۷

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو ۱ کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو
بقدرِ حسرتِ دل چاہئے ذوقِ معاصی بھی ۲ بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو
اگر وہ سروِ قد گرمِ خرامِ ناز آجاوے ۳ کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

حالیؔ:- ''یہ محض ایک خیالی مضمون نہیں ہے' بلکہ حقیقت واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور دُنیا کے حالات سے ناواقف اور لوگوں کی ترقّی وتنزّل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جس قدر اس کا دائرۂ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے' اسی قدر اس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے' جس پر حسد و رشک کیا جائے' بلکہ ان کی محنت اور تدبیر کا نتیجہ ہے اور اس لئے انصاف اور فیاضی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہ خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے پر متوجہ ہو جاتا ہے۔ شاعر اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ ''چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو''۔ جس طرح شعراء نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے۔ اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے''۔

طباطبائیؔ:- تجربہ کے بعد تجھے معلوم ہو جائیگا کہ حسد کرنا بیجا ہے۔ دُنیا میں دولت کے لئے کوئی سبب نہیں درکار ہے۔ ہر جگہ یہی حال ہے۔

۲۔ ذوقِ معاصی:- ذوقِ گناہ ÷ بھروں:- تر کروں ÷ آبِ ہفت دریا:- سات سمندروں کا پانی' مراد کثرتِ معاصی۔

میرے دل میں گناہوں کی حسرت اس قدر زیادہ ہے اگر گناہوں کے سات سمندر ہوں تو ان کے سارے پانی سے میرا ایک گوشۂ دامن تر ہوگا۔ ظاہر ہے پورا دامن تر کرنے کے لئے کتنے زیادہ سمندر درکار ہوں گے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں عصیاں کم ہیں اور میرا ذوقِ عصیاں زیادہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ فارسی میں تردامن گناہگار کو کہتے ہیں۔ غالبؔ ۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک   میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۳۔ کفِ ہر خاک:- ہر کفِ خاک۔ یعنی خاک کی ہر مٹھی' قمری کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اور وہ سرو کی عاشق ہوتی ہے۔

اگر وہ سروقد معشوق محوِ خرامِ ناز ہو کر گلشن میں آجائے تو گلشن کی خاک کی ہر مٹھی قمری کی طرح اس کے عشق میں نالہ کشی کرنے لگے۔ قمری اور کفِ خاک کی مشابہت نے لطف پیدا کردیا ہے۔

۱۱۸

کعبہ میں جارہا تو نہ دو طعنۂ کیا کہیں ۱ بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مئے انگبیں کی لاگ ۲ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے ۳ ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

غالبؔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے!
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو!

۱۔ کنشت:- بت خانہ÷ کِشت:- کھیت÷

اگر میں کعبہ میں رہنے لگا تو مجھ کو طعنہ نہ دو۔ میں بت خانہ والوں کی صحبت کے حق کو بھولا نہیں ہوں۔ مجھے اس انقلاب کے بعد بھی ان کا خیال ہے اور رہیگا۔ میں حق ناشناس نہیں ہوں۔ ان کی مہربانیاں اور احسان میرے دل پر نقش ہیں۔ تبدیل مذہب اور تعصب ان کو بُھلا نہیں سکتا۔

بیخود لکھتے ہیں کہ اگر میں ہندوستان سے ہجرت کر کے کعبہ جارہا تو...... الخ

۲۔ طاعت:- عبادتِ خدا÷ انگبیں:- شہد÷ لاگ:- طمع÷

حالیؔ:- جب تک بہشت قائم ہے' لوگ عبادت اسی امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور اور حور ملے گی۔ پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہئے۔ تا کہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصاً بوجہ اللہ عبادت کریں۔

۳۔ میں راہ و رسمِ ثواب سے کیونکر برگشتہ نہ ہوں۔ کاتبِ تقدیر نے جس قلم سے میری سرنوشت لکھی سوئے اتفاق سے اس پر قط ٹیڑھا لگا ہوا تھا قط ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے میری سرنوشت بھی ٹیڑھی لکھی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مقدر ہی میں رہِ ثواب سے منحرف رہنا لکھا ہے۔

۴۔ سعی:- کوشش۔ جدوجہد÷ لہنا:- فائدہ÷ ملخ:- ٹڈی÷ کشت:- کھیت÷ خرمن:- اناج کا ڈھیر÷

بطور شکایت کے کہتے ہیں۔ اپنی جدوجہد سے فائدہ اُٹھانا کچھ میری تقدیر ہی میں نہیں۔ اگر بالفرض ٹڈیاں میری کھیتی کو نہ کھائیں اور فصل تیار ہو جائے تو خرمن کو جلا کر خاک کردے گی۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ مقامِ شکایت میں ریاضت کے ثمرہ کو لہنا کہتے ہیں۔ غالبؔ نے اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

۱۱۹

وارستہ اس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو ۱ کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا ۲ ہے دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ ۳ ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
پیدا ہوئی ہے' کہتے ہیں ہر درد کی دوا ۴ یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو
ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ ۵ اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ۶ ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیٔ ہمّت ہے انفعال ۷ حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں ۸ اپنے سے کرُ نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی ۹ عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ جو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ ہو

وارستہ:- آزاد۔ بے پرواہ÷

ہم اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ تم ہم سے محبّت ہی کرو۔ اگر محبت تمہیں منظور نہیں' نہ سہی' عداوت ہی کرو' لیکن ہم سے بالکل قطع تعلق نہ کرو (آسی۔ سعید)۔

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے   کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

بیخود۔ طباطبائی:- اگر تم محبت نہیں کرتے تو عداوت ہی کرو۔ لیکن مجھ سے کرو۔ غیر کی شرکت عداوت میں بھی ناگوار ہے۔

۲۔ اختلاط:- محبت۔

ضعف نے مجھے اس قدر کمزور کردیا ہے کہ طبیعت میں رنگ اختلاط بھی باقی نہیں رہا۔ اب حالت یہ ہے کہ دل پر نقشِ محبت بھی بار معلوم ہوتا ہے۔

غالب ع   یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

طباطبائی:- رنگ کا لفظ فقط تصویر کے مناسبات سے ہے۔ اور یہاں ضرورت نہ تھی بیخود نے مزید تشریح کی ہے۔ "ضعف نے مجھے ایسا سُکھا دیا ہے کہ میرے جسم میں خون باقی نہیں رہا اور خون نہ رہنے سے رنگِ اختلاط بھی مٹ گیا"۔ میرے نزدیک یہ توجیہہ بہت دور کی ہے۔

۳۔ ہر چندتم نے مجھ سے غیر کا تذکرہ بطور شکایت کیا ہے لیکن پھر بھی مجھے تم سے یہ شکایت ہے کہ تم نے مجھ سے غیر کا ذکر ہی کیوں کیا' چاہے وہ بطورِ شکایت ہی تھا۔

۴۔ چارہ:- علاج۔

لوگ کہتے ہیں کہ دُنیا میں ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے' اگر یہ بات درست ہو تو مرضِ عشق کا علاج کیوں نہ ہو اور مریضِ عشق لا علاج کیوں رہ جائے گویا یہ غلط ہے کہ ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے۔

۵۔ خجالت:- شرمندگی۔

شکر ہے کہ بیکسی کی وجہ سے میرا کسی سے معاملہ نہ پڑا۔ گویا مجھ پر بیکسی کا یہ احسان ہے کہ اُس نے مجھے اوروں کے احسان سے بچایا اور اپنا ممنون احسان رکھا۔ اگر لوگوں کا مجھ پر کوئی احسان ہوتا تو ان سے مجھے شرمندگی ہوتی۔ اب بیکسی کی بدولت میں اُن سے شرمندہ نہیں۔ اگر شرمندہ ہوں تو اپنی ذات ہی سے ہوں اور یہی غیرت کا تقاضا ہے۔ بقول سعید بیکسی میں تسکین کا نیا پہلو نکالا ہے۔

بیخود۔ طباطبائی:- بیکسی کا احسان ہے کہ سب کے احسان سے بچالیا۔ لوگوں سے کچھ

نفع ہوتا تو خجالت تو ان سے ہوتی۔ اب خجالت بھی مجھے ہے تو اپنے ہی سے ہے آسی نے دونوں مفہوم لکھے ہیں۔

۶۔ کہتے ہیں آدمی اگر تنہا بھی ہو تو ایک حشرِ خیال ہے یعنی جب وہ خلوت میں ہوتا ہے تو تخیلات اور تصوّرات کا ایک ہنگامہ اس کے دل و دماغ میں برپا رہتا ہے۔ یہی حالت ہماری ہے' اس لئے اگر ہم خلوت میں بھی ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انجمن میں ہیں' کیونکہ ہمارے خیالات ہنگامہ آرا رہتے ہیں۔ قاعدہ ہے جب لوگ کسی مجلس میں جمع ہوتے ہیں تو طرح طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح خیالات کی ہنگامہ آرائی سے خلوت جلوت بن جاتی ہے۔

طباطبائی اور بیخود اس شعر کو عارفانہ شعر لکھتے ہیں۔ نیز اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تخلیہ نفس بہت مشکل ہے اور خطراتِ قلب پر قابو پانا دشوار تر ہے۔

۷۔ انفعال:- دوسرے کا اثر قبول کرنا۔ شرمندگی ÷ زبونیِ ہمّت:- کم ہمت:- کم ہمّتی ÷

دوسروں کا احسان یا اثر قبول کرنا کم ہمّتی کی دلیل ہے۔ اس لئے زمانہ سے عبرت بھی حاصل نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ زمانے سے عبرت حاصل کرنے سے زمانے کا احسان ہوگا۔ احسان سے شرمندگی ہوگی اور شرمندگی اُٹھانا زبونیِ ہمّت کی نشانی ہے۔

آسی کا دوسرا مفہوم ملاحظہ فرمائیے کہاں سے کہاں پہنچے ہیں "انفعال سے کم ہمّتی کا پتہ چلتا ہے لہٰذا کم ہمّتی کا خود کو مہتم ٹھہرانا بہت بُرا ہے۔ زمانے سے کچھ نہ کچھ حاصل کیوں نہ کیجئے' چاہے وہ عبرت ہی ہو یعنی بے حصولِ کمال دُنیا میں محض انفعال سے کام نہیں چلتا"۔

۸۔ وارستگی:- آزادی ÷ وحشت:- رمیدگی' بھاگنا۔

عام لوگ آزادی کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ اپنے پرائے سے قطع تعلق کرلیا جائے۔ کہتے ہیں آزادی کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ آزادیٔ وحشت' رمیدگی اور بیگانگی محض اپنے نفس سے اختیار کرنی چاہئے نہ کہ دُنیا اور اہلِ دُنیا سے حقیقتاً یہ ہے آزادی کا صحیح مفہوم کہ انسان بے غرض ہو کر زندگی بسر کرے۔

۹۔ فرصت:- مہلت' وقت ÷ فوت ہونا:- ضائع ہونا ÷

عام خیال یہ ہے کہ عمر کا بہترین مصرف عبادت و بندگی معبود ہے کہتے ہیں خواہ ساری عمر عزیز عبادت ہی میں صرف کیوں نہ ہوجائے پھر بھی عمرِ عزیز کے ضائع ہونے کا رنج ضرور ہوتا ہے۔

آسی لکھتے ہیں کہ عمر عزیز ترین شے ہے۔

طباطبائی کا خیال ہے کہ عبادت کا جو ثمرہ ہے اس سے بڑھ کر انسان حاصل کر سکتا ہے۔ پھر عبادت میں اگر مہلت حیات کو صرف کر دیا تو کیونکر اس کا غم نہ ہوگا۔

۱۰۔ ہم اس فتنہ خو کے در پر آن بیٹھے ہیں اور اب ہم یہاں سے ہرگز نہیں اٹھیں گے۔ چاہے ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ گزر جائے۔ لطف یہ ہے روز قیامت ہر چیز اُٹھے گی۔ پھر بھی ہم نہیں اُٹھیں گے' یا یہ کہ قیامت تک بیٹھے رہیں گے۔ تیسرا مفہوم یہ ہے چاہے ہمارے سر پر کتنے ہی ظلم و ستم کیوں نہ ہوں ہم ہرگز نہیں اُٹھنے کے۔

۱۲۰

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانے میرے شیون کو ۱ مرا ہونا بُرا کیا ہے' نوا سنجانِ گلشن کو!

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے ۲ نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اُس جراحت پر ۳ کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں ۴ کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو'

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں ۵ نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا ۶ کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے ۷ سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے ۸ مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو ۹ جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا ۱۰ رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویاں ہوں جواہر کے ۱۱ جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو!

۱۔ شیون:- فریاد۔

میں قفس میں گرفتار اور نالہ و شیون میں مصروف ہوں۔ برخلاف اُس کے نوا سنجانِ چمن شاد

کام اور آزاد ہیں۔ پھر وہ میرے نالوں کو کیوں کر سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں تو میں لطفِ چمن میں ان کا حصہ دار بھی نہیں بن سکتا۔ آخر مجھ سے متنفر ہونے کی وجہ کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا' میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔

۲۔ ہمدمی:- دوستی۔

میں یہ اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ غیر کے لئے دوست کا ہمدم ہونا آسان بات نہیں ہے لیکن میرے لئے یہ غم کیا کم ہے کہ غیر کو بھی میرے دوست کی آرزو ہے۔ اللہ میاں! کیا ہی اچھا ہوتا جو تم رقیب کو آرزوئے دوست نہ دیتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر غیر کو آرزوئے دوست نہ ہوتی تو میں رشک کی تکلیف سے بچ جاتا۔

۳۔ جراحت:- زخم۔ سینہ:- ذو معنی ہے یعنی چھاتی اور سینا پرونا۔

تو کس قدر سنگدل ہے کہ تیری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔ جسے سینے میں (ٹانکے لگانے میں) سُوئی کی پلکوں تک سے خون ٹپکنے لگا۔ جب زخم کو سِیا جاتا ہے تو سُوئی کی نوک خون آلودہ ہو جاتی ہے اور اس میں سے قطراتِ خون ٹپکنے لگتے ہیں (سعید)

طباطبائی:- سوزن سے سوزنِ غم مراد ہے جس کا مقام سینے کے اندر ہے اور سوزن سے یہ استعارہ نہ لیں تو شعر عامیانہ ہو جائے گا۔ جیسے نافہم شعرا غیر واقعی باتیں نظم کر دیا کرتے ہیں۔ ہاں اگر سینے کی جگہ سینا سمجھو تو استعاروں کی ضرورت نہیں۔

بیخود:- تیری آنکھ سے ان زخموں کا حال سُن کر ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ جن زخموں کو میرے دل میں دیکھ کر سوزنِ غم کی آنکھوں سے خون جاری ہو گیا۔

آسی نے یہی شرح لکھی ہے۔ صرف سوزنِ غم کی جگہ مژگان سوزن لائے ہیں۔

۴۔ کشاکش:- کھینچا تانی۔

خدا کرے میرے ان ہاتھوں کو شرم آئے اور یہ اپنی حرکت سے باز رہیں کہ یہ ہمیشہ کھینچا تانی میں مصروف رہتے ہیں۔ جب معشوق کھینچا تانی میں مصروف ہوتا ہے تو اس وقت اس کے دامن کو پکڑ کر کھینچتے ہیں اور اگر وہ نہیں ہوتا تو غمِ فراق میں میرے گریبان کو پھاڑتے ہیں۔

بقول بیخود اس شعر میں یہ شوخی ہے کہ اپنے جوشِ عشق اور وفورِ شوق کا الزام بے گناہ ہاتھوں

پر لگایا ہے۔

آسی اور حسرت کا خیال ہے۔ اگر چہ "جاناں کا دامن"۔ "دامنِ جاناں کا صحیح ترجمہ ہے لیکن فصیح نہیں۔

۵۔ شناور:- تیرتا ہوا÷ جوئے خوں:- دریائے خوں۔ توسن:- گھوڑا!

ہم قتل گاہ کا نظارہ کرنا معمولی بات سمجھے ہوئے ہیں کیونکہ ابھی ہم نے دریائے خون میں تیرے توسن کو تیرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب یہ منظر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ قتل گاہ کا نظارہ کرنا کس قدر ہمّت کا کام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قتل گاہ میں اتنے عاشقوں کا خون ہوگا کہ خون کا دریا بہ جائیگا اور اس میں تیرا گھوڑا تیرتا پھریگا۔ بھلا ایسا خونیں منظر کون دیکھنے کی ہمت رکھتا ہے؟

بیخود کی تشریح مزید بالکل اچھوتی ہے۔ لکھتے ہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا قاتل گروہِ عشاق میں سے ایک خوش نصیب عاشق کو انتخاب کر کے خنجر ناز یا تیغ غمزہ سے شہید کردیگا۔ یہ نہیں معلوم کہ اس تماشے کے بعد اتنے آدمی رشک سے اپنے گلے کاٹیں گے کہ خون کا دریا بہ جائے گا۔

۶۔ چرچا:- شہرہ۔

جوہر کی چمک کو جنبش اور بیتابی سے تعبیر کیا ہے۔ میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا جوشہرہ ہوا تو لوہے کے جوہر نے لوہے کو کان کے اندر بیتاب کردیا یعنی جوہرِ آہن اس لئے بیتاب ہوا کہ اس کا لوہا میرے پاؤں کی زنجیر بنے۔

طباطبائی:- میری دیوانگی وہ رُتبہ رکھتی ہے کہ آہن کو آرزو ہے کہ زنجیر بن کر میرے پاؤں میں پڑنے کا شرف حاصل کرے۔ آسی۔ غالب کے اس مبالغہ کو اچھا نہیں سمجھتے۔ حالانکہ خوب ہے۔

۷۔ کسان جب ابر کو دیکھتا ہے تو بہت خوش ہوتا ہے کہ اس کے برسنے سے کھیتیاں شاداب ہوں گی اور بڑی اچھی فصل اُٹھے گی' لیکن غالب کہتے ہیں اگر میری کھیتی پر سو بار بھی ابر آئے تو مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی' کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بجلی ابھی سے میرے خرمن کو جلانے کے لئے ڈھونڈ رہی ہے۔ یعنی جب مراد پوری ہونے سے پہلے نامرادی کا سامان نظر آرہا ہے۔ پھر خوشی کیونکر ہو یہ مضمون غالب کو بہت مرغوب ہے۔ پہلے بھی کئی مرتبہ لکھ چکے ہیں۔

۸۔ حالی:- یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بُت خانے میں کاٹ دے اور وہیں مرے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبہ میں دفن کیا جائے اس لئے کہ اس نے وفاداری کا پورا پورا حق ادا کردیا اور یہی ایمان کی اصل ہے" بقول طباطبائی۔ وفاداری و پائداری ہر حال میں یہاں تک کہ کفر میں بھی قابلِ قدر ہے۔

۹۔ کاتبِ ازل نے میری قسمت ہی میں شہید ہونا لکھا تھا۔ اسی لئے میں جہاں کہیں تلوار دیکھتا ہوں اپنی گردن جُھکا دیتا تھا۔

طباطبائی:- تلوار استعارہ ہے ناز وادا اور جور وجفا سے اور گردن جھکانا کنایہ ہے گوارا کرنے سے اور شہادت سے خونِ آزاد مراد ہے۔ اگر معنی حقیقی پر ان لفظوں کو لیں تو شعر کا کوئی محصل نہیں رہتا۔

۱۰۔ آسی اس شعر کو بیت الغزل کہتے ہیں۔ اگر میں دن کو نہ لٹتا تو رات کو ایسا بے فکر ہوکر مزے سے کیونکر سوتا۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے چوری کا خطرہ رہتا۔ اب میں لُٹ گیا ہوں' اس لئے بے فکر ہوں' آرام کی نیند سو رہا ہوں اور رہزن کو دُعا دیتا ہوں کہ خدا تیرا بھلا کرے۔ تُو نے مجھے غمِ اسباب اور فکرِ متاع سے آزاد کردیا۔

طباطبائی اور بیخود:- تعلقات دنیوی تکلیف وتشویش سے خالی نہیں۔ جُدائی اس سے ناگوار تو ہوتی ہے لیکن راحت اسی میں ہے۔

۱۱۔ جویا:- تلاش کرنے والا÷ معدن:- کان۔

ہمارا جگر معدن اور ہمارے اشعار جواہرات ہیں۔ اگر ہم جگر کاوی سے جوہرِ سخن نہ نکال سکتے ہوں تو پھر ہم معدن کو کھود کر اس میں سے جواہرات نکالتے ہوئے اچھے لگیں گے۔ بقول بیخود و طباطبائی۔ مطلب یہ ہے۔ کہ جگر کاوی کر کے شعرِ تر نکالنا معدن کو کھود کر جواہر نکالنے سے بہتر ہے۔

۱۲۔ سلیمانؑ بہت بڑے بادشاہ تھے۔ ان کی جن وانس پر حکومت تھی۔ پیغمبر اولوالعزم تھے اور یہ بادشاہ جن کا مصرعہ ثانی میں ذکر ہے اگر چہ بڑے بادشاہ تھے لیکن نہ تو مسلمان تھے اور نہ ان میں وہ صفات تھیں جو میرے بادشاہ میں ہیں۔ پھر ان کو میرے بادشاہ سے کیا نسبت ہوسکتی ہے' وہ تو سلیمان جیسے مرتبے والا ہے۔

۱۲۱

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو ۱ رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو ۲ ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ ۳ ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور ۴ تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ ۵ ہلتے ہیں خودبخود مرے اندر کفن کے پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف ۶ اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں ۷ دُکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پانو

غالب مرے کلام میں کیونکر نہ ہو مزہ
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

۱۔ جوشِ محبت کے اظہار اور خاطر مدارات کے لئے اس سیمیں بدن محبوب کے پانو دھو کر ان کا دھوون پینا چاہتا ہوں تو ضدی معشوق لگن سے باہر پانو کھینچ لیتا ہے' گو وہ مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ میں اس کے پانو دھو کر پیوں۔ بقول سعید اس کو مجھ سے اس درجہ نفرت اور کینہ ہے۔

۲۔ پانو پڑنا:- عاجزی دکھانا' منت سماجت کرنا۔ یہ محاورہ عورتوں کی زبان کا ہے۔ محبت اور ہمدردی دکھلانے کے لئے بولا جاتا تھا۔ مثلاً اس کے پاؤں پڑوں۔ وہ کس مصیبت میں مبتلا ہے۔

ہیہات:-افسوس۔

پیرزن میں تلمیح ہے۔ خسرو نے فرہاد سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ نہر کھود کر اس کے قلعہ تک لے آئیگا تو شیریں کو اس کے حوالے کردیا جائیگا۔ فرہاد نے نہر کھود نکالی اور محل تک پہنچادی۔ خسرو کو بہت فکر ہوا کہ اب کیا ہوگا؟ اس نے تو ایسی شرط پیش کی تھی جس کا پورا کرنا امرِ محال تھا۔ آخر خسرو کی پریشانی دیکھ کر اس کے ایک مصاحب نے ایک ترکیب سوچی۔ وہ ایک بُڑھیا کا بھیس بدل کر فرہاد کے پاس گیا اس کو دیکھ کر چیخیں مار کر رونے لگا۔ فرہاد نے کہا کہ بڑی بی کیوں روتی ہو؟ اس سوال پر وہ اور زیادہ روئی اور سخت اصرار کے بعد بتایا کہ میں شیریں کی دایہ ہوں۔ میں نے اس کو پالا ہے۔ وہ آج ایک دم مرگئی اور تُو ہے کہ اس کے خیال میں ہمہ تن مصروف ہے۔ فرہاد یہ سُن کر دیوانہ ہوگیا

اُس نے وہی تیشہ جس سے وُہ پہاڑ کاٹ رہا تھا' اپنے سر میں مارا اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔

غالب ہمدردی کے لہجہ میں کہتے ہیں' فرہاد نے کس سادگی سے ایک بُڑھیا کے فریب میں آکر جان دے دی۔ افسوس اس بُڑھیا کے پاؤں کیوں نہ ٹوٹ گئے کہ وہ وہاں تک پہنچ ہی نہ سکتی۔

بیخود:- پاؤں پڑنا بیوقوف بنانے کے محل پر بولتے ہیں۔ طباطبائی اور دیگر شارحین کا خیال ہے کہ یہ محاورہ جوشِ محبت میں اظہار ہمدردی کرنے کے معنوں میں صرف کیا گیا ہے۔

۳۔ ہم راہزن سے ڈر کر بھاگے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر ہی میں یہ لکھا تھا کہ راہزن ہمیں لُوٹ لے' لُوٹ کر قید کرلے اور پھر ہم قیدی اور غلام بن کر اس کے پاؤں دبایا کریں۔ گویا ہم تقدیرِ الٰہی سے باوجود کوشش کے بچ نہ سکے اور ہماری کوشش کا نتیجہ برعکس برآمد ہوا (سعید' بیخود)

طباطبائی لکھتے ہیں اس شعر کے جو معنی حقیقی ہیں وہ تو شاعر کے (طرز) کلام سے نہیں معلوم ہوتے۔ ہاں اگر یہ باتیں استعارہ سمجھو تو وہ بھی صاف نہیں آسی تائید کرتے ہیں۔

۴۔ میرا جسم زخمی تھا۔ میں زخموں کے لئے مرہم کی تلاش میں بہت دُور دُور پھرا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ خستہ تن کے پاؤں میرے زخموں سے زیادہ فگار ہوگئے۔

اس شعر میں بھی گزشتہ شعر کا مفہوم ہے۔ بقول بیخود مطلب یہ ہے کہ گوہر مراد ہمیشہ نہیں ملتا۔ کبھی مل جاتا ہے۔ طباطبائی لکھتے ہیں کہ جس چیز سے بھاگتے ہیں اسی کا سامنا ہوتا ہے اور جس آفت کی چارہ جوئی کریں اُسی میں پھنستے ہیں۔

۵۔ مجھے دشت نوردی اور صحرا گردی کا اس قدر شوق تھا کہ مرنے کے بعد بھی کفن کے اندر میرے پاؤں ہلتے تھے۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ حالتِ ذوق وشوق میں خود بخود پاؤں ہلنا خلقتِ فطری ہے۔

بیخود نے تشریح فرمائی ہے۔ کہتے ہیں زندگی میں دُنیا کے جنگلوں میں پھرتا تھا۔ موت کے بعد میدانِ عدم طے کررہا ہوں۔ بالکل اچھوتا خیال ہے۔ آسی نے اس شعر کو بیت الغزل قرار دیا ہے۔

۶۔ اس مرتبہ بہار میں اس قدر جوش گل ہے کہ اُڑتے وقت مرغانِ چمن کے پاؤں

پھولوں کے جال میں پھنسے جاتے ہیں۔ آخری مصرعہ سے دو مفہوم پیدا ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس قدر پھول ہیں کہ مرغانِ چمن کو پرواز کرنے کے لئے بھی جگہ نہیں ملتی اور دوسرے یہ کہ پرندے جلوۂ گل دیکھ کر وہیں رہ جاتے ہیں۔ چمن سے باہر نہیں جاسکتے (سعید نے پہلا مفہوم لکھا ہے۔ بیخود نے دوسرا اور باقی شارحین نے دونوں)

۷۔ آج اس نازک بدن محبوب کے پاؤں دُکھ رہے ہیں۔ شاید وہ خواب میں غیر کے ہاں گیا ہوگا۔ گویا ایسے نازک بدن معشوق کا رقیب کے گھر پاؤں سے چل کر جانا ناممکن ہے۔ جس کے پاؤں خواب میں کسی کے گھر جانے سے دُکھنے لگیں۔

۸۔ غالب میرا کلام کیونکر مزے دار نہ ہو میں بادشاہِ شیریں سخن کے پاؤں دھودھو کر پیتا ہوں۔ اس لئے میرے کلام کا پُر لطف اور خوش ذائقہ ہونا یقینی ہے۔ الفاظ نہایت مناسب صرف کئے ہیں۔ مثلاً مزہ' پینا' شیریں' خسرو وغیرہ' اس شعر میں صنعتِ مراۃ النظیر ہے۔ اپنے کلام کو مزیدار کہنے کے لئے بادشاہ کو خسرو شیریں سخن کہا ہے۔

۱۲۲

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار ۱ یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ! ۲ آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

۱۔ ہولِ دل:- ایک مرض ہے جس میں دل کی حرکت بڑھنے سے خفقان کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔

معشوق ہولِ دل میں مبتلا ہے۔ عاشق اس خیال سے شرمندہ ہورہا ہے کہ کہیں یہ ہولِ دل میری آہ کی تاثیر ہی سے نہ ہوگیا ہو۔ طباطبائی لکھتے ہیں معشوق کا وسوسی اور خفقانی ہونا ادائے معشوقانہ ہے۔ آسی کا خیال ہے کہ معشوق کا ہولِ دل محض رقیب کی جدائی میں ہے۔ بقول بیخود جوشِ محبت کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔ معشوق کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو عاشق اُسے اپنی آہ کا اثر سمجھا کرتا ہے۔

۲۔ تاکہ:- جب تک ÷ نخچیر:- شکار مراد عاشق۔

اس ستمگر کا ذرا ذوقِ ستم دیکھنا جب تک کہ چشمِ نخچیر (دیدہ عاشق) کا آئینہ نہ ہو وہ اپنی شکل ہی نہیں دیکھتا یعنی وہ ہمیشہ دیدۂ عاشق کے آئینہ میں صورت دیکھ کر آرائش کرتا ہے کوئی اور آئینہ

استعمال میں نہیں لاتا۔

۱۲۳

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو ۱ صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے ۲ کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو
ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن ۳ تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
جان کر کیجیے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو ۴ یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو!
رشک ہم طرحی ودردِ اثرِ بانگِ حزیں ۵ نالہ مرغِ سحرُ تیغِ دودم ہے ہم کو!
سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا ۶ ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار ۷ پاسِ بے رونقی دیدۂ ہم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ۸ ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ۹ ہوسِ سیر و تماشا' سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر ۱۰ عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

۱۔ پے ہم:- پیہم' پے درپے' مسلسل ÷ صدرہ:- سوطرح سے' سوبار ÷ واں:- مراد کوچہ یار ÷ آہنگ:- ارادہ ÷

کوچہ یار میں پہنچ کر جو مجھ کو بار بار غش آتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ میں اپنے قدموں کی زمین چومنے کا سو سو طرح سے ارادہ کرتا ہوں۔ کیونکہ باوجود ناتوانی کے وہ مجھ کو وہاں لے جاتے ہیں۔ لفظ پیہم باضافت اور بلا اضافت دونوں طرح صحیح ہے لیکن اُردو میں بے اضافت بولا جاتا ہے۔ اور محاورۂ زبان کی پیروی کرنا فصاحت ہے۔

مندرجہ بالا شرح پر سارے شارحین متفق ہیں۔ آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے کہ وہاں پہنچ کر مجھے جو بار بار غش آتا ہے گویا ان کی قدمبوسی کا بہانہ مِل جاتا ہے۔

۲۔ دل کو میں اور مجھ کو دل گرفتارِ وفا رکھتا ہے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ ہم دونوں کو کس

قدر ذوقِ گرفتاری یعنی شوق آزار ہے۔

۳۔ نقشِ پےِ مور:- چیونٹی کے پاؤں کا نشان÷ طاقتِ رم:- بھاگنے کی طاقت۔

اس قدر ضعف و نقاہت ہے کہ چیونٹی کے پاؤں کا نقش بھی میرے لئے طوقِ گردن ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ میری گردن میں پےِ مور کا بھاری طوق پڑا ہوا ہے تو پھر میں تیرے کوچے سے کیونکر بھاگ سکتا ہوں۔ اللہ رے ضعف۔

۴۔ نگاہِ غلط انداز:- نا آشنا نظروں سے دیکھنا۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا تم میری طرف سے غافل نہ ہو۔ شوق سے تغافل برتو لیکن مجھے اپنا عاشق سمجھتے ہوئے۔ کیونکہ جان کر تغافل کرنے میں ایک قسم کا التفات پایا جاتا ہے۔ اور رحم و کرم کی کچھ نہ کچھ امید رہتی ہے لیکن ایسی نا آشنا نگاہیں جن سے تم مجھے دیکھتے ہو میرے لئے زہر کا اثر رکھتی ہیں اور میری تمام امیدوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

۵۔ ہم طرحی:- ہم رنگی' ایک جیسا ہونا÷ تیغ دودم:- دودھاری تلوار۔

مرغِ سحر کا نالہ میرے لئے دودھاری تلوار ہے۔ اس کی ایک دھار رشک ہم رنگی ہے اور دوسری باڑھ خود اس کی فریاد کا درد و اثر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو اس رشک سے مرتا ہوں کہ وہ بھی میری طرح اس کا عاشق ہے اور میری طرح صبح کے وقت نالہ و فریاد کرتا ہے اور دوسری طرف اس کے غمناک نالوں کی دردبھری آواز مجھے مارے ڈالتی ہے (آسی۔ بیخود۔ طباطبائی) سعید نے ہم طرحی اور دردِ اثر بانگ حزیں دونوں کا رشک کو مضاف قرار دیا ہے۔

۶۔ حالی:- اس شعر میں ''ترے سر کی قسم ہے ہم کو کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ تیرے سر کی قسم ہے ہم ضرور تیرا سر اڑائیں گے اور دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اڑائیں گے' جیسے کہتے ہیں کہ آپکو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے یعنی کبھی کبھار ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔ آسی لکھتے ہیں کہ ہنسا اور سر اُڑانے پر سر کی قسم کھانا لطیف مضمون ہے۔

۷۔ دل کے خون کرنے کی محض یہ وجہ ہے کہ بغیر خوں فشانی کے آنکھیں بے رونق معلوم ہوتی تھیں۔ اور ہم کو آنکھوں کی بے رونقی کا بہت زیادہ خیال تھا۔ اس لئے مجبور ہوکر ہم نے دل کو خون کرکے اپنی آنکھوں کو پُر رونق بنالیا ہے۔

۸۔ تم ایسے نازک ہو کہ تم کو میری خموشی بھی فغاں معلوم ہوئی اور ہم اس قدر عاجز اور کمزور و ناتواں ہیں کہ تم نے جو ستم ترک کرکے تغافل اختیار کیا تو ہم نے اس کو ستم قرار دیا۔

۹۔ باقی اشعار قطعہ بند ہیں کہتے ہیں لکھنؤ آنے کا کچھ سبب معلوم نہیں ہوا کہ آخر ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم سیر و تفریح کے لئے آئے ہیں تو یہ غلط ہے کیونکہ سیر تماشے کی ہوس ہمیں بالکل نہیں یا اگر ہے تو بہت تھوڑی ہے۔

۱۰۔ مقطع:- خاتمہ۔

یہ شہر ہمارے سلسلۂ شوق کا مقطع نہیں ہے کہ یہاں سفر ختم ہوجائے بلکہ ہمارا ارادہ نجف اشرف کی زیارت اور طوافِ حرمِ رسول کا بھی ہے یعنی یہ سلسلہ وہاں جاکر ختم ہوگا۔ نجف میں حضرت علیؑ کا روضہ ہے۔

۱۱۔ غالبؔ ہم جہاں کہیں بھی جارہے ہیں وہاں ہمیں ایک امید لئے جاتی ہے اور لفظ کرم کا مرکز کاف ہمارے لئے جادۂ راہ بنا ہوا ہے یہ شعر اس وقت کے ہیں جب میرزا لکھنؤ اور بنارس ہوتے ہوئے اپنی پنشن جاری کرانے کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔

۱۲۴

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ۱ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے ۲ قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گنہ کُش و حق ناشناس ہیں ۳ مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو
اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار ۴ مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چُھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید ۵ مسجد ہو' مدرسہ ہو' کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف' سب درست ۶ لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دُنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

۱۔ ایسا معلوم ہوتا ہے محبوب کو بہت روکا کہ وہ غیر سے ملنا جلنا ترک کردے لیکن وہ باز نہیں آیا۔ بلکہ انہیں سے تعلقات منقطع کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ آخر تنگ آکر کہتے ہیں خیر چلو تم خوش

رہو، ہمیں رشکِ رقابت بھی گوارا ہے۔ غیر سے تمھارے جو بھی تعلقات ہیں، تم جانو اور تمہارا کام جانے ہمیں کچھ سروکار نہیں۔ لیکن اگر ساتھ کے ساتھ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کون سی بڑی بات ہے۔

۲۔ مواخذہ:- پکڑ دھکڑ، پُرسش۔

تم نے روزِ حشر کی جواب دہی سے بچنے کے لئے مجھ کو رقیب سے قتل کروایا۔ یاد رہے، تم اس حیلے سے مواخذۂ حشر سے بچ نہیں سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ رقیب قاتل ہے لیکن تم گواہ تو ہو۔ اس لئے تم سے پُرسش ضرور ہوگی۔

آسی اس شعر کو بیت الغزل لکھتے ہیں۔ بیخود کے نزدیک رقیب قاتل اس لئے ہے کہ اس کی طبعِ رشک نے قتل کیا ہے۔ سعید لکھتے ہیں اگرچہ قاتل رقیب ہی ہے لیکن بنا تو تم ہی ہو۔

۳۔ بے گناہ کُش:- بے گناہوں کو مارنے والا ÷ حق ناشناس:- حق نہ پہچاننے والا۔

آپ کہتے ہیں ہمیں آدمی نہ کہو، سُورج کہو چاند کہو، ہم نے مان لیا کہ آپ واقعی سورج اور چاند ہیں۔ لیکن کیا سُورج اور چاند بھی آپ کی طرح بے گناہوں کا خون بہانے اور حق کو نہ پہچاننے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے نہیں۔

۴۔ ان کی نقاب پر ایک تار اُبھرا ہوا ہے۔ میں اُسے دیکھ کر رشک کے مارے مرا جاتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ خدانخواستہ کہیں یہ کسی کی نگاہ کا تار نہ ہو۔ جو ان کی نقاب پر جم گیا ہے۔

۵۔ حالی:- اس شعر میں ازراہِ تہذیب اس کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا، جب وہی چھٹ گیا۔ اب مسجد میں مل جائے تو، اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو، سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہِ شوخی کی گئی ہے۔ یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں، وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا مقتضائے بلاغت ہے"۔ بہترین شعر ہے۔

۶۔ واعظوں کی زبانی جس قدر ہم بہشت کی تعریف سنتے ہیں، وہ سب ہم کو تسلیم ہیں۔ لیکن خدا نہ کرے وہاں تیرا دیدار نصیب نہ ہوا تو پھر وہ ہمارے نزدیک ہیچ ہے۔ یہ شعر مجاز میں بھی ہوسکتا ہے۔

۷۔ اوّل تو یہ ضروری ہے کہ غالب جیسا باکمال شاعر تیرے ساتھ رہے۔ لیکن خیر اگر غالب نہ بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ میری دعا تو یہ ہے کہ خدایا دُنیا ہو اور میرا بادشاہ ہو۔ گویا وہ ہمیشہ زندہ رہے اور بامراد زندگی بسر کرے۔ بس یہی کافی ہے۔ (بیخود۔ آسی)

بقول سعید میری عُمر بادشاہ پر قربان ہوجائے۔ بقول طباطبائی میری عمر بھی بادشاہ کو ملے۔

۱۲۵

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو ۱ کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال ۲ کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجئے ۳ حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا ۴ بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ ۵ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ۶ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

ہمیں پھر اُن سے امید اور انہیں ہماری قدر ۷ ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا ۸ نہ مانے دیدۂ دیدار جُو تو کیوں کر ہو

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار ۹ یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

۱۔ کہے سے کچھ نہ ہوا:- یعنی گفتگو ہونے پر بھی کچھ نہ ہوا۔

وہ وقت گزر گیا جب ہم یہ سوچا کرتے تھے کہ اگر ان سے گفتگو کا موقع ہاتھ آئے تو کس طریقے سے گفتگو کی جائے کہ ہمارا سکہ ان کے دل پر بیٹھ جائے۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایسا موقع مِل گیا، لیکن ہماری گفتگو کا کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا یعنی وہ ہم پر پھر بھی مہربان نہ ہوئے۔ اب کہو کہ کیا کیا جائے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ پہلی گفتگو سے کچھ حاصل نہ ہوا تو پھر بتاؤ اب کیا ہو اور ہم کیا کریں۔ یعنی جب پہلے کچھ نتیجہ نہ نکلا تو اب کیا نکلے گا۔ سعید و بیخود نے پہلا مفہوم لکھا ہے اور آسی و طباطبائی

نے دونوں۔

۲۔ ہمارے ذہن میں وصال کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس فکر میں غرق رہیں کہ اگر وصال نصیب نہ ہو تو ہم کہاں جائیں اور اگر ہو تو کیوں کر ہو۔ گویا اگر ہو تو اس کے لئے کیا سامان ہونے چاہئیں اور اگر نہ ہو تو کس قسم کی کوشش کرنی چاہئے۔ طباطبائی لکھتے ہیں کہ اسی فکر میں ہم خوش رہتے ہیں کہ وصال کبھی نصیب نہیں ہوتا۔

۳۔ ایک طرف ہمارے دل میں ان کا لحاظ و ادب ہے اور دوسری طرف اپنے ارمانوں کا خیال ہے گویا ہم ایک کش مکش میں مبتلا ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ یہ تو ہماری حالت ہے اور ان کی حالت یہ ہے کہ ان کو حیا مانع ہے اور وہ گومگو کے عالم میں پھنسے ہوئے ہیں کہ کیا کریں' کیا نہ کریں۔ بتاؤ پھر کام بنے تو کیونکر بنے۔

آسی:- اگر ہمارا یہی ادب' یہی اُلجھن' یہی گومگو اور ان کا یہی حیا کا عالم ہے تو آخر کیونکر کام بنے گا اور کیا ہوگا۔

۴۔ ہم تم ہی سے پوچھتے ہیں کہ اگر تمہاری جیسی عادت تمام دُنیا کے معشوقوں کی ہو تو عاشقوں کا گزارا اس دُنیا میں کیوں کر ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ تم جیسے سخت گیر معشوق دُنیا میں ہوں تو عاشق عشق کو ترک کر دیں گے لیکن یہ ہماری ہی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی عشق سے باز نہیں آتے۔

۵۔ حالی:- اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو (آسی اور طباطبائی نے فقط پہلا مفہوم لکھا ہے)

۶۔ جس بدنصیب شخص کو مجھ جیسا روزِ سیاہ نصیب ہو' وہ شخص مجبور ہے کہ دن کو رات کہے' کیونکہ ایسے روزِ سیاہ کو ہرگز دن نہیں کہا جاسکتا۔ اندازہ کرنا چاہئے کہ اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی' جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے۔

۷۔ جب ہماری بات ہی نہ پوچھیں تو پھر ہمیں ان سے کوئی امید کیوں کر ہو اور ان کو ہماری قدر کیوں کر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ بات کرنے ہی سے یہ دونوں باتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ شعر میں تعقید

ہے اور قافیہ بنانے کے لئے ''وہ'' کو ''وو'' نظم کیا ہے۔ ایک اور جگہ بھی تصرف کیا ہے لیکن یہ قابل اعتراض نہیں۔

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مو آئے　　　اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

۸۔ دیدارِ جو:- دیدار کا طلبگار۔

ہمارے دل کو یقین تھا کہ ان کا خط آنے سے ہمارے دل کو تسلی ہو جائے گی اور یہ غلط نہ تھا کیونکہ معشوق کے خط سے تسلیِ خاطر ہو ہی جاتی ہے چنانچہ دل کی تسلی ہوگئی لیکن دیدار کی طلبگار آنکھوں کی تسلی نہیں ہوتی۔ وہ اس کو دیکھنے ہی پر مصر ہیں۔ اب کیا بنے۔

۹۔ نیش:- نشتر۔ ڈنک÷ مژۂ یار کو نیش سے تشبیہ دی ہے۔

پہلے کوئی اس کی مژہ کو دیکھے اور پھر مجھے بتلائے کہ جس شخص کی رگِ جان کے اندر ایسا نشتر چھپا ہوا ہو اس کو کیوں کر قرار ہو سکتا ہے۔

۱۰۔ مصرعہ ثانی بہادر شاہ ظفر کا ہے۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ یہ ان کی فرمائش کی غزل ہے۔ فرماتے ہیں' مجھے جنوں نہیں ہے کہ میں آپ ہی آپ بیقرار ہوں۔ مجھے فراقِ یار میں تسکین کا پہلو نظر نہیں آتا۔ پھر تسکین ہو تو کیوں کر ہو۔



کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو　۱　نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے' ہم اپنی وضع کیوں بدلیں　۲　سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو　۳　نہ لائے تاب جو غم کی' وہ میرا رازداں کیوں ہو
وفا کیسی' کہاں کا عشق' جب سر پھوڑنا ٹھہرا　۴　تو پھر اے سنگدل' تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن' کہتے نہ ڈر ہمدم　۵　گری ہے جس پہ کل بجلی' وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں' پر یہ بتلاؤ　۶　کہ جب دل میں تمہیں تم ہو' تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ' دیکھو جرم کس کا ہے　۷　نہ کھینچو گر تم اپنے کو' کشاکش درمیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟　۸　ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا' تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟　۹　عدو کے ہو لئے جب تم' تو میرا امتحاں کیوں ہو

ہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی ۱۰ بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے اے غالبؔ؟

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

۱۔ اگر کوئی کسی کو دل دیدے تو پھر اس کی فریاد کیوں کرے۔ جب ایک چیز دے چکے تو ہر اس کے لئے رونے کا کیا مطلب ہے اس کے علاوہ جب سینے میں دل ہی نہ ہو تو پھر منہ میں بان کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ زبان کو بھی ان کی نذر کردینا چاہئے۔ کیونکہ دل کے بغیر زبان یکار ہے۔ جب دل نہ رہے گا۔ تو زبان کس کی ترجمانی کرے گی۔ بیخودؔ لکھتے ہیں کہ زبان ہی کو کاٹ کر پھینک دینا چاہئے یا کیل دینا مناسب ہے (آسیؔ اور سعیدؔ میرے ہم خیال ہیں)

۲۔ خو:- عادت ÷ وضع:- خودداری یا ضبط کی عادت ÷ سبک سر:- حقیر، ہلکے ÷ سرگراں:- ناراض ÷

انہیں ناراض ہونے کی عادت ہے اور ہم ضبط خوگر ہیں۔ نہ ہم اپنی وضعداری کے خلاف جاسکتے ہیں اور نہ وہ اپنی عادت کو چھوڑ سکتے ہیں۔ پھر ہم اُن سے یہ بات پوچھ کر حقیر کیوں بنیں کہ تم ہم سے خفا کیوں ہو۔

بقول طباطبائی اس شعر نے وہ بندش پائی ہے کہ نثر میں بھی ایسے برجستہ فقرے نہیں ہوسکتے۔

۳۔ میرے غمخوار نے مجھے بدنام کردیا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ مرے رنج وغم کو برداشت نہ کرسکا۔ وہ ہر ایک سے کہتا پھرا کہ دیکھنا میرا دوست فلاں پر عاشق ہوگیا ہے۔ دن رات مچھلی کی طرح تڑپتا ہے۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی، چونکہ عشق کرنا بُرا خیال کیا جاتا ہے۔ اور موجب رسوائی عاشق ومعشوق ہوتا ہے۔ اس لئے میں زمانہ بھر میں بدنام ہوگیا۔ کہتے ہیں۔ ایسی محبت کو آگ لگے اور میں ایسے غمخوار سے باز آیا جو غم کی تاب بھی نہیں لاسکتا۔ پھر وہ میرا رازدان کیوں بنتا ہے۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ انشاء پردازی داد طلب ہے۔

۴۔ کیسی وفا اور کہاں کا عشق، جب سر ہی پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ

آستاں ہونا کیا ضرور ہے۔ جہاں جی چاہے گا۔ سر پھوڑلیں گے غالبؔ ۔

جب میکدہ چُھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید

مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

بقول طباطبائی یہ شعر رنگ وسنگ میں گوہر شاہوار ہے۔ آسیؔ لکھتے ہیں کہ اس شعر کی بندش میں وہ چُستی ہے جس کی تعریف غیر ممکن ہو۔

۵۔ طباطبائی لکھتے ہیں کہ اس قدر معنی ان دو مصرعوں میں سما گئے ہیں کہ ان کی تفصیل یہاں لطف سے خالی نہیں (۱) ''ایک طائر چمن نشیمن سے جدا ہوکر اسیر ہوگیا''۔ اس مضمون پر صرف ایک لفظ قفس اشارہ کررہا ہے (۲) اس نے اپنی آنکھوں سے باغ میں بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے اور قفس میں متردد ہے کہ نہ جانے میرا آشیانہ بچایا جل گیا۔ اس تمام معانی پر فقط کل کا لفظ دلالت کررہا ہے (۳) ایک اور طائر جو اس کا ہم صفیر اور ہمدم ہے وہ سامنے کسی درخت پر آبیٹھا ہے اور اسیر قفس نے اس سے روداد چمن کو دریافت کرنا چاہا ہے مگر اس سبب سے کہ اسی کا نشیمن جل گیا ہے۔ طائر ہم صفیر مفصل حال کہتے ہوئے پس وپیش کرتا ہے کہ اس اسیری میں نشیمن کے جلنے کی خبر کیا سناؤں۔ اس تمام مضمون پر فقط یہ جملہ دلالت کرتا ہے کہ مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم! (۴) علاوہ اس کثرتِ معانی کے اس مضمون نے جو دوسرے مصرعے میں ہے تمام واقعہ کو کیسا دردناک کردیا ہے یعنی جس گرفتارِ قفس پر ایک ایسی تازہ آفت وبلائے آسمانی نازل ہوئی ہے کہ اس نے کیسا اپنے دل کو سمجھا کر مطمئن کرلیا ہے کہ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں۔ کیا میرے ہی نشیمن پر بجلی گری ہوگی۔ یہ حالت ایسی ہے کہ دیکھنے والوں کا اور سننے والوں کا دل کڑھتا ہے اور ترس آتا ہے اور یہ ترس آجانا وہی اثر ہے جو شعر نے پیدا کیا ہے۔

غرض یہ کہ یہ شعر ایک مثال ہے ان جلیل الشان مسئلوں کی جو کہ آداب کاتب وشاعر میں ہم اصول ہیں۔ ایک مسئلہ تو یہ کہ ''خیر الکلام ماقلّ ودلّ'' اور دوسرا مسئلہ یہ کہ ''الشعر کلام ینقبض بہ النفس وینبسط'' اور یہاں انقباض خاطر کا اثر پیدا ہوا ہے۔

۶۔ تم مجھ سے یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ ہم تیرے دل میں نہیں۔ اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جب میرے دل میں تم ہی تم ہو تو پھر تم میری نظروں سے کیوں پوشیدہ ہو۔ پہلے مصرعہ میں استفہام انکاری

ہے۔ سعید لکھتے ہیں کہ اس میں معشوق حقیقی کو مخاطب کیا ہے۔ آسی نے اس کے علاوہ دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ ''بیشک تم کہہ سکتے ہو کہ ہم دل میں نہیں ہیں لیکن اس حالت میں کہ جب تم یہ کہو کہ ہم دل میں ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ آنکھوں سے نہاں کیوں ہو۔

۷۔ جذبِ دل:۔کششِ دل۔

تمہارا یہ شکوہ غلط ہے کہ میری کششِ دل تم کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ذرا غور کرو اور دیکھو کہ اس میں قصور کس کا ہے' میرا ہے یا تمہارا؟ اگر تم اپنے آپ کو نہ کھینچو تو پھر یہ کشاکش کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ میرا جذبِ دل تمہیں اپنی طرف کھینچتا ہے اور تم مجھ سے کھینچتے (گریز کرتے) ہو اس لئے کشاکش کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ اگر تم اپنے آپ کو نہ کھینچو۔ تو پھر کشاکش نہ ہو۔

۸۔ یہ فتنہ:۔تمہاری دوستی۔

تمہارا کسی پر مہربان ہونا اور اس کا دوست بننا اس کی خانہ ویرانی کے لئے بہت کافی ہے۔ پھر آسمان اس کا دشمن کیوں بنے اور مفت میں اپنا نام دشمنوں میں لکھوائے۔

۹۔ جب تم ہمیشہ کے لئے دشمن کے ہوچکے تو میرا امتحانِ محبت کیوں لیتے ہو۔ اگر اس کا نام آزمانا ہے تو ستانا کس کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آزمائش تو اس صورت میں درست تھی جب کہ تم نے دشمن کے حق میں فیصلہ نہ کیا ہوتا۔ اب یہ آزمانا نہیں ہے بلکہ ستانا ہے۔ آسی نے داغ کا شعر نقل کیا ہے۔ خوب ہے۔

ہوچکا قطعِ تعلق تو جفائیں کیوں ہوں   جن کو مطلب نہیں رہتا تو ستاتے بھی نہیں

۱۰۔ طباطبائی وحسرت:۔ اس شعر کی بندش نہایت دل پذیر ہے۔ ہم نے معشوق سے کہا۔ دیکھو غیر سے ملنے میں رسوائی ہے۔ باز آجاؤ پچھتاؤ گے۔ اس بات کا اُس نے تلخی سے یہ جواب دیا کہ غیر سے ملنے سے رسوائی کیوں ہونے لگی؟ ہم نے جواب دیا ہاں بندہ پرور آپ بجا فرماتے ہیں۔ سچ فرماتے ہیں۔ ذرا پھر دوبارہ کہنا کہ ہاں رسوائی کیوں ہونے لگی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر غیر سے ملنے میں بدنامی و رسوائی نہیں ہے تو پھر اور کس کام میں رسوائی ہے اے غالب تم اس سے طعنے دے کر اپنا کام نکالنا چاہتے ہو۔ بھلا کہیں ایسا ممکن ہے کہ وہ تمہارے دام میں آجائے اور تمہارے بے مہر کہنے سے وہ تم پر مہربان ہوجائے۔

بیخود نے طعن کی نہایت خوب تشریح کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ محبوب ہمیشہ کہنے کے خلاف کیا کرتا ہے اور یہ بات سمجھ کر اسے نامہربان کہا ہے کہ وہ اپنی عادت کے ماتحت مہربان ہوجائے۔

۱۲۷

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو   ۱   ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے درو دیوار سا اک گھر بنایا چاہئے   ۲   کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار   ۳   اور اگر مرجایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

۱۔''اب'' کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ جو لوگ ہمدم و ہم سخن اور ہمسایہ و ہم وطن ہیں اُن سے کوئی رنج ضرور پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر ان سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی ایسی جگہ جا کر رہے جہاں ان لوگوں میں سے کوئی نہ ہوتا کہ پھر رنج پہنچنے کا کوئی امکان ہی نہ رہے اقبال۔

دُنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب   کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بُجھ گیا ہو

۲۔ اب ہمیں بے درودیوار سا گھر بنانا چاہئے۔ جب در نہیں ہوگا۔ تو پاسبان بھی نہ ہوگا اور دیوار نہ ہوگی تو کوئی ہمسایہ بھی نہ ہوگا۔ مطلب وہی ہے کہ ہمسایوں اور پاسبانوں سے بھی نفرت ہوگئی ہے۔

۳۔ چونکہ یہ لوگ منافق ہیں اور ان کے ہاتھوں شاعر کو دُکھ پہنچا ہے اس لئے وہ ایسے لوگوں کی تیمارداری اور نوحہ خوانی بھی پسند نہیں کرتا۔ کس اطمینانِ قلب کے ساتھ کہتا ہے کہ وہاں کس قدر آرام وسکون ہوگا۔ اگر ہم بیمار پڑجائیں گے تو کوئی تیماردار نہ ہوگا اور اگر مرجائیں گے۔ تو کوئی نوحہ خواں نہ ہوگا۔ گویا وہ لوگ جن سے نفرت ہے اور جن کی شکل دیکھنی بھی گوارا نہیں' وہ کسی صورت میں بھی سامنے نہ آئیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہ

۱۲۸

ازمہرتابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ   طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

سورج سے لے کر ذرہ تک ہر چیز دل ہی دل ہے اور دل بصورت آئینہ ہے گویا طوطی کو ہر

سمت آئینے ہی آئینے مقابل نظر آتے ہیں۔ وہ آئینہ خانہ میں ہے اور ہر طرف سے اسے اپنی شکل نظر آتی ہے (آئینہ اور طوطی کا مضمون مشہور ہے) کہ تمام کائنات وجودِ واحد کا پرتو ہے (حسرت۔آسی)

طباطبائی نے اس کی یہ تاویل نکالی ہے کہ عالم میں رُخ و رُخ اور دل و دل باہم دگر آئینہ ہیں یعنی اس کو اس میں اپنی صورت دکھائی دیتی ہے اور اس کو اس میں غرض یہ ہے کہ سارا عالم متحد بوجود واحد ہے اور ایک دوسرے سے غیریت نہیں۔ یہ اس میں اپنے تئیں اس طرح دیکھتا ہے جیسے آئینہ میں کوئی دیکھے۔ جب یہ حالت ہے تو طوطی جس طرف رُخ کرے' آئینہ سامنے موجود ہے اور طوطی محض استعارہ ہے۔ مراد اس سے وہ شخص ہے جس سے یہ اتحاد دکھائی دے اور وجدوحال میں ترانۂ اناالحق بلند کرے۔

بیخود اور سعید دونوں میرے ہم خیال ہیں۔ فقط انہوں نے طوطی سے مراد عارف لیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہستی مطلق کے سوا اور کوئی ہستی نہیں۔

۱۲۹

ہے سبزہ زار ہر درودیوارِ غمکدہ ۱ جس کی بہار یہ ہو' پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
ناچار بے کسی کی بھی حسرت اُٹھایئے ۲ دشواریِ رہ وستم ہم زباں نہ پوچھ

۱۔ جب کوئی مکان مدتوں غیرآباد اور منہدم پڑا رہتا ہے تو بارشوں سے اس میں سبزہ اُگ آتا ہے۔ کہتے ہیں میرے غمکدہ میں میری گریہ وزاری کی برسات سے ہر طرف سبزہ اُگ آیا ہے۔ گویا میرا غم کدہ سبزہ زار بن گیا ہے اور اس میں بہار آئی ہے۔ گھر میں سبزہ اُگنا ویرانی کی نشانی ہے۔ جس گھر کی بہار یہ ہے کہ وہ بالکل ہی ویران ہوگیا ہے بلکہ خزاں سے بھی بدتر ہے۔ اس کی خزاں کی بابت نہ پوچھو کہ کس قیامت کی ہوگی۔

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

۲۔ ہمرہاں:- ہمراہی۔

سعید:- ایک تو راستہ ہی دشوار تھا۔ اُس پر طرّہ یہ کہ ہم کو جو ساتھی ملے وہ بھی ظالم نکلے۔ قطع نظر اس کے ہم اپنے آپ کو بیکس بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ ظالم ہی تھے لیکن ہمارے

ساتھ تو موجود تھے۔ پس مجبوراً بیکسی کی حسرت دل ہی میں رہی (حسرت)

آسی:- مجبوراً ہم کو اب بیکسی کی بھی حسرت اُٹھانی پڑتی ہے یعنی ایسی چیز کی حسرت کرتے ہیں جس کی کوئی حسرت نہیں کرتا۔ مگر بیکسی کو ہم ایسے ہمراہیوں کے ہونے سے اچھا جانتے ہیں' جو ظالم ہیں اور جن کی وجہ سے راستہ طے ہونا دشوار ہوگیا ہے۔

بیخود:- راہ کی دشواریاں اور ہمراہیوں کے ستم کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ وہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ مجبور ہوکر میں نے یہ ارادہ کرلیا ہے کہ اب بیکسی اور تنہائی کی حسرت اُٹھانی چاہئے اور ایسے دشوارگزار راستے میں اس قدر ظالموں کا ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔

طباطبائی نے دوسرے مصرعہ کو 'دشواریٔ راہ وستمِ ہمرہاں نہ پوچھ' سمجھ کر شرح لکھی ہے یعنی ہمراہیوں کے ہاتھ سے جو ستم مجھ پر ہوتا ہے۔ اس مصیبت کا کاٹنا دشوار ہے۔ اس کی دشواری کچھ نہ پوچھو۔ حسرت ہوتی ہے کہ کاش ہم بیکس وتنہا ہوتے!

☆☆☆☆☆☆☆

ی

۱۳۰

صد جلوہ رُوبرو ہے جو مژگاں اُٹھایئے ۱ طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھایئے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق ۲ یعنی ہنوز منتِ طفلاں اُٹھایئے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم ۳ اے خانماں خراب! نہ احساں اُٹھایئے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے ۴ یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اُٹھایئے

۱۔ صد جلوہ:- سینکڑوں جلوے÷ مژگاں اُٹھایئے:- نظر اُٹھا کر دیکھئے۔

اگر ہم آنکھ اُٹھا کر دیکھیں تو محبوبِ حقیقی کے سینکڑوں جلوے نظر آتے ہیں مگر ہم میں اتنی تاب و طاقت نہیں کہ نظارہ کا احسان اُٹھائیں اور اس کے جلووں سے لطف اندوز ہوں۔ کمال استغنا ہے کہ آنکھوں کا احسان بھی نہیں اُٹھانا چاہتے۔

۲۔ برات:- وہ کاغذ یا فرمان جس کی رُو سے خزانہ سے روپیہ وصول کیا جاتا ہے یعنی چک۔

معاشِ جنوں کا فرمان پتھروں پر لکھا گیا ہے اور نشانہ سنگِ طفلاں ہونا لوازماتِ جنونِ میں سے ہے، اس لیے ہمیں جنون و دیوانگی میں بھی پتھر مارنے والے لڑکوں کا احسان اٹھانا پڑے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جنون میں کسی کا احسان اٹھانے کی ضرورت باقی نہ رہنی چاہیے تھی۔ لیکن معلوم ہوا کہ جنونِ عشق میں دیوانہ ہوکر بھی احسان اُٹھانا پڑتا ہے کیونکہ جنوں کی معاش سنگ طفلاں مقرر ہوتی ہے۔

۳۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دُنیا میں کسی کا احسان نہیں اُٹھانا چاہئے کیونکہ احسان ایسا بوجھ ہے جسے بے جان دیوار بھی برداشت نہیں کرسکتی اور انسان کا درجہ اس سے بہت بلند ہے۔ دیوار کے جُھک جانے کو مزدور کے احسان کا نتیجہ قرار دے کر خانماں خراب شخص کو عبرت دلاتے ہیں کہ وہ مکان کی تعمیر سے باز آئے۔

۴۔ میرے دل میں رشک رقیب سے گھاؤ پڑ گئے ہیں اور محبوب یہ کہہ کر مجھے رسوا کرتا پھرتا ہے کہ یہ رشک سے مراجاتا ہے کہتے ہیں تو آپ میرے زخمِ رشک کو اس طرح رسوا نہ کریں یا یہ جو آپ رقیب کے ساتھ چھپ چھپ کر ہنستے ہیں۔ اس پردے کو اُٹھادیں یعنی اس طرح سے ہنسنا چھوڑ دیں کیونکہ آپ کے تبسّم ہائے پنہاں کی موجودگی میں میرا رشک کرنا بجا و درست ہے۔

آسی لکھتے ہیں کہ زخمِ رشک کو رسوا کرنا محض پردہ اور تبسّم پنہاں کی رعایت سے کہا ہے۔ یہ شعر بیت الغزل ہے اور اس کی بندش بے انتہا چست۔

۱۳۱

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے ۱ بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر ۲ آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہئے
دے داد اے فلک! دلِ حسرت پرست کی ۳ ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہئے!
سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوّری ۴ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے
مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو ۵ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا ۶ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے
سرپائے خم پہ چاہئے ہنگامِ بے خودی ۷ رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہئے

یعنی بحسب گردشِ پیمانۂ صفات ۸ عارف ہمیشہ مستِ مے ذات چاہئے
نشوونما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہئے

۱۔ خرابات:- شراب خانہ۔ آنکھ کو بوجہ مستی شراب خانہ اور محراب ابرو کو محراب مسجد سے مشابہت ہے۔ اسی مشابہت کو مسجد و شراب خانے کے قریب قریب ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ قبلۂ حاجات سے واعظ کی طرف اشارہ ہے۔

اے قبلہ حاجات یعنی حضرتِ واعظ دیکھ لیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے آنکھ کے پاس ابرو کو بنایا اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسجد کے زیر سایہ شراب خانہ ضرور ہونا چاہئے۔ آسیؔ اور حسرتؔ کا خیال ہے بھوں کا لفظ یہاں بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ مکافات:- بدلہ، تلافی۔

خداوند تعالےٰ عادل ہے، وہ ظالم کو ظلم کی سزا ضرور دیتا ہے، آپ نے اپنے عاشق پر ظلم کیے۔ آخر خداوند تعالےٰ نے اس کی تلافی اس طرح سے کی کہ آپ کسی پر عاشق ہوگئے اب آپ کو اُس کے ظلم ہماری طرح برداشت کرنے پڑیں گے۔ گویا آپ کو ان ظلموں کا بدلہ ملے گا جو آپ نے ہم پر کئے ہیں بس یہی آپ کے ستم کی مکافات ہے۔

۳۔ مافات:- جو گزر چکا۔

اے فلک! تُو نے میری حسرتوں کا خون کردیا۔ اب کوئی آرزو تو پوری کردے کہ جس سے میری خوں شدہ حسرتوں کی کچھ نہ کچھ تلافی ہوجائے۔

لفظ ہاں سے شعر میں جان پڑگئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فلک کو آمادہ کر رہے ہیں۔ دُوسرا لطیف پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی حسرت پوری نہ کی جائے تو خیر کچھ مضائقہ نہیں، اب میرے دل حسرت پرست کی محفل داد ہی دیدے، تاکہ کچھ تلافی مافات ہوجائے۔

۴۔ ملاقات کرنے کے لئے ہمیشہ کسی تقریب کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور حسینوں کو فن مصوّری سے خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے مصوّری سیکھ لی ہے تاکہ اس سلسلے میں ہماری ان سے ملاقات ہوسکے۔ گویا وہ اپنی تصویر بنوانے کے لئے ہمیں بُلالیا کریں گے۔

طباطبائی اور بیخود کا خیال ہے کہ مصوری سے شاعری مُراد ہے غالب۔

خوار ہمی بہ نقش طرازی علم کنم   تابا تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

۵۔شراب نوشی سے میرا مقصد عیش ونشاط ہرگز نہیں۔ میں تو شراب محض بیخود اور خود فراموش ہونے کے لئے پیتا ہوں تا کہ رنج و تعب میرے دل و دماغ پر محیط نہ ہونے پائیں اور میں شب و روز اپنے آپ کو بھولا رہوں۔

۶۔ اثبات:- ثابت کرنا۔

لالۂ نسرین (سیوتی) گل وغیرہ کے رنگ علاحدہ علاحدہ ہوتے ہیں لیکن اہل نظر کے نزدیک رنگ وصورت کا اختلاف کوئی معنی نہیں رکھتا انہیں ہر رنگ میں بہار کا ثبوت ملتا ہے بقول سعید گو کائنات کی مختلف شکلیں ہیں لیکن جلوۂ حقیقی ہر ایک میں موجود ہے۔

۷۔ بیخودی کے عالم میں سرپائے خم پر اور دعا کے وقت منہ قبلہ کی طرف ہونا چاہئے (تمام متفق)

سعید لکھتے ہیں صوفیا کے نزدیک کہ یعنی مظہر کی الفت کیونکہ کفر دین کی ضد ہے اور اضداد کا مخرج وہی واجب الوجود ہے پس اگر بیخودی اور استغراق کے وقت سرپائے خم پر رکھا ہوا اور دعا کے وقت مُنہ قبلہ کی طرف کرلیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

۸۔ یعنی پیمانۂ صفات (الٰہی) کی گردش کے مطابق عارف کو ہمیشہ بے ذات سے مست و بیخود رہنا چاہیئے کیونکہ صفات بھی لوازم ذات ہیں۔

۹۔ فروع:-فرع، شاخ، ٹہنی ÷ اصل:- جڑ۔

خاموشی کو اصل (جڑ) اور باتوں کو فروع (شاخیں) قرار دیا ہے کہتے ہیں۔ اے غالب! جس طرح جڑ سے شاخوں کی نشوونما ہوتی ہے۔اسی طرح جو نکلتی ہے وہ خاموشی ہی سے بات نکلتی ہے۔ انسان کا قاعدہ ہے کہ وہ بات کرنے سے پہلے خاموش ہوجاتا ہے۔کچھ سوچتا ہے اور پھر زبان سے کہتا ہے۔ گویا ہر بات کی اصل خاموشی ہے۔

بقول حسرت دوسرا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ جو بات چاہئے وہ خاموشی ہی سے نکلتی ہے۔ یہاں ''بات نکلتی ہے'' بمعنی محاورۂ مشہور لیا جائے گا۔ مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں کی دیوانگی میں بھی ایک بات

نکلتی ہے۔

۱۳۲

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی ۱ سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے ۲ تکلف بر طرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے ۳ مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم ۴ کہ ہوگا باعثِ افزائش دردِ دروں وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ! ۵ مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
مےِ عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجئے ۶ لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی!
مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں ۷ خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

۱۔ میری عاجزی کی بساط میں محض ایک دل تھا اور وہ بھی ایک قطرۂ خون سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا۔ اب اسکی یہ حالت ہے کہ رنج وغم سے ہر وقت وہ سرنگوں رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی ٹپک جائے گا۔

سعید:- اپنے دل کو خون کے ایک ٹپکتے ہوئے قطرے سے تشبیہ دے کر اس کی لاچاری اور عاجزی کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔ بقول آسی غالب نے ترقی در ترقی کا منظر دکھایا ہے۔ بساطِ عجز اس میں ایک دل، دل بھی ایک خطرۂ خون، قطرۂ خوں بھی آمادۂ چکیدن، آمادۂ چکیدن بھی بحالت سرنگوں یہ تمام کیفیتیں لطف سے خالی نہیں۔

۲۔ ہم اُس شوخ سے چند دن تکلف اور تصنع سے آزردہ اور ناراض رہے، تکلف بر طرف وہ بھی ہمارا ایک اندازِ جنوں تھا۔ ورنہ حقیقتاً ہم اس سے خفا نہ تھے۔ طباطبائی اور بیخود لکھتے ہیں کہ دوسرے معنی میں تکلف کے معنی شرم ولحاظ کے ہیں۔

آسی کا دوسرا مفہوم۔ تکلف سے ہم اس سے آزردہ تھے۔ تکلف کو اُٹھادیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک اندازِ جنوں تھا۔ وگرنہ معشوق سے آزردہ ہونا اپنے آپ سے آزردہ ہونا ہے۔

سعید کی مزید تشریح ملاحظہ ہو:- بناوٹ سے آزردگی اس لئے تھی کہ وہ مہربانی سے پیش آئے لیکن اب صاف کہنا پڑتا ہے کہ وہ بھی ایک اندازِ جنوں تھا، ورنہ معشوق کہیں ایسی باتوں سے

پگھلا کرتے ہیں۔

۳۔ صیدِ زبوں:- مریل شکار۔

تمنا کو دام اور خیالِ مرگ کو صیدِ زبوں قرار دیا ہے۔ صرف موت کا خیال میرے دل کو آزردہ کر گیا۔ تسکین دے سکتا ہے کیونکہ میرے تمنا کے جال میں خیال مرگ جیسے سینکڑوں شکار پھنسے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ تسکین تو اس وقت ہوتی' جب تمنائے مرگ سب سے زیادہ زبردست تمنا ہوتی اور وہ دامِ تمنا میں گرفتار ہوتی۔ مشکل یہ آپڑی ہے کہ وہ ایک صیدِ زبون ہے اس لئے اس کے پھنس جانے سے کوئی خاص تسلی نہیں۔ قاعدہ ہے کہ موٹے شکار کو پھنسا کر دل خوش ہوا کرتا ہے۔ پھر صیدِ زبوں کے شکار سے کیا خوشی اور تسلی ہوسکتی ہے۔

۴۔ اے ہمدم میرا خیال تھا کہ نالہ کرنے سے دل کی بھڑاس نکل جائیگی' اگر مجھے اس بات کا پہلے سے اندازہ ہوتا کہ اس سے دردِ دل بڑھ جائیگا تو میں ہرگز نالہ نہ کرتا۔

۵۔ بُرش:- کاٹ' تیزی۔ بُرش کو بر بنائے جو ہر موج سے تشبیہ دی ہے۔

آپ اپنی تیغِ جفا کی بُرش پر اتنا ناز نہ کریں۔ میرے نزدیک آپ کی تیغِ جفا کی بُرش معمولی چیز ہے کیونکہ میرے دریائے بیتابی میں یہ بُرش ایک موجِ خون سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ وہاں ایسی سینکڑوں موجیں تلملا رہی ہیں۔

۶۔ ایک دو چار:- ۱+۲+۴=۷ آسمان سات ہیں÷ جام واژگوں:- اوندھے جام یعنی خالی جام۔

ہم ساقی گردوں سے شراب کی آرزو کیا خاک کریں' وہ تو خود ہی ایک دو چار (سات) اُلٹے (خالی) پیالے لئے بیٹھا ہے۔ بھلا اس کے پاس شرابِ عیش کہاں۔

۷۔ میرے دل میں وصل کا شوق اور ہجر کا شکوہ بھرا ہوا ہے۔ خدا وہ دن کرے کہ میں ان کے سامنے وصل کے شوق کا اظہار کروں اور ہجر کا شکوہ سناؤں۔ اس شعر میں تخلّص ذومعنی استعمال ہوا ہے جس سے شعر کا لطف دوچند ہوگیا ہے۔

۱۴۳

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے ۱ تنگ آئے ہیں ہم اے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدح وجہ پریشانی صہبا ۲ یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد ۳ زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے
بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر' ۴ ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

۱۔ خوشامد طلب معشوقوں سے ہم ایسے تنگ آئے ہیں کہ سخن لبوں سے آزردہ ہوگیا ہے۔ گویا ان کی محفل میں اب بات چیت کرنے کو بھی ہمارا جی نہیں چاہتا ہے کہ میں اس کی خوشامد کروں تو وہ لب تک آئے۔ گویا رعبِ حُسن سے معشوق کے سامنے بات بھی منہ سے نہیں نکلتی۔

۲۔ صہبا:- شراب÷ دورِ قدح:- باری باری یا ٹھہر کر شراب پینا÷ خُم:- مٹکا شراب کا۔

ٹھہر ٹھہر کر تھوڑی تھوڑی شراب پینا شراب کی پریشانی کا باعث ہے کیونکہ اس طرح سے شراب تقسیم ہوجاتی ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ ایک ہی بار شراب کا خم میرے منہ سے لگا دو تاکہ شراب بھی پریشان نہ ہو اور میرا دل بھی سیر ہوجائیگا۔ اس ترکیب سے فائدہ یہ متصوّر ہے کہ جس طرح خم میں ایک جگہ تھی۔ اسی طرح میرے دماغ میں بھی یکجا محفوظ رہے گی۔ ڈگڈگا کر پینے کا پُر لطف سبب نکالا ہے۔

۳۔ طرف نہ ہونا:- منہ نہ لگانا۔

اے زاہد! رندانِ درمیکدہ نہایت گستاخ اور منہ پھٹ واقع ہوئے ہیں۔ دیکھنا ان بے ادبوں سے کہیں کچھ کہہ نہ بیٹھنا' یہ آپ کے وعظ و نصیحت کی تاب ہرگز نہ لائیں گے۔

۴۔ جاتی رہی:- جان جاتی رہی' جدا ہوگئی÷ ربط:- تعلق' دوستانہ۔

میری جان ہمیشہ لبوں پر رہا کرتی تھی' اس لئے اس کو لبوں سے بہت محبّت تھی۔ لیکن بیدادِ وفا نے اسے لبوں سے جدا کر دیا اور دو دوستوں کو جُدا کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔

۱۴۴

تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا ۱ سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ ترا احوال سُنادینگے ہم اُن کو ۲ وہ سُن کے بُلالیں یہ اجارہ نہیں کرتے

۱۔ معشوق کی شوخی اور سفّاکی بیان کی ہے کہتے ہیں۔ محض اس لئے کہ شکایت کرنے کا موقعہ نہ ملے کہ آپ کو ہمارے ذکر سے نفرت ہے۔ وہ ہمارا ذکر سُن تو لیتے ہیں لیکن اسے سُن کر وہ

پنی زبان سے کچھ نہیں کہتے افسوس وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ ہم پر اور بھی زیادہ ظلم ہے۔ کیونکہ اُن کی اس روش سے شکایت دُور نہیں ہوتی۔

۲۔ اجارہ:- ٹھیکہ۔ ذمہ۔

یہ شعر نہایت بلیغ اور دقیق ہے۔ کہتے ہیں۔ غالبؔ ہم تیرا احوال ان کو کسی نہ کسی طرح سُنا تو ضرور دینگے لیکن اس بات کا ذمہ نہیں لیتے کہ وہ اسے سُن کر تجھے اپنے پاس بُلالیں۔ پہلے مصرعہ سے عاشق کی زار حالی اور بیتابی کا پتہ چلتا ہے اور دوسرے سے معشوق کے غرورِ حسن اور غرّہ و ناز کا۔

۱۳۵

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

میرے گھر میں رکھا ہی کیا تھا کہ غمِ عشق اس کو غارت و برباد کرتا۔ ہاں ایک حسرتِ تعمیر تھی، سو وہ ابھی تک غمِ عشق کی دست بُرد سے محفوظ ہے۔ کاش کہ وُہ اُسے بھی غارت کردیتا۔ غالبؔ ؎

ہُوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں!

۱۳۶

غم دُنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی ۱ فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی!
کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب ۲ قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے ۳ ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی
اُنہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا ۴ اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی!
ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا ۵ ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی!
لکدکوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی ۶ مری طاقت کہ ضامن تھی بُتوں کے ناز اُٹھانے کی
کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ ۷ بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

۱۔ حالیؔ:- یعنی جب غمِ دُنیا سے سر اُٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اُٹھاتے ہی آسمان پر نظر جاپڑتی ہے اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اسکے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے۔ اب دوسرا غم شروع ہوجاتا

ہے۔ غرض یہ کہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں"۔

مطلب یہ ہے کہ اول تو دُنیا کی وجہ سے بالکل فرصت نہیں ملتی۔ اگر فرصت ملتی ہے تو پھر غمِ عشق دامنگیر ہوجاتی ہے۔

۲۔ کسی بات کی قسم کھانا یعنی کسی کام کے نہ کرنے کا عہد کر لینا کہتے ہیں۔ پہلے وہ میرے خط کو جلادیا کرتا تھا۔ اور خط کے جلنے سے اس پر میرے سوزِ غم کا حال واضح ہوجاتا تھا لیکن اب اس کافر نے عہد کرلیا ہے کہ وہ میرا خط ہرگز نہ جلائیگا۔ اے خدا اب میرے سوزِ غم کا حال اسے کیونکر معلوم ہوگا (بیخودؔ۔ طباطبائیؔ وحسرتؔ)

سعیدؔ اور آسیؔ لکھتے ہیں:- "اے خدا میرا نامۂ شوق اس پر کیونکر ظاہر ہوگا۔ کیونکہ اس کافر نے قسم کھائی ہے کہ اب ہر اُس کاغذ کو جو بطریقِ خط میرے پاس آئے گا یا ہر کاغذ کو میں جلادونگا تو یقیناً اب وہ میرے مکتوب سے باخبر نہیں ہوسکتا"۔ یہ مضمون محاورہ کے خلاف ہے۔

۳۔ پرنیاں:- حریرہ ریشم، ایک قسم کا ریشمی کپڑا۔

باریک ریشمی کپڑے کو بہت جلد آگ لگ جایا کرتی ہے مگر انسان اُس میں شعلۂ آتش کو لپیٹ سکتا ہے، لیکن دل میں سوزِ غم نہیں چھپا سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ دل پرنیاں سے زیادہ نازک ہے اور وہ سوزِ غم کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ شعلۂ آتش اور سوزِ غم کا فرق ظاہر ہے۔

۴۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے زخمیوں کو جا کر دیکھ آئیں۔ ذرا ان کے بہانے کی شوخی ملاحظہ ہو کہ اُنہوں نے سیرِ گل کا بہانہ کیا۔ گویا وہ زخمیوں کے دیکھنے کو سیرِ باغ خیال کرتے ہیں۔ شاعر نے اسی کو بہانے کی شوخی قرار دیا ہے۔

۵۔ یہ ہماری سادگی تھی کہ ہم تیرے التفاتِ ناز پر مرمٹے۔ گویا یہ سمجھے کہ یہ تو نے خاص التفات فرمایا ہے کہ یہاں تک آیا ہے۔ اے ظالم تو بیشک آیا لیکن تُو نے آتے ہی کہنا شروع کیا ہم جاتے ہیں۔ یہ تیرا آنا نہ ہوا۔ بلکہ تیرے جانے کا پیش خیمہ ٹھہرا۔ اس لئے ہم تیرے التفاتِ ناز پر مرنے کو اپنی سادگی قرار دیتے ہیں۔ التفات کو التفاتِ ناز سمجھتے ہیں۔ ناز کا پہلو یہ ہے کہ ابھی آئے اور ابھی چلے۔

۶۔ لکدکوب:- لات مارنا۔ لتیاؤ۔

پہلے مجھ میں اتنی طاقت تھی کہ میں بُتوں کے ناز بخوبی اُٹھالیا کرتا تھا لیکن اب یہ حال ہے کہ میں حادثات کی لکدکوبی بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ شاعر کے خیال میں بُتوں کے ناز حوادثاتِ ایّام سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔

آسی نے دوسرا مفہوم یہ نکالا ہے کہ میری طاقت ضامن اس بات کی تھی کہ بُتوں کے ناز اُٹھائے۔ آخر یہ اس کے ساتھ لکدکوب حوادثات کا طوفان کیسا آیا۔ میری طاقت اس کا تحمّل کرنے کو تیار نہیں۔

٧۔ اوضاع:۔ جمع وضع کی ÷ ابنا:۔ جمع ابن کی ابنائے جہاں یعنی اہلِ جہان بطور طنز کہتے ہیں کہ میں اہلِ دُنیا کی خوبی وضع کیا بیان کروں بس یہ سمجھ لو کہ جس سے ہم نے بار ہا نیکی کی۔ اس نے ہمارے ساتھ ہمیشہ بدی کی ہمیں نیکی کا صلہ بدی ملا۔

١٣٧

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی ١ دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے ٢ میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

١۔ حاصل:۔ پیداوار۔ محصول ÷ ہاتھ دھو بیٹھ:۔ ناامید ہوجا ÷ آرزو خرامی:۔ طباطبائی نے اس کے معنی خرامِ حسبِ آرزو قرار دیے ہیں۔ اور آسی آرزو کا چکّر لگانا اور گشت کرنا مراد لیتے ہیں ÷ ڈوبی ہوئی آسامی:۔ وہ کاشتکار جس سے لگان وصول ہونے کی امید نہ ہو۔ دل کو ڈوبی ہوئی آسامی اس لئے کہا ہے کہ جوشِ گریہ سے کسی فائدے کی امید معلوم نہیں ہوتی۔

طباطبائی:۔ جوشِ گریہ سے کوئی ثمر حاصل نہ ہوگا کہ حسبِ آرزو اور موافق مراد خرام کرسکوں۔ دل کو ڈوبی ہوئی آسامی سمجھنا چاہیئے کہ اس کا ریاض بے ثمر رہا۔

بیخود:۔ اے آرزو تو گریہ پر بھروسہ کرکے اپنی مراد حاصل کرنی چاہتی ہے۔ اور گریہ کی بے اثری دل کو لے ڈوبی ہے۔ تیرے حسبِ مراد کوئی کام نکلنا معلوم نہیں ہوتا۔

آسی:۔ آرزو تو جو دل میں پھرتی ہے اور امید رکھتی ہے کہ جوشِ گریہ سے کوئی نفع حاصل ہوگا۔ یہ خیال خام ہے۔ اس سے ہاتھ دھو بیٹھ۔ یعنی نا اُمید ہوجا۔

٢۔ ہوں داغِ ناتمامی:۔ مجھ کو اپنے ناتمام رہنے کا افسوس (داغ) ہے۔

میں اس شمع کی مثل ہوں جسے جلتے جلتے کسی نے بجھا دیا ہو اور وہ پوری طرح نہ جلنے پائی ہو یعنی میں پوری طرح جلنے نہ پایا تھا کہ مجھ کو کسی نے بجھا دیا اس لئے مجھے اپنے ناتمام رہ جانے کا افسوس ہے' ایک اور جگہ لکھتے ہیں ۔

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اِک بار جل گئے
اے نا تمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف'

١٣٨

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے ١ جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے ٢ پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے
حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ ٣ غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے
کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا ٤ آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا ٥ بس چپ رہو' ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوار یار میں ٦ فرمانروائے کشور ہندوستان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا! ٧ کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے
ہے بارِ اعتماد وفاداری اس قدر ٨ غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

بیضۂ مور:۔ چیونٹی کا انڈا۔ بہت چھوٹی چیز۔

١۔ ہم ستم زدوں کا جہان اس قدر تنگ ہے کہ اس کا آسمان ایک چیونٹی کا انڈا ہے۔ آسمان چونکہ روئے زمین پر محیط ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جائے کہ ستم زدوں کا جہان کتنا چھوٹا ہے۔

سعید:۔ ہم اس قدر مظلوم وستم زدہ ہیں کہ چیونٹی کا انڈا بھی جس کی کوئی حقیقت نہیں' ہم پر ظلم کرنے کو آسمان بنا ہوا ہے۔ آسی کا گمان ہے۔ کہ جہان میں ہمارے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں۔ بیخود اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مظلوم آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرے لئے دُنیا سمٹ کر بہت ہی تنگ دائرہ میں آگئی ہے۔ نہ میرا کوئی معاون ہے نہ فریادرس۔

٢۔ ذرّہ ایک بے جان چیز ہے لیکن جب آفتاب کا پرتو اس پر پڑتا ہے تو اس میں جان پڑجاتی ہے۔ چنانچہ سُورج کی روشنی میں لاتعداد ذرّات ہمیں حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں'

بالکل اسی طرح تیرے ذوق کی بدولت کائنات میں جان پڑگئی ہے اور وہ بہ تقاضائے فطرت ذرّات کی مانند تیری طرف دوڑ رہی ہے گویا کاینات کی حیات تیرے پرتو سے ہے ؎

ہے تجلّی تری سامانِ وجود ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

۴۔ سیلی:۔تھپڑ ÷ خارا:۔پتھر یعنی ضربِ سنگ۔

میرا شیشہ پتھر کی ضرب سے لالہ رنگ (سُرخ) ہورہا ہے۔لیکن غافل یہ سمجھتا ہے کہ اس میں سُرخ شراب بھری ہوئی ہے۔ طباؔطبائی اعتراض کرتے ہیں کہ پتھر کی چوٹ سے شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لالہ رنگ نہیں ہوتا لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ مصنف نے شیشہ سے دل کا استعارہ لے کر اس کو لالہ رنگ کہا ہے۔

۴۔ جاگرم کرنا۔ جب کوئی شخص کسی مقام پر دیر تک بیٹھے تو جگہ گرم ہوجاتی ہے اسی لئے جاگرم کردن فارسی کا محاورہ ہے اور اس سے مراد مستقل طور پر کسی جگہ قیام کرنا ہے÷ اہلِ ہوس:۔ رقیب۔

اُس نے سینۂ اہلِ ہوس میں اپنی مستقل جگہ بنالی ہے۔ بھلا اس کو اہلِ ہوس کا سینہ کیوں نہ پسند آئے۔گرمیِ عشق اس میں بالکل نہیں۔ وہ ٹھنڈا مکان ہے اور ٹھنڈے مکان کو ہر شخص پسند کرتا ہے۔

۵۔ حالؔی:۔''ہمارے بھی منہ میں زبان ہے''۔ اس میں دو معنی رکھے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں، کہ اگر ہم بولنے پر آئے تو تم کو قائل کردینگے اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتاسکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں''۔

۶۔ کشور:۔سلطنت' ملک۔

وہ عاشق جو یار کی دیوار کے سائے میں بیٹھا ہے وہ گویا ہندوستان کی سلطنت کا فرمانروا ہے۔ شارحین نے سایۂ دیوار سے یہ لطیف مضمون پیدا کیا ہے کہ سایہ میں تیرگی ہوتی ہے اور ہندوستان کالا ملک کہلاتا ہے اس لئے سایۂ دیوار میں بیٹھنے والا فرمانروائے ہندوستان بن گیا۔ بعض لوگ کشور ہندوستان کی ترکیب پر معترض ہیں کہ اعلانِ نون جائز نہیں۔ غالبؔ کے دور تک یہ تصرف جائز تھا۔

۷۔ کثرتِ غم نے میرے جگر کی ہستی کو بالکل مٹادیا۔ اب اگر کسی سے میں کہوں کہ داغ اصل میں جگر کا نشان ہے تو کسی کو اعتبار نہیں آیگا۔ اور کوئی یہ یقین نہ کریگا کہ واقعی اس کے پہلو میں کبھی جگر بھی تھا اور یہ داغ اسی کا نشان ہے بقول طباؔطبائی یہ مضمون بالکل نیا ہے اور خاص غالبؔ کا نتیجۂ فکر ہے۔

۸۔ ہم اس کے نامہرباں ہونے سے بھی خوش ہیں کیوں کہ اس کی نامہربانی اور جفاکاری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُسے ہماری وفاداری پر اعتماد ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں ظلم بھی کرونگا تو ہماری محبت میں کمی واقع نہیں ہوگی۔

۱۳۹

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے ۱ کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ ۲ تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال ۳ دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تونے پیمانِ وفا باندھا تو کیا ۴ عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی ۵ یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہوگیا ۶ خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جاچھپنا نقابِ خاک میں ۷ ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی ۸ اُٹھ گئی دُنیا سے راہ ورسمِ یاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا ۹ دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تاربرشگال ۱۰ ہے نظر خوکردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال ۱۱ ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

یہ پوری غزل سوز وگداز میں ڈوبی ہوئی ہے اور اس کے اکثر شعر بکائیہ ہیں معلوم ہوتا ہے کسی محبوب کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے۔

۱۔ معشوق دم توڑ رہا ہے' اس کی حالت کو دیکھ کر عاشق درد سے بیقرار ہوجاتا ہے معشوق اس حالت میں عاشق کی بیقراری دیکھ کر بے چین ہوجاتا ہے عاشق کہتا ہے اے ظالم تیری غفلت شعاری کیا ہوئی۔ جب ہم تیرے دردِ محبت سے تڑپتے تھے اور تجھے پرواہ بھی نہ ہوتی تھی۔ اس وقت بھی اس غفلت شعاری کو کام میں لا اور میرے درد کی پروا نہ کر۔

۲۔ آشوب:- تکلیف۔ مصیبت۔

اگر تجھ کو غم کی سختیاں اُٹھانے کا حوصلہ نہ تھا تو پھر تُو نے میری غمگساری کیوں کی تھی۔ مناسب تھا کہ میرے حال سے بے خبر رہتا اور اس طرح میرے غم سے اثر پذیر نہ ہوتا۔

۳۔ اگر میری غمخواری کا تجھ کو خیال نہ آیا ہوتا تو آج ان حالوں کو نہ پہنچتا۔ افسوس صد افسوس مجھ سے اظہارِ ہمدردی کر کے تو نے اپنے ساتھ دشمنی کی (سعید۔آسی)

طباطبائی اور بیخود:- میرے ساتھ غمخواری کر کے تُو نے اپنے آپ کو رسوا کیا۔ پھر شرمِ رسوائی سے اپنی جان دے دی۔

۴۔ اگر چہ تُو نے مجھ سے عمر بھر وفادار رہنے کا عہد کیا مگر وہ کس کام کا۔ کیونکہ کمبخت عمر ہی پائدار نہیں۔ دیکھ لے آخر اس نے تجھے دغا دی اور دُنیا سے اُٹھالیا۔

۵۔ مجھے اب آب و ہوائے زندگی زہر معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس نے تجھ سے موافقت نہیں کی۔ جو تیرا موافق نہیں' تیری محبّت کی وجہ سے میں اس کا رفیق نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا میں اس سے بیزار ہوں۔

۶۔ ایک زمانہ تھا کہ تیرا جلوہ گل فشانی کیا کرتا تھا۔ افسوس اب اُسے کیا ہوگیا یعنی موت نے اُسے خاک میں ملا دیا۔ اب تیری قبر پر پھول پڑے ہوئے ہیں۔

۷۔ تو عشق کی رسوائی کی تاب نہ لا سکا اور اس شرم سے پردۂ خاک کے پیچھے جا چھپا۔ تجھ پر الفت کی پردہ داری ختم ہے' اس سے زیادہ کوئی عشق کی رُسوائی کو اور کیا چھپائے گا۔

۸۔ تو نے مجھ سے عمر بھر کے لئے پیانِ وفا باندھا تھا۔ تیرے مرجانے سے وہ عہد ٹوٹ گیا۔ اس لئے ناموسِ پیانِ محبت خاک میں مِل گئی۔ گویا دوستی راہ و رسم ہی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا' شکایت سے دردمترشح ہے۔

۹۔ مجھے امید تھی کہ تو مجھے خوب چھریاں مارے گا اور میرے دل کو درد کی دولت سے مالا مال کردے گا۔ لیکن افسوس کہ ابھی دل پر ایک زخم کاری بھی نہ لگنے پایا تھا کہ دستِ قاتل بیکار ہوگیا اور ہمیشہ کے لئے لذّتِ درد سے محروم ہوگیا۔

۱۰۔ شب ہائے تار برشگال:- برسات کی اندھیری راتیں÷ خوکردہ:- عادی÷

اب برسات کی اندھیری راتیں کیونکر کٹیں گی۔ ہم کو تو عادت ہوگئی تھی کہ محبوب کے انتظار میں تارے گن گن کر راتیں کاٹا کرتے تھے۔ برسات استعارہ ہے رونے سے اور شبہائے غم کو شب ہائے تار کہا ہے۔

۱۱۔ میرے کان پیامِ یار سے مہجور اور آنکھیں جمالِ دوست سے محروم ہیں۔ ہائے ہائے ایک دل ہے اور اس پر اس درجہ نا اُمیدیاں' قیامت ہے۔

۱۲۔ میرے عشق نے ابھی وحشت کا رنگ نہ پکڑا تھا یعنی ابھی ہرزہ گردی اور دشت نوردی کی نوبت نہ آئی تھی کہ معشوق اس دُنیا سے رخصت ہوا۔ میرا عشقِ ناتمام اور ذوقِ رسوائی دل ہی میں رہ گیا۔

۱۴۰

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے ۱ تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر ۲ اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک ۳ ہر مُوئے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا ۴ ہر چند اُسکے پاس دلِ حق شناس ہے
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب ۵ اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مرگیا تو جنگل اُداس ہے

۱۔ سرگشتگی:- جنونِ عشق÷ نوید:- خوشخبری' مژدہ۔

سرگشتگی کی وجہ سے زندگی سے بالکل مایوس ہوگیا ہوں۔ اب تسکین کو خوشخبری دو کہ تیری بلائیں دُور ہونے کا وقت آپہنچا ہے یعنی وقت مرگ قریب ہے۔ ظاہر ہے کہ موت آجانے سے جنون سرگشتگی کو ہمیشہ کے لئے تسکین ہوجائے گی۔

۲۔ معشوق یہ سمجھتا ہے کہ میرا دل اب تک میرے ہی پاس ہے۔ اس لئے اس کی خبر نہیں لیتا۔ حالانکہ وہ عشق میں آوارہ ہو چکا ہے اور میرے پاس نہیں رہا (میرے ہی پاس ہے) یہ بھی مفہوم پیدا کر رہا ہے کہ معشوق سمجھتا ہے دل اسی کے پاس ہے اس لئے وہ بے فکر ہے۔

۳۔ جب تپ چڑھتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شاعر نے انہیں زبان شکر گزار قرار دیا ہے کہتا ہے میں تپ غم کا سرور کہاں تک بیان کروں بس یہ سمجھ لو کہ اس کی شکر گزاری میں میرے بدن کا ہر رونگٹا نالہ سپاس بن گیا۔

سعید، آسی:- معشوق حق شناس دل رکھتا ہے اور وفا کی قدر کرنے والا محض دشمن کی وجہ سے وہ مائل بہ خفاتِ نو بیگانہ دل ہے۔

دیگر شارحین اور طباطبائی:- میرا دلِ حق شناس اسی کے پاس ہے اور اُس نے حقِ وفا سے اُسے آگاہ کر دیا ہے، مگر وہ غرورِ حسن میں کب سُنتا ہے۔ اگر دلِ حق شناس سے معشوق کا دل مراد لیں تو محاورہ کے خلاف ہوگا۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ اس کے پاس چشمِ روشن اور دلِ بینا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کا دل روشن ہے اور چشم بینا ہے۔

۵۔ شب مہتاب میں جس قدر بھی شراب ملے پی جا کیونکہ شب مہتاب ٹھنڈی ہونے کی وجہ سے بلغمی مزاج ہے اور بلغمی مزاج کو اطبا ٹھنڈی دوائیں نہیں دیتے بلکہ اس کے لئے گرم ادویات تجویز کرتے ہیں۔ گویا برودت کو قطع کرنے کے لئے خوب شراب پینی چاہئے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ چاندنی رات ٹھنڈی ہوتی ہے اور میرا مزاج بلغمی ہے پھر کیونکر شراب نہ پیوں۔ شراب میرے لئے اس موسم میں ازحد مفید ہے۔

۶۔ مکین:- مکان میں رہنے والا ÷ شرف:- عزت۔

مکان کی عزت ہمیشہ مکین سے ہوتی ہے۔ مجنوں کا مکان جنگل تھا۔ اور وہ اس کے دم سے آباد تھا۔ اب وہ مر گیا ہے۔ تو جنگل اُداس معلوم ہوتا ہے، گویا جنگل کی رونق مجنوں کے دم قدم سے تھی۔ اس کے اُٹھ جانے سے جنگل پر اُداسی چھا گئی ہے۔

۱۴۱

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے ۱ خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ ۲ دل فردِ جمع و خرچ زبانہائے لال ہے
کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا ۳ رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی! ۴ اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے
مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان ۵ نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے ۶ دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ!
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

۱۔ اگر خاموشی سے یہی فائدہ ہے کہ حال دل پوشیدہ رہے تو میں بہت خوش ہوں، کیونکہ مجھے خاموش ہونے سے یہ فائدہ حاصل ہے یعنی میری بات ہی کوئی نہیں سمجھتا۔ بقول بیخودؔ۔ خاموشی اور گفتگو کو مساوات کا درجہ دینا نہایت بلیغ خیال ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے اس میں اپنا کلام عام نہ ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

طباطبائی حال سے وارداتِ قلبی مراد لیتے ہیں۔ آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ ”لوگ کہتے ہیں جو لوگ بے وقوف ہیں ان کو خاموش رہنا مناسب ہے تا کہ ان کے راز کسی پر نہ کھلیں“۔ اگر یہ واقعی ہے تو میں بہت خوش ہوں کہ مجھے ہر وقت خاموش بیٹھے رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میرا راز کوئی نہ سمجھ سکے گا۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ میری خاموشی ایسی جو میرے لئے الٹی غماز ثابت ہوگی“۔ یہ مفہوم قرینِ قیاس نہیں۔

۲۔ فردِ جمع و خرچ:- جمع و خرچ کا دفتر ÷ زبان ہائے لال:- گونگی زبانیں۔

حسرت:- ہزاروں حسرتیں ایسی تھیں جن کے اظہار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ پس گویا دل زبان ہائے لال کی فردِ جمع و خرچ ہے۔ یعنی شکووں کا ایک دفتر ہے (سعید)

طباطبائی:- حسرتِ اظہار زبان کے گویا نہ ہونے سے گلہ مند ہے کہ کس کے آگے اس گلہ کو بیان کرو اور فردِ جمع و خرچ سے طومار شکایت مراد ہے یعنی اظہارِ شوق زبان سے نہ ہوگا تو دل میں زبان کی شکایتیں بھری ہوئی ہیں۔ مصنف نے زبان کو لال اس اعتبار سے کہا ہے کہ بہت سے موقعوں پر زبان نے اظہارِ شوق میں کوتاہی کی ہے اور ممکن ہے کہ احباب کی زبانیں مراد لیں۔

بیخودؔ:- حسرتِ اظہار ان لوگوں سے گلہ مند ہے جو گونگوں کی طرح زبانوں کو منہ میں رکھتے ہیں یعنی مجھ سے میری مصیبتوں کا حال نہیں پوچھتے باوجودیکہ میرے چہرے سے حسرتِ اظہار ظاہر ہورہی ہے۔

آسیؔ:- میں اپنی حسرتِ اظہار کا کس کے سامنے گلہ کروں۔ بس میرا دل خوب جانتا ہے کہ کس قدر مجھے حسرتِ دل کا اظہار کرنا چاہئے تھا اور زبان سے کس قدر اظہار ہوسکا۔ گویا میرا دل ایک جمع اور خرچ کی فرد ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر حسرت اظہار اس میں جمع ہے۔ وہ زبان کے ذریعہ سے کچھ بھی خرچ نہیں ہوسکی۔

۳۔ آئینۂ پرواز:- جلوہ گر، محوِ آرائش۔

اے خدا تیری رحمت جو لبِ بے سوال کی عذرخواہ ہے وہ کس پردے میں آئینۂ پرواز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں لبِ بے سوال رکھتا ہوں' اور راضی برضا ہوں۔ وہ میری عذرخواہی میں کیوں دیر کررہی ہے۔

طباطبائیؔ:- لبِ بے سوال کا بےنفس ہونا ضرور ہے اور لب کو بے سوال اور بے نفس اسی مناسبت سے کہا ہے کہ نفس کے پہنچنے سے آئینہ مکدر ہوجاتا ہے۔ تو ضرور ہوا کہ آئینہ پرواز کے ملنے کی خواہش لبِ بے سوال سے کرنا چاہئے اور آئینہ پرواز وہ جو آئینہ کو جلا کرے۔ رحمت کا فعل محذوف ہے یعنی رحم کر (ظاہر ہے یہ شرح بہت ہی مبہم ہے)

بیخودؔ نے مزید شرح یہ لکھی ہے۔ میرے لب رحمت کا سوال اس شرم سے نہیں کرتے کہ میں نے بے انتہا گناہ کئے ہیں اور میری یہ خاموشی گویا میرے گناہوں کا عذر ہے۔ اس صورت میں اظہار رحمت ضروری ہے۔

۴۔ منفعل:- شرمندہ ہونا۔

اے شوق تو اپنے خیال پر شرمندہ ہو بھلا وہ اور تیرے ساتھ خدانخواستہ دشمنی کریں گے۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اے شوق تو اس غلطی پر شرمندہ ہے کہ تو نے دشمن کو دوست سمجھا۔ یہ تیری شرمندگی بے جا ہے' وہ دشمن نہیں ہوسکتا۔

۵۔ مشکیں لباس:- کعبہ پر سیاہ غلاف چڑھایا جاتا ہے اور اس پر طرح طرح کے عطر

لگائے جاتے ہیں۔ نافِ غزال:- نافہ کستوری کی تھیلی جو ایک قسم کے ہرن کی ناف میں ہوتی ہے۔ غزال:- ہرن ÷ نافِ زمیں:- مرکزِ زمین۔ کسی زمانے میں کعبہ مرکزِ زمین تھا۔

حضرت علیؑ کعبہ میں تولد ہوئے تھے' اس لئے کہتا ہے کہ غلاف خانہ کعبہ کو حضرت علیؑ کے قدم سے مشکیں سمجھ' ورنہ کعبہ نافِ زمین ہے۔ نافِ غزال نہیں کہ وہ مشکیں ہوتا۔

۶۔ عرصۂ آفاق:- میدانِ عالم ÷ عرقِ انفعال:- وہ پسینہ جو شرمندگی سے آجاتا ہے۔

میری وحشت اور آوارگی کے لئے زمین کی وسعت بہت کم تھی۔ اس لئے زمین عرق شرم سے تربتر ہوگئی۔ یہ دریا وغیرہ جو نظر آتے ہیں۔ یہ اسی شرمندگی کا نتیجہ ہیں اور عرقِ انفعال کا حکم رکھتے ہیں۔

۷۔ خیال:- کرۂ زمین کو حلقہ دامِ خیال سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں۔ دیکھنا اسدؔ تم ہستی کے فریب میں نہ آجانا۔ تمام عالم وہم و خیال کے جال کا ایک حلقہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام عالم ایک خیالی دام ہے جس میں تمام عالم پھنسا ہوا ہے۔ گویا ہستی کو ہستی نہیں بلکہ نیستی خیال کرنا چاہئے۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

۱۴۲

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو ۱ حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

دلا یہ دردِ الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر ۲ نہ گریۂ سحری ہے' نہ آہِ نیم شبی ہے

۱۔ کھود کھود کر پوچھنا:- کرید کرید کر پوچھنا ÷ حذر کرو:- ڈرو ÷

برائے خدا تم اپنی شکایتیں مجھ سے کرید کرید کر نہ پوچھو۔ تم ان باتوں کو شکوہ سمجھتے ہو یہ شکوہ نہیں بلکہ آگ ہے جو میرے دل میں دبی ہوئی ہے' اس لئے ان باتوں کو جانے دو۔ اگر یہ آگ بھڑک اُٹھے گی تو قیامت آجائے گی۔

بیخودؔ اور طباطبائیؔ حذر کرو کی توجیح یہ کرتے ہیں کہ اظہارِ شکایت سے اکثر آتشِ عناد مشتعل ہوجاتی ہے۔

۲۔ مغتنم:- غنیمت ÷

اے دل تو دردِ الم کو غنیمت جان کیونکہ چند روز کے بعد نہ یہ گریۂ سحری رہیگا۔ نہ آہِ نیم

شی۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آخر کار یہ درد و الم ہمارا کام تمام کر کے ہمیں تکلیف و اذیت سے ہمیشہ کے لئے نجات دے دے گا۔

نغمہ ہائے دل کو بھی اے دل غنیمت جانیے — بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

۱۴۳

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا! ۱ ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں! ۲ ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا ۳ ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے لاچار ہے
ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ ۴ جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے
مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی ۵ زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا ۶ تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

۱۔ حالی:- غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر حرف بہ آسانی کزلک وغیرہ سے اُڑ سکے اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں ازراہِ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے کہ جس پر سے حرف خود بخود اُڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تُو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرفِ وفا لکھا تھا۔ سو وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔

۲۔ میرا دل ذوقِ فنا کی ناتمامی پر کیوں نہ جلے کیونکہ باوجود نفس کی آتش باری کے ہم نہیں جلتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ذوقِ فنا ناتمام یعنی ناقص ہے اور یہی دل کے جلنے کا سبب ہے (حسرت۔ آسی)

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے سینے میں ایک شعلہ روشن ہے' سانس کی آمد و رفت اس کو ہر دم مشتعل کرتی رہتی ہے۔ اس آگ کی گرمی سے تخریب و تعمیر کے عمل کے ساتھ ساتھ انسان کی زندگی قائم رہتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر انسان کو فنا کا ذوق ہے لیکن ہمارا دل اس ذوقِ فنا کی ناتمامی پر جلتا ہے کہ ہم اس نفسِ شعلہ بار سے ایک دم ہی کیوں نہ جل گئے۔ یہ مضمون غالب کو بہت مرغوب ہے۔ کئی جگہ اس کا اعادہ کر چکے ہیں۔

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے — اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف!

۳۔ شاعر کے دل میں یہ خیال ہے کہ آگ خاموشی سے جلتی ہے۔ لیکن جب اس کو پانی میں ڈال کر بجھاتے ہیں تو اس میں بجھنے کی آواز پیدا ہوتی ہے وہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ درماندگی کی حالت میں انسان کے منہ سے نالہ نکل ہی جاتا ہے۔ دیکھ لو آگ جیسی خاموش جلنے والی چیز بھی اس حالت میں خاموش نہیں رہ سکتی۔

۴۔ حالی:- ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق عذر خواہ یعنی چاہنے والا یا معذور رکھنے والا ہے۔ اس شعر میں دعوے' ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعوے متضمن دلیل واقع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرّات عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں' ان کی بدمستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جس کے پرتوِ وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔ (بیخودؔ سعید)

آسی:- جس کے جلوہ سے زمین سے لیکر آسمان تک کائنات کا ایک ایک ذرہ بدمست اور سرشار ہو رہا ہے۔ اور اس بدمستی کا وہی عذر خواہ بھی ہے کہ میرا جمال اور حسن ایسا ہے کہ جس سے ہر کسی کو بدمست اور سرشار ہونا چاہیے۔

۵۔ معشوق عاشق کو خفا دیکھ کر اس سے کہتا ہے تم تو ہمیں اپنی زندگی کہا کرتے تھے' آج کیا بات ہے؟ عاشق جواب دیتا ہے۔ تم میرے سامنے یہ بات نہ دہراؤ۔ کیونکہ آج کل میرا دل زندگی سے بھی بیزار ہے۔ خوب پُر لطف شعر ہے۔ باوجود زندگی سے بیزار ہونے کے معشوق سے بیزار ہونا گوارا نہیں۔

۶۔ سرنامہ:- لفافہ÷ کھل جائے:- ظاہر ہو جائے÷
میں نے خط کے لفافہ پر آنکھ کی تصویر کھینچ دی ہے تاکہ تجھ کو دیکھتے ہی معلوم ہو جائے کہ مجھے دیدار کی حسرت ہے۔

۱۴۴

پینس پہ گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے ۱ کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

سُنا ہے کہ مولانا آزردہ ایک دن غالب کے مکان کے سامنے سے گزرے اُس وقت ذرا جلدی میں تھے۔ اس لئے اُنہوں نے غالب کے پاس ٹھہرنا نہ چاہا کہاروں سے تاکید کی' جلد چلو وہ

کندھا بدلنے لگے مگر آزردہ صاحب مرحوم نے ان کو کندھا نہ بدلنے دیا۔ غالبؔ نے یہ حالت دیکھ لی اور فوراً یہ شعر لکھ کر ان کے پاس بھیج دیا جس کی معذرت کے لئے وہ خود آئے۔

وہ مجھ سے اس قدر بیزار ہیں کہ اگر اتفاق سے اُن کا گزر میرے کوچہ سے ہوتا ہے تو
کہاروں سے کہتے ہیں کہ سیدھے نکل چلو۔ سانس کے لئے کندھا بھی نہ بدلو۔

۱۲۵

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے ۱ جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے
خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو ۲ وہی ہم ہیں' قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم ۳ اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے
نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تاب رنجِ نومیدی ۴ کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

۱۔ اس نظریہ کے پیش نظر کہ حیرت کے عالم میں انسان آہ و نالہ بھی بھول جاتا ہے۔ اپنی ہستی کو حیرت آبادِ تمنا اور نالے کو اس عالمِ حیرت کا عنقا قرار دیا ہے۔ عنقا ایک پرندہ ہے جو موجود ضرور ہے لیکن مثلِ عنقا مفقود ہے۔ کہتے ہیں میری ہستی حیرت آبادِ تمنا کی ایک فضا ہے اور اس میں نالہ کا مثل عنقا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ میری حیرت ہی فریاد ہے کیونکہ حیرت میں انسان نالہ کرنا بھول جاتا ہے۔

بیخوؔد:- میری ہستی حیرت آبادِ تمنا کو رونق بخشنے والی ہے۔ نالہ و فریاد جس آواز کا نام اہلِ دُنیا نے مقرر کرلیا ہے' وہ اس عالم کا عنقا ہے یعنی کسی قسم کی آواز بلند نہیں ہوتی۔ صوفیا کی زبان میں مقامِ حیرت اس مقام کو کہتے ہیں۔ جہاں طالب پر تجلّیٔ ذات وارد ہوتی ہے۔

۲۔ ہمیں کوئی مطلب نہیں کہ خزاں کیا ہے اور فصلِ بہار کسے کہتے ہیں غرض کوئی موسم ہو' یہاں تو ہمیشہ اپنے بال و پر کا ماتم رہتا ہے۔ اس شعر کی بندش نہایت چُست ہے۔ چھ جملے دو مصرعوں میں نہایت صفائی سے نظم کئے ہیں اور لُطف یہ ہے کہ بلبلِ اسیر کی زبانی۔

۳۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ نالہ و فریاد میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لوگوں نے یہ ڈھکوسلا بنا رکھا ہے کہ آہ میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں اے ہمدم معشوقوں کی وفا کو اتفاقی خیال کر' نالہ و فریاد میں یہ تاثیر نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنے اثر سے مہربان بنادے۔

۴۔ تجدیدِ تمنا:- ازسرِ نو امید کرنا:- جب کوئی چیز ضائع ہوجاتی ہے تو انسان ہاتھ مل مل کر افسوس کرتا ہے۔ نیز جب کوئی نیا عہد کیا جاتا ہے تو اس وقت ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں۔ اس طرح سے کفِ افسوس ملنا گویا تجدیدِ تمنا ٹھہرا یعنی ہاتھ مل کر جس چیز کا ہم افسوس کرتے ہیں ساتھ کے ساتھ اس کی تمنا بھی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میری شوخیٔ اندیشہ مایوسی کا رنج نہ اُٹھا سکی۔ اس نے ناکامی پر کفِ افسوس ملا اور اس سے ظاہر ہو کہ وہ تجدیدِ تمنا کا عہد کررہی ہے۔

۱۲۶

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے ۱ نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں ۲ ورنہ یاں بیرونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

۱۔ بود:- ہستی ÷ چراغِ کشتہ بیمارِ وفا سے استعارہ ہے۔

اے ظالم! تو بیمارِ وفا (چراغِ کشتہ) پر رحم کر۔ اس کی ہستی ہی کیا ہے اس کی نبض بجھے ہوئے چراغ کے دھوئیں کی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہے اور اطبا اسے دودی کہتے ہیں۔

آسیؔ کہتے ہیں کہ طباطبائیؔ نے آخری نبض کو دودی لکھا ہے۔ دودی کمزوری ضرور کرتی ہے مگر وہ بالکل قوّت کو ساقط نہیں کرتی۔ ان کے نزدیک آخری مصرعہ کی شرح یہ ہونی چاہئے۔ ''بیمارِ وفا کی نبض چراغِ کشتہ کا دھواں ہے کہ وہ بتدریج کم اور سرد اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اسی صورت سے آخری وقت کی نبض ہوتی ہے۔

۲۔ سُود:- فائدہ۔

ہم کیا کریں' مجبور ہیں کہ دل لگی کی آرزو ہمارے دل کو بے چین رکھتی ہے ورنہ ہم ہرگز عشق نہ کریں۔ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ رونق چراغ یعنی چراغ کا جلنا چراغ کے لئے باعثِ نقصان ہے۔ کیونکہ جلنے سے چراغ کا تیل اور بتی دونوں ہی جل جاتے ہیں۔ اور اگر وہ نہیں جلتا تو اُس کو یہ نقصان نہیں پہنچتا اس لئے نہ جلنا اور بے رونق رہنا اس کے لئے نفع کا باعث ہے۔ اسی طرح اگر ہم بھی شعلۂ عشق سے نہ جلیں تو ہمیں بھی یقیناً فائدہ پہنچے۔ لیکن کیا کریں دل لگی کی آرزو سے مجبور ہیں۔

۱۲۷

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نواپرداز ہے ۱ سرمہ تو کہوے کہ دُودِ شعلۂ آواز ہے
پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے ۲ نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے
دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا! ۳ یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پانداز ہے

۱۔ نواپرداز:- گویا سخن گو÷ تو کہوے:- یعنی تو گوئی۔ گویا۔

معشوقوں کی آنکھیں خاموشی کی حالت میں بھی باتیں کرتی ہیں (نواپرداز سے مراد اشارہ گردشِ چشم ہے)

گویا ان کی آنکھوں کا کاجل شعلۂ آواز پر بنایا گیا ہے۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ جو شخص سُرمہ کھالے اُس کی آواز ہمیشہ کے لئے بیٹھ جاتی ہے۔ اور وہ بات نہیں کرسکتا۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ معشوقوں کا سُرمہ وہ سُرمہ نہیں بلکہ یہ کاجل شعلۂ آواز پر بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس کا اثر عام سُرمہ جیسا نہیں بلکہ اس کا اثر قوّتِ گویائی بخشا ہے' جیسا کہ حالتِ خاموشی میں معشوقوں کی آنکھوں کی گویا سے ثبوت ہے۔

معشوقوں کو شمع۔ اس کی آواز کو شعلہ اور شعلہ کے دُھوئیں کو ایسا سُرمہ قرار دینا جو سُرمہ کی عام خاصیّت کے خلاف گویائی بخشے' شاعرانہ لطف سے خالی نہیں اور یہ مرزا صاحب کی شاعری کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

۲۔ پیکر:- جسم÷ ساز:- باجہ÷ طالع ساز:- گردشِ سیارہ۔ بدقسمتی÷

عشاق کا جسم بدنصیبی اور بدبختی کا ساز ہے اور ان کا نالہ وفریاد گردشِ سیارہ کی آواز ہے۔

عاشقوں کے ہمہ تن نالہ وفریاد ہونے کے سبب سے ان کے جسموں کو طالع ناساز کا ساز کہا ہے۔

بقول طباطبائی لفظِ عشاق اس مقام پر ساز کے ضلع کا لفظ ہے اور اہلِ فارس کی موسیقی میں مقامِ عشق ایک راگ کا نام ہے۔

۳۔ دستگاہ:- قدرت' کمال÷ دیدۂ خونبار:- چشمِ خونفشاں÷ یک بیاباں:- بکثرت÷

فرشِ پا انداز:- وہ فرش جو راستے میں بچھادیا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر سُرخ بانات کا ہوتا ہے۔

مجنوں کی چشمِ خونفشاں کا کمال ملاحظہ فرمایئے۔ اس نے اس قدر خون بہایا ہے کہ ایک صحرا

کو خونی اشکوں سے گلزار رنگیں بنادیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجنوں کا فرش پا انداز جلوۂ گل سے بنا ہے۔

اشکِ خونی اور گل کی تشبیہ ظاہر ہے' نیز فرش پا انداز پھولوں کا بنانے سے مجنوں کی بلند پائیگی کا ثبوت پہنچتا ہے۔ دستگاہ اور پانداز میں بھی رعایت لفظی ہے۔

۱۲۸

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی ۱ میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے ۲ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی ۳ اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے' ۴ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو' ۵ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام' ۶ دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں' ۷ نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف ۸ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے' ۹ بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ!
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی!

۱۔ تم میرے عشق کو وحشت اور دیوانگی قرار دیتے ہو۔ چلو یونہی سہی لیکن یہ کیا کم ہے کہ میری وحشت تمہاری شہرت کا باعث ہے۔ (آسی)

سعید:- اگر میرے عشق سے تمہاری بد نامی ہوتی ہے اور اس کو وحشت کہنا تمارے لئے شہرت کا باعث ہوسکتا ہے تو تم میرے عشق کو وحشت ہی کہو مجھے یہ بھی منظور ہے۔

طباطبائی و بیخود:- تو میرے اظہار پر کہتا ہے کہ دیوانہ ہوگیا ہے' ایسی وحشت ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''عشق مجھ کو نہیں۔ الخ''

۲۔ آپ ہم سے قطع تعلق نہ کریں۔ اگر محبت نہیں کرتے تو کیا مضائقہ ہے' عداوت ہی

کیجئے۔ اس مضمون کو مرزا نے متعدد مرتبہ نظم کیا ہے اور ہر جگہ نئے اسلوب سے۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
وارستہ اس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو — کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا — سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

۳۔ مجھ سے کھلم کھلا ملنے میں تمہاری کیا رسوائی ہے؟ اگر تم مجھ سے مجلس میں ملنا باعثِ رسوائی خیال کرتے ہو تو درپردہ خلوت ہی میں سہی۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ بقول حسرت اس لئے کہ ہم پاکدامن ہیں۔

طباطبائی:- اے وہ کا لفظ اس میں بہت رکیک ہے۔ اہلِ زبان ہی اس کو سمجھیں گے۔ واضح ہو کہ یہ غالب کے دور کی زبان ہے۔

۴۔ اگر غیر سے تمہیں محبّت ہے تو یوں ہی سہی۔ ہم اپنے دشمن نہیں ہیں۔ کہ یہ بات جانتے ہوئے ہم تمہارے عشق کے دُکھ اور رشک کی تکلیف برداشت کریں۔ محض آسی کو اس شرح سے اختلاف ہے لکھتے ہیں ''بھی'' اور ''سہی'' اور بات کے شاہد ہیں کہ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ تجھ کو غیر سے محبت ہے تو سہی' ہم بھی جانتے ہیں' مگر ہم بھی تو دشمن نہیں' ہم بھی تو اپنے ہی ہیں۔ ہم کو بھی تجھ سے محبّت ہے۔ پھر ہم کو اس کے مقابلے پر ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے؟

۵۔ جو کچھ حاصل کرنا چاہئے وہ اپنی ذات اور اپنی ہستی ہی سے حاصل کرنا چاہئے۔ اگر اپنی ذات سے آگہی اور معرفت حاصل نہیں ہوسکتی تو پھر غفلت ہی حاصل کرنی چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ دوسرے کا احسان اُٹھانا درست نہیں۔

اس شعر میں تصوّف کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ حدیث نبوی ہے ''مَن عُرفَ نفسہ فَقَد رَبہٗ'' یعنی اپنی ہستی سے آگاہی عین عرفانِ الٰہی ہے اور اگر نفس سے آگاہی حاصل نہ ہو تو پھر اپنی ہستی سے غافل ہو جانا چاہئے کیونکہ جب انسان اپنے آپ کو نیست سمجھ لیتا ہے تو پھر اسے جلوۂ حق نظر آتا ہے۔ مطلب وہی نکلا کہ آگاہی اور غفلت کا تعلق اپنی ہستی سے رکھنا چاہئے۔

۶۔ برق خرام:- برق رفتار۔ جلدی سے غائب ہونے والی ÷ فرصت:- مہلت ÷
ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عُمر بجلی کی طرح بہت جلد گزر جاتی ہے لیکن زندگی میں اتنی مہلت اور

فرصت تو ضرور ملتی ہے کہ دل کو خون کرلیا جائے۔ (بیخود)

طباطبائی و آسی:- وجہ مناسبت یہ ہے کہ برق بھی خونِ رگِ ابر ہے۔

۷۔ ہم عشق کو تکلیفوں کی وجہ سے ہرگز ترک نہ کریں گے۔ اگر عشق میں مصائب سے نجات نہیں تو ہم عشق کو عشق نہ سمجھیں گے' بلکہ اسے ''مصیبت'' خیال کرلیں گے۔

۸۔ رخصت:- اجازت۔

اے نا انصاف آسمان! میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ تو میری مراد پوری کر۔ اور کچھ نہیں تو تو مجھے آہ و فریاد کی اجازت ہی دے دے۔ خوب شعر ہے۔

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی — ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہئے

۹۔ ابھی ہماری طبیعت میں بے نیازی کی خو نہیں ہے لیکن یہ دیکھ کر کہ بے نیازی تیری عادت ہے اور تو ہمارے عجز و نیاز کی کوئی پروا نہیں کرتا ہم بھی تسلیم و رضا کی عادت ڈال ہی لیں گے تاکہ تیری بے نیازی سے ہم بددل نہ ہونے پائیں اور اس کو برداشت کرنے کے خوگر ہو جائیں۔

۱۰۔ حسرت سے مراد اظہارِ حسرتِ وصل ہے۔ یار سے کچھ نہ کچھ چھیڑ جاری رہنی چاہئے۔ اگر وصل میسّر نہیں تو نہ سہی' اظہارِ حسرتِ وصل ہی سہی۔ لطف یہ ہے کہ اظہارِ حسرت دل ہی سے چھیڑ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ خاموش ہو جانا چھیڑ پیدا نہیں کرتا۔ بقول سہاؔ آخر زندگی کے لئے کوئی نہ کوئی مشغلہ چاہئے۔

۱۴۹

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے ۱ صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ڈھونڈے ہے اُس مغنّیِ آتش نفس کو جی ۲ جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال ۳ تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں ۴ آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ ۵ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

۱۔ آرمیدگی:- آرام طلبی ÷ نکوہش:- ملامت ÷ بجا:- درست۔ صبح کو خندۂ دنداں نما اس کی سفیدی کی وجہ سے کہا ہے۔

میں اپنی آرام طلبی کی وجہ سے واقعی قابلِ ملامت ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ صبحِ وطن مرے اُوپر ہنس رہی ہے۔ گویا جستجوئے یار میں مجھے آوارگی اختیار کرنی چاہئے۔ چونکہ عاشق اپنا فرض ادا نہیں کرتا۔ اس لئے ادائے فرض کا خیال دل میں بے چینی پیدا کردیتا ہے' یہاں تک کہ صبح کی سفیدی اسے خندۂ دنداں نما معلوم ہونے لگتی ہے۔خوب شعر کہا ہے۔

۲۔ مغنّی :- گانے والا÷ آتش نفس:- ایسا نفس یا آواز جو دل میں سوزوگداز پیدا کردے۔

میرا دل اس گانے والے کو ڈھونڈ رہا ہے جس کی آواز میں ایسا سوز و گداز ہو کہ وہ فنا کردینے والی بجلی کی طرح مجھ پر گرے اور مجھے جلاکر خاک کرڈالے۔ یہ آرزوعشق کا معمولی کرشمہ ہے۔

۳۔ بازگشت:- واپسی÷

میں وادیٔ خیال کے راستے کو مستانہ وار طے کررہا ہوں تاکہ اس بے خودی کے عالم میں مجھے واپس آنے کا ہوش نہ رہے۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ جب کوئی بے ہوشی کی حالت میں راستہ طے کرتا ہے تو پھر اسے راستوں کے موڑ توڑ اور ہیر پھیر یاد نہیں رہ سکتے اور وہ اسی راستے سے واپس نہیں آسکتا۔ شاعر وادیٔ خیال میں اس استغراق سے گامزن ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ نہیں چاہتا کہ دوبارہ ہوش میں آئے اور اپنے مقام پر واپس آسکے۔

۴۔ چونکہ تو باغ میں نکہتِ گل کے سامنے بہت زیادہ بے حجابیاں کرنے لگا ہے اس لئے مجھے نکہتِ گل سے شرم آنے لگی ہے۔

شرم آنے کے اور بھی سبب ہوسکتے ہیں۔ مثلاً بقول آسیؔ' وہ میری ایک کامیاب رقیب ہے۔ اس لئے میری نظر اُس کے سامنے نہیں اُٹھتی بقول سعیدؔ و بیخودؔ و طباطبائی ۔ میں تو نکہتِ گل کو بے حجاب کہا کرتا تھا۔ اب تیری بے حجابیاں دیکھ کر بوئے گل کو کیسے بے حجاب کہوں۔ تو اس سے بھی زیادہ بے حجاب نکلا۔

۵۔ جس قسم کی انسان کی طبیعت اور خیالات ہوتے ہیں وہ ویسے ہی اشعار پسند کرتا ہے اس لئے کہتے ہیں کہ میرے دلی معاملات اور پوشیدہ راز کسی کو معلوم نہ ہوتے۔ لیکن شعروں کے

انتخاب نے میرا بھانڈا پھوڑ دیا۔ گویا ان کے ذریعہ سے لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ میں عاشق مزاج ہوں۔

۱۵۰

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ ۱ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

۱۔ ''اس شکل سے'' محاورہ ہے' بمعنی بُرے حالوں سے بعض نسخوں میں ''رنگ سے'' اس کے بھی وہی معنی ہیں۔

فرماتے ہیں جب ہماری زندگی ایسے بُرے حالوں میں گزری کہ کبھی کوئی آرزو ہی پوری نہ ہوئی تو ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ ہمارا بھی کوئی خدا تھا۔

۱۵۱

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے ۱ بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے
دل ہی تو ہے' سیاستِ درباں سے ڈرگیا ۲ میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے ۳ مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر ۴ حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم ۵ تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو ۶ کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو ۷ دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے
ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں ۸ بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے
غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سُنا کئے

۱۔ میں اس کی بزم میں بے حیا بنا بیٹھا رہا۔ اگرچہ لوگ آپس میں اشارے کیا کئے اور مجھ پر آوازے کستے رہے۔ میں کیا کرتا مجبور تھا کیونکہ بغیر بے حیا بنے میں وہاں بیٹھ نہ سکتا تھا (سعیدؔ' طباطبائی' بیخودؔ)

بیخودؔ:- غیر سے ان کے اشارے ہوتے رہے۔آسیؔ نے دونوں مفہوم لکھے ہیں۔

۲۔ **سیاست**:- سزا' خوف۔

آخر دل ہی تو ہے۔کوئی فولاد یا پتھر کا ٹکڑا نہیں۔ وہ سوئے اتفاق سے دربان سے ڈر گیا اور میں تیرے در پر بغیر صدا لگائے چلا آیا۔ ورنہ ایسا ممکن ہوسکتا ہے کہ میں تیرے دروازے پر بغیر صدا کئے چلا جاتا۔

۳۔ **خرقہ**:- گودڑی' لباسِ فقرا÷ **سجادہ**:- مصلّٰی ÷ **رہن مے**:- شراب کے بدلے گروی رکھنا÷ **دعوتِ آب و ہوا**:- یعنی دعوتِ بہار۔

میں اپنی گودڑی اور مصلّٰی شراب کے بدلے گروی رکھتا پھرتا ہوں کیونکہ موسم بہار کی دعوت کئے ہوئے مدّت ہوگئی ہے۔ بقول بیخؔود اس شعر میں شوخی یہ ہے کہ ایک چیز سے قیمت شراب ادا نہ ہوسکی۔ اس لئے دونوں چیز کو ملا کر گروی رکھا ہے۔

۴۔ **بے صرفہ**:- بے فائدہ÷ **کل**:- روز قیامت۔ عمر چاہے کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو دنیاوی مخمصوں کی وجہ سے مہلت نہیں ملتی اور وہ یونہی گزر جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت خضر بھی کل قیامت کے دن باوجود اتنی طویل عمر کے یہی کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے۔ یعنی ہم نے کچھ نہیں کیا۔

۵۔**لئیم**:- کنجوس' بخیل÷ **گنجِ گرانمایہ**:- بیش قیمت خزانے۔ اگر مجھے مقدور ہو تو میں زمین سے دریافت کروں کہ اے کنجوس وہ قیمتی خزانے جو تجھ میں دفن تھے تو نے کیا کئے۔ مطلب یہ ہے کہ تو نے ان خزانوں کو بیکار ضائع کردیا۔ خود ان سے کچھ فائدہ اُٹھایا نہ دوسروں کو اُٹھانے دیا۔

آسیؔ:- مقدور کا لفظ پتہ دیتا ہے کہ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر یہ دولت میرے پاس جمع ہوجائے تو میں لوگوں کو فائدہ پہنچاؤں اور زمین کو طعنہ دوں کہ آخر تو نے اس قدر خزانوں سے کیا کام لیا یا کسی کو فائدہ پہنچایا۔ دیگر شارحین گنج گرانمایہ سے وہ لوگ مراد لیتے ہیں جو زمین میں دفن ہیں۔

۶۔ ہر روز دشمنوں نے ہم پر تہمتیں اور الزام لگائے اور ہمیشہ انہوں نے ہم پر سخت ترین ظلم کئے۔ تہمت تراشنا اور آرے چلانا میں رعایت ہے۔

۷۔ معشوق بغیر التجا کئے بوسہ دیتا ہے۔ اس بات سے عاشق کے دل میں یہ وہم پیدا ہوتا

ہے کہ پہلے تو یہ بات نہ تھی۔ ہم بار بار التجائیں کرتے تھے۔ پھر کہیں جا کر بوسہ ملتا تھا۔ اس خلافِ عادت عنایت سے وہ فوراً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کہیں یہ عادت اُسے رقیب کی صحبت میں نہ پڑی ہو۔ بہر حال شاعر نے اس شعر میں اس عاشق کی دلی کیفیت دکھائی ہے' جو اس قدر خوگرِ غم ہو چکا ہے کہ خوشی میں بھی غم کا پہلو ڈھونڈ نکالنا ہے۔

۸۔ ضد کی اور بات ہے جب اُسے ضد پڑ جاتی ہے تو واقعی وعدہ وفا نہیں کرتا۔ لیکن اس کی عادت بُری نہیں۔ چنانچہ جب کبھی وہ اپنی ضد کو بھول گیا ہے تو اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے ہیں۔

۹۔ ہم نے مان لیا کہ تم اپنے دل کی بات ان سے کہتے رہے اور وہ تمہاری باتوں کو سنتے رہے۔ لیکن یہ بتلاؤ کہ تمہاری باتوں کا وہ کیا جواب دیں گے؟

مطلب یہ ہے کہ اوّل تو وہ تمہاری بات کا جواب نہ دیں گے اور اگر بالفرض جواب بھی دیا تو نفی میں ہوگا۔

۱۵۴

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے ۱ اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے ۲ بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا ۳ نے بھاگنے کی گوں' نہ اقامت کی تاب ہے

جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت ۴ غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حُسن کا ۵ جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں ۶ مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسدؔ مسرّتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

۱۔ **رہِ اضطراب**:- وہ راستہ جو حالتِ اضطراب میں طے ہو÷ سال سے مراد عمر۔

جس طرح سال کا حساب گردشِ آفتاب سے طے کرتے ہیں اسی طرح عمرِ گریزاں کے سال کا حساب رفتارِ آفتاب کے بدلے رفتارِ برق سے کرنا چاہئے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کی مدّت عمر ایک چشمک برق کے برابر ہے۔ اس کی عمر کے سال

پلک جھپکتے میں گزر جاتے ہیں۔ چونکہ عمر راہِ اضطراب کو طے کر رہی ہے اس لئے برق کو آفتاب قرار دے کر انسان کی عمر کے سالوں کا حساب کرنا چاہئے۔

۲۔ مینائے مے:- شراب کی صراحی ÷ تذرو:- چکور ÷

بالِ تذرو سے ابر کا استعارہ کیا ہے۔ شراب کی صراحی بہار کی خوشی میں سروِ بہار بن گئی ہے اور بالِ تذرو موجِ شراب کا نظارہ پیش کر رہی ہے۔

طباطبائی:- نشاطِ بہار میں مینائے سبز رنگ کشیدہ بالا سرو کا انداز دکھا رہا ہے اور شراب سر جوش کی لہر بالِ تذرو کی جھلکی دکھا جاتی ہے حاصل یہ ہے کہ صحبتِ شراب میں تماشائے باغ کا مزہ آ رہا ہے۔

۳۔ پاشنہ:- ایڑی ÷ ثبات:- استقلال و پائداری ÷ گوں:- مراد ہمت۔

پائے ثبات کی ایڑی زخمی ہوگئی ہے۔ اب میدانِ عشق میں نہ بھاگنے کی ہمت ہے اور نہ ٹھہرنے کی قوت۔ مطلب یہ ہے کہ ایڑیاں رگڑنے کی نوبت آ گئی ہے۔ ایک اور جگہ لکھا ہے

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

۴۔ جاداد:- یعنی جائداد ÷ گیتی خراب:- آوارہ ÷ بے سروسامان:- بالکل مفلس ÷ شش جہت:- تمام دنیا ÷

غافل تو یہ خیال کرتا ہے کہ ہم رند لوگ بالکل بے سروسامان اور آوارہ ہیں۔ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ تمام دُنیا رندوں کی بادہ نوشی کی جاگیر ہے۔ نشہ کی ترنگ رند کو بادشاہ بنا دیا کرتی ہے۔

طباطبائی:- بادہ سے عرفان اور رند سے عارف مراد ہے۔ اور عالم کے خراب و ویران ہونے سے یہ مطلب ہے کہ کوئی صانع و مدبر اس کے زعم میں نہیں ہے جو شخص جلوۂ حقیقت سے غافل ہے (بیخودؔ سعید)

۵۔ حریف:- مقابل ÷

نظارہ میں یہ طاقت نہیں کہ اس برقِ حُسن کا نظارہ کر سکے جس کے جلوہ کے لئے جوشِ بہار نقاب بن گئی ہے یعنی بہار کی رنگینی کو جوشِ نقاب کا کام دے رہا ہے۔ یا اُس کے جلوہ میں اس قدر

جوشِ بہار ہے کہ اُس نے جلوہ کو چھپا لیا ہے۔ (آسیؔ حسرت)۔

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا   مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

طباطبائی:- عالمِ اجسام کا ظہور حسنِ شاہدِ حقیقی کے لئے حفاظت کا باعث ہے اس کو نظر کیونکر دیکھ سکتی ہے۔ نظر جب پڑے گی نقاب ہی پر پڑے گی۔ یعنی آنکھ جب دیکھے گی اجسام ہی کو دیکھے گی۔ جوشِ بہار ظہورِ عالم سے استعارہ ہے اور نقاب اسے اس وجہ سے کہا کہ جس طرح نقاب چہرے کی آڑ کر لیتی ہے۔ اسی طرح تماشائے عالمِ اجسام صوفیا کے نزدیک عالمِ لاہوت تک جانے سے مانع ہے۔ (بیخودؔ)

۶۔ نامراد کا تعلق دل اور میں دونوں کے ساتھ ہوسکتا ہے۔

کہتے ہیں میں مانتا ہوں کہ میری نگاہ تیرے دیدار سے لطف اندوز ہوتی رہی ہے لیکن میں اپنے دلِ نامراد کو تسلی کیونکر دوں، وہ کسی اور چیز کا طلبگار ہے یعنی دل کو تسلی محض دیدار سے نہیں ہوسکتی۔

آسیؔ:- میں نے مان لیا کہ چشمِ تصور سے میں ہر وقت تم کو دیکھ رہا ہوں یا یوں ہی تمہارے رُخ پر میری نگاہیں پڑ رہی ہیں مگر میں تو نامراد ہوں اس سے بھی مری مراد بر نہ آئی یعنی دل کی تسلی نہ ہوئی۔ ایک اور جگہ لکھا ہے۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا   نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

۷۔ گزرا:- باز آیا ÷

یار کا پیغام آنا یقیناً مسرت بخش ہے۔ لیکن میں ایسی خوشی سے باز آیا۔ کیونکہ میں قاصد کا ان سے سوال و جواب کرنا برداشت نہیں کرسکتا۔ شاعر کے نزدیک معشوق کا قاصد سے ہمکلام ہونا ناقابلِ برداشت رشک ہے۔ اس لئے وہ پیغامِ یار ہی سے درگزرا۔

۱۵۳

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے ۱ میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے ۲ آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے
غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے ۳ گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے ۴ دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ! ۵ نغمہ ہوجاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق' ۶ پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پاجائے ہے
اُس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور یاں' ۷ مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے
ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا ۸ رنگ کُھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں! ۹ کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

۱۔ انتہائے رشک یہ ہے کہ عاشق کو اپنے سے رشک پیدا ہوگیا ہے۔ اور وہ یہ گوارا نہیں کرتا کہ خود اس کو دیکھئے' اس لئے اپنی قسمت پر افسوس کرتا ہے کہ رشک نے اُسے دیدار سے بھی محروم کردیا۔ رشک کے مضمون غالبؔ نے ہر جگہ بڑھ چڑھ کر باندھے ہیں مثلاً ؎

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے   مرتے ہیں مگر اُن کی تمنا نہیں کرتے
تکلف بر طرف نظارگی میں بھی سہی لیکن'   وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

۲۔ گرمیٔ اندیشہ سے اندیشہ وفکر کا وہ اثر مراد ہے جو دل و دماغ کو بے چین اور معطّل کردیتا ہے۔ اسے تندیٔ صہبا سے اور دل کو آگینہ سے تشبیہ دی ہے۔

اگر اندیشہ (فکر) میں یہی گرمی ہے تو دل سے ہاتھ دھو لیجئے۔ کیونکہ دل یہ گرمی برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ ایسی تند شراب ہے کہ شیشہ دل اس سے پگھلا جاتا ہے۔

۳۔ حالیؔ:- یہ شعر معاملہ ہے جو طالب ومطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرعے میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے۔ پھر اس کے کیا معنی؟ کیا حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور اگر حیا بھی اس کو آتی ہے یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بے جا سے اور شرما جائے ہے یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرنے سے۔

آسیؔ:- (۱) غیر کو چھیڑنے اور گستاخی کرنے سے اُسے شرم آتی ہے تو وہ اس شرم سے بھی شرما جاتا ہے۔ (۲) اس کو شرم ضرور آتی ہے۔ مگر وہ شرمانے سے بھی شرماتا ہے۔

۴۔ لت:- بُری عادت۔

اُدھر شوق کو یہ بُری عادت پڑی ہے کہ وہ ہر دم نالہ کشی کا تقاضا کرتا ہے اور اُدھر کمزوری اور ناتوانی کے سبب سے دل کی یہ حالت ہے کہ وہ سانس تک لینے کی تکلیف سے گھبراتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سانس لینے کی طاقت نہیں۔ نالہ کیسے کروں۔

آسیؔ نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ جیسا میرا شوق دیوانہ ہے' ایسا ہی دل ہے کہ میں دم لیتا ہوں یعنی ذرا نالہ کشی سے باز رہتا ہوں تو گھبرا جاتا ہے۔ غرض دونوں یکساں ہیں اور میری حالت تباہ کررہے ہیں۔

۵۔ خدا تیری بزمِ مسرّت کو نظر بد سے بچائے۔ اس کی تاثیر ایسی ہے کہ اگر میں نالہ کرتا ہوں تو وہاں پہنچ کر نغمہ بن جاتا ہے ؎

ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست   واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

طباطبائیؔ لکھتے ہیں کہ اس اثر سے مقصود تشنیع ہے۔ یعنی میرے نالے سے تو خوش ہوتا ہے۔

۶۔ ہم اس پر عاشق ہیں لیکن اپنا عشق اس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ کہ کہیں وہ ہم پر ظلم و ستم نہ کرنے لگے' اس لیے ہم نے طرزِ تغافل اختیار کرلی ہے تاکہ وہ رازِ عشق کو معلوم نہ کرسکے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ جب ہم اس کے سامنے جاتے ہیں تو بالکل کھوئے جاتے ہیں۔ اور وہ ہماری غیر حالت دیکھ کر ہمارے عشق کو پاجاتا ہے۔ (حسرت ہم خیال) اس سے ذرا بچ کر کہتے ہیں ؎

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے   کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پاگئے

سعیدؔ:- اگرچہ معشوق کے طرزِ تغافل سے ہمارے عشق کی پردہ پوشی ہوتی ہے لیکن اس کے تغافل سے مجھے ایسی شرمندگی ہوتی ہے کہ لوگ تاڑ جاتے ہیں کہ اس کو ضرور عشق ہے۔

طباطبائیؔ' بیخودؔ' آسیؔ:- اگرچہ وہ ہمارا رازِ عشق چھپانے کے لئے ہم سے اپنی بزم میں تغافل برت رہا تھا مگر وائے برحالِ ما کہ اس تغافل سے ہم حیران و پریشان ہوجاتے ہیں اور وہ اس کو سمجھ جاتا ہے۔ مجبوراً اس کو ہم پر ستم کرنا پڑتا ہے۔

۷۔ بیٹھنا کا تعلق دو لفظوں سے ہے۔ یعنی ایک تو بیٹھنا نقشِ مدعائے غیر کا یعنی رقیب کا مدعا بر آنا۔ دوسرے عاشق کے دل کا بیٹھنا بے طاقتی اور مایوسی کے سبب سے۔

جب میں اغیار کے ساتھ اس کی بزم آرائیوں کا حال سُنتا ہوں تو میرا دلِ رنجور یہاں اس طرح بیٹھتا ہے جیسے رقیب کا نقش بزمِ یار میں بیٹھتا ہے۔ بیخود لکھتے ہیں کہ اس طرح جیسے رقیب کی وفا کا سکہ اس کے دل پر بیٹھتا ہے۔

۸۔ عشق میں رنگ سفید ہونے کو رنگ کے کھلنے سے تعبیر کیا ہے۔ کہتے ہیں وہ پری وش عاشق ہوکر اور بھی زیادہ حسین و نازک بن گیا۔ زیادہ حسین اس لئے بنا کہ اس کا رنگ اُڑ کر اور کھل گیا اور نزاکت اس لئے بڑھی کہ وہ عشق کے صدمے سے کمزور ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق عموماً لوگوں کی شکل بگاڑ دیتا ہے۔ لیکن معشوق کا عشق سب سے نرالا ہے کہ اس سے حسن و خوبصورتی میں اضافہ ہوگیا۔

۹۔ اس کی تصویر مصوّر سے کیا کیا ناز کرتی ہے۔ وہ جس قدر اُسے کھینچتا ہے تصویر اس سے اتنی ہی کھنچتی چلی جاتی ہے یعنی کھِنچتی نہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ مصوّر کو بھی اپنا عاشق سمجھتی ہے۔ نقش کے ساتھ "کھنچا جائے ہے" خاص لطف رکھتا ہے۔

۱۰۔ دُود:- دُھواں÷ مجھ سے میرا سایہ اس طرح بھاگتا ہے جیسے دُھواں آگ سے اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ میں آتش بجاں ہوں۔ میری جان میں ایک آگ سلگ رہی ہے اس لئے میرے قریب میرا سایہ جو دھوئیں کی مانند ہے نہیں ٹھہر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ جب کسی کے دل میں عشق کی آگ سلگتی ہے تو اور لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ہے سایہ بھی جُدا ہوجاتا ہے۔

۱۵۴

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے ۱ تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم ۲ لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریِ وہم ۳ کردیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا ۴ عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

۱۔ نہالی:- فرش۔ بستر÷ شکلِ نہالی:- وہ حسین تصویر جو بستر یا فرش پر بنائی جاتی ہے÷ بَرد:- سردی÷ لیالی:- جمع لیل کی بمعنی رات۔

شبِ ہجر میں شکلِ نہالی کو دیکھ کر میں نالہ و فریاد کرنے لگا کیونکہ اسے دیکھ کر مجھے اپنے

معشوق کی شکل یاد آگئی اور اس خیال نے میرے دل کو بے چین کردیا کہ یہ شکل میرے سامنے ہو اور میرا معشوق میرے پہلو میں نہ ہو۔ غرض گرمیِ فریاد کی بدولت مجھے شب ہائے ہجر کی سردی سے امان ملی ورنہ شبِ فراق کی سردی میرا خاتمہ کردیتی۔

۲۔ نسیہ:- اُدھار' قرض۔

میری عالی ہمتی نے مجھ کو مجھ سے لے لیا گویا میری عالی ہمتی نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں نقدِ دُنیا اور عقبیٰ کے عوض بک جاؤں کیونکہ اُن کی قیمت میری خریداری کے لئے کافی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری بلند ہمتی کی وجہ سے میرا رتبہ دنیا و عقبےٰ دونوں سے بلند ہے کیونکہ وہ غمِ کونین سے مستغنی ہے۔

۳۔ عام قاعدہ ہے کہ لوگ وحدت کو کثرت میں جلوہ گر بتاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہر جگہ اسی وحدت الوجود کا جلوہ ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ یہ خیال کرنا وہم پرستی ہے اور انہی اصنامِ خیالی نے یعنی وحدت کو کثرت میں جلوہ گر سمجھنے نے مجھ کو کافر بنادیا۔ کیونکہ وحدت کو وحدت نہ سمجھنا ہی شرک و کفر ہے۔

۴۔ جب تک پر و بال تھے اس وقت تک مجھے ہوسِ گل تھی۔ لیکن جب پر و بال نہ رہے تو مجھے ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا۔ گویا بے پروبالی نے مجھے تمام فکروں سے آزاد کردیا اور میں آرام سے سوگیا۔

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو آرام سے سوتا رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

۱۵۵

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے ۱ برقِ خرمنِ راحت' خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا' برگِ عافیت معلوم ۲ باوجود دل جمعی' خوابِ گل پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اُٹھایا جائے ۳ داغ پُشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

۱۔ غالب نے ان تینوں شعروں کی شرح عود ہندی میں اپنے قلم سے لکھی ہے فرماتے ہیں۔ داغ ساماں مثل انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو موجودیت لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجئے کہ پھول کے

درخت یا غلّہ جو کچھ بویا جاتا ہے دہقان کو جوتنے بونے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج والم ہے اور مزارع کا وہ لہو جو کشت وکار میں گرم ہوا ہے وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ حاصلِ موجودیت داغ اور داغِ مخالف و راحت اور صورت رنج ہے۔

حسرت:- دہقان کی سعی گل کے خرمن راحت کے لئے برق کا کام دیتی ہے دیکھو وہ لالہ کے درخت پر اس قدر کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ گلِ لالہ داغ بدل ہو جاتا ہے۔

۲۔ کلی جب نئی نکلے' بصورتِ قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے برگ عافیّت معلوم۔ یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگِ عافیت بمعنی مایۂ آرام۔

مصرعہ:- برگِ عیش بگورِ خویش فرست' برگ اور سروبرگ بمعنی سازو سامان ہے۔ خواب گل وشخصیت گل باعتبار خاموشی و برجاماندگی' پریشانی ظاہر ہے۔ یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بصورتِ دل جمع ہے باوصف جمعیت دل۔ گل کو خواب پریشاں نصیب ہے''۔

طباطبائی کی تشریح مزید ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں۔ کل جب تک کھلے کھلے سازو برگِ عافیت کا حاصل ہونا یعنی آفت سے اس کا محفوظ رہنا کہاں سے معلوم ہے جب یہ حال ہوا تو گل کو باوجود دلجمعی پریشانی ہے اور غنچہ کو دل سے تشبیہ دی ہے اور جمعیت دل کی صورت بھی اس سے ظاہر ہے۔ اسی طرح گلِ شگفتہ کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا پریشانی کی صورت ظاہر کر رہا ہے اور گل کی خاموشی اور برجا ماندگی خواب کا عالم دکھا رہی ہے۔ غرض یہ کہ تینوں حالتیں گل پر طاری رہتی ہیں تو باوجود دلجمعی خواب گل پریشان رہتا ہے اور سبب پریشانی کا یہ ہے کہ اندیشہ ہے کہ دیکھئے کہ سازو برگ عافیت اس دار بلا میں ممکن ہوتا ہے یا نہیں۔

۳۔ پشتِ دست' صورت عجز اور حسنِ بدنداں اور کاہ بدنداں گرفتن بھی اظہارِ عجز ہے۔

پس جس عالم میں کہ داغ نے پشتِ دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو۔ ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو۔

ان اشعار کے متعلق مرزا لکھتے ہیں۔' ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر وشوکت کے طرز

میں ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع ہے ۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھے گئے۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اُس دیوان کو دُور کیا' اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیئے۔

۱۵۶

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ!   ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

یہ موضوع بھی غالبؔ کو بہت مرغوب تھا۔ اسے دوسرے الفاظ میں اس طرح نظم کیا ہے۔

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ ویرانی تماشہ کر'   ا   مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

۱۔ گھر میں گھاس اُگنا ویرانی کی نشانی ہے۔ لیکن شاعر عالم وحشت میں اسے بہار قرار دیتا ہے۔ کہتا ہے ہم جنگلوں میں خاک چھانتے پھرتے ہیں اور ہمارے نہ ہونے سے گھر اس قدر ویران ہوا ہے کہ اس کی در و دیوار پر سبزہ اُگ آیا ہے گویا بہار آگئی ہے اس شعر سے مختلف مفہوم پیدا ہوتے ہیں۔ (۱) جب گھر میں اس قدر ویرانی ہے تو پھر بیابانوں میں ہم ناحق پھرتے ہیں (۲) ہم دیوانے ہوئے ہیں کہ گھر کی بہار چھوڑ کر جنگلوں میں پھرتے ہیں اور بہار کی پروا نہیں کرتے (۳) اپنی دیوانگی اور بدنصیبی کی تصویر نہایت سادہ الفاظ میں کھینچ دی ہے (۴) یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ گھر کو چھوڑے ہوئے مدتیں گزر چکی ہیں' اس لئے ویرانی کے سبب سے گھر جنگل بن گیا ہے (۵) نیز اپنی خانہ ویرانی دیکھنے کے لئے اس لئے بے چین ہے جیسے جلوۂ بہار دیکھنے کے لئے ہوتا ہے۔

۱۵۷

سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے   ۱   بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا   ۲   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے باایں ہمہ   ۳   ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی   ۴   یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

رنج رہ کیوں کھینچئے واماندگی کو عشق ہے   ۵   اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتش دوزخ ہمارا دل سہی! ۶ فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب وگِل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ وتاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

۱۔ میرے دل میں حسرت ہے کہ میں ان کی سادگی پر جان دے دوں۔ مگر یہ حسرت پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ قتل کرنے کے لئے ان کے ہاتھ میں خنجر ہے۔ جب خنجر سے قتل کردیں گے تو پھر میں سادگی پر کیسے جان دوں گا۔ گویا مجھے کشتہ خنجر ہونا پڑے گا اور دل کی حسرت نہ نکلے گی۔

طباطبائیؔ:- سادگی سے یہاں ترکِ زینت و آرائش مراد ہے جوکہ بے تلوار کے قتل کرتی ہے یعنی بے تلوار باندھے ہوئے جو عالم اس پر ہوتا ہے میں اسی انداز پر گلا کاٹ کر مرجانے کی حسرت میں ہوں۔ لیکن وہ گلا کاٹنے نہیں دیتا اور خنجر اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ خنجر اس کے ہاتھ میں ہونے سے دو وجہوں سے حسرت نہیں نکل سکتی۔ ایک تو یہ کہ جب خنجر اس کے ہاتھ میں ہوتو وہ سادگی کہاں رہی جس پر ہم جان قربان کرتے تھے اور پھر کے لفظ سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ پہلے بھی ایسا ہوچکا ہے کہ ہم گلا کاٹتے تھے' مگر اس نے خنجر ہاتھ میں لے لیا کہ پھر نہ وہ سادگی باقی رہی۔ جس انداز پر ہم جان دیتے تھے نہ خنجر ہی پر ہم قابو پاسکے (بیخودؔ آسیؔ)

حسرتؔ:-(۱) میرے ہم خیال (۲) اس کی اس سادہ لوحی پر مرجانے کی حسرت ہے' جو ہم کو خنجر سے مارنا چاہتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ وہ ہمیں بغیر خنجر ہی شہید کرسکتا ہے۔

۲۔ حالیؔ:- کسی کے حُسنِ بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہوسکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نہ نکلے وہ سامعہ کے دل میں اس طرح اُتر جائے کہ اُس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی (سعیدؔ حسرتؔ بیخودؔ)

آسیؔ:- (۱) ہم خیال حالیؔ (۲) جو بات وہ کہتا ہے میں خیال کرتا ہوں کہ اسی بات کے سُننے کی مجھے حسرت ہے (۳) اس کی ہر بات اتنی دلفریب ہے کہ اس کے ہونٹوں سے نکلتے ہی میرے دل میں اُتر جاتی ہے۔

۳۔ عاشق اپنے دل کو تسلی دیتا ہے کہ میرا ذکر مجھ سے بہتر ہے کہ ان کی محفل میں ہے' اگر

چہ بہت بُرائیوں کے ساتھ ہے مگر یہ بھی کیا کم شرف ہے کہ وہاں مذکور ہے کیونکہ میں تو باوجود کوششوں کے وہاں تک نہیں پہنچ سکا۔

۴۔ اے ہجوم نا امیدی! بس بس کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لذت جو ہمیں سعیِ بے حاصل میں ملتی ہے' پامال ہوجائے۔ پھر مطلب یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں۔ کہ ہماری سعی و کوشش بیکار ہے۔ پھر بھی ہمیں اس میں ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ بقول طباطبائیؔ نا امیدی کی حالت بُری اور سعی گو بے نیل ومرام ہو۔ مگر لذت سے خالی نہیں۔

۵۔ رنجِ رہ:- راستے کی تکلیفیں÷ واماندگی:- تھکان۔

واماندگی کو میرے قدم سے عشق ہوگیا ہے اور وہ نہیں چھوڑتی کہ میں منزلِ مقصود کی طرف جاؤں اور منزل کے راستے کی تکلیفیں اُٹھاؤ' اس لئے جو قدم راہِ منزل میں رکھا ہے واماندگی کی بدولت وہیں کا وہیں پڑا ہے۔

حسرتؔ:-''چونکہ واماندگی سے ہمارا عاشقانہ تعلق ہے اس لئے ہمارا جو قدم اُٹھ نہیں سکتا (یعنی وامانده ہے) وہ گویا منزل میں ہے یعنی اپنے مقصد کو پہنچ چکا ہے۔ پس پھر ہم رنج راہ کیوں اُٹھائیں''۔

سعیدؔ نے دونوں مفہوم لکھے ہیں۔ آسیؔ حسرتؔ کے ہم خیال ہیں۔ طباطبائیؔ (۱) میرے ہم خیال (۲) ہم واماندگی کے نیازمند ہیں کہ اس کی بدولت اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم ہے منزل میں ہے۔

۶۔ معشوق عاشق سے کہتا ہے کہ تمہارے دل میں دوزخ کی آگ بھری ہوئی ہے۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ اچھا یونہی سہی کہ ہمارا دل جلوہ زار دوزخ ہے مگر مہربانی فرماکر یہ بتلایئے کہ فتنہ شورِ قیامت کس کے خمیر میں ہے یعنی اگر میرا دل جلوہ زار دوزخ ہے تو تمہارا خمیر بھی تو فتنہ شورِ قیامت سے اُٹھایا گیا ہے۔ اس شعر میں نکتہ یہ ہے کہ آتشِ دوزخ قیامت ہی کے دن بھڑکائی جائے گی۔

۷۔ غالب کا دلِ شوریدہ ایک طلسمِ پیچ وتاب بنا ہوا ہے اور تمہاری تمنا اس میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس لئے تم اپنی تمنا پر رحم کرو اور اُسے اس طلسمِ پیچ وتاب سے نکال لو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم غالبؔ پر رحم نہیں کرتے تو نہ کرو۔ لیکن اپنی تمنا پر تو رحم کرو کہ وہ سخت مشکل میں پھنسی ہوئی ہے۔

خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ تمنا اپنی نکالنا چاہتے ہیں، لیکن اسے معشوق کی تمنا قرار دیکر معشوق کو آمادہ کرتے ہیں کہ اپنی تمنا پر رحم کرے۔ اس شعر میں تمنا بر آنے کا مضمون بالکل نئے انداز سے ادا کیا گیا ہے۔

۱۵۸

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی ۱ دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق ۲ تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں ۳ اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں ۴ بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا ۵ موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی ۶ اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا ۷ مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا ۸ کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں ! ۹ وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی!

۱۔ تیری نگاہ کا تیر دل کو چیرتا ہوا جگر تک پہنچ گیا۔ چونکہ دل و جگر دونوں تیر نگہ سے زخمی ہونے کے آرزومند تھے۔ اس لئے دونوں اس ادا سے خوش ہوگئے۔

۲۔ عاشق کو زخمِ جگر کی پردہ داری سے سخت تکلیف تھی جب اس کا سینہ شق ہوگیا تو اس کو عجب سرور حاصل ہوا۔ کیونکہ اُسے زخمِ جگر کو چھپائے رکھنے کی تکلیف سے نجات مل گئی اور وہ کھلم کھلا لذتِ فراق کے لطف اُٹھانے لگا۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں ختم ہوگئیں۔ جب ساری ساری رات شراب نوشی میں مشغول اور بدمست رہا کرتے تھے۔ جب صبح کی ٹھنڈی ہوا چلتی تو بے خبر ہو کر سوجاتے اور نیند کے لطف اُٹھاتے تھے۔ بس اب بیدار ہو جایئے کہ وہ لذتِ خوابِ سحر جاتی رہی۔

طباطبائی:۔ اگر اس شعر کے الفاظ معنی حقیقی پر محمول کریں تو کچھ لطف نہیں۔ غالباً مصنف کو استعارہ مقصود ہے یعنی بادۂ شبانہ سے نشہ شباب اور سحر سے پیری کا استعارہ ہے اور اُٹھنے کا خطاب

اپنے نفسِ غافل کی طرف ہے۔ جملہ شارحین نے یہی معنی بیان کئے ہیں۔

۴۔ بقول طباطبائی یہ مضمون بہت ہی پامال ہے اور غالب کے مرتبہ کلام سے گرا ہوا ہے۔

مضمون پامال سہی۔ طرزِ بیان نے اسے بلند کردیا ہے۔

ہوا کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ اے ہوا میں تیرا ممنون ہوں کہ تیری اس مہربانی کی بدولت میرے دل میں سے بال و پر کی ہوس جاتی رہی۔ اگر تو یہ مہربانی مجھ پر صرف نہ کرتی تو پھر مجھے بال و پر کی آرزو ہوتی کہ اُڑ کر اس کی گلی میں جاؤں اور اپنی دیرینہ آرزو پوری کروں۔

۵۔ گل کترنا:۔ شگوفہ چھوڑنا، یعنی کوئی ایسی بات کرنا جس سے فساد پیدا ہو اور آپ الگ رہیں۔ خرامِ یار کی موج اس لئے کہا ہے کہ موج کے تحرک سے سطحِ آب پر نقش پیدا ہو جاتے ہیں (ا) کہتے ہیں جہاں جہاں سے موجِ خرامِ یار گزری ہے وہاں گل بکھیرتی چلی گئی ہے گویا اس کے نقشِ قدم دیکھنے والے اُن پر فدا ہو رہے ہیں (آسی)

۶۔ موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر (شگوفہ چھوڑ) گئی۔ ہے کہ اس کے دلفریب نقوش دیکھ کر عشاق واغیار میں باہم فساد ہو رہا ہے یا اس کا نقشِ قدم ایسا دلفریب ہے کہ دُنیا اس کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہے (سعید) بیخود نے دونوں مفہوم لکھے ہیں۔

۶۔ بوالہوس:۔ ہوس پرست۔

حُسن پرستی اصل میں اہلِ نظر کا شیوہ تھا کہ وہ حُسن کی خوبیاں دیکھ کر اس کی قدر کیا کرتے تھے لیکن اس زمانے میں ہوس پرستوں نے حُسن پرستی اپنا شعار بنالیا ہے۔ چونکہ ان کا عشق صادق نہیں ہوتا ہوس پرستی پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اہل نظر یعنی عشاق صادق کا اعتبار اور وقار بھی جاتا رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حُسن پرستی اب معزز لوگوں کا شیوہ نہیں رہا بلکہ ایسے ویسے لوگوں کا پیشہ ہوگیا ہے اس لئے اہل نظر کے عشقِ صادق کی قدر جاتی رہی ہے۔

۷۔ میری نگاہ تیرے رخ پر پہنچ کر ایسی خود رفتہ اور بدمست ہوئی کہ وہ بکھر گئی اور بکھر جانے سے وہ دیدار میں مانع ہوئی۔ گویا نگاہ بکھر جانے اور مانع دیدار ہونے سے نقاب بن گئی۔

نگاہ کو تار سے تشبیہ دی ہے۔ اس مضمون میں ندرت یہ ہے کہ تارِ نگاہ کے بکھرنے کو مانع دید ہونے سے نقاب کا تصور پیدا ہوا کیونکہ نقاب بھی تاروں سے بنائی جاتی ہے۔

۸۔ دی:۔ گزشتہ کل۔ فردا:۔ آنے والی کل۔

(ا) حالی کہتا ہے کہ تمہارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہوگئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی اور ایسا ہی قیامت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بہ زمانہ حال ہو جائیں گے پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گزر گئی۔ قیامت گزر جانے کے دو معنی ہیں نہایت سختی کا زمانہ گزر جانا اور خود قیامت کا آجانا۔

۲۔ سیدھے اور صاف معنی یہ ہیں کہ کل جب تم ہمارے پاس سے چلے گئے تو ہماری ایسی بُری حالت ہوئی کہ قیامت ہی برپا ہوگئی اور اس حالت میں فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا۔ گویا گزشتہ کل ہی میرے لئے فردائے قیامت بن گئی (آسی، سعید)

۹۔ افسوس صد افسوس اسداللہ خاں تمہیں زمانے نے مار ڈالا۔ یعنی محبت کی بدولت تم موت آنے سے پہلے مر گئے۔ اب وہ تمہارے جوش اور ولولے اور جوانی کیا ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ سب غارت ہو گئے۔

طباطبائی:۔ نام کے ساتھ خاں کا لفظ لانے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ کسی زمانے میں قوت و سطوت حاصل تھی، جواب نہیں رہی۔

۱۵۹

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے	۱	حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل	۲	میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم	۳	ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم	۴	میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
تجھ کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا	۵	فرصت کشا کشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں	۶	جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا!
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

۱۔ تسکین قلب اس طرح ہوسکتی ہے کہ تو مِل جائے اور ذوق نظر سے یہ مطلب ہے کہ تُو نہیں تو کوئی تیرا ہم شکل ہی مِل جائے اور اسے دیکھ کر ہمارا ذوقِ نظر پورا ہو جائے۔ کہتا ہے اگر جنت میں ہمارا ذوقِ نظر پورا ہو جائے تو ہم تسکینِ قلب کا ماتم نہ کریں اور اسی پر قناعت کرلیں مگر مصیبت یہ ہے کہ بہشت میں کوئی حُور تیری ہم شکل نہیں۔ اس لئے ہم ذوقِ نظر اور تسکینِ قلب دونوں سے محروم ہیں۔

۲۔ مجھے قتل کرنے کے بعد اپنی گلی میں دفن نہ کر، کیونکہ رشک کی وجہ سے مجھے یہ گوارا نہیں کہ میرے مدفن کے پتہ سے لوگوں کو تیرا گھر ملے۔ اس شعر کے کئی پہلو ہیں مثلاً (۱) لوگ یہ کہیں گے کہ جس گلی میں غالب کی قبر ہے وہاں فلاں شخص ہے (۲) اس سے تیرے قاتل ہونے کا حال کُھل جائے گا۔ (۳) اور تجھ سے مواخذہ ہوگا (۴) تیری بدنامی ہوگی (۵) تیرے نام کے ساتھ میں اپنا ذکر پسند نہیں کرتا (۶) مجھے عشق میں قتل ہونے سے شہرت مطلوب نہیں۔

۳۔ ویسے تو ہر شب کو جتنی تھوڑی بہت شراب مل جاتی ہے، ہم پی ہی لیتے ہیں۔ لیکن آج تم ساقی بنے ہو، اپنی ساقی گری کی لاج رکھو اور خوب جی بھر کر پلا دو۔

حسرت:۔ بے اندازہ حوصلہ دو۔

آسی:۔ ساقی دو چار جام پلا چکا ہے اور ان کا دل سیر نہیں ہوا برابر سوال جاری ہے۔ وہ کہتا ہے بس جتنی تُو پیتا ہے، اس کے موافق ہم تجھے پلا چکے اب نہ دیں گے۔ یہ کہ ساقی گری کی الخ......

۴۔ غالب ایک خط میں اس کی شرح لکھتے ہیں:۔ شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی۔ مگر کھٹکا یہ کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ایک دوست اس عاشق کے پاس ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتدالیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کرے گا خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد مکتوب الیہ کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہوگیا۔ کیسا خط، کیسا جواب، دیوانہ بن کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس واقعہ کے بعد ندیم سے کہتا کہ غیب دان تو خدا ہے۔ کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر ہے۔ اے ندیم تجھ سے کچھ

کلام نہیں۔ لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا۔

۵۔ کہتے ہیں اگر غمِ پنہاں کی کشاکش سے ہمیں نجات مل جائے یعنی اگر غمِ دل ہماری روک تھام نہ کرے تو پھر ہم تمہیں بتائیں کہ مجنوں نے کیا کیا تھا اور ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ''مجنوں نے کیا کیا'' معنی خیز ہے۔ مثلاً یہ کہ ہم مجنوں کی طرح جنگل میں نکل جائیں اور مجنوں کا نمونہ بن کر دکھائیں، یا یہ ثابت کر دکھائیں کہ مجنوں نے کچھ نہ کیا تھا اور ہم کچھ اس سے بڑھ چڑھ کر کر سکتے ہیں۔

بیخودؔ:۔ غمِ پنہاں سے اپنی پردہ دری اور رسوائی کا خیال ہے کہ وہ ہمیں جنگل کی طرف جانے سے روکتا ہے اور کھینچ کھینچ کر واپس لے آتا ہے۔ ورنہ ہم تمہیں دکھاتے کہ مجنوں نے عاشقی کو کس حد تک ترقی دی ہے۔

۶۔ خضر بھٹکے ہوئے مسافروں کی رہنمائی کرنے میں مشہور ہیں، کہتے ہیں ہم پر یہ لازم نہیں آتا کہ ہم حضرت خضر کی پیروی کریں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ راہِ سلوک میں ہم گامزن تھے۔ اور اس سفر میں ہمیں ایک بزرگ ہم سفر مل گئے تھے جو حضرت خضر کہلاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے ہم بھٹکے ہوئے تھے ویسے ہی خضر بھی تھے، ہمارا مرتبہ سلوک ان سے کچھ کم نہ تھا۔

۷۔ اے ساکنانِ کوچہ دلدار، اگر تمہیں کہیں غالبؔ خستہ چلتا پھرتا یا گرا پڑا مل جائے تو ذرا دیکھنا کہ اس کی کیا حالت ہے یا اس کا خیال رکھنا۔

۱۶۰

کوئی دن گر زندگانی اور ہے ۱ اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں ۲ سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھیں ہیں اُن کی رنجشیں ۳ پر کچھ اب کے سر گرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر ۴ کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم، ۵ وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

۱۔ طباطبائی:۔ بندش کی خوبی اور محاورہ کے لطف نے اس شعر کو سنبھال لیا، ورنہ آخری مصرعہ مبہم ہے۔ حسرتؔ، بیخودؔ اور سعیدؔ اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ کچھ روز اور زندگی ہوئی تو ہم ترکِ محبت کی کوشش کریں گے۔

غالبؔ نے اپنے ایک خط میں اس شعر کی شرح ان الفاظ میں بیان کی ہے "اس (شعر) میں کوئی اشکال نہیں ہے، جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا مقصود کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا پیہم کہتا ہے کہ میں کچھ کروں گا۔ خدا جانے شہر یا نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس کو چلا جائے" (سعیدؔ)

آسیؔ:۔ حقیقتاً دوسرا مصرعہ بہت سے معانی پیدا کرتا ہے جو عین فصاحت ہے۔

۲۔ حق یہ ہے کہ آتشِ دوزخ میں بہت گرمی ہے۔ لیکن اس میں ایسی گرمی نہیں جیسی کہ سوزِ غم ہائے نہانی میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سوزِ غم آتشِ دوزخ سے زیادہ سخت ہے۔

۳۔ سر گرانی:۔ رنجش، خفگی۔

ہم نے ان کی رنجشیں اور خفگیاں بارہا دیکھی ہیں لیکن اب کی مرتبہ ان کی خفگی کسی اور ہی قسم کی ہے گویا یہ خفگی ایسی نہیں کہ پھر صفائی ہو جائے۔

۴۔ نامہ بر نے ان کا خط مجھے دے دیا ہے لیکن وہ خط دے کر میرا منہ تک رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے علاوہ ان کا کچھ زبانی پیغام بھی ہے جسے پہنچانے میں وہ ہچکچا رہا ہے۔

بقول طباطبائی شاید کچھ گالیاں بھی کہلا بھیجی ہیں کہ ان کو دہرانے میں وہ حجاب کرتا ہے یا بقول آسیؔ یہ کہہ دیا ہے کہ اب تو میں نے جواب دے دیا ہے آئندہ مجھے کوئی خط نہ لکھنا۔

۵۔ قاطع:۔ قطع کرنے والے ÷ اعمار:۔ جمع عمر کی ÷ نجوم:۔ ستارے ÷ بلائے آسمانی:۔ مراد معشوق ÷

اکثر ستارے عمروں کو قطع کرنے والے ہیں۔ یعنی اُن کے اثرِ بد سے انسان مر جاتا ہے لیکن جس بلائے آسمانی (ستمگر معشوق) سے میرا سابقہ پڑا ہے، وہ ان ستاروں سے بھی زیادہ تباہ کُن ہے، جو قاطعِ زندگی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق عمر قطع کر کے مصائب کا خاتمہ نہیں کر دیتا بلکہ وہ زندگی کو موت سے بدتر بنا دیتا ہے۔

۶۔ مرگِ ناگہانی:۔ وہ موت جو بِن کہے ایک دم آ جائے۔

کہتے ہیں سب بلائیں ہم پر ختم ہو چکیں اور ہم نے انہیں برداشت کر لیا۔ اب فقط مرگِ ناگہانی باقی رہ گئی ہے۔ طباطبائی لکھتے ہیں کہ یہاں مرگِ ناگہانی سے محض موت مراد ہے۔ چونکہ موت کہہ کر نہیں آتی بلکہ ناگہانی آتی ہے۔

۱۶۱

کوئی امید بر نہیں آتی، ۱ کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے ۲ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی ۳ اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ۴ پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ۵ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں ۶ میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا ۷ بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ۸ کچھ ہماری خبر نہیں آتی!
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی ۹ موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

۱۔ نہ تو میری کوئی اُمید بر آتی ہے اور نہ امید بر آنے کی صورت نظر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام عمر نامرادی میں بسر ہو گئی اور آئندہ بھی یہی اُمید ہے۔

آسی نے دُوسرا مفہوم یہ لکھا ہے کہ اتنی امید بھی پوری نہ ہوئی کہ کوئی صورت معشوق کے وصل کی نظر آ جائے۔

۲۔ موت تو اس لئے نہیں آتی کہ اس کے آنے کا دن مقرر ہے لہٰذا وہ اپنے وقت پر آئے گی۔ لیکن نیند کو کیا ہو گیا ہے وہ موت تو نہیں ہے کہ وقت پر ہی آئے گی۔ اسے تو آنا چاہئے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب موت کا ایک دن مقرر ہے تو پھر موت کے خوف کی وجہ سے نیند رات بھر کیوں نہیں آتی۔

۳۔ اس شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ بقول طباطبائی میرؔ کو بھی اس پر رشک کرنا چاہئے۔ کہتے ہیں پہلے یہ حالت تھی کہ کبھی مجھے اپنے حالِ زار پر ہنسی آ جاتی تھی کہ میں نے اپنی کیسی شکل بنالی ہے لیکن اب افسردگی کا یہ عالم ہے کہ مجھے اپنے حال پر بھی ہنسی نہیں آتی۔

۴۔ طاعت:۔ عبادت۔

میں عبادت و زہد کے ثواب کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن کیا کروں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں کہ وہ اس طرف مائل ہی نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ عبادت خلوصِ قلب سے کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ درجہ ابھی حاصل نہیں ہوا۔

۵۔ کچھ ایسی ہی بات ہے جس کی وجہ سے میں بات نہیں کرتا ورنہ یہ بات نہیں کہ میں بات کرنی نہیں جانتا۔ پہلا مصرعہ بہت سے پہلو رکھتا ہے مثلاً (۱) میرے خاموش رہنے میں کچھ مصلحت ہے جسے میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ (۲) رسوائی معشوق کے خوف سے بات نہیں کرتا (۳) اسے معشوق کے کچھ راز معلوم ہو گئے ہیں (۴) دل گلہ مند ہے، منہ کُھلے گا تو شکائتیں منہ سے نکلیں گی، شکائتیں سُن کر وہ ناراض ہو جائے گا (۵) شکائتیں کون سُنتا ہے اس لئے خاموش رہنا ہی بہتر ہے (۶) ممکن ہے معشوق ہی نے بولنے سے منع کر دیا ہو (۷) عشق نے منہ پر مہر لگا دی ہو۔

ہمیں عشق میں میرؔ چپ لگ گئی ہے   نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت

۶۔ اگر میں نہ چیخوں اور اُن تک میری گریہ وزاری کی آواز نہ پہنچے تو وہ کہتے ہیں آج وہ شور مچانے والا کہاں گیا، اس کی آواز نہیں آتی۔ اس کے کئی ایک پہلو ہیں مثلاً (۱) میری نالہ کشی وہ پسند کرتے ہیں اور اس میں ان کو لطف آتا ہے اس لئے میں کیوں نہ چیخوں (۲) میری گریہ وزاری کو وہ اپنی شہرت کا ذریعہ خیال کرتے ہیں (۳) اگر میں نہیں روتا تو وہ مجھ کو بُلاتے ہیں اور بُلا کر نالہ و فریاد کی تاکید کرتے ہیں (۴) مجھ پر ظلم کرتے ہیں تاکہ میں ضرور نالہ کشی کروں۔

۷۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چارہ گر کو یقین نہیں آتا کہ عاشق کے دل میں داغ ہے، عاشق

اس سے کہتا ہے، اے چارہ گر تجھے داغِ دل نظر نہیں آتا تو کیا اس کی بو بھی نہیں آتی۔ گوشت جلنے کی بو بہت جلد آتی ہے اس لئے اس سے کہتے ہیں کہ اگر تو دیکھ نہیں سکتا ہے تو کیا تیری قوتِ شامہ بھی سلب ہوگئی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں استفہام انکاری استفہام اقراری بن کر طنز کی صورت پیدا کر رہا ہے۔

آسیؔ:۔ اے چارہ گر تجھے میری محبت سے انکار ہے تو کیا میرے اندازِ مجنونانہ سے بھی پہچان نہیں سکتا۔

٨۔اب ہماری خود رفتگی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ ہمیں خود بھی اپنے حال کی کچھ خبر نہیں رہی۔ پھر دوسروں کا تو پوچھنا کیا ہے۔

٩۔میں مرنے کی آرزو میں مرا جاتا ہوں یعنی مجھے موت کا بے حد شوق اور انتظار ہے مگر موت نہیں آتی۔ گویا مجھے آرزوئے موت میں موت آتی ہے۔ حقیقی معنوں میں میں نہیں مرتا۔ موت کے آنے نہ آنے سے زندگی عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔

بیخودؔ:۔ رات دن سینکڑوں آدمیوں کا مرنا سُنتے ہیں مگر مجھ کو موت نہیں آتی۔

١٠۔ مگر:۔شاید۔

غالبؔ! تم خانہ کعبہ کی زیارت کا ارادہ رکھتے ہو۔ شاید تمہیں وہاں جاتے ہوئے شرم نہیں آئے گی۔ بندۂ خدا ساری عمر تو تم نے شاہد پرستی شراب خوری اور قماری بازی میں صرف کی اب وہاں جا کر خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔

١٦٢

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ١ آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ٢ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں ٣ کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ٤ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ٥ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے ٦ نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے
لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں ٧ ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید ٨ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا ٩ اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں ١٠ میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ!
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

١۔درد سے مراد عشق ہے۔ اپنے دل کو ملامت کرتے ہیں کہ اے نادان تجھے ہوا کیا ہے ہوش کر۔ باز آ۔ جس مرض میں تو مبتلا ہورہا ہے اس کا کوئی علاج نہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ تجھے ہوا ہی کیا ہے جس کا معالجہ کیا جائے۔

تیسرا مفہوم۔دل ناداں تجھے کیا ہوگیا ہے۔ اپنا مرض بتا۔ زیادہ نہ چھپا۔ تاکہ میں اس کا علاج کروں یا یہ کہ تو اپنی حرکتوں سے باز آئے تو تیرے علاج کی طرف رجوع کروں۔

٢۔ حالیؔ:۔ گویا ابھی عشق کے کوچہ میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں جو راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں، اُن سے ناواقف ہے اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے بقول بیخودؔ یہ شعر بھی مرزا کے نشتروں میں سے ہے۔

آسیؔ:۔"یہ سُنا ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے مگر یہاں عجب حالت ہے کہ ہم اس کے مشتاق ہیں اور وہ ہم سے بیزار ہے"۔

٣۔معشوق عاشق سے کوئی بات نہیں کرتا۔ عاشق خاموش رہتا ہے لیکن دل ہی دل میں اُبل رہا ہے اور تلا بیٹھا ہے کہ ذرا سا موقعہ مل جائے تو داستانِ دل کے دفتر کھول بیٹھے۔ آخر مایوس ہوکر کہتا ہے میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں، گونگا نہیں ہوں، کاش تم مجھ سے میرا مدعائے دل پوچھو، تو پھر میں اپنی داستانِ غم بیان کروں۔ (آسیؔ، سعیدؔ)

بیخودؔ و طباطبائی:۔ تم غیروں سے استفسار حال کرتے ہو، مجھے بھی خدا نے زبان دی ہے۔

مجھ سے بھی پوچھ کر دیکھو کہ تیرا مدعا کیا ہے۔

۴۔ یہاں سے اشعار قطعہ بند ہیں۔ اے خدا جب کہ تیرے سوا کوئی موجود نہیں ہے تو پھر یہ ہنگامہ کیا۔

۵۔ یہ پری چہرہ اور حسین لوگ کیسے ہیں اور یہ ان کے ناز و انداز کیا چیز ہیں۔

۶۔ یہ عنبریں زلفوں کے شکن کیسے ہیں اور یہ نگہ چشم سرگیں کیا بلا ہے۔

۷۔ یہ سبزہ و گل اور بہار کہاں سے آئی ہے۔ ابر کیا ہے، ہوا کیا ہے ان پے درپے استفسارات سے مطلب یہ ہے کہ جب خدا کی ذات کے سوا، تمام چیزیں ہیچ اور معدوم ہیں تو پھر یہ چیزیں کیا ہیں جو انسان کے دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور اطمینان کے ساتھ اسے ذات باری کی طرف رجوع ہونے سے روکتی ہیں۔ اشعار متذکرہ ان ہنگامہ خیز اشیاء کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کو ہم ضرور ذات باری کی طرف رجوع کریں۔ لیکن یہ دل فریبیاں ہمارے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور سکونِ قلب سے ذات باری کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتیں۔

۸۔ عشق نے عقل خبط کردی ہے کیونکہ ہم ان لوگوں سے وفا کی امید لگائے بیٹھے ہیں جن کو معلوم نہیں کہ وفا کس چیز کا نام ہے بقول آسی جفا کاروں سے امیدِ وفا خیالِ خام ہے طباطبائی و بیخود کا خیال ہے کہ وہ کمسنی کی وجہ سے ایسے نادان ہیں کہ وفا ہی کو نہیں جانتے۔

۹۔ ہم درویشوں کی یہی صدا ہے کہ "ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا۔" الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود ایک فقیر ہیں اور یہ صدا لگا کر معشوق کو بھلائی کرنے پر آمادہ کر رہے ہیں۔

۱۰۔ میں اوروں کی طرح خالی دعائیں دینی نہیں جانتا ہوں بلکہ اپنی جان تم پر نثار کرتا ہوں۔

آسی نے دوسرا مفہوم یہ پیدا کیا ہے کہ میں اپنے مرنے کی دُعا کیوں مانگوں۔ اے لو، اپنی جان دیئے دیتا ہوں۔

۱۶۳

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے ۱ اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت ۲ کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم ۳ آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے!

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین ۴ ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے!

جلاّد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ۵ ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت ۶ دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں ۷ اُس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر ۸ اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

اُس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

۱۔ غالیہ اُس مرکب خوشبو کو کہتے ہیں جو مشک و عنبر اور کافور وغیرہ کو ملا کر بناتے ہیں۔ غالیہ مو:- مشکیں و معنبر زلفوں والا محبوب۔

اے ہمدمو! تم میری حالت زار کو دیکھ کر یہ دُعا کرتے ہو کہ وہ عنبریں زلفوں والا محبوب آ جائے تا کہ غالب کو سکون قلب حاصل ہو جائے، لیکن میری تمنا یہ ہے کہ تم میں سے کوئی گھبرا کے کہے کہ لو وہ آ گئے۔

۲۔ میں کشمکش نزاع میں مبتلا ہوں۔ اس لئے اُن سے کلام کرنے کی مہلت نہیں۔ لیکن اے جذبِ اُلفت اتنا تو کر کہ تو اُن کو میری عیادت کے لئے کھینچ لا۔ تا کہ اور کچھ نہیں تو مرتے وقت میں اُنہیں دیکھ ہی لوں۔

۳۔ صاعقہ:- گرنے والی بجلی۔ سیماب:- پارہ۔ یہ دونوں چیزیں ایک جگہ قرار نہیں پاتیں۔

اگر چہ معشوق آیا۔ لیکن اس کا آنا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بجلی کی طرح تڑپتا، شعلہ کی طرح بھڑکتا اور سیماب کی طرح مچلتا ہوا آیا۔ گویا ایک دم بھر بھی چین سے نہ بیٹھا کہ چل دیا۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہم لوگوں کو دُنیا میں آنا سمجھ میں نہیں آتا کہ شعلہ برق و سیماب کی طرح ایک دم کو قرار نہیں ملتا۔ جتنی مدّت زندہ رہتے ہیں۔ بے قرار ہی رہتے ہیں۔

۴۔ حاشی:- نکیرین وہ فرشتے جو دفن ہونے کے بعد مُردے کا حساب لینے قبر میں آتے

ہیں۔ بادۂ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی۔ ازراہِ شوخی کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں تاکہ نکیرین اس کی بو کی کراہت سے بغیر سوال و جواب کئے چلے جائیں۔

۵۔ یہ شعر تصوف میں ہے کہتے ہیں کہ ہم ہر چیز میں محبوبِ حقیقی کا جلوہ دیکھتے ہیں اس لئے نہ تو جلاد سے جھگڑتے ہیں اور نہ واعظ سے لڑتے ہیں۔ گویا ہم یہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہی ہے کہ اپنا بھیس بدل کر مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش   من انداز قدت را می شناسم

۶۔ اے اہلِ طلب یہ طعنہ کون سُنتا کہ اُس نے رازِ معرفت کو ڈھونڈا اور نہ پایا۔ اس لئے جب میں نے دیکھا کہ وہ کسی طرح نہیں ملتا تو اپنے آپ ہی کھو دیا تاکہ یہ طعنۂ نایافت سُننے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہے۔

۷۔ اپنا شیوہ اور دستور یہ نہیں ہے کہ مایوس ہو کر ہمت ہار دیں۔ جب ہم نے دیکھا کہ معشوق مجازی کے در پر ہمیں بار نہیں تو ہم خانۂ کعبہ ہی سے ہو آئے کہ وہ معشوق حقیقی کا گھر ہے۔ مطلب یہ نکلا۔ مایوسی نے ہمارے درجہ کو اور بھی بلند کر دیا۔

آسی، طباطبائی اور سعید کا خیال ہے کہ شاعر خانہ کعبہ کو جانا ہرزہ گردی اور مشغلۂ بیکاری سمجھتا ہے۔ بیخود لکھتے ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا پتہ کہیں نہیں ملتا تو جا کر خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہو آئے یعنی یہاں یار نہ ملا تو یار کے گھر ہی کو دیکھ آئے۔

۸۔ ہم نفس:۔ دوست۔ اثرِ گریہ میں:۔ اثرِ گریہ کے بارے میں۔

میرے دوستوں نے ازراہِ ہمدردی معشوق کے پاس جا کر اثرِ گریہ کے بارے میں گفتگو کی اور کہا کہ غالب دن رات روتا ہے اور رو رو کر اس کا بُرا حال ہو گیا ہے۔ دیکھنا اس کی گریہ وزاری تمہیں برباد کر دے گی۔ اس بیان سے معشوق پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر گریہ میں اثر ہوتا تو اس پر ضرور کچھ نہ کچھ اثر ہوتا۔ چنانچہ اُس نے میرے دوستوں کو یہی دلیل پیش کر کے قائل کر دیا اور اُنہوں نے بھی مان لیا کہ ہاں واقعی گریہ وزاری میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کے ہم خیال ہونے سے معشوق خوش ہو گیا۔ گویا یہ لوگ تو اس سے اچھے رہے لیکن مجھ کو ڈبو آئے "ڈبو آئے" کے

متعدد مفہوم ہیں۔ بقول بیخود میرے گریہ کی بے اثری کا قائل ہو جانا میرے لئے شرمندگی کا سبب تھا۔ بقول آسی، کبھی کبھی جو میں اُس کو اپنے نالہ و فریاد کے اثر کی دھمکی دیتا تھا۔ اب وہ گئی۔

حسرت، سعید:۔ اس طرح سے اس پر میرے رونے کی بے اثری ثابت ہو گئی۔ بیخود نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے کہ معشوق سے میرے گریہ کا حال کہہ دیا۔ جس کو میں ہمیشہ پوشیدہ رکھتا تھا۔ اب اس حال کے ظاہر ہو جانے کے بعد میں اس کی نگاہوں میں حقیر ہو جاؤں گا۔

آسی کی شرح میں ''اچھے رہے آپ اس سے'' کی شرح درست نہیں لکھتے ہیں کہ اس حساب سے دوست تو اچھے رہے کہ اُنہوں نے میرے اُوپر احسان ثابت کر دیا۔ سعید نے بھی ''اس سے'' کی تشریح مبہم رکھی ہے لکھتے ہیں ''ایسا کرنے سے وہ اپنے آپ تو سرخرو بن گئے الخ''۔

۹۔ تقدیر سے مُراد بُری تقدیر ہے۔ اس بزمِ ناز کی کیا بات ہے یعنی وہ ایسی پُر لطف ہے کہ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہم وہاں گئے اور اس سے لطف اندوز ہوئے۔ اس وقت معاً ہمیں یہ خیال آیا کہ غالب افسوس تیری قسمت کہ تو اس انجمن ناز کے لطفِ صحبت سے محروم ہے۔

دُوسرے مصرعہ کی شرح میں طباطبائی لکھتے ہیں۔ تیرے صدمہ دوری کا حال ہم اس سے جا کر بیان کر آئے۔ آسی نے دونوں مفہوم بیان کئے ہیں۔

۱۶۴

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے ۱ سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن، ۲ آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز ۳ پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم دلّالِ جنسِ رسوائی ۴ دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی، ۵ وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر، ۶ محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے ۷ روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں، ۸ پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز ۹ گرم بازارِ فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر ۱۰ زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال، ۱۱ ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب، ۱۲ اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا ۱۳ آج پھر اُس کی رو بکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۱-میرا دل پھر بے چین ہو رہا ہے اور میرا سینہ عشق کاری زخم کھانے کا مشتاق ہے مطلب یہ ہے کہ دل و جگر کسی کی تیز نگاہ کا نشانہ بننا چاہتے ہیں۔

۲-چونکہ لالہ بونے کی فصل آرہی ہے اس لئے میرا ناخنِ غم پھر جگر کو کریدنے لگا ہے۔ الفاظ نہایت مناسب صرف کئے گئے ہیں۔

۳-نیاز:- حاجت۔ پردۂ عماری:- وہ محمل جس میں معشوق فروکش ہے۔

کہتے ہیں پھر ہماری نگاہِ نیاز مند کا قبلہ وہی پردہ عماری بن گیا ہے جس میں معشوق فروکش ہے یعنی ہم پردۂ عماری کی طرف متوجہ ہیں۔ پردۂ عماری اور غلافِ خانہ کعبہ کی رعایت ملحوظ رہے۔

۴-ہماری آنکھ دلال ہے اور وہ جنسِ رسوائی کی دلالی کر رہی ہے۔ ذوقِ خواری کی وجہ سے دل اور جنسِ رسوائی کا خریدار بنا ہے مطلب یہ ہے کہ آنکھ ہی دلالی کر کے دل کو سودائے عشق میں پھنساتی ہے۔

۵-پہلے شعر کی تفصیل اس شعر میں بیان کرتے ہیں کہ دل پھر اسی طرح سو سو رنگ سے نالہ فرسائی میں مشغول ہے اور میں پھر وہی سینکڑوں طرح سے بے قرار ہوں۔ گویا کسی پہلو چین نہیں۔

۶-یار کے خرامِ ناز کی آرزو میں میرا دل پھر محشرستان بے قراری بن گیا ہے خرام یار کو محشر سے تشبیہ دیا کرتے ہیں اور محشرستان اس مقام کو کہتے ہیں جہاں بیشمار قیامتیں برپا ہوں دل کے محشرستان بے قراری بننے سے یہ مطلب ہے کہ دل میں بے قراریوں کے ہزار ہا حشر برپا ہیں۔

۷-حسرت:- یعنی جلوۂ یار پھر سرناز ہے اور جاں سپاری عشق کا بازار گرم ہے (سعیدؔ)

طباطبائیؔ:- جان سپاری عاشق کا روزِ بازار ہے کہ جلوۂ معشوق متاعِ ناز کو عرض کر رہا ہے کہ

کون اس کا خریدار ہے۔

آسیؔ:- جلوۂ یار نے ظاہر ہو کر سربازار جاں سپاریِ عاشق کو آب و تاب اور رونق دی ہے اور جاں سپاری کا بازار گرم ہے۔

بیخودؔ:- جلوۂ یار متاعِ ناز و غرور کو دکھا کر کہہ رہا ہے کہ کون عاشقِ جانباز اس کا خریدار بنتا ہے۔ گویا بازار جاں سپاری کی ہر روز گرم بازاری ہے۔

۸-پھر اسی بے وفا پر مرتے ہیں اور ہماری زندگی پھر پہلی طرح وقفِ آلام ہے یا بقول طباطبائیؔ جس پر مرتے ہیں اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں۔

۹-عدالت ناز کے دروازے پھر کھل گئے ہیں اور پھر فوجداری کا بازار گرم ہو گیا ہے یعنی عدالت ناز کے کھلنے سے عشاق میں وارداتیں ہونے لگیں اور ان کے مقدمات عدالت میں پیش ہونے لگے یا بقول بیخودؔ فصلِ گل کے آتے ہی پھر جنون و عشق کے ولولے دلوں میں پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

۱۰-جہاں میں ایک اندھیر ہو رہا ہے کیونکہ زلف سرشتہ داری کے عہدہ پر فائز ہے اُس نے تہلکہ مچا رکھا ہے، سرشتہ اور اندھیر زلف کے مناسبات بھی ہیں۔

۱۱۔ ''سوال دینا'':- قانونی زبان میں درخواست دینے اور دعویٰ دائر کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر پارۂ جگر نے دعویٰ دائر کیا ہے اس لئے فریاد و آہ و زاری جوابدہی کے لئے جمع ہوئی ہیں کہ یہ دعویٰ جھوٹا ہے۔

۱۲-اس مقدمہ میں گواہ عشق پھر طلب ہوئے ہیں کہ اپنا بیان دیں اور اشکباری کا حکم جاری ہوا ہے یعنی اشکباری کو بھی طلب کیا گیا ہے۔

۱۳- روبکاری:- پیشی۔ تاریخ۔ حاضری۔

دل اور مژگاں کے درمیان جو مقدمہ تھا۔ آج پھر اس کی تاریخ ہے کہ اپنا اپنا دعویٰ اور جوابِ دعویٰ پیش کریں۔

۱۴-غالبؔ یہ بیخودی اور خود فراموشی بے سبب نہیں ہے کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے۔ جسے چھپانے کے لیے بے خودی کی آڑ لی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رازِ عشق کو چھپانے کی غرض سے تم

نے بیخودی اختیار کی ہے۔

آسی لکھتے ہیں کہ مقطع بھی قطعہ میں شامل ہے۔ گویا پوچھا گیا ہے کہ اگر تم کو مژگاں نے نہیں ستایا ہے تو تم یہ تو بتاؤ کہ بے خود کیوں ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ قصور تمہارا ہے اور تم اس کو چھپاتے ہو یعنی تم کو عشق ہے۔ اسی وجہ سے تم کو بے خودی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مژگاں کا کوئی قصور نہیں۔

۱۶۵

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی ۱ نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذّت زندگانی کی
کشاکش‌ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی ۲ ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی
پس از مردن بھی دیوانہ زیارتگاہِ طفلاں ہے ۳ شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

۱۔ اگر رنج یا تکلیف کی حالت میں انسان کو تھوڑی سی راحت یا آرام مل جائے تو اس کے بعد تکلیف کا احساس اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے شادمانی کی "شادمانی کردم" کا ترجمہ ہے فرماتے ہیں۔ اگر ہم نے کسی قدر لطف زندگی اور شادمانی حاصل کی تو اس سے ہمارے جنوں پر تسکین کا الزام نہیں لگا یا جا سکتا۔ کیونکہ شادمانی تو زخمِ دل پر اور بھی زیادہ نمک پاشی کرتی ہے (حسرت، سعید)

طباطبائی:۔ اگر میں نے شادمانی کی تو اس پر مجھ پر تسکین کی تہمت نہیں لگ سکتی بلکہ میری شادمانی نمک پاشیِ زخمِ دل کے سبب سے ہے نہ کہ تسکین کے سبب سے، اور لذّت زندگانی کا نمک پاش ہونا یہ مطلب رکھتا ہے کہ اُن بُرے حالوں جیتے رہنا زخمِ دل پر نمک چھڑکنا ہے اور زخمِ دل پر نمک چھڑکنے سے اور سوزش زیادہ ہوتی ہے، تسکین کجا (بیخود، آسی)

آسی کا دوسرا مفہوم۔ اے جنون چونکہ ہم نے کچھ خوشی کی ہے تو تجھ پر اس سے تسکین کی تہمت جو تیرے لئے باعثِ ننگ ہے، نہیں رکھی جاسکتی، بلکہ اگر ہم نے لذّتِ زندگی کچھ اُٹھائی ہے تو وہ اس لئے اُٹھائی ہے کہ کچھ دیر بعد وہ ہم سے چھن جائے یا ہم اسکو چھوڑ دیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ جو عیش فانی ہو وہ اور بھی باعثِ تکلیف ہے۔

۲۔ چونکہ زندگی کی کشاکش سے کوئی شخص آزاد نہیں ہو سکتا اس لئے سعیِ آزادی فضول ہے، اس کے ثبوت میں یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ موجِ آب کو دیکھئے۔ ظاہرا طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روانی آزاد ہے لیکن اگر بہ نظرِ غور دیکھیں تو وہ آزاد نہیں بلکہ وہ اپنی روانی ہی کی وجہ سے پابند ہے

کیونکہ موج کی روانی زنجیر کی صورت پیدا کرتی ہے اور جس کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی ہو اُس کو آزاد نہیں کہا جاتا۔ پس معلوم ہوا کہ موج گرفتار ہے اور وہ سعیِ آزادی بھی برابر کر رہی ہے لیکن باوجود متواتر کوششوں کے اس کی سعیِ آزادی کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا بلکہ اور زیادہ الجھتی چلی جاتی ہے۔

آسی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہاں آزادی بھی گرفتاری ہے۔

۳۔ مرنے کے بعد بھی تیرا دیوانہ لڑکوں کی زیارت گاہ بنا رہا۔ وہ پتھر جو اُنہوں نے مجھ دیوانے کی قبر پر مارے۔ ان کے شراروں سے میری قبر پر خوب گلفشانی ہوئی۔ وہ قبریں جو زیارت گاہ بن جاتی ہیں ان پر ہمیشہ پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ عشق کے دیوانے کی قبر تھی، اس لئے اس پر گلہائے آتشیں چڑھائے گئے جو سنگ باری سے پیدا ہوئے۔

۱۶۶

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی ۱ مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی
رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے ۲ اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی
پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا ۳ ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بیدادِ ذوقِ پر فشانی عرض کیا قدرت ۴ کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اُس کے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے ۵ مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

۱۔ نکوہش:۔ ملامت۔ چونکہ بیداد دلبر کے فریادی کی سزا آئینِ عشق کے مطابق ملامت ہے، اس لئے میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی قانون کے مطابق قیامت کے دن صبحِ محشر بھی اس پر خندہ زن ہو یا خندۂ دنداں نما کرے (طباطبائی، بیخود، آسی) سعید و حسرت کا خیال ہے کہ مبادا رفعِ تعجب کے لئے لائے ہیں۔

۲۔ ریشگی بمعنی خلش مشہور ہے کہ ایک مرتبہ لیلیٰ نے فصد کھلوائی اس کا اثر مجنوں پر یہ ہوا کہ اُس کے ہاتھ سے خود بخود خون جاری ہو گیا۔ اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں، اگر دشتِ مجنوں میں دہقان بجائے دانہ بونے کے نشتر کی نوک بوئے تو اتحادِ حسن و عشق کے اثر سے نوکِ نشتر کی خلش لیلیٰ کو بھی اسی طرح محسوس ہو جس طرح لیلیٰ کی فصد کُھلنے سے مجنوں کی فصد خود بخود کُھل گئی تھی۔ (حسرت) باقی شارحین ریشگی سے مُراد اُگنا لیتے ہیں یعنی اگر دشتِ مجنوں میں

دہقان دانہ کی جگہ نوکِ نشتر بودے تو اس زمین میں سے رگِ لیلےٰ اُگے۔ طباطبائی کا خیال ہے کہ کاتب نے نقطے لگا کر دست کو دشت بنا دیا ہے۔ آسی کہتے ہیں۔ دستِ مجنوں سے یہ لطیف معنی پیدا نہیں ہوتے اور نہ لفظِ خاک با معنی رہتا ہے۔

۳۔ کشتیِ مے:۔ وہ سینی جس میں شراب کے لبریز ساغر رکھ کرمے نوشوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں۔ شاید پروانے کا پر کشتیِ مے کا بادبان تھا کیونکہ جب محفل گرم اور شمع روشن ہوئی تو پروانے آگئے اور پروانوں کے آتے ہی کشتیِ مے گردش کرنے لگی یعنی ساغر کا دور چلنے لگا۔ اس شعر میں یہ خوبی ہے کہ ہوا گرمی سے تحریک میں آتی ہے اور جب ہوا میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو بادبانوں کی مدد سے کشتی کو بھی حرکت ہوتی ہے۔

حسرت:۔ دورِ ساغر کی روانی گرمیِ مجلس پر منحصر تھی اور گرمیِ محفل سوز پروانہ پر، اس لئے پروانہ گویا کشتیِ مے کا بادبان ٹھہرا کہ اس کی وجہ سے دورِ ساغر و کشتیِ مے ظہور میں آیا۔

۴۔ پرفشانی:۔ پرواز، اُڑنا۔ کیا قدرت:۔ مجھ میں قدرت نہیں۔ طاقت اُڑ گئی:۔ زائل ہوگئی۔ شہپر:۔ وہ پر جس کی مدد سے پرندے اُڑتے ہیں۔

مجھ میں اتنی قدرت نہیں کہ میں ذوقِ پرواز کے ظلم وستم پر ناز کروں۔ بس یہ سمجھ لو کہ اُڑنے سے پہلے میرے پر پرواز کی طاقت زائل ہوگئی۔ اور پرفشانی کا شوق دل کا دل ہی میں رہ گیا۔ اب یہی ذوقِ پرفشانی مجھے ناقابلِ برداشت تکلیف پہنچا رہا ہے۔

۵۔ یارب میں خیمہ یار کے پیچھے کہاں تک روئے جاؤں! کیا میری قسمت میں پتھر کی دیوار بھی نہ تھی کہ میں اُس سے اپنا سر پھوڑ کر قصہ تمام کر لیتا اور اس رونے کی تکلیف سے نجات پاتا۔

۱۶۷

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے ۱ جتنے زیادہ ہوگئے اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے ۲ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے ۳ یہاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر ۴ وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں ۵ تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں ۶ ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اللہ رے تیری تندیِ خو جس کے بیم سے ۷ اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق ۸ جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے ۹ جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

۱۔ سُبک:۔ خفیف، ذلیل۔ اپنی بے اعتدالیوں کی بدولت ہم سب کی نگاہوں میں ذلیل ہوگئے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہم جس قدر زیادہ (اپنی حد سے) بڑھے، اتنے ہی لوگوں کی نظروں میں گھٹ گئے۔

۲۔ سخت قریب:۔ بہت ہی قریب۔

صیاد نے ہمارے آشیانے کے بہت ہی قریب جال پھیلایا تھا اور ہم کو اس کی خبر نہ تھی۔ اس لئے اپنے گھونسلے سے ابھی اُڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوگئے۔

حالی:۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ "ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب وشدائد نے گھیر لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کی زندگی شروع سے لیکر آخر تک وقفِ آلام رہی، اس لئے یہ شعر آپ بیتی ہے۔

۳۔ کسی چیز کے نہ ہونے کو محاورے میں اس طرح کہتے ہیں کہ فلاں چیز ہمارے پاس قسم کھانے کو بھی یا نام کو بھی نہیں ہے۔ گویا وہ برائے نام بھی ہوتی تو ثبوت کے لئے قسم کھانے کو کافی تھی۔ اس شعر میں کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری ہستی فنا ہے اور اس کا وجود برائے نام صرف قسم کھانے کے لئے ہے۔ یعنی ہم اس حد تک مٹ چکے ہیں کہ بس قسم کھانے کو رہ گئے ہیں۔ اس لئے ہماری ہستی فنا کی دلیل ہے۔

۴۔ عشق کی سختیاں اٹھانے والے لوگوں کی حالت تم کیا پوچھتے ہو وہ لوگ رنج وغم سے گھلتے گھلتے ازسرتا پا الم بن گئے یعنی غم نے گھلا گھلا کران کو اپنی طرح غیر مرئی بنادیا۔

۵- تیری وفا سے بھلا ظلموں کی کیا تلافی ہوسکتی ہے۔ بیشک تو وفا کر کے اپنے ظلموں کی تلافی کرسکتا ہے۔ لیکن ان ظلموں کی تلافی کیونکر ہوسکتی ہے جو تیرے علاوہ اور لوگوں نے ہم پر کئے ہیں۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ معشوق کو تلافیِ ستم کرنے پر آمادہ پاتا ہے چاہتا ہے کہ اسے اور زیادہ ترس آئے۔

۶- قلم ہوئے یعنی کٹ گئے، لکھتے رہے کی رعایت سے قلم ہوئے لائے ہیں یعنی باوجود یکہ ہمارے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے لیکن پھر بھی ہم جنونِ عشق کی داستان خونچکاں لکھنے سے باز نہ آئے یا یہ کہ ہاتھ کٹوانے منظور کیے لیکن جنون کی خونچکاں داستان لکھنی ترک نہ کی۔

۷- بیم:- خوف، ڈر۔ رزق ہم ہوئے:- ایک دوسرے کا رزق ہوگئے یعنی ایک کو دوسرا کھا گیا۔

اللہ رے تند خوئی کہ جس کے خوف سے میرے نالے کے اجزا ایک دوسرے کا رزق بن گئے یعنی ایک دوسرے کو کھاگئے یا مُنہ سے باہر نہ نکلے۔ مطلب یہ ہے کہ نالے تیرے خوف سے مُنہ سے باہر نہ نکلے اور دل کے دل میں ہی فنا ہوگئے۔

۸- نبردِ عشق:- میدانِ عشق، جنگِ عشق پاؤں کے اُٹھنے کو علمِ فتح قرار دیا ہے اور اس سے مراد پاؤں کا اُکھڑنا ہے۔

میدانِ عشق کو چھوڑ کر بھاگ جانا اہلِ ہوس کی فتح ہے کیونکہ میدان سے بھاگنے میں جو قدم ان کے اُٹھے وہ گویا ان کی فتح کے علم بلند ہوگئے۔ بقول بیخوؔد جان بچی لاکھوں پائے۔

۹- دم:- بمعنی سانس۔

جب ہم عدم میں تھے تو ہمارے سپرد چند نالے کئے گئے۔ ان نالوں میں سے کچھ نالے تو ہم نے عدم میں کھینچے۔ جو باقی رہے وہ ہمارے ساتھ اس دنیا میں آگئے اور وہ ہمارا سانس بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو ہم سانس لیتے ہیں یہ سانس نہیں ہے بلکہ وہ نالے ہیں جو ہم عدم میں نہ کھینچ سکے تھے۔ بقول حسرتؔ اپنے سراپا درد ہونے کو اس پہلو سے بیان کیا ہے کہ میرا نفس گویا نالہ ہے۔

۱۰- ہم عشق و عاشقی کے اس قدر دل دادہ ہیں کہ فقیر ہوگئے۔ لیکن عاشقی نہ چھوڑی پہلے عشق

حسینوں سے تھا۔ اب اہلِ کرم کے عاشق ہیں اور ان کی تلاش میں دربدر یا ان کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں۔

۱۶۸

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی ۱ تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی ۲ کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی میری کہانی
یوں ہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا ۳ کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

۱- داغ کی صورت اشرفی کی سی سُرخ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو نقدِ دل کہا ہے۔ شعلہ کو زبان سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ شعلہ کا پاسبانی نہ کرنا بے زبانی ہے اور اس بے زبانی کا انجام فسردگی یعنی بجھ جانا ہے۔

کمین:- گھات۔

کہتے ہیں۔ اگر شعلۂ عشق میرے دل کی نقدی کی پاسبانی نہ کرے۔ تو افسردگی جو کہ بے زبانی کی اوٹ میں چھپی بیٹھی ہے۔ وہ داغِ دل افسردہ ہو جائے۔

۲- بچپن میں بچّوں کو کہانیاں سُننے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس نے کبھی بچپن کے زمانے میں تو میری کہانی سُنی نہیں، اب جوانی کے زمانے میں مجھے اس سے کب توقع ہوسکتی ہے کہ وہ میری داستانِ غم سُنے گا۔

۳- بے وجہ کسی کو دُکھ دینا اچھا نہیں ورنہ میں یہ دُعا مانگتا کہ یا رب میری زندگی میرے دشمن کو دے دے۔ مطلب یہ ہے کہ میری زندگی بہت زیادہ دُکھوں بھری ہے ویسے تو دشمن کو میری زندگی کا یقین نہیں آتا اور وہ مجھ پر آوازے کستا ہے۔ اگر اس کو مجھ جیسی حالت ہوگی تو پھر اُسے حقیقت معلوم ہوگی۔ لیکن شرافت ذاتی مجھے اس دُعا کی اجازت نہیں دیتی۔

۱۶۹

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ۱ اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال ۲ مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب ۳ اے شوق یاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا ۴ کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدارِ بادہ حوصلۂ ساقی نگاہِ مست ۵ بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل! ۶ زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۷ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی ۸ مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط ۹ دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ ۱۰ یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں ۱۱ نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ۱۲ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

۱-میرزا نے اس مطلع کی شرح ایک خط میں خود لکھی ہے فرماتے ہیں ع

"اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے"

یہ خبر ہے، پہلا مصرعہ "ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے"۔ یہ مبتدا ہے۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا، ظلمتِ غلیظ۔ سحر نا پیداء گویا خلق ہی نہیں ہوئی، ہاں "ایک" دلیلِ صبح کی بود پر ہے۔ یعنی بجھی ہوئی شمع اس راہ سے شمع و چراغِ صبح کو بُجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے۔ منجملہ اسبابِ تاریکی کے، پس دیکھنا چاہئے۔ جس گھر میں علامتِ صبح موید ظلمت ہو گی، وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

۲-آشتی بمعنی صُلح :- مدّت ہوگئی، نہ تو کانوں نے مژدۂ وصلِ یار سُنا ہے اور نہ آنکھوں نے جمالِ یار کا نظارہ کیا ہے، اس لئے کانوں اور آنکھوں میں باہم صُلح و آشتی ہے مطلب یہ ہے کہ پہلے چشم و گوش میں جنگ رہتی تھی۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ اگر پہلے کان مژدۂ وصل سُن پاتے تھے تو وہ خوش ہوتے تھے اور آنکھیں بوجہ رشک اُن سے لڑتی اور جلتی تھیں کہ یہ اچھے رہے، اُنہوں نے ہم سے پہلے مژدۂ وصلِ یار کا لطف اُٹھا لیا اور ہم نظارۂ جمال سے محروم رہے اور اسی طرح جب آنکھیں نظارۂ جمال سے

لطف اندوز ہو جاتیں اور کان مژدۂ وصل سے محروم رہتے تو وہ ان سے خائف ہو جاتے۔ غرض اسی طرح آپس میں رشک و حسد سے لڑائیاں جاری رہتیں لیکن اب مدت سے نہ کانوں نے مژدۂ وصل سُنا اور آنکھوں نے جمالِ یار دیکھا ہے۔ اس لئے اختوانِ نزاع دُور ہو جانے سے دونوں میں صلح و صفائی ہے۔

۳-اجازتِ تسلیم:- عقل و ہوش سے دست بردار ہونے کی اجازت۔

شراب کے نشہ نے اس حسنِ خود آراء کو بے حجاب کر دیا ہے۔ اے شوق! ایسی حالت میں تجھے اجازت ہے کہ تو اپنے ہوش و حواس اور ضبط و قرار کو بالائے طاق رکھ دے۔ مطلب یہ ہے تو بھی اُن کی طرح بے حجاب ہو جا! اور اپنے دل کی آرزو نکال!

۴-عقد:- لڑی۔ اوج:- بلندی۔

ذرا دیکھنا! گوہر فروش کا ستارہ کس قدر بلندی پر ہے یعنی وہ کس قدر خوش قسمت ہے کہ اس کا موتیوں کا ہار معشوقوں کی گردن میں پڑا ہوا ہے گوہر فروش پر رشک کیا ہے۔

۵-میکدہ میں عام طور پر شور ہوا کرتا ہے لیکن میکدۂ بزمِ خیال ایسا میکدہ ہے جہاں شور و شر بالکل نہیں۔ یہاں دیدارِ معشوق شراب ہے کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتی اور حوصلہ ساقی ہے کہ ہر شخص کو اس کے ظرف کے اندزے سے شراب پلاتا ہے اور نگاہ ایسی مے خوار ہے جو کسی طرح سیر نہیں ہوتی شراب دیدار پئے جاتی ہے لیکن پھر بھی بدمست ہو کر شور و شر نہیں کرتی۔

۶-اس قطعہ میں ان لوگوں سے خطاب ہے جو بزمِ عشق میں نووارد ہیں۔ کہتے ہیں اے لوگو! جو فرشِ آرزوئے دل پر ابھی ابھی آ کر بیٹھے ہو یعنی بزمِ عشق میں پہلی مرتبہ آئے ہو۔ خبردار اگر تمہیں نغمہ نے کو سُننے اور شراب پینے کی خواہش ہے تو۔

۷-بزمِ عشق میں قدم رکھنے سے پہلے اگر تم دیدۂ عبرت نہیں رکھتے ہو تو میری حالت کو دیکھو کہ اس شوق کی بدولت میرا کیسا عبرت ناک حشر ہوا ہے اور اگر تم نصیحت سننے والے کان رکھتے ہو تو میری بات سُنو!

۸-جب ساقی جلوہ افروز ہوتا ہے تو وہ اپنے دلفریب حسن سے ایمان اور عقل کو غارت کر دیتا ہے اور جب مطرب گاتا ہے تو وہ اپنی خوش نوائی سے تمکین و ہوش لوٹ لیتا ہے

۹-رات کے وقت تو ہم نے یہ گہما گہمی دیکھی کہ محفلِ عیش و طرب کے فرش کا ہر گوشہ

پھولوں کی کثرت سے دامنِ باغباں اور کفِ گل فروش بنا ہوا تھا یعنی ہر طرف پھولوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔اور

۱۰-ساقی کی خوش خرامی کا لطف نگاہوں کو جنت کا سماں دکھلاتا تھا اور چنگ کی میٹھی میٹھی آواز کانوں کو بہشت کا مزہ دے رہی تھی۔ گویا لطفِ خرام ساقی سے آنکھیں اور نے کی نغمہ سرائی سے کان ایسا لطف اُٹھا رہے تھے جو جنت میں حاصل ہوسکتا ہے۔

۱۲- صبح کے وقت بزم میں آ کر کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف اُداسی چھائی ہے۔ نہ وہ سرود ساز ہے اور نہ وہ جوش وخروش۔

۱۱-بلکہ اس سامانِ عیش و نشاط کے بدلے صرف ایک شمع باقی ہے جو صحبتِ شب کے فراق میں داغ داغ اور خاموش ہے۔

۱۳-یہ قطعہ نہایت پُر درد اور بلیغ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ یہ مقطع اس کا ثبوت ہے۔

نوا:- آواز۔ سریر خامہ:- قلم کی آواز جو لکھتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ نوائے سروش:- فرشتہ غیب کی آواز۔

غالبؔ، میرے خیال میں یہ مضامین بلند و بلیغ غیب سے آتے ہیں گویا میرے قلم کی آواز فرشتہ غیب کی آواز ہے۔ جو یہ اچھوتے مضامین عرش سے لاتی ہے۔

۱۷۰

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے ۱ طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنّت حیاتِ دہر کے بدلے ۲ نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو ۳ ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر ۴ خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی ۵ غیرِ گل آئینہ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے ۶ وائے اگر عہد استوار نہیں ہے
تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالبؔ
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

۱-تو جلدی آ کیونکہ میری جان سخت بیقرار ہے اور اب بیدادِ انتظار برداشت کرنے کی طاقت نہیں رہی۔

۲-اللہ میاں اگر ہم کو حیاتِ دہر کی تکلیفوں کے بدلے میں آپ جنت دیتے ہیں تو یہ کچھ فیاضی نہیں ہے کیونکہ یہ نشہ (یعنی آرام جنت) خمار (تکالیفِ دُنیا) کے مقابلے میں بہت کم ہے۔اس کا اندازہ وہی رند کرسکتا ہے جس نے خمار کی تکلیفیں اُٹھائی ہوں اور اس کے خمار کی تکالیف کی تلافی کرنے کے لئے اس کو بہت کم مقدار میں شراب دی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ تکلیفیں جو انسان کو دُنیا میں جھیلنی پڑتی ہیں ان کی تلافی کے لیے جنت کے عیش و آرام بہت کم ہیں۔

دوسرا مفہوم:- ہم جنت کی کوئی پروا نہیں کرتے لہٰذا حیاتِ دہر کے عیش و آرام کے بدلے جنت سے دست بردار ہوتے ہیں، کیونکہ جس قدر ہم کو خمار کی تکلیف ہے اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس شراب بہت ہی کم ہے اس لئے جو شراب ہمیں جنت میں ملے گی۔ بہتر ہے کہ یہیں مل جائے۔ شاعر دُنیا کی تکلیفوں سے تنگ ہے اور نسیہ کے مقابلے میں نقد کو ترجیح دیتا ہے۔

۳- گریہ واشکباری تیری بزم سے مجھے نکالتے ہیں، افسوس کہ مجھے رونے پر اختیار نہیں۔ اگر میں چپ رہتا تو اس کی بزم سے نہ نکلتا۔ بزم سے نکالنے کے دو پہلو ہیں (۱) محبوب کی رسوائی ہوتی ہے (۲) بزمِ نشاط میں میری اشکباری سے سب متاثر ہوتے ہیں۔

۴-آپ کی یہ بدگمانی فضول ہے کہ ہمارے دل میں آپ کی طرف سے کوئی رنجش یا غبار ہے، کیونکہ عاشقوں کی تو خاک میں بھی غبار نہیں ہوتا۔ یا ہم عاشق ہیں اس لئے ہمارے دل میں غبار ہونا چہ معنی؟

طباطبائی:- عشاق مرکر خاک ہوگئے ہیں لیکن ان کی خاک میں بھی غبار نہیں ہے۔ یہ محض ادعائے شاعرانہ ہے، جس کے لئے تعلیل کی ضرورت، ہے مطلب مصنف کا یہ ہے کہ عشاق کی طینت میں غبار نہیں ہے لیکن طینت کی جگہ خاک کہنا محاورہ سے گرا ہوا ہے۔ بیخودؔ پہلے معنی اور سعیدؔ دوسرے معنی لکھتے ہیں۔ آسیؔ نے دونوں مفہوم لکھے ہیں۔

۵-جس طرح گل وہ آئینہ ہے جس میں معانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح دل بھی ایک آئینہ ہے جس میں معانی کا جلوہ نظر آتا ہے اس لئے اگر تجھے جلوہ ہائے معانی کا لطف اُٹھانا ہے تو

وہ آئینہ دل سے اُٹھا۔

حسرت نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے ۔ "بہار کی نمود اسی وقت تک ہے جب تک کہ گل قائم ہے لیکن چونکہ قیامِ شگفتگیِ گل ناپائیدار ہے اس لئے بہار بھی ناپائیدار ہے' بس اس سے بہتر ہے کہ دل سے جلوہ معانی کا لطف اُٹھایا جائے کیونکہ لطفِ سخن کی بہار بے خزاں ہے۔

۶۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے قتل کرنے کا عہد کیا۔ اگر یہ عہد مضبوط نہیں ہے تو بہت ہی افسوس ہے۔

۷۔ غالب تم نے میکشی کی قسم کھائی ہے یعنی یہ عہد کیا ہے کہ اب ہم شراب نہ پئیں گے۔ مگر تیری قسم کا ہم کو اعتبار نہیں کیونکہ تجھ سے میکشی نہیں چھوٹ سکتی (تمام متفق)

بیخود:۔ اے غالب! تو نے میکشی کی قسم کھائی ہے تیری قسم سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ ترکِ میکشی کی قسم کھائی ہے یا میکشی کرنے کی اور جب تیری قسم سے یہ دونوں پہلو جھلک رہے ہیں تو ہمیں تری قسم کا ہرگز اعتبار نہیں ہے۔

۱۷۱

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے ۱ کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذّت زخمِ سوزن کی ۲ سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

۱۔ کثرتِ غم کے بوجھ سے میرا سر اس قدر جُھکا ہے کہ تارِ دامن اور تارِ نظر میں امتیاز کرنا دشوار ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے تارِ دامن سے تارِ نظر اس طرح متصل ہوگیا ہے کہ دونوں ایک معلوم ہوتے ہیں۔

۲۔ رفوئے زخم سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ زخم سِل کر مندمل ہوجائے بلکہ اس سے زخمِ سوزن کی لذّت مطلوب ہے۔ کہیں یہ نتیجہ نہ نکالنا کہ دردِ عشق کے دیوانے کو اب درد کا ذوق نہیں رہا اس لئے وہ زخم کا رفو کرا رہا ہے اس خیال کو اس طرح بھی ادا کر رہا ہے ۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن   غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

۳۔ غنچۂ گل کے چٹکنے کو خندۂ دل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ گلاب کی کلی بلحاظ رنگ و صورت دل سے مشابہتِ تامہ رکھتی ہے۔ کہتے ہیں وہ گل (معشوق) جس گلستاں میں جلوہ فرما ہو وہاں غنچوں کا چٹکنا خندۂ دل کا ہم معنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کلیاں اس کو جلوہ افروز دیکھ کر ہنستی ہیں۔ بوجہ مشابہت کلیوں کے چٹکنے کی آواز کو خندۂ دل کہا ہے۔

۱۷۲

پابدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد ۱ خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت ۲ ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ! ۳ ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تُو مجھے

۱۔ زانو کو آئینہ سے تشبیہ دی جاتی ہے کیونکہ آئینہ کو زانو پر رکھ کر دیکھتے ہیں اور آئینۂ فولادی کے جوہر کانٹوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں میں صحرانورد تھا لیکن پاؤں میں کانٹے چبھ جانے سے میں صحرانوردی سے معذور ہوگیا اور اب پابدامن بیٹھا ہوں۔ وہ کانٹے جو صحرانوردی میں میرے پاؤں میں چبھے تھے آئینہ زانو کا جوہر معلوم ہوتے ہیں ۔

آسی:۔ لطیف بات اس میں یہ ہے کہ جو کانٹے پاؤں میں چبھے ہیں اُن کا اثر زانو تک محسوس ہورہا ہے۔

میرے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ بلکہ تلوؤں میں سے کانٹے کے لئے جس طریقے سے بیٹھا جاتا ہے مصنف نے اس سے فائدہ اُٹھایا ہے یا جب پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو تلوا زمین پر نہیں ٹکا جاتا بلکہ آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح بیٹھنے سے کانٹے سامنے آجاتے ہیں اور انہیں نکالنے میں آسانی ہوتی ہے۔

۲۔ میرے دل کی حالت محبوب سے ہم آغوشی کے وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا بال بال میرے لئے ایک نگاہِ آشنا بن جاتا ہے ۔وہ میرے دل کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہوتا ہے ۔مطلب یہ ہے کہ ہم آغوشی کے وقت کسی قسم کی غیریت کا احساس نہیں ہوتا۔ کیونکہ محبوب کا رونگٹا رونگٹا مجھ سے واقف ہوتا ہے۔

بیخود، آسی:۔ کیونکہ دل تیری زلف میں مدّتوں اسیر رہ چکا ہے اس وجہ سے ہر ایک سرِ

موہم آغوشی کے وقت نگاہ آشنا کا کام دے گا۔

سعید:۔ کیونکہ میں ہمیشہ اپنے تصور میں اس کی ہم آغوشی کا خیال باندھتا رہا ہوں اس وجہ سے اس کا ہر سرِ مو میرے قلب سے آشنا ہو گیا ہے۔

طباطبائی:۔(۱) ہم خیال آسی و بیخود (۲) اور سرِ مو کو عام لیں تو بھی معنی درست ہیں یعنی ہنگامِ ہم آغوشی تیرا ہر سرِ مو میرے دل کی حالت دیکھنے کے لئے نگاہ آشنا ہو جائے گا۔

۳۔میں سراپا شکایتوں کے راگ کا ساز ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ تم لوگوں کے سامنے مجھے نہ چھیڑو، ورنہ بیساختہ میرے منہ سے شکایتیں نکلنے لگیں گی۔ اسی مضمون کو یوں بھی لکھا ہے ۔

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجہ   اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

۱۷۳

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے ۱ جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر ۲ تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گرانمایگیِ اشک بجا ہے ۳ جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر! ۴ کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے
اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ ۵ طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب ۶ اک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے!
مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک ۷ آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے!
غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر ۸ کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے
تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ نالاں ۹ جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے
آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے ۱۰ اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

۱۔ کالبد:۔ قالب، مرادِ جسم۔ صورتِ دیوار:۔ وہ تصویر جو دیوار پر بنائی جائے۔
جس بزم میں تو ناز و ادا سے گفتگو کرے ۔ اگر تیری جاں بخش باتوں سے ان تصویروں کے

جسموں میں جان پڑ جائے جو دیوار پر آرائش کے لئے بنادی جاتی ہیں تو کوئی تعجب نہیں، کیونکہ تیرے لب و دہن میں مسیحائی کی صفت ہے۔

۲۔اگر تُو اپنے اس دلکش قد کے ساتھ گلزار میں آئے تو سرو و صنوبر تجھ پر عاشق ہو جائیں اور سایہ کی طرح تیرے ساتھ ساتھ پھریں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے قد کی دلکشی کو بھول اور تیرے قد پر عاشق ہو جائیں۔ بیخود اس شعر کو بیت الغزل قرار دیتے ہیں۔

۳۔اشک کو اس وقت اپنی گراں مایگی پر ناز کرنا بجا ہے۔ جب دیدۂ خونبار میں جگر کے ٹکڑے بھی کٹ کٹ کر آئیں۔

۴۔ کہتے ہیں بے وجہ ستانے میں کوئی لطف نہیں۔ تم مجھے ذرا شکایت کرنے کی اجازت دیدو، کیونکہ جب میں تم سے تمہاری شکایتیں کروں گا تو تمہیں غصہ آئے گا۔ تو مجھ پر ظلم کرو گے۔ پھر جیسی پُر زور میری شکایت ہوگی ویسا ہی سخت مجھ پر ظلم ہوگا۔ اسی طرح تمہیں بھی ظلم کرنے اور آزار دینے کا لطف آئے گا، ادھر میں بھی لطف اندوز ہوں گا۔ خاموشی سے ظلم اُٹھانے میں مجھے بھی کوئی لطف نہیں آتا۔ طباطبائی اور بیخود اس شعر کو حاصل زمین قرار دیتے ہیں۔

۵۔فسوں گر بمعنی جادوگر۔ آئینہ اور طوطی میں مناسبت ہے کیونکہ آئینہ سامنے رکھ کر طوطی کو بولنا سکھایا جاتا ہے۔ دوسرے اس تمثیل میں لطف یہ ہے کہ جب محبوب آئینہ کے سامنے اشارہ کرے گا تو آئینہ میں بھی دکھائی دے گا۔ گویا اس طرح سے آئینہ میں قوت گفتار پیدا ہو جائے گی اور یہی چشمِ فسوں کا جادو ہے کہ بے جان آئینہ اُس کے جادو سے گویا ہو گیا۔

۶۔وادیِ پُر خار میں پیاس کے مارے کانٹوں کی زبان سوکھ گئی خدا کرے کوئی آبلہ پا (عاشق) اس وادیِ پُر خار میں آ نکلے کہ اس کے آبلوں کے پانی سے ان کانٹوں کی زبان تر ہو جائے۔ آسی لکھتے ہیں کہ در پردہ اپنی رہائی کی دُعا کی ہے۔

۷۔معشوق کے گلے میں زنّار پڑی ہوئی دیکھ کر رشک سے مرے جاتے ہیں میں رشک سے کیوں نہ مر جاؤں کہ میرے سامنے اس کے تنِ نازک کو حلقۂ زنّار نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم آغوشی میرا حق تھا نہ کہ کمبخت زنّار کا۔

۸۔اگر ہوسِ زر غارت گرِ ناموس نہ ہوتو شاہدِ گل (پھول) بازار میں ہرگز فروخت نہ ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ پھول جیسی خوبصورت چیز کو محض تحصیلِ زر کیلئے بازار میں فروخت کردیا جاتا ہے۔

پھول کو شاہدِ گل کہہ کر اس کو بازار میں لانے سے گل کی سخت توہین مقصود ہے یعنی ہوس زر شاہد فروشی کو بھی جائز قرار دیتی ہے جو کہ ادنٰے قسم کا انسان بھی گوارا نہیں کرسکتا (آسی، حسرت)

طباطبائی:۔ گلاب میں جو زیرہ ہوتا ہے اُسے زرگل کہتے ہیں۔ شعر کا مطلب یوں سمجھو کہ گلاب کا کھلنا اور زرگل کا کُھلنا کیا ہے۔ گویا زر کی ہوس میں ہاتھ پھیلانا ہے جس کا انجام یہ ہوا کہ سرِ بازار آنا پڑا نہیں تو بربادی ناموس کا کیوں سامنا ہوتا۔ غنچہ کی طرح بندھی مٹھی چلا گیا ہوتا۔ جب ہاتھ پھیلا کر زر لیا تو شاہدِ بازاری ہوگیا اور ناموس وعزت برباد ہوگئی (بیخود)

۹۔اے دلِ نالاں، گریبان چاک کرنے کا لطف تو اس وقت ہے جب ہر تارِ گریبان کے ساتھ ایک نفس بھی اُلجھا ہوا ساتھ آئے۔ مطلب یہ ہے کہ گریبان کے ساتھ دامن زندگی بھی تار تار ہونا چاہئے۔ عشق میں موت کی آرزو کا اظہار کیا ہے۔

۱۰۔رازِ نہاں کی گرمی سے میرا سینہ آتشکدہ بن چکا ہے، اگر خدانخواستہ کہیں یہ آگ ظاہر ہوجائے تو خدا جانے کیا آفت برپا ہو۔ دُنیا جل جائے۔ پتہ نہیں اس سے کہاں کہاں آگ لگے۔

۱۱۔ گنجینہ بمعنی خزانہ۔ اے غالب! جو لفظ کہ میرے اشعار میں آئے۔ اس کو گنجینۂ معانی کا طلسم سمجھئے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے ایک ایک لفظ میں بیشمار معانی اور مفہوم ہوتے ہیں اور جوں جوں وہ نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ انسان حیران ہوتا چلا جاتا ہے۔

۱۷۴

حسن مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے ۱ اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ ۲ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ۳ ساغرِ جم سے مرا جام سفال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے ۴ وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق ۵ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض ۶ اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا ۷ جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہوجائے ۸ کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز ۹ شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

۱۔چاند کا حُسن جس وقت کہ وہ تکمیل کو پہنچ چکا ہو یعنی بدر بن گیا ہو، اچھا ہے لیکن اس سے میرا خورشید جمال معشوق یقیناً اُسی طرح بہتر ہے جس طرح کہ خورشید ماہ سے بہتر ہے۔ بقولِ حالی دوسرے مصرعہ میں دعویٰ متضمن دلیل ہے کہ معشوق کو مہِ خورشیدہ جمال اس لئے کہا ہے تاکہ اس کو ماہِ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہوجائے۔ آسی یہ دلیل پیش کرتے ہیں ''کہ از مہر پرتو بود ماہ را''۔

۲۔ کہتے ہیں دل کی قیمت بوسہ ہے، وہ تو دیتے نہیں اور ہر وقت دل اُڑالینے کی فکر میں ہیں اور جی میں کہتے ہیں کہ اگر یہ مال مفت میں یعنی بغیر قیمت (بوسہ) دئے ہاتھ آجائے تو اچھا مال ہے (تمام متفق)

بیخود لکھتے ہیں کہ وہ اس خیال سے دل کو مُفت اُڑالینے کی فکر میں ہیں کہ یہ مال اگر مفت مل جائے تو خوب ہے۔ پھر کسی موقعہ پر بوسہ کو جان کی قیمت میں لگائیں گے۔

۳۔حالی:۔ شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے۔ جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے اور جامِ جمشید ایک ایسی چیز تھی جس کا بدل دُنیا میں موجود نہ تھا۔ اُس کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک جامِ سفال میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ جامِ جم جیسی چیز سے فائق اور افضل سمجھا جائے، نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جامِ جم میں شراب پی جاتی تھی اور مٹی کے کوزے میں شراب پی جاسکتی ہے۔ اب قوتِ متخیّلہ نے اس تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دے کر ایسی صورت میں جلوہ گر کردیا کہ جامِ سفال کے آگے جامِ جم کی کچھ حقیقت نہ رہی اور پھر اس صورت میں موجودہ فی الذہن کو بیان کا ایک دلفریب پیرایہ دے کر اس قابل کردیا کہ زبان اس کو پڑھ کر متلذذ اور کان اس کو سُن کر محظوظ اور دل اُس کو سمجھ کر متاثر ہوسکے اس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلومات سابقہ کو دوبارہ ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشی ہے۔ وہ تخیل یا امیجنیشن ہے اور اس نئی صورت موجودہ فی

الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہن کر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے اس کا نام شعر ہے۔ نیز اس مثال میں ایمیجی نیشن کا عمل خیالات اور الفاظ دونوں کے لحاظ سے بمرتبہ غایت اعلےٰ درجہ میں واقع ہوا ہے کہ باوجود کمال سادگی اور بے ساختگی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب انگیز ہے"۔

جامِ سفال بمعنی مٹی کا کوزہ۔ فرماتے ہیں۔ میرا مٹی کا پیالہ جام جمشید سے بہتر ہے۔ کیونکہ اگر ہمارا پیالہ ٹوٹ جائے تو ہم بازار سے اور لاسکتے ہیں۔ جامِ جم میں یہ بات کہاں ہے اس لئے وہ ہمیں پسند نہیں۔

۴۔اگر اہل کرم سے بھکاری کو بے مانگے بھیک ملے تو اسے بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے کیونکہ سوال کرنے سے اس کے جذبہ خودداری کو ٹھیس لگتی ہے اور بقول بیخود سوال کی تلخی عطا کی شیرینی کو بدمزہ کردیتی ہے، اس لئے وہ گدا جس کو سوال کرنے کی عادت نہ ہو اچھا ہے۔

بیخود:۔اس شعر میں ردیف کی نشست ایسی زبردست واقع ہوئی ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔

طباطبائی:۔سوال کرنے کی مذمت کیا اچھی طرح سے کی ہے۔

۵۔حالی:۔شاعر کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور بگڑی ہوئی طبیعت بحال ہوجاتی ہے، نیز یہ بھی معلوم تھا کہ دوست کو جب تک عاشق اپنی حالتِ زار اور اُس کی جدائی کا صدمہ نہ جتائے۔ دوست عاشق کی محبّت اور عشق کا پورا پورا یقین نہیں کرسکتا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ بعض وقت خوشی سے دفعتاً ایسی بشاشت ہوسکتی ہے کہ رنج وغم اور تکلیف کا مطلق اثر چہرہ پر باقی نہ رہے اور امیجینیشن نے اس تمام معلومات میں اپنا تصرّف کر کے ایک نئی ترتیب پیدا کردی یعنی یہ کہ عاشق کسی طرح سے اپنی جدائی کے زمانے کی تکلیفیں معشوق پر ظاہر نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جب تکلیف کا وقت ہوتا ہے اُس وقت معشوق نہیں ہوتا اور جب معشوق ہوتا ہے۔اُس وقت تکلیف نہیں رہتی۔ اس مثال میں امیجینیشن کا عمل معناً اور لفظاً دونوں طرح بدرجہ غایت لطیف اور حیرت انگیز واقع ہوا ہے۔ جیسا کہ ہر صاحبِ ذوقِ سلیم پر ظاہر ہے۔

۶۔حالی:۔ گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دُنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں۔ یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال اچھا بتایا ہے تو اس کے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہوجائیں۔ نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑے گا۔ وبائیں نہ آئیں گی لڑائیاں

نہیں ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔

۷۔انسان میں جس طرح کا کمال بھی ہو وہ بہت اچھا ہے کیونکہ کمال انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ فرہاد ایک معمولی مزدور تھا۔ شیریں تک اس کا پہنچنا محال تھا۔ کیونکہ یہ مزدور تھا اور وہ شہزادی مگر اُسے کوہ کنی اور تیشہ زنی میں کمال حاصل تھا اس لئے وہ شیریں تک پہنچا اور اس کو اپنی محبوبہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا۔

طباطبائی:۔ پہلے مصرعہ گنجلک ہے، دوسرے میں تنافر اور دونوں میں ربط بھی خوب نہیں اور مضمون بھی کچھ نہیں۔

آسی:۔اس اعتراض کی تردید کرتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے، بہرحال یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اُوپر کے شعروں کے مقابلہ میں یہ شعر بہت کمزور اور پھُس پھُسا ہے۔

۸۔اس میں مصنف نے قطرہ و دریا کی تمثیل کو نظم کیا ہے۔ یہ مضمون پہلے بھی کئی شعروں میں ادا کرچکے ہیں مثلاً

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا
دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے کہ فنا فرع کو اصل سے ملاتی ہے اس لئے ہر چیز اپنے مبداء سے اتصال کے لئے کوشاں ہے۔ چنانچہ قطرہ جب اپنے آپ کو دریا میں فنا کردیتا ہے تو وہ قطرہ نہیں رہتا بلکہ دریا ہوجاتا ہے اور چونکہ اس کا یہ کام یعنی دریا میں فنا ہوجانا اچھا ہے اس لئے اس کا انجام بھی اچھا ہے۔

آسی:۔اس میں مصنف نے ایک اخلاقی سبق دیا ہے۔

طباطبائی:۔ یہ مضمون کثرتِ استعمال سے مبتذل ہوگیا ہے۔ جو شخص اسے نظم کرتا ہے، شعر ہی بدمزہ ہوجاتا ہے۔''سازِ انا البحر'' والے شعر کی تعریف کرتے ہیں کہ محاورہ کی چاشنی نے پھیکے مضمون کو چٹ پٹا بنا دیا ہے۔

۹۔یہ شعر شہزادہ خضر سلطان فرزند بہادر شاہ بادشاہ متخلص بہ ظفر کی مدح میں لکھا ہے۔ کہتے ہیں، خداوند کریم خضر سلطان کو ہمیشہ سرسبز اور شاد کام رکھے کیونکہ گلستان شاہ میں یہ نونہال بہت اچھا

ہے۔ اس شعر میں الفاظ نہایت مناسب ہیں مثلاً خضر، سرسبز، باغ، تازہ نہال، خاندانِ شاہی کو باغ اور فرزند شاہ کو تازہ نہال سے تشبیہ دے کر شعر میں جان ڈال دی ہے۔

۱۰۔ کہتے ہیں۔ ہمیں جنت کی حقیقت معلوم ہے یعنی وہ کچھ بھی نہیں محض ''نافہموں کو ایک سبز باغ دکھایا ہے''۔ بہرحال دل کو خوش رکھنے کے لئے یہ خیال بہت خوب ہے۔

۱۷۵

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی ۱ امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
خار خارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے ۲ شوقِ گل چینِ گلستانِ تسلی نہ سہی
مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے ۳ ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا ۴ گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق ۵ نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ۶ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

۱۔ معشوق کو عاشق کے عشقِ صادق کا یقین نہیں آیا اور یہاں عاشق امتحانِ محبت میں جان دے چکا ہے۔ عاشق اس حالت کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اگر میرے مرجانے سے تیری تسلی نہ ہوئی تو کچھ مضائقہ نہیں۔ تُو اور امتحان لینا چاہتا ہے تو وہ بھی خوشی سے لے لے میں بعداز مرگ بھی بہ طیبِ خاطر مزید امتحان کے لئے تیار ہوں۔

سعیدؔ:۔ ''اگر یہ بات ہے تو امتحان کی خاطر میں نہیں مروں گا''

طباطبائی:۔ اس شعر پر اگر غالب خدائے سخن ہونے کا دعویٰ کریں تو خدا گواہ ہے کہ زیبا ہے۔ پھر دیکھئے تو نہ فنِ معنی کی کوئی خوبی ہے نہ فنِ بیان کا کچھ حُسن ہے، نہ فنِ بدیع کے تکلفات ہیں۔

۲۔ اگر شوق گلستانِ تسلی کا گلچیں نہیں بنا تو نہ سہی۔ اس کے لئے حسرتِ دیدار کا رنج و غم ہی کافی ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر شوق کو تسلی حاصل نہیں ہوئی تو کیا ہوا، یہ کیا کچھ کم ہے کہ وہ حسرتِ دیدار کے رنج میں مصروف ہے۔

۳۔ اے مے پرستو! اگر ایک دن بزم میں ساقی نہیں کہ وہ جام بھر بھر کر پلائے تو نہ سہی۔ خم منہ سے لگا کر پی جاؤ۔ مطلب تو جی بھر کر پینے سے ہے۔ طباطبائیؔ کو مے پرستوں کی جگہ ''مے پرستاں'' اور ''لگائے ہی بنے'' لانے پر اعتراض ہے۔

۴۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ لیلیٰ کا رنگ کالا تھا اور وہ کالے خیمہ میں رہا کرتی تھی۔ اس کے گھر کو سیہ خانہ کہا ہے۔ بیخودؔ و طباطبائیؔ لکھتے ہیں کہ مجنوں کو خیمہ لیلیٰ میں بار نہ ملی۔ اس لئے اظہار نفرت کی خاطر اس کو سیہ خانہ کہا ہے۔

نفسِ قیس جو اپنی شعلہ باری کے لحاظ سے چشم و چراغ صحرا بنا ہوا ہے۔ اگر وہ لیلیٰ کے سیاہ خانہ کی شمع نہ بنا تو نہ سہی، یہ کیا کم ہے کہ صحرا اس سے روشن ہے۔ آسیؔ سیہ خانہ لیلیٰ سے لیلیٰ کا تاریک دل مراد لے کر معنی بیان کرتے ہیں۔ بقول حسرتؔ غالبؔ نے اس شعر میں عشق کے استغنا کا اظہار کیا ہے۔

۵۔ گھر کی رونق ایک ہنگامہ پر موقوف ہے۔ اگر نغمۂ شادی نہیں ہے تو نہ سہی۔ نوحۂ غم ہی سہی۔ کیونکہ ہنگامہ کے لحاظ سے غم اور شادی دونوں برابر ہیں اس شعر میں کمال مجبوری اور انتہائی محرومی کا اظہار کیا ہے۔ بقول سعیدؔ ایسے شخص کی جو نوحۂ غم اور نغمۂ شادی میں تمیز نہیں کرسکتا، عیش و راحت کی محرومی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے یا بقول طباطبائیؔ عارف کی نظر میں شادی و غم دونوں کی ایک صورت ہے۔

۶۔ مرزا کے کلام پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا تھا کہ مہمل اور مشکل ہوتا ہے۔ کہتے ہیں نہ مجھے کسی سے داد لینے کی تمنا ہے اور نہ صلے کی پروا یعنی جو کچھ کوئی دیتا ہو وہ شوق سے نہ دے۔ اگر میرے، کلام میں معنی نہیں اور وہ مہمل ہے تو ہوا کرے، کسی کو کیا؟

۷۔ خیال یہ ہے کہ عشق کے صدمات اور شدائد عاشق کو عمر طبعی تک نہیں پہنچنے دیتے، وہ گھلا گھلا کر پہلے ہی اسے ختم کردیتے ہیں۔ غالب اگر تمہیں صدماتِ عشق نے گھلا گھلا کر عمرِ طبعی کو پہنچنے سے پہلے مار ڈالا تو کچھ مضائقہ نہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ تمہاری جتنی عمر گزری وہ حسینوں کی صحبت میں گزری گویا عشرتِ صحبتِ خوباں کو عمرِ طبعی پر ترجیح دیتے ہیں۔

۱۷۶

عجب نشاط سے جلاّد کے چلے ہیں ہم آگے ۱ کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے
قضانے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت ۲ فقط "خراب" لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی ۳ وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے
خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا ۴ کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے ۵ تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے
دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجہ خوں ہے ۶ ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

۱۔ہم قتل ہونے کی خوشی میں جلاّد کے آگے آگے جا رہے ہیں اور ہماری خوشی کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ شوقِ شہادت میں ہمارے سر کا سایہ پاؤں سے بھی دو قدم آگے ہے۔ جب آفتاب چلنے والے کی پشت پر ہو تو اس کے سر کا سایہ ہمیشہ پاؤں سے آگے پڑتا ہے۔ مرزا نے اسی مشاہدہ سے یہ مضمون پیدا کیا ہے۔

۲۔روزِ ازل کاتبِ تقدیر نے مجھے خراب بادۂ اُلفت لکھنا چاہا تھا لیکن اُس نے خراب لکھا تھا کہ اُس کا قلم آگے نہ چل سکا۔ گویا میں محض خراب و برباد ہی رہ گیا۔ خراب بادۂ اُلفت نہ ہوسکا۔

طباطبائی:۔یہاں مضمون کے ناتمام رہ جانے نے بڑا لطف دیا اور ہر ایک حالت کی ناتمامی کا بیان ہمیشہ لطف دیتا ہے اور قلم کے نہ چل سکنے کی وجہ مستی اور بے ہوشی ہے جو لفظ خراب لکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

۳۔غمِ زمانہ نے ہماری نشاطِ عشق کی مستی کو جھاڑ دیا یعنی غمِ دُنیا نے عشق کو بُھلا دیا، ورنہ کبھی ہم بھی غمِ عشق کی لذّت سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

۴۔خدا کے لئے ہمارے اس جنونِ عشق کی داد دینا کہ اِدھر ہم یار کے نام خط لکھ کر نامہ بر کے حوالے کرتے ہیں او راُدھر جواب کے شوق میں یار کے دروازے پر نامہ بر سے پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ یہی جنونِ شوق ہے کہ خط پہنچا نہیں اور اس کے جواب کے طالب پہلے سے کھڑے ہیں۔

۵۔"تمہارے آگے آئے" بددعا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں جو کچھ ہم نے کیا ہے ہمارے آگے آئے اور جو کچھ تم نے کیا ہے تمہارے آگے آئے۔ فرماتے ہیں۔ اے گیسوئے خمدار یار تمہاری بدولت جو ہم نے پریشانیاں اُٹھائی ہیں خدا کرے وہ تمہارے آگے آئیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم بھی ہمیشہ میری طرح پریشان رہو۔ شاعر نے یہاں بدُعا میں دُعا کا پہلو نکالا ہے چونکہ پریشان ہونا زلف کی صفت ہے۔ اس لئے عاشق کی بدُعا دُعا بن گئی اور دُعا یہ ہے کہ خدا کرے تمہاری زلف میں یہی دلکشی رہے۔

۶۔پُرافشاں:۔جوش زن۔ موجہ خوں:۔خون کی موج۔ زعم:۔گمان۔ دم:۔سانس۔
ہمارے دل و جگر میں جو ایک موجِ خون جوش زن ہے۔اس کو پہلے ہم سانس خیال کرتے تھے۔اب جبکہ عشق نے اسے لہو بنا کر بہایا تو ہمیں معلوم ہوا کہ یہ سانس نہیں، موجِ خون ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق نے یہ حالت بنادی ہے کہ سانس کے ساتھ سینے سے لہو کٹ کٹ کر آرہا ہے اور عاشق یہ خیال کرتا ہے۔ کہ سانس ہی حقیقتاً لہو ہے۔ کیا معصومانہ استنباط ہے! اسی کو شاعری اور آرٹ کہتے ہیں۔

۷۔قسم کھانا:۔انکار کرنا۔ آگے:۔پہلے۔
یاتواں کی یہ حالت تھی کہ پہلے وہ میری جان کی قسم کھایا کرتے تھے اور جان کی قسم اسی کی کھایا کرتے ہیں جس سے محبت ہوا کرتی ہے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ اُن کو میرے جنازے پر بھی آنے سے انکار ہے۔

۱۷۷

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے ۱ یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیئے تو گلا ہوتا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجہ ۲ اِک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو! ۳ شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے
عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال ۴ سست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم ۵ آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ ۶ کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب ۷ لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے بار بدِ بزمِ سخن، ۸ شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے
اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم! ۹ تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجیے! ۱۰ تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال ۱۱ آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے
میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں ۱۲ یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

۱۔اگر میں شکوہ کا نام بھی لیتا ہوں تو وہ بے مہر خفا ہوتا ہے ۔اس کی خفگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ "وہ شکوے کے نام سے خفا ہوتا ہے "تو یہ بھی وہ گلہ خیال کرتا ہے ۔

طبا طبائی :۔ یہ بات بھی یعنی (جو کہے تو گلہ ہوتا ہے)منہ سے نہ نکا لو گلہ نہیں تو گلہ کا نام تو زبان پر آ گیا (سعید و آسی)

۲۔میں شکایتوں سے اس طرح بھرا ہُوا ہوں جس طرح راگوں سے باجہ بھرا ہُوا ہوتا ہے بس مجھے چھیڑنے کی دیر ہے۔پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔اس مضمون کو اس طرح بھی لکھا ہے۔

ہوں سراپا ساز آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ   ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

۳۔وہ اپنی کم سنی یا سادگی کی وجہ سے میرے شکووں کا مطلب نہیں سمجھتا۔لیکن اُس کی حُسن تلافی قابلِ داد ہے کہ شکوۂ جور کرنے سے وہ اور زیادہ جفائیں کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ محبوب کو خبر نہیں کہ میں شکوۂ جور سے مزید جفاؤں کا طلب گار ہوں۔پہلے کہہ چکے ہیں ۔

نالہ جز حُسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں   ہے تقا ضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

۴۔چرخ مکوکب :۔ کوکب ستارہ دار آسمان ستاروں کو آبلوں سے اور چرخ مکوکب کو آبلہ سے تشبیہ دی ہے۔

عشق کی راہ میں ستارہ دار آسمان اس طرح سنبھل سنبھل کر اور رُک رُک کر چلتا ہے ، جیسے کوئی آبلہ پا شخص چلتا ہے۔

۵:۔ہدف :۔نشانہ :۔ناوک :۔تیر۔

معشوق کے ناوکِ بیداد کا نشانہ بننے کے ہم اس قدر آرزو مند ہیں کہ اگر اس کا کوئی تیر خطا ہو جا تا ہے تو دوڑ کر ہم اُسے خود اُٹھا لاتے ہیں اور اس کو دیتے ہیں کہ لو دوبارہ ہم پر چلاؤ ایسی حالت میں بھلا ہم اس کے ناوک ہدف کیوں نہ ٹھہریں۔مطلب یہ ہے کہ انہیں تیر کھانے کا مجھ جیسا شوقین اور کہاں مِل سکتا ہے۔

۶۔ تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ اگر ہم اپنا بھلا چاہتے ہیں تو ہمیشہ بُرا ہوتا ہے ۔اگر یہ بات ہمیں پہلے معلوم ہو جاتی تو ہم اپنے بدخواہ بن جاتے اور اپنی بدخواہی کرتے ۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ہماری بھلائی کی صورت پیدا ہو جاتی۔کیونکہ جو کچھ وقوع میں آتا ہے ،وہ ہمیشہ ہماری خواہش کے برخلاف ہوتا ہے۔

۷۔پہلے میرے نالوں میں اس قدر زور تھا کہ وہ عرشِ معلےٰ سے بھی آگے نکل جاتے تھے لیکن اب کمزوری کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی نالہ بہت ہی رسا ہوتا ہے تو وہ مشکل سے لب تک آتا ہے ۔ورنہ بیشتر نالے تو سینے میں رہ جاتے ہیں ۔

۸۔بار بد :۔ایک مشہور ایرانی گویّے کا نام ہے جو بادشاہ ایران کا درباری گویا تھا۔ یہاں مراد مطرب۔

میرا قلم جو کہ بزم سخن کا بار بد (مطرب) ہے بادشاہ کی مدح میں اس طرح نغمہ سرا ہوتا ہے۔

۹:۔ کواکب سپہ :۔جمع کوکب بمعنی ستارہ یعنی وہ جس کی فوج آسمان کے ستارے ہوں۔ مراد لاتعداد فوج۔مہر علم :۔جس کا علم آفتاب ہو۔

اے شہنشاہ ستارے تیرا لشکر اور آفتاب تیرا علم ہے تُو اس قدر بڑا بادشاہ ہے کہ کوئی شخص تیرے انعام و اکرام کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

۱۰۔سات اقلیم :۔سات سلطنتیں مراد ساری دنیا۔ حاصل :محصول: نعل بہا:۔۔۔وہ روپیہ جو چھوٹی حکومتیں بڑی حکومت کو ادا کرتی ہے تاکہ وہ ان کی سرپرستی اور حفاظت کرے۔

اگر سات سلطنتوں کا محصول فراہم کریں تو وہ تیرے لشکر کا نعل بہا ہوتا ہے۔

۱۱۔ہر مہینے جو چاند بدر سے گھٹ کر ہلال ہو جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تیرے آستانے پر اس قدر ناصیہ فرسائی کرتا ہے کہ گھستے گھستے بدر سے ہلال بن جاتا ہے۔

۱۲-میں جو آئینِ غزلخوانی میں گستاخی کرتا ہوں۔ یہ تیرے ہی کرم کا اثر ہے کہ وہ میری آتشِ اشتیاق کو مشتعل کرتا ہے (سعیدؔ)

بیخودؔ:- میں جو غزلخوانی کو تو ذکر تیرا مدح سرا ہوتا ہوں۔ تیرے کرم کی وجہ سے یعنی تیرا کرم ذوق مدح سرائی بڑھاتا رہتا ہے۔

آسیؔ:- میں جو گستاخانہ اور بے تکلفانہ اچھی اچھی غزلیں پڑھتا ہوں اس کی کوئی وجہ نہیں بلکہ کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔

۱۳:-اے غالبؔ! میری تلخ نوائی سے درگزر کرنا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج میرے دل کا درد کچھ بڑھ گیا ہے اور ضبط کی تاب نہیں رہی، اس لئے زبان سے تلخ الفاظ نکل رہے ہیں۔ بیخودؔ تلخ نوائی سے اشعارِ پُر درد مراد لیتے ہیں سعیدؔ تلخ گوئی سے سخت گوئی اور سخت سست کہنا سمجھتے ہیں۔

۱۷۸

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے ۱ تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا ۲ کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تندخو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے ۳ وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے!

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ۴ ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا ۵ کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل ۶ جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز ۷ سوائے بادۂ گلفامِ مشک بو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دوچار ۸ یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی ۹ تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگر نہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

۱-تم میری ہر ایک بات پر کہتے ہو کہ تیری حقیقت ہی کیا ہے تُو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے، یا تو ہے کیا چیز، خدا کے لئے تمہیں بتاؤ کہ یہ طریقہ گفتگو کس قسم کا ہے یعنی تم نے یہ کس قدر توہین آمیز

طرزِ گفتگو اختیار کی ہے۔

۲-اگر میں اس کی تندخوئی کے سبب سے اسے شعلہ کہوں تو شعلہ میں وہ کرشمہ نہیں جو اس میں ہے۔ اور اگر میں اس کی شوخی کی وجہ سے اس کو برق قرار دوں تو برق میں وہ ناز اور انداز نہیں جو اس میں ہے۔ پھر خدارا کوئی مجھے یہ بتادے کہ آخر میں اس شوخِ تند کو کیا کہوں۔

۳-مجھے اس بات کا خوف نہیں کہ دشمن تمہیں میری طرف سے بدگمان کرتا اور تمہارے کان بھرتا ہے۔ مجھے تو رشک یہ ہے کہ وہ تم سے ہمکلام ہوتا ہے۔

۴-ہمارے گریبان کو اب رفو کی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ لہو سے بدن پر پیراہن چپک گیا ہے۔ اسی مضمون کو فارسی میں اس طرح ادا کیا ہے۔

بہ تن چسپیدہ بازم از نم خونابہ پیراہن
خراشِ سینہ سطرِ بخیہ شد چاکِ گریبانم

طباطبائیؔ:- اس شعر میں سستی یہ ہے کہ کوئی وجہ نہیں بیان کی کہ لڑکوں نے پتھر مار کر خون بہایا ہے یا خود سر پھوڑ ڈالا ہے یا خون کے آنسو بہے ہیں یا چھاتی کو پیٹتے پیٹتے زخمی کرلیا ہے یا گریبان پھاڑنے میں ناخن سے نوچا ہے۔ یہ سب احتمال ہیں مگر تعین نہ کرنے سے بے لطفی پیدا ہوگئی ہے۔ بیخودؔ لکھتے ہیں کہ احتمالات تعین نہ کرنے سے زیادہ لطف پیدا ہوگیا ہے۔

۵- عاشق سوزِ عشق سے جل چکا ہے اور معشوق اس کی راکھ کرید رہا ہے کہتے ہیں ارے نادان جسم کے ساتھ دل بھی جل گیا ہوگا۔ اب راکھ کرید کر دل کو کیا تلاش کرتا ہے۔

طباطبائیؔ:- کرید نا برا ہے۔ دقیقہ سنج لوگ ضرور کہیں گے کیا معشوق مرغی تھا۔ آسیؔ لکھتے ہیں کہ اعتراض آسان ہے۔ اس جگہ اور لفظ رکھا جائے تو حقیقت کھلے۔

۶-ہم اس لہو کو لہو نہیں مانتے جو رگوں میں دوڑتا پھرے ہم تو اس کو لہو مانتے ہیں جو آنکھ سے ٹپکے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لہو نہیں جو آنکھ سے آنسو بن کر نہ ٹپکے۔

۷-وہ چیز جس کی وجہ سے ہمیں بہشت عزیز ہو سکتی ہے سوائے بادۂ گلفام مشک بو کے اور کیا چیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں بہشت اسی وجہ سے عزیز ہے کہ وہاں نہایت عمدہ شراب ملے گی اور بمقدار کثیر ملے گی۔

۸۔ہم اس قدر بلانوش واقع ہوئے ہیں کہ قدح وشیشہ وکوزہ وسبو کو کچھ چیز نہیں سمجھتے ۔ہاں اگر دو چار خم سامنے ہوں تو پھر شراب پیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تھوڑی شراب پی کر طبیعت بے لطف نہیں کرنا چاہتے۔

۹۔اوّل تو مجھ میں طاقتِ گفتار ہی باقی نہیں رہی اور اگر ہو بھی تو کس امید پر کہوں کہ میری آرزو کیا ہے۔کیونکہ اس سے آرزو پوری ہونے کی بالکل توقع نہیں رہی اور یہ ہمہ ناامیدی نتیجہ ہے اس کے گزشتہ سلوک کا، کہ اُس نے کبھی کوئی آرزو پوری نہیں کی۔

۱۰۔ذرا غالبؔ کو دیکھنا؛ بادشاہ کے مصاحب بن کر اتراتے پھرتے ہیں، ورنہ جو کچھ شہر میں ان کی آبرو ہے، وہ معلوم ہی ہے یعنی کچھ نہیں۔

کہتے ہیں ایک دن اُستاد ذوقؔ کہیں پالکی میں بیٹھے جارہے تھے کہ غالبؔ کی نظر پڑی۔ چونکہ ان سے معاصرانہ چشمک تھی مصرعہ اولیٰ فی البدیہہ کہہ کر پڑھا۔اُستاد ذوقؔ نے سُن لیا اور بادشاہ سے شکایت کی۔بادشاہ نے غالبؔ کو بُلوایا اور پوچھا کہ آپ نے کون سی غزل کہی ہے؟ انہوں نے پوری غزل سنائی اور مقطع میں یہ مصرعہ بھی شامل کردیا۔

۱۷۹

میں اُنہیں چھیڑوں اور وہ کچھ نہ کہیں ۱ چل نکلتے جو مے پیے ہوتے
قہر ہو، یا بلا ہو، جو کچھ ہو، ۲ کاش کے تم مرے لئے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا ۳ دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ ۴ کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

۱۔میں انہیں چھیڑوں اور وہ کچھ نہ کہیں، یہ بڑے تعجب کی بات ہے،اگر کہیں اس وقت وہ شراب کی ترنگ میں ہوتے، تو میرے چھیڑنے پر آفت برپا کردیتے۔

۲۔تم قہر ہو یا بلا ہو،خواہ کچھ ہی ہو۔کاش کے تم میرے لئے مخصوص ہوتے۔مطلب یہ ہے کہ میں کسی حالت میں بھی یہ گوارا نہیں کرتا کہ تم دوسروں کے لئے ہو۔اس کے علاوہ معشوق کی شوخ مزاجی اور عربدہ جوئی اور شوق وحسرت وغیرہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔

۳۔یارب !اگر میری قسمت میں اتنا زیادہ غم لکھا تھا تو اُسے برداشت کرنے کے لئے دل بھی کئی ایک دیئے ہوتے۔مطلب یہ ہے کہ جس قدر غم مجھے دیا گیا ہے وہ ایک دل کی برداشت سے

بہت زیادہ ہے۔میرؔ

کاش کے دل دو تو ہوتے عشق میں ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

۴۔راہ پر آنا:۔ کہا مان لینا۔

غالبؔ وہ عنقریب راہ پر آجاتا اور تمہاری دلجوئی کرتا۔تم بہت جلد مایوس ہوکر چل بسے۔کوئی دن اور جئے ہوتے کہ لطفِ صحبتِ محبوب اُٹھاتے۔

۱۸۰

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ۱ ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ۲ ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ۳ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم ۴ دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے
دِل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر ۵ یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر ۶ دیکھیے کب دن پھریں حمّام کے
عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۱۔محفل سے مراد محفلِ معشوق ہے اور پیغام سے مراد پیغام طلب۔ تشنہ جام کی رعایت سے لائے ہیں۔اپنی حرماں نصیبی کا نقشہ کھینچا ہے۔کہتے ہیں افسوس کہ غیر تو محفلِ یار میں جام کے بوسے لیں یعنی بے تکلف شراب پئیں اور ہم پیغامِ طلب سے بھی محروم رہیں یا ہماری کوئی بات بھی نہ پوچھے۔

۲۔اپنی بربادی اور خستگی کا تم سے گلہ نہیں، یہ سب فلکِ کج رفتار کے ہتھکنڈے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم سے گلہ نہیں۔اپنی تقدیر سے شکوہ ہے۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ نیلی فام بھرتی کا لفظ ہے۔اس کو معانی میں دخل نہیں۔ بتاویل کہہ سکتے ہیں کہ نیلا رنگ منحوس اور غم کی نشانی ہے۔

۳۔چاہے خط لکھنے کی ضرورت ہو یا نہ ہو، ہم تمہیں برابر خط لکھے جائیں گے، کیونکہ ہم تمہارے نام کے عاشق ہیں۔اس لئے ہمیں تمہارے نام خط لکھنے سے مطلب ہے۔

۴۔زمزم:۔مکہ معظمہ میں ایک کنواں ہے، جس کے پانی کو خانۂ کعبہ کے قرب کی وجہ سے متبرک خیال کیا جاتا ہے۔رات کو ہم نے چاہِ زمزم پر بیٹھ کر شراب پی اور صبح کے وقت اُسی کے پانی سے جامۂ احرام کے دھبّے دھوڈالے یعنی پاک صاف ہو گئے۔اس شعر میں مرزا صاحب نے رندانہ شوخی دکھائی ہے کہ ہم حج کے موقعہ پر بھی شراب نوشی سے باز نہیں آئے بلکہ چاہِ زمزم پر بیٹھ کر شراب پیتے رہے اور پھر اسی متبرک پانی سے شراب کے دھبّے دھوئے۔

۵۔مگر بمعنی شاید۔ میرے دل کو میری آنکھوں نے تمہارے عشق کے جال میں پھنسایا ہے۔شاید یہ (میری آنکھیں) تمہارے دام کے حلقے ہیں۔چونکہ آنکھوں کی بدولت انسان عشق میں مبتلا ہوتا ہے۔اس لئے اپنی آنکھوں کو معشوق کا حلقۂ دام کہا، حلقۂ چشم اور حلقۂ دام میں مناسبت ہے۔

۶۔افواہ ہے کہ بادشاہ غسلِ صحت کرنے والے ہیں دیکھئے حمام کی تقدیر کب پھرتی ہے یعنی وہ کب حمام میں غسلِ صحت فرما کر اسے شرفِ قدوم میمنت لزوم بخشتے ہیں۔

۷۔غالب ہمیں عشق نے کسی کام کا نہ رکھا ورنہ ہم بڑے کام کے آدمی تھے۔

۱۸۱

پھر اس انداز سے بہار آئی ۱ کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطّۂ خاک ۲ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی؛
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتا سر ۳ روکشِ سطحِ چرخِ مینائی؛
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی ۴ بن گیا رُوئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے ۵ چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوامیں شراب کی تاثیر، ۶ بادہ نوشی ہے باد پیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

۱۔پھراس انداز سے بہار آئی ہے کہ مہر و مہ اس کو بڑے شوق کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں
۲۔اے زمین کے رہنے والو،دیکھو!اسے عالمِ آرائی کہتے ہیں۔
۳۔روکش:۔مدِ مقابل:چرخِ مینائی:۔سبز آسمان

زمین کثرتِ سبزہ وگل کی بدولت سبز آسمان کی مدِ مقابل بن گئی ہے یعنی آسمان بھی سبز ہے اور زمین بھی سبز ہے یا یہ کہ زمین آسمان سے بڑھ گئی ہے۔

۴۔ کثرتِ سبزہ وگل سے سبزہ کو جب روئے زمین پر جگہ نہ ملی تو وہ آخر کار سطحِ آب پر کائی بن کر ظاہر ہوگیا۔کائی بھی سبز ہوتی ہے۔

۵۔خداوند تعالیٰ نے سبزہ وگل کے نظارہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے چشمِ نرگس کو بینائی دی ہے۔یاد رہے چشمِ نرگس کو عام شعرا نابینا خیال کرتے ہیں لیکن غالبؔ نے اس خیال کو ترک کر کے نیا مضمون پیدا کیا ہے۔

۶۔حالیؔ:۔یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے اس میں باد پیائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کردیئے ہیں۔باد پیائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں۔پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہوگی ہے اور جبکہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیائی یعنی فضول کام ہے۔اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا اور باد پیائی خبر۔دوسرے معنی یہ ہیں کہ باد پیائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے اور جس طرح بادہ پیائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح باد پیائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں۔اس صورت میں مطلب یہ نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانی بھی شراب پینی ہے(سعید بیخودؔ) آسی اور طباطبائی نے محض پہلے معنی لکھے ہیں۔

۷۔موسم بہار کو دُنیا کی خوشی قراردے کر کہتے ہیں کہ بھلاساری دُنیا خوش کیوں نہ ہو۔بادشاہ سلامت نے شفاپائی ہے۔چونکہ مصرعہ اولیٰ میں دُنیا کا لفظ آیا تھا اس لئے اس کی مناسبت سے دوسرے مصرعہ میں دین کا لفظ لائے ہیں۔اس تناسب کو مدِ نظر رکھے بغیر دیندار اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

۱۸۲

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے ۱ اگر پہلوتہی کیجیے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے ۲ بھرے ہیں جس قدر جام وسبو میخانہ خالی ہے

۱۔تغافل دوست ہوں:۔یعنی میں تغافل کو پسند کرتا ہوں۔دماغ عجز:۔عجز کا دماغ مرادرتبہ عجز۔ پہلوتہی:۔تغافل۔جگہ خالی کرنا:۔جگہ اس شخص کے لئے خالی کی جاتی ہے جس کا

احترام مقصود ہو۔

میں تغافل پسند انسان ہوں۔ میرا دماغِ عجز اس درجہ بلند ہے کہ اگر آپ مجھ سے پہلوتہی کریں تو میں اس پہلوتہی کرنے سے یہ سمجھونگا کہ آپ نے میرے لئے جگہ خالی کر کے مجھ پر خاص کرم فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں تغافل پسند ہونے کی وجہ سے تغافل کو پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ تغافل میں نکتہ یہ ہے کہ آپ مجھے عاشق سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر مجھ سے گریز کرتے ہیں۔ ایک جگہ پہلے لکھ چکے ہیں۔

جان کر کیجیے تغافل کہ کوئی بات بھی ہو　　یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

۲۔ حالی:۔ یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں گزرا ہو، مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنادیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کردیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دُنیا میں اگر ہمّت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دُنیا ویران ہوجاتی۔ پس یہ جاننا چاہئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں یعنی جس طرح مے خانہ میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ مے خانہ میں کوئی مے خوار نہیں ہے، اسی طرح عالم کا آباد و معمور ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہلِ ہمّت معدوم ہیں (تمام متفق)

آسی:۔ (i) اگر چہ دُنیا آباد ہے مگر اہلِ ہمّت اس میں نہیں ہیں۔ گویا یہ ایک مے خانہ ہے جس میں شراب ندارد ہے۔ جام و سبو بھرے پڑے ہیں۔

۲۔ حالی کے ہم خیال (۳) اہل ہمت کے نہ ہونے سے دنیا آباد ہے کہ جام و سبو جس قدر بھر بھر کر دیں گے۔ مے خانہ خالی ہوجائے گا یعنی یہ لوگ اگر مے خانۂ دُنیا میں ہوتے تو دنیا کو لٹا دیتے اور ان کا جود و کرم دنیا کو آباد نہ رہنے دیتا۔

۱۸۳

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری ۱　　اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ ۲　　دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار ۳　　مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں زخود رفتہ بیدائے خیال ۴　　بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا ۵　　رُک گیا دیکھ روانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں ۶　　سخت ارزاں ہے گرانی میری
گرد بادِ رہ بے تابی ہوں ۷　　صرصرِ شوق ہے بانی میری
دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا ۸　　کھل گئی ہیچ مدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
ننگِ پیری ہے جوانی میری

۱۔ کہانی میری یعنی میرا افسانہ عشق۔ شارحین اس شعر کو تعریف سے مستغنی قرار دیتے ہیں۔ واقعی نہایت بے تکلف واقعہ ہوا ہے۔

کہتے ہیں وہ اوّل تو میری کہانی کب سُنتا ہے اور اگر سُنے بھی تو میری زبانی سُننا ناممکن ہے۔

۲۔ غمزۂ خونریز کی خلش کی کیفیّت مجھ سے نہ پوچھ بلکہ میری خونابہ (خالص خون) فشانی دیکھ لے۔ اسے دیکھ کر تجھے غمزۂ خونریز کی خلش کی کیفیت معلوم ہوجائے گی کہ اُس نے میرے سینے میں کیسے زخم ڈال دیئے ہیں جو خالص خون کے آنسو جاری ہیں۔

۳۔ جب کوئی عزیز مر جاتا ہے تو اقربا مرنے والے کی صفات بیان کر کے روتے ہیں۔ کہتے ہیں میرے عزیز اور دوست مرنے کے بعد میری کیا صفات یاد کر کے روئیں گے؟ اس سوال کا خود ہی جواب دیتے ہیں کہ شاید وہ میری "آشفتہ بیانی" بیان کر کے روئیں گے۔ اس شعر میں شاعر اپنی آشفتہ بیانی کو ایسی مابہ الامتیاز صفت قرار دیتا ہے، جسے یاد کر کے اعزاء کو رونا آئے گا۔ خوب شعر ہے۔

۴۔ بیدا:۔ صحرا۔ نشانی:۔ پہچان۔

حسرت:۔ میں صحرائے خیال کا از خود رفتہ ہوں اور از خود رفتگی ہی میری نشانی یا پہچان ہے۔ (سعید)

طباطبائی:۔ خیال سے احباب مراد ہے اور اسے میدان فرض کیا ہے اور اپنے تئیں اس میدان کا از خود رفتہ کہا ہے یعنی خیال احباب سے میں نکل جاتا ہوں اور احباب کا مجھے بھول جانا ہی میری نشانی ہے۔ (طباطبائی، بیخود، آسی)

آسی:۔ میں خیالِ یار کے دشتِ ناپیدا کنار میں از خود رفتہ ہو گیا ہوں اور میری گم گشتگی اور از خود رفتگی کا نشان یہ ہے کہ وہ مجھے بھول گیا ہے۔

۵-ایک خط میں غالب نے اس شعر کی شرح خود لکھی ہے تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج، وجود و عدم، لفظ مقابل اس مصرعہ میں بمعنی مرجع ہے، جیسے کہ حریف کہ بمعنی دوست کے بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ ہے کہ ہم اور دوست از روئے خوئے و عادات ضد ہمدگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رُک گیا (عود ہندی)

حسرت :-برمتقابل یعنی بہ تصنع مقابل ہے مطلب یہ ہے کہ حریف میری روانی (روانی طبع) کو دیکھ کر درحقیقت قائل ہو گیا۔ لیکن ظاہر میں محض اس بات کی پچ کے لئے بہ تصنع مقابلہ کئے جاتا ہے۔

۶- حالی:- گرانی کے معنی بھاری پن کے ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی کہتا ہے کہ میری قدر اس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہوا اور ہر شخص آتے جاتے اس پر پاؤں رکھ کر گزرے یعنی ہوں تو گراں مگر اس پتھر کی طرح بیقدر ہوں پس میری گرانی کس قدر ارزاں ہے (سعید، بیخود)

۷- گرد باد:- بگولا۔ صرصر:- آندھی ہوائے تند۔ بانی ÷ بانی مبانی

میں راہ بیتابی کا بگولا ہوں یعنی بگولے کی طرح بے قراری ہوں اور اس بے قرای کی بانی مبانی صرصرِ شوق ہے یعنی وہ بگولا ہوں جو شوق کی آندھی سے پیدا ہوا ہے۔

۸-معشوق کا دہن ہیچ ہے۔ جو شخص ہیچ نہ جانے وہ ہیچ مدان ہے۔ کہتے ہیں۔ جب اس کا دہن باوجود کوشش کے مجھے معلوم نہ ہوا۔ تو میری ہیچ مدانی ظاہر ہوگئی۔

۹-ننگ بمعنی عار کہتے ہیں اگر چہ میں جوان ہوں لیکن ضعف و نقاہت نے مجھے عاجز کر دیا ہے، مجھے ایسا ضعف ہے کہ اگر بڑھاپے میں بھی کسی کو ہوتا تو ننگ پیری کہلاتا۔ مطلب یہ ہے کہ میری جوانی بڑھاپے کے لئے باعث ننگ و عار ہے۔

۱۸۴

نقشِ نازِ بُتِ طناز بہ آغوشِ رقیب ۱ پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
تو وہ بد خو کہ تحیّر کو تماشا جانے ۲ غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

وہ تپِ عشق تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع ۳ شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

۱-پئے بمعنی بجائے۔ مور کا تمام جسم خوبصورت مگر اس کے پاؤں بدصورت ہوتے ہیں۔ اسی طرح معشوق خوبصورت اور رقیب جس کی گود میں وہ بیٹھا ہوا ہے بدصورت ہے۔ اسی لئے جب اس معشوق سراپا ناز کی اس حالت کی تصویر ناز مصوّر تیار کرے تو مناسب ہے کہ وہ خامۂ مانی کی بجائے پائے طاؤس مانگے گا۔ تاکہ رقیب کی تصویر مور کے پاؤں کی طرح خراب بنے۔ یہ طرزِ بیدل کا شعر ہے۔

آسی:- خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ یہاں خود مصنف نے یہ نہیں کہا کہ میں ایسا چاہتا ہوں بلکہ یہ کہا ہے کہ اس قسم کی تصویر کا یہ تقاضا ہے۔

۲-عالمِ حیرت میں خاموشی کا ہونا ضروری ہے لیکن تو ایسا بدخو واقع ہوا ہے کہ میری حیرت اور خاموشی کو تماشا اور سامانِ تفریحِ خیال کرتا ہے۔ حالانکہ حیرت کی وجہ یہ ہے کہ ہم افسانۂ غم بیان نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ایسا افسانہ ہے جو آشفتہ بیانی چاہتا ہے اور آشفتہ بیانی کو تو پسند نہیں کرتا۔ اس لیے ہم سخت کشمکش میں ہیں۔

آسی:-تو مجھ کو محوِ تماشہ سمجھتا ہے۔ اور میرے غم کا افسانہ ایسا ہے جو چاہتا ہے کہ آشفتہ بیانی بھی اس کے ساتھ ہو (۲) میری حیرت تیرے لیے ایک تماشا ہے، اور اگر اس سے آشفتہ ہوں اور میرا غم مجھے مجبور کردے تو تو آشفتہ بیانی سمجھتا ہے۔ غرض دوگونہ عذاب ہے۔ چپ رہوں تو مصیبت، کچھ کہوں تو آفت (باقی شارحین میرے ہم خیال ہیں)

۳-نبض سے مراد رگ" ریشہ دوانی مانگے" یعنی سرایت کرے۔ مجھے ایسے تپ عشق کی تمنّا ہے کہ جس کا شعلہ شمع کی طرح رگِ جگر تک سرایت کرے گویا تمام جسم کو جلا ڈالے۔ شمع کی مثال اس لئے دی ہے کہ جب اس کی بتی کو آگ لگتی ہے تو شعلہ اس کے جگر تک بتی کے ذریعہ سے سرایت کرتا ہے۔ ریشہ دوانی بھی اسی رعایت سے لائے ہیں۔

۱۸۵

گلشن کو تری صحبت ازبسکہ خوش آئی ہے ۱ ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی ہے
واں کنگرۂ استغنا ہر دم ہے بلندی پر ۲ یاں نالے کو اور اُلٹا دعویٰ رسائی ہے

از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز ے ۳ جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

۱۔چونکہ گلستاں کو تیری ہم نشینی اور تیرا یارانہ بہت ہی زیادہ مرغوب ہے اس لئے باغ کی کلیاں کھلتی نہیں بلکہ جوشِ محبت میں تجھ سے بغلگیر ہونے کے لئے اپنی آغوش وا کرتی ہیں۔

۲۔ کنگرۂ استغنا:۔بام استغنا (بے پروائی) کا کنگورہ۔

اُدھر یار کے بام استغنا کا کنگورہ ہر دم بلند ہوتا جاتا ہے اور ادھر ہمارے نالہ کو اُلٹا رسائی کا دعویٰ ہے یعنی یار تو ہر دم ہم سے بے پروا ہوئے جاتا ہے مگر ہمارے نالے کو دعویٰ رسائی ہے ع

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

۳۔داغ صورت میں آنکھ سے مشابہ ہے۔ کہتے ہیں،غم میرا استاد بنا ہے اور وہ مجھے ضبطِ غم کی تعلیم دے رہا ہے۔ اس صورت میں مجھے جو داغ نظر آ رہا ہے وہ اُستاد کی چشم نمائی کا حکم رکھتا ہے۔ گویا زبان حال سے کہتا ہے کہ دیکھیو نالہ و فریاد نہ کیجیو۔

۱۸۶

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی ۱ لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سرِ انگشت حنائی کا تصور ۲ دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے ۳ یاں تو کوئی سُنتا نہیں فریاد کسو کی

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو ۴ خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالبؔ

حسرت میں رہے ایک بُتِ عربدہ جُو کی

۱۔جس زخم میں ٹانکے لگ سکتے ہوں وہ مجھے درکار نہیں،اے خدا! ایسا زخم دشمن کی قسمت میں لکھ دیجیو۔ میں تو ایسا زخم چاہتا ہوں جس کا کوئی علاج ہی نہ ہو سکے۔ بقول حسرتؔ اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔

۲۔حالیؔ:۔ لفظ "تو" نے جو دوسرے مصرعہ میں ہے یہ معنی پیدا کر دیئے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہ رہا۔ اس لئے دوست کے سرِانگشت حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

۳۔حالیؔ:۔ بے حوصلگی یعنی کم ظرفی۔ یاں سے مراد دنیا۔ معشوق سے کہتا ہے کہ تُو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے ظلم و جور سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کریں گے، کیونکہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد نہیں سُنتا۔

۴۔دشنہ اور خنجر سے مُراد ناز و انداز اور ظُلم و بیداد معشوق دشنہ کا جگر کو منہ نہ لگانا سے مراد جگہ کو ٹکڑے نہ کرنا اور خنجر کا گلو کی بات نہ پوچھنا سے مراد اس کو نہ کاٹنا۔

اس ظالم معشوق کے دشنہ نے جس عاشق ناکام کے جگر کو منہ تک نہ لگایا ہو اور اس کے خنجر نے کبھی اس مظلوم کے گلے کی بات تک نہ پوچھی ہو، اُس کی حسرت دیکھا چاہیئے۔ آسیؔ اور طباطبائیؔ نے اس شعر کو مقطع سے پہلے لکھا ہے۔ اس ترتیب سے شعر کا مفہوم بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

۵۔ بتِ عربدہ جو۔ معشوق جنگجو+

غالبؔ افسوس صد افسوس اس ناکامِ تمنا کی حالت پر جو ایک عُمر یعنی عرصہ دراز تک ایک بُت جنگجو کی حسرت میں رہے

۱۸۷

سیماب پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم ۱ حیراں کئے ہوئے ہے دلِ بیقرار کے

آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے ۲ اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

۱۔سیماب:۔پارہ۔ پشت گرمی:۔پشت بانی یعنی اعانت و امداد پہلا مصرعہ مثالیہ ہے اور "ہم" دوسرے مصرعہ کے ساتھ ہے۔ دل بیقرار کو سیماب سے اور اپنی حیرانی کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔

کہتے ہیں جس طرح شیشے پر پارہ چڑھانے سے شیشہ آئینہ بن جاتا ہے اور حیران کہلاتا ہے اسی طرح ہم دلِ بیقرار کے حیران کئے ہوئے ہیں یعنی پہلے بے قراری کا سیماب ہمارے دل کے شیشے پر چڑھا ہے پھر اس میں حیرانی کی صفت پیدا ہوئی ہے۔(تمام متفق)

آسیؔ نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ سیماب کا کام یہ ہے کہ وہ آئینہ کی مدد کرتا ہے اور اسے چمکاتا ہے۔ برعکس اس کے ہمارے دل بیقرار نے ہم کو حیران بنا دیا اور پریشان کر دیا۔ یعنی ہم بیکار ہو گئے اور گویا یہ اس سیماب کی نئی تاثیر ہے۔

۲۔پھول کھلنے کو آغوش گل کشودہ سے تعبیر کیا ہے لطف یہ ہے کہ پھول کا کھلنا اس کی ف

کی دلیل ہے۔ کہتے ہیں پھولوں نے رخصت ہونے کے لئے اپنی آغوش واکردی ہے اے عندلیب! اس سے گلے مِل کر رخصت ہو کہ بہار کے دن ختم ہوگئے۔

۱۸۸

ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں ۱ معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیئے
اس لب سے مِل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں ۲ شوقِ فضول و جُرأتِ رندانہ چاہیئے

۱۔ تمکین:۔ خودداری۔ اگر وصل کی رات معشوق کے دل میں تمکنت اور عاشق کے دل پر ضبط و قرار کا عالم طاری ہو تو پھر وصل ہجر بن جاتا ہے۔ دراصل وصل میں معشوق کو شوخ وشنگ اور عاشق کو دیوانہ و گستاخ ہونا چاہیئے تاکہ کسی قسم کا تکلف بے لطفی پیدا نہ کرے۔

۲۔اس کے لب کا بوسہ کبھی نہ کبھی مِل ہی جائے گا۔ ہاں اس کے لئے شوق فضول اور جُرأتِ رندانہ چاہیئے۔ بیخود۔ ''شوق فضول'' کے معنی حد سے بڑھا ہوا شوق لکھتے ہیں اور آسی کہتے ہیں کہ بوسہ کے شوق کو شوقِ فضول اس لئے کہا کہ مصنف اس کو ابوالہوی سمجھتا ہے نہ کہ عاشقی۔

۱۸۹

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے ۱ یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے
صحبت رنداں سے واجب ہے حذر ۲ جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھادل! ۳ بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے
چاک مت کر جیب بے ایّامِ گل! ۴ کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی، ۵ منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے!
دشمنی نے میری کھویا غیر کو ۶ کس قدر دشمن ہے دیکھاچاہیئے!
اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی ۷ یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے!
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ۸ نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیئے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے ۹ چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

۱۔انسان دُنیا میں جس قدر بھی محبت کرے وہ حسینوں سے کرے اور اگر خوش قسمتی سے اس کے جواب میں وہ اسے چاہنے لگیں تو پھر کسی اور نعمت کی ضرورت نہیں۔

۲۔شراب کشیدن:۔ شراب کھینچنا۔ اپنے کو کھینچنا:۔ پرہیز کرنا۔

کہتے ہیں میخواروں کی صحبت سے پرہیز کرنا واجب ہے۔ بجائے شراب کھینچنے (شراب پینے) کے اپنے آپ کو اس سے کھینچنا چاہیئے یعنی پرہیز کرنا چاہیئے۔

۳۔ تیرے عشق کو دل بالکل آسان بات سمجھتا تھا۔ اب اس سے ذرا پوچھنا چاہیئے کہ تُو نے عشق کو کیا سمجھا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ عشق بہت مشکل تھا۔ لیکن دل نے اُسے آسان سمجھ لیا تھا (سعید) بیخود، طباطبائی و آسی:۔ دوسرے مصرعہ میں سمجھنا بازپُرس کرنے کے معنی پر ہے۔ یعنی معشوق کو صلاح دیتے ہیں کہ ذرا اس کا مزاج بھی پوچھو کہ کیا سمجھ کر عشق کیا تھا۔

۴۔ حالی:۔ پھول کے کھِلنے کو چاک گریبان سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیئے۔ پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی اپنا گریبان چاک مت کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوش جنوں زیادہ ہوتا ہے۔

طباطبائی:۔ یہاں چاک گریبان کے منع کرنے نے بہت لطف دیا کہ یہ بندش کا نیا انداز ہے۔

آسی:۔ جدّت یہ ہے کہ فصلِ بہار میں گریبان چاک کرنا بہار کے لیے نہیں ہے بلکہ بمقتضائے ایمائے قدرت ہے۔

۵۔ محبوب عاشق کے سامنے خاص طور پر اپنا منہ چھپاتا ہے۔ کہتے ہیں، تم ہم سے یہ منہ چھپانا چھوڑ دو۔ جس طرح تم اوروں سے بے حجابانہ اور بے تکلفانہ ملتے ہو، اسی طرح ہم سے بھی ملو۔ اپنا منہ چھپا کر تم بیگانگی اور ناواقفیت کا اظہار کرنا چاہتے ہو۔ لیکن دراصل اس طرح کی بیگانگی میں لگاوٹ پائی جاتی ہے۔ اس لئے دیکھنے والے فوراً اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ معاملہ دگرگوں ہے۔ برعکس اس کے اگر تم ہم سے منہ چھپانا چھوڑ دو اور بے حجابانہ ملو تو دیکھنے والوں کو تمہارے اور ہمارے دلی معاملات نہ معلوم ہونے پائیں گے اور اس طرح سے بیگانگی، دوستی کا پردہ ہو جائے گی اس مضمون کو اس طرح بھی لکھا ہے۔

در پردہ اُنہیں غیر سے ہے ربط نہانی — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

۶۔مرزا پہلے لکھ چکے ہیں ۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

اس مضمون کو اب اس طرح ادا کرتے ہیں کہ " محبوب میرا اس قدر دشمن ہے کہ رقیب نے اس کے سامنے میرے خلاف زہر اُگلا اور وہ میرا ذکر سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا ۔اس طرح دشمن کو میری وجہ سے نقصان پہنچا" ۔(سہاؔ) غیر میری دشمنی میں سب کچھ بھول گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو معشوق کی بھی خبر نہیں، دیکھئے وہ ہمارا کس قدر دشمن ہے۔

۷۔اگر ہم اپنے تئیں رسوا اور بدنام کرنے کی کوشش بھی کریں تو کامیاب نہیں ہو سکتے ۔ ہاں اگر یار ہنگامہ آرا ہو تو رسوائی ہو سکتی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو ہمیں جلوہ دکھا کر رسوا کر سکتا ہے ۔ جلوہ دکھانے میں رسوائی کی صورت یہ ہے کہ اس کی جلوہ آرائی سے بیتابی پیدا ہو گی اور بیتابی رسوائی کا باعث ہو گی۔

۸۔جس شخص کی امید مرنے پر منحصر ہو، اس کی نا امیدی دیکھنے کے قابل ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اس درجہ مایوس ہے کہ موت مانگتا ہے لیکن وہ بھی نہیں آتی طباطبائیؔ لکھتے ہیں ۔مرنے پر امید حاصل ہوئی تو کیا ع

امید نیست کہ عمرِ گزشتہ باز آید

اے غافل !ان مہ وشوں کو چاہنے والا بھی حسین و خوبرو ہونا چاہئے مطلب یہ ہے کہ آپ خوبرو نہیں ہیں اس لئے کامیاب نہ ہوں گے۔

۱۰۔دیکھنا اسدؔ صاحب حسینوں کو چاہتے ہیں ۔ ذرا آپ کی صورت تو ملاحظہ کیجئے ۔ یہ منہ اور منصور کی دار (یہ منہ اور مسور کی دال)

۱۹۰

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے ۱ — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا بتغافل خوشتر ۲ — ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں ۳ — صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں ۴ — کس قدر خانہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں ۵ — صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو، ۶ — پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے ۷ — ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے ۸ — سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے ۹ — آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

۱۔میں بھاگ رہا ہوں تا کہ منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں ۔ لیکن ہر قدم پر منزل کا راستہ بڑھتا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر میں آگے بڑھتا ہوں اسی قدر بیابان بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔منزلِ مقصود بیابان ہے یا بیابان سے آگے ہو گی ۔

سعیدؔ:۔ بیابان میری رفتارِ مجنونانہ سے ڈر کر مجھ سے بھاگتا ہے۔(ظاہر ہے یہاں یہ مفہوم نہیں)

۲۔حسرتؔ:۔ ظاہر ہے کہ "رشتۂ شیرازۂ مژگاں" غیر محسوس ہوتا ہے ۔بس مطلب یہ ٹھہرا کہ کتابِ یار کے دیدار کا درس یا (بحذف استعارات) محبوب کے دیدار کا لطف اسی حالت میں ہے کہ ہم اسے دیکھیں اور اسے ہمارے اس دیکھنے کی خبر نہ ہو۔ (سعیدؔ ہم خیال ہیں یہی شرح سب سے بہتر ہے)

طباطبائیؔ :۔ میری نگاہ شیرازۂ مژگاں کا رشتہ بن گئی ہے۔ حاصل یہ کہ تغافل پسند ہونے کے سبب سے نگہ آنکھ سے باہر نہیں نکلتی اور تماشائے دُنیا سے درس لینا بھی تغافل سے اچھا ہے اور عنوان کا لفظ مبالغہ پیدا کرنے کے لیے لائے ہیں یعنی سارا تماشا تو ایک طومار ہے اس کے دیکھنے کا کے دماغ ہے۔ یہاں عنوانِ تماشا کے بھی دیکھنے سے تغافل ہے۔

آسیؔ:۔ عنوان تماشائے دوست کا درس حالتِ تغافلِ یار میں اچھا ہے تا کہ اس پر یہ ظاہر نہ ہو اور اس کے سوائے دوسروں پر بھی یہ راز نہ کھلے کہ نگاہ نے عنوانِ تماشا کا درس لیا یعنی کسی کو دیکھا۔ اس وجہ سے نگاہ مجھ سے رشتۂ شیرازۂ مژگاں بنی ہوئی ہے۔ یعنی مجھ سے چھپی ہوئی ہے اور اس کا یہ

فعل اس لئے ہے کہ اس کا راز معشوق پر تو کیا، مجھ پر بھی نہ ظاہر ہو۔

بیخود :۔ دُنیا کے تماشے سے عبرت کا سبق حاصل کرنا بھی تغافل کے ساتھ بہتر ہے یعنی اُچٹتی ہوئی نگاہ سے آغازِ تماشا کو دیکھ لینا نتیجہ نکال لینے کے لئے کافی ہے اس لئے میری نگاہ شیرازۂ مژگاں کا رشتہ بن گئی ہے۔ مطلب یہ ہے میں ایسا تغافل پسند ہوں کہ میری نظر بھی آنکھ کے پردے سے باہر نہیں نکلتی اور دُنیا کی نیرنگیوں سے سبق حاصل نہیں کرتی۔

۳۔شبِ فراق میں میرا سایہ میری آتشِ دل کی وحشت سے ڈر کر مجھ سے اس طرح بھاگتا ہے۔ جس طرح آگ سے دُھواں بھاگتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ شبِ فراق میں میرا سایہ جو ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہے میرا ساتھ نہیں دیتا یہی مضمون اس طرح بھی ادا کیا ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ!
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

۴۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غمِ عشاق حسینوں کو سادگی سکھا دے اور یہ لوگ عشاق کے غم میں ترکِ آسائش کر دیں۔ محض ایک میرے مرجانے سے خانہ آئینہ ویران ہوگیا ہے۔ اگر غمِ عشاق میں تمام محبوب آرائش ترک کر کے سادگی اختیار کر لیں گے تو خانہ آئینہ کا پوری طرح ویران ہو جانا یقینی ہے۔

آسیؔ نے دُوسرا مفہوم غمِ عشاق کو منادیٰ قرار دے کر لکھا ہے یعنی اے غمِ عشاق! تو معشوقوں کو سادگی نہ سکھا۔ دیکھ تو سہی! تیرے اس فعل سے آئینہ خانہ کیسا ویران معلوم ہوتا ہے یعنی میرے غم میں محبوب نے آرائش ترک کردی ہے۔

۵۔ آبلے کو گوہرِ روشن اور جادہ صحرا کو رشتہ گوہر سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں میرے پاؤں کے چھالوں کے اثر سے صحرائے جنوں کا رشتہ گوہر کی طرح چمک رہا ہے اور وہ رشتہ گوہر چراغاں کا سماں پیش کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے آبلوں میں سے جادۂ صحرا پر برابر برابر خون کے قطرے ٹپکتے چلے گئے ہیں اور وہ چراغوں کی طرح روشن ہیں۔

آسیؔ :۔ دُوسرا مفہوم۔ میرے آبلے ایسے پُر سوز ہیں کہ جن کے نقش تک جل کر چراغاں کا منظر دکھا رہے ہیں۔

۶۔ تمہید کے لغوی معنی بچھانے کے ہیں اور بچھانا بستر کے مناسبات میں سے ہے۔ تمہید کے اصطلاحی معنی ہیں ”کسی کام سے پہلے ایسی باتیں کہنا جن پر کام موقوف ہو“۔ اور یہی مصنّف کا مقصود ہے یعنی بیخودی حصُولِ فراغت کی تمہید یا دیباچہ ہے۔ فراغت کے لغوی معنی خالی ہونے کے ہیں اور یہ پُر ہونے کے مناسبات میں سے ہے۔ اصطلاح میں راحت کے معنی ”پُر“ ہیں اور یہی معنی یہاں مراد ہیں ”ہوجو“ ہوجیو کا مخفف ہے۔

کہتے ہیں خدا کرے میری بے خودی کو بسترِ تمہیدِ فراغت بننا نصیب ہو۔ کیونکہ اس کی بدولت میرا شبستان (خواب گاہ) مجھ سے اس طرح بھرا ہوا ہے جس طرح سایہ کا شبستان سائے سے پُر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری بے خودی کا بھلا ہو کیونکہ اس کے سبب سے میں اپنی خواب گاہ میں سایہ کی طرح بے حس وحرکت آرام سے پڑا ہوں اور میری خواب گاہ اس سایہ سے بھری بھری یعنی آباد معلوم ہوتی ہے۔ اگر بیخودی نہ ہوتی تو میں خدا جانے کہاں کہاں آوارہ اور ویران پھرتا اور ادھر میری خواب گاہ میرے نہ ہونے سے بالکل ویران ہوجاتی۔

۷۔ گردن مارنا:۔ سر کاٹنا۔ گُلِ شمع ؛ شمع کا گل۔ اگر شمع کا گل کاٹ دیا جائے تو اس کے اجزا بکھر جاتے ہیں اور گل کاٹنے سے شمع کا شعلہ زیادہ روشن ہوجاتا ہے۔ گلِ شمع شعلۂ شمع کو بھی کہتے ہیں۔

اگر شوقِ دیدار میں تُو میرا سر قلم کردے تو گردن کٹ جانے سے میرا شوقِ دیدار کم نہ ہوگا بلکہ میری نگاہ گلِ شمع کی طرح اور زیادہ روشن ہوجائے گی۔

اگر بکھر جانے کے معنی لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ میری نگاہ شوق دیدار میں گلِ شمع کی مانند پریشان ہوجائے گی، گویا ایک نگاہیں کئی نگاہیں بن جائیں گی۔

۸۔شبِ ہجر میں بیکسی کی وحشت اس قدر زیادہ ہے کہ میرا سایہ مجھ سے ڈر کر بھاگا ہے اور آفتاب قیامت کے سایہ میں جا کر چھپ گیا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ سایہ آفتاب سے بھاگتا ہے۔ لیکن یہاں شاعرؔ نے سُورج کی روشنی سے سایہ غائب ہو جانے کو سایہ کا چھپ جانا قرار دیا ہے۔

آسیؔ :۔ ہائے شبِ ہجر میں مجھے وحشت ہوتی تھی تو سایہ مجھے کِس کِس طرح ڈرایا کرتا تھا۔ اس کی شرم اور ندامت کی وجہ سے قیامت کے دن خورشید قیامت میں سایہ مجھ سے

پوشیدہ ہورہا ہے اور چھپا چھپا پھرتا ہے۔ (یہ معنی قرینِ قیاس نہیں)

۹۔صد جلوۂ رنگین:۔یعنی جلوۂ حُسن۔ دیدۂ حیران:۔ حیرتِ عشق۔

جلوۂ حُسن کے ساغر کی گردش تیری بدولت ہے اور دیدۂ حیران کی آئینہ داری میرے سبب سے بقول حسرت مطلب یہ ہے یہ جلوۂ حُسن کا تعلق تجھ سے ہے اور حیرتِ عشق کا مجھ سے (سعید و حسرت)

طباطبائی:۔ تیرا جلوۂ رنگین اس محفل میں گردشِ ساغر کا کام کررہا ہے۔ اور میرا دیدۂ حیراں آئینہ کا، جلوہ کو ساغر اس وجہ سے کہا ہے کہ وہ بھی مثلِ ساغر ہوشربا ہے (آسی، بیخود)

۱۰۔اے اسد! میری نگاہِ گرم سے آگ برتی ہے اور اس آگ سے خس و خاشاکِ گلستاں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ یا چراغاں ہورہا ہے۔ گویا گلستاں میں یہ چراغاں میری نگہ گرم کی بدوم ہے۔

۱۹۱

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے ۱ کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بُلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل ۲ اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے ۳ کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر، ۴ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا ۵ ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے ۶ پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے ۷ تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بُلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے ۸ کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

۱۔میں اپنا غمِ دل اس کو سُنا نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ ہر بات میں مین میخ نکالنے کا عادی ہے۔ بھلا میری تدبیر وہاں کیا کارگر ہوسکتی ہے۔ جہاں میں کوئی بات نہیں بنا سکتا، بات کا بننا اور بن پڑنا۔ تدبیر نکالنا۔ بات کا بنانا۔ جھوٹی بات بنانا اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے۔

آسی نے دوسرا مفہوم غمِ دل کو نکتہ چیں قرار دے کر لکھا ہے یعنی غمِ دل اس لئے نکتہ چینی

کرتا ہے کہ تُو اس پر مجھے اظہار نہیں کرتا اور ہم سے اس کو اپنا حال رعبِ حُسن یا موقعہ نہ ملنے کی وجہ سے سنایا نہیں جاتا۔ کہتے ہیں۔ غمِ دل تو اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے نکتہ چینی میں مصروف ہے۔ مگر وہاں کی رنگت کو یہ نہیں جانتا کہ وہاں کوئی بات بنائے تو بن نہیں سکتی۔ پھر بھلا کامیابی کیسے ہوسکتی ہے۔

۲۔میں اس کو بُلاتا تو ہوں، لیکن امید نہیں کہ وہ آئے اے جذبۂ دل! مدد کا وقت ہے، تو اپنے اثر سے اس کو اتنا مجبور کردے کہ وہ آئے بغیر نہ رہے۔

۳۔وہ ستانے کو ایک کھیل سمجھتا ہے، اس لئے مجھے خوف ہے کہ کہیں وہ ستانا نہ چھوڑ دے اور بھول نہ جائے۔ کاش ایسا ہو کہ اُس کو ستائے بغیر چین ہی نہ آئے گویا اس کو ستانے کی عادت ہوجائے۔

۴۔تُو نے رقیب کو خط لکھا ہے اور وہ تیرے خط کو اس طرح کُھلے بندوں لئے پھرتا ہے کہ اگر کوئی اس سے پوچھے یہ کیا ہے تو وہ اس کو چھپا نہیں سکتا بلکہ اس کو مجبوراً بتانا ہی پڑے گا فلاں کا خط ہے۔ گویا تم رقیب کو خط لکھنے سے ایک نہ ایک دن ضرور بدنام ہوجاؤ گے کیونکہ اس کو تمہاری رسوائی کا مطلق خیال نہیں۔

۵۔اس شعر میں نزاکت کی مذمت اور تعریف کی ہے کہتے ہیں، وہ بھلے ہیں تو کیا ہوا۔ مگر اس نزاکت کا بُرا ہو کہ ہماری مطلب براری ان سے نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اگر وہ حسن اتفاق سے ہاتھ آجائیں تو ہم ان کی نزاکت کی وجہ سے اُنہیں چھو بھی نہیں سکتے۔

۶۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کس کی جلوہ گری ہے۔ کیونکہ اس نے عالمِ امکان پر اسباب کا ایسا پردہ ڈالا ہے کہ جسے کوئی نہیں اُٹھا سکتا مطلب یہ ہے یہ رنگارنگی اور کثرت کے پردے کو اُٹھا کر کوئی کنہ حقیقت دریافت نہیں کرسکتا۔

۷۔حسرت:۔ موت کی راہ دیکھنے سے کیا فائدہ کہ وہ تو خواہ مخواہ آئے ہی گی۔ تمہاری خواہش کرنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر تم نہ آؤ۔ تو مجھے بُلاتے بھی نہ بن پڑے۔

طباطبائی:۔ موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ آئے بغیر نہ رہے گی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا کہ تم سے کہوں۔ تم نہ آؤ کہ پھر مجھے بلاتے بھی نہ بن پڑے یعنی اب میں آنے کو منع کروں تو کس

مُنہ سے بُلاؤں۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تمہارے نہ آنے سے موت کا آنا بہتر ہے۔

بیخودؔ:۔ موت کی میں کیوں راہ دیکھوں۔ اس کا آنا لازمی ہے۔ وہ بغیر انتظار کے بھی اپنے وقتِ معیّن پر آ کر رہے گی۔ تم کو چاہوں کہ اگر تم نہ آؤ تو ہمارا بُلانا بھی ممکن نہیں ہے مطلب یہ ہے۔ تمہارا بلانا موت کے آنے سے دشوار تر ہے۔

آسیؔ نے چار مفہوم لکھے ہیں اور اس مفہوم کو سب سے بہترین قرار دیا ہے۔" یہ جو شب و روز موت کا انتظار کرتا ہوں۔ یہ فضول ہے۔ اس کو چھوڑ دینا چاہیے اور اس کی راہ مجھ کو نہ دیکھنی چاہیے، کیونکہ وہ تو خواہ مخواہ آئے گی اور اس کے یقینی ہونے کا اور ضروری آنے کا سبب اور اس کے بلانے کی تدبیر یہ ہے کہ میں یہ چاہوں یعنی اس بات کی خواہش کروں کہ تم نہ آؤ تو اس خواہش کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ مجھ سے ناراض ہو جاؤ گے اور پھر منہ نہ پڑے گا کہ میں تم کو بُلاؤں اور پھر اس صدمہ سے لازمی مجھے موت آ جائے گی۔

سعیدؔ:۔ یعنی میرے اوپر شبِ انتظار میں جو کلفت ہے وہ صرف دو صورت سے رفع ہو سکتی ہے یا تم آؤ یا موت، لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اگر نہ آؤ تو میں بُلا بھی نہیں سکتا۔ اس لئے تمہاری آمد کو کیوں چاہوں اور موت ہی کا راستہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ اس تکلیف میں یقیناً آ کر رہے گی۔

۸۔ میرے سر پر سے وہ بوجھ گرا ہے کہ میں اُٹھا نہیں سکتا اور ایسی مشکل میں پھنس گیا ہوں کہ کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتا۔ مطلب یہ ہے کہ میں ایسی سخت کشمکش میں مبتلا ہوں کہ کچھ بن نہیں پڑتا۔

۹۔ غالبؔ! عشق پر کسی کا زور نہیں۔ یہ وہ آگ ہے کہ نہ لگائے لگ سکتی ہے اور نہ بُجھائے بُجھ سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق نہ اپنی خواہش سے پیدا ہوتا ہے اور نہ اپنی خواہش سے ترک کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۲

چاک کی خواہش اگر وحشت بعریانی کرے ۱ صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے
جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے کہ اگر کیجئے خیال ۲ دیدۂ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے
ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک ۳ آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پائے شکست ۴ موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے
خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد ۵ یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

۱۔ اگر عریانی کی حالت میں میری وحشت گریبان چاک کرنے کی خواہش کرے تو صبح کی طرح میرا زخمِ دل گریبان بن کر چاک چاک ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جب گریباں نہ رہے اور جنون کو گریبان چاک کرنے کی خواہش ہو تو پھر میرے زخمِ دل کا گریبان اس طرح چاک ہو جیسے گریبانِ صبح چاک ہوتا ہے۔

۲۔ تیرے جلوے کا وہ عالم ہے کہ اگر اس کا خیال کریں تو دیدہ حیرت کی زیارت گاہ بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس کا خیال کریں تو دیدہ دل حیرت گاہ بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محض تیرے جلوہ کے خیال سے دل کو سخت حیرانی ہوتی ہے۔

۳۔ اب تو شکستگی سے بھی ہمارا دل نا امید ہو گیا۔ حالانکہ معشوق سخت سنگدل ہے۔ لیکن پھر بھی شکستگی دل کی اُمید اس سے پوری نہیں ہوتی۔ یارب پہاڑ کے سامنے شیشہ کب تک اپنی گراں جانی کا اظہار کرے گا۔ اور کب تک پہاڑ اس کی مشکل حل نہ کرے گا۔ معشوق کو کوہ اور دل کو آبگینہ سے تشبیہ دی ہے۔

۴۔ موئے شیشہ:۔ شیشہ چٹخنے سے اس میں بال پڑ جاتے ہیں۔ مژگانی کرے:۔ پلکیں بن جائے۔

اگر میکدہ معشوق کی مستِ ناز آنکھوں سے شکست پائے تو اس شکست میں ساغر میں جو بال پڑیں گے، وہ دیدۂ ساغر کے لئے پلکیں بن جائیں گے اور دیدۂ ساغر چشم مست یار کو دیکھ کر حیران رہ جائے گا یا شرمندہ ہوگا۔

۵۔ یک قلم منظور ہے یعنی سب منظور ہے۔ قلم کے لفظ میں دوہری رعایت ہے۔ ایک تو رخساروں پر قلمیں ہوتی ہیں۔ دوسرے خط بھی قلم سے لکھا جاتا ہے۔

یار کے رخساروں پر جو خط نمایاں ہوا ہے وہ خط نہیں ہے، بلکہ ایک عہدنامہ ہے جو اُلفت نے زلف کو لکھ کر دیا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ میرے حق میں پریشانی کو جو کچھ کرنا ہو، وہ بخوشی کرے۔ مجھے سب منظور ہے۔

۱۹۳

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے ۱ ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا ۲ تیری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو ۳ نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ۴ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے
اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا مرے پاؤں داب تو دے

۱۔ یہ ممکن ہے کہ وہ خواب میں آئے اور مجھے اضطراب سے تسکین دے لیکن مشکل یہ ہے کہ تپشِ دل (بیقراریٔ دل) مجھے سونے ہی نہیں دیتی۔

۲۔ لگاوٹ بمعنی محبت۔ محبت میں تیرا رو دینا مجھے قتل کئے ڈالتا ہے کیونکہ تیری آنکھوں میں آنسوں جھلکنے سے ایسی چمک اور آب پیدا ہوتی ہے۔ کہ کوئی اور معشوق اس طرح اپنی تیغ نگہ کو آب نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تیرا رونا مجھے قتل کئے ڈالتا ہے۔

۳۔ اگر بوسہ نہیں دیتے تو نہ دو، اپنے منہ سے انکار ہی کردو۔ ہم تمہاری جنبش ہی سے تمام ہو جائیں گے۔ پہلے یوں لکھ چکے ہیں ۔

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسےٰ نہ ہوا

۴۔ اے ساقی! اگر تجھے ہم سے نفرت ہے اور تو اپنے پیالے میں ہمیں شراب نہیں پلانا چاہتا تو کچھ مضائقہ نہیں، اوک ہی سے پلا دے، ہمیں تو شراب چاہئے، پیالے سے غرض نہیں۔

۵۔ اس شعر میں اپنی خوش بختی اور محروم القسمتی دکھائی ہے۔ کہ مجھے ان کے پاؤں دبانے کا موقعہ ملا تو خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے گویا پھر بھی حظِ وصل سے محروم رہا۔

۱۹۴

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے ۱ مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے!
سرشک سر بصحرا دادہ نورالعینِ دامن ہے ۲ دلِ بیدست و پا اُفتادہ برخوردارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو ۳ فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدار بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی ۴ شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی ۵ ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے
کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

۱۔ میری تپش سے بستر کا ہر ایک تار بے چین ہے۔ میرا سر تکیہ کے لئے باعثِ ایذا اور میرا جسم بستر کے لئے وبال ہے۔ تپش بمعنی تڑپ اور حرارت۔

۲۔ سرشک :- آنسو۔ سر بصحرا دادہ :- آوارۂ دشت۔ نورالعین :- آنکھ کا تارا۔ بیدست و پا افتادہ :- بیدست وپا پڑا ہوا۔ برخوردار :- عزیز۔ اُنس گرفتہ۔

میرا آنسو جو کثرتِ گریہ سے دشت میں آوارہ ہے یعنی بہتے بہتے صحرا میں جا پہنچا ہے۔ وہ میرے دامن کی آنکھ کا تارا ہے۔ گویا میرے دامن کے لئے باعثِ فخر و ناز ہے اور میرا دل جو بستر پر بیدست وپا پڑا ہوا ہے، وہ بستر سے غایت درجہ اُنس رکھتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر برخوردارِ بستر ہے۔ نورالعین اور برخوردار مقابلے کے الفاظ ہیں اور مطلب یہ ہے کہ میرے وہ اشک جو نورالعین دامن ہیں۔ بہتے بہتے صحرا میں جا پہنچے ہیں اور میرا دل جو برخوردارِ بستر ہے ایسا بیدست وپا ہوا ہے کہ وہ ہر وقت بستر پر پڑا رہتا ہے۔

آسیؔ :- "نورالعین دامن" سے صحرا کے دامن کا نورالعین مراد لیتے ہیں۔

طباطبائی :- آنسو دامن کی آنکھ کا تارا ہے اور دل بسترِ مرض کا مرادوں والا ہے یعنی آنسو ہمیشہ دامن میں رہتا ہے اور دلِ بیمار کو بستر پر پڑا رہنے سے اُنس ہو گیا ہے۔ (بیخودؔ)

سعیدؔ :- مجھ رفتہ صحرانوردی کا آنسو دامن کا نورالعین ہے اور مجھ عاجز کا دل بستر کا برخوردار ہے یعنی بہ آرزوئے صحرانوردی میرے ہمیشہ روتے رہنے سے دامن کو آنسوؤں سے اور میری بیچارگی اور عاجزی کی وجہ سے ہمیشہ پڑے رہنے سے بستر کو دل سے غایت انسیت ہو گئی ہے۔ اپنی کثرتِ یاس ومحرومی کا اظہار کیا ہے۔

۳۔ رنجوری :- بیماری: عیادت :- بیمار پُرسی : بالیں :- سرہانہ : طالع بیدار :- جاگی ہوئی قسمت

میری بیماری کا نصیب کیسا اچھا ہے کہ تم عیادت کو آئے ہو ورنہ تم کہاں اور ہم کہاں! تمہاری تشریف آوری سے میرا طالع بیدار بسترِ مریض کے لیے شمع بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے آنے سے میری تقدیر اس شمع کی طرح روشن ہو گئی ہے جو بیمار کے سرہانے جلائی جاتی ہے۔ (آسی)

بیخود: تمہارے قدم رنجہ کرنے سے شمع بالیں کی روشنی طالع بیدار بستر بن گئی ہے۔

حسرت:- تمہارے آنے سے طالعِ بیدارِ بستر فروغِ شمعِ بالیں ہے۔ یعنی طالع بیدار کی درخشندگی شمعِ بالیں کی روشنی سے بھی بڑھ گئی ہے۔

۴۔ شامِ فراق، جوشِ اضطراب کی وجہ سے ایک طوفان گاہ بن گئی ہے اور اس طوفانِ اضطراب اور تاریکیِ شبِ فراق کی وجہ سے ہر تارِ بستر شعاعِ آفتابِ قیامت بنا ہوا ہے۔ قیامت کے دن سورج سوا نیزے پر آجائے گا اور اس کی شعاعیں ناقابلِ برداشت ہوں گی۔

طباطبائی:- پہلے مصرعہ میں پے درپے چار اضافتیں بے لطفی پیدا کرتی ہیں۔

آسی:- چونکہ یہ ثقالت پیدا نہیں کرتیں۔ اس لئے ان پر اعتراض کرنا درست نہیں۔

۵۔ بالش:- تکیہ: عارِ بستر:- بستر کے لئے باعثِ ننگ وعار۔

ابھی میرے تکیے میں سے معشوق کی زلفِ مشکیں کی خوشبو آ رہی ہے گویا شبِ وصل کو گزرے ہوئے کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ زلیخا کی طرح یوسف سے محض خواب میں ملاقات کرنا ہماری دید اور بستر کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے۔ مطلب یہ ہے ہم عالمِ خواب میں وصل حاصل کرنا موجبِ عار خیال کرتے ہیں۔

۶۔ غالب میں کیا بیان کروں کہ ہجرِ یار میں میرے دل کی کیا حالت ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ میرے بستر کا ہر ایک تار کانٹا بنا ہوا ہے۔ گویا میں بستر پر نہیں لیٹتا۔ کانٹوں پر لوٹتا ہوں۔

بیخود:- تڑپتے تڑپتے میرے بستر پر اس قدر سلوٹیں پڑ گئی ہیں کہ ایک ایک تارِ بستر چبھ جانے کے لئے خارِ بستر بن گیا ہے۔

۱۹۵

خطر ہے رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہو جائے ۱ غرورِ دوستی آفت ہے تُو دُشمن نہ ہو جائے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشوونما غالب
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

۱۔ رگِ گردن:- مراد غرور۔ رگِ گردن کبر و غرور کی حالت میں پھر جاتی ہے۔

کہتے ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ میرا رشتۂ اُلفت کہیں رگِ گردن نہ ہو جائے گویا کہیں میں تیری دوستی پر غرور کرنے لگوں اور تجھے میرے اس غرور پر غصہ آئے کہ ہیں یہ اور میری دوستی پر غرور کرتا ہے۔ غرض مجھے خوف ہے کہ مبادا اس بنا پر تُو مجھ سے بگڑ بیٹھے اور میرا دشمن ہو جائے۔ (آسی)

باقی شارحین نے یہ شرح لکھی ہے کہ "معشوق کو میری دوستی اور رشتہ محبت پر غضب کا غرور ہوا۔ اس سے مجھے یہ خطرہ ہو گیا ہے۔ کہیں یہ دوستی دشمنی سے نہ بدل جائے۔ کیونکہ غرورِ دوستی آفت ہے" اس شرح میں خرابی یہ ہے کہ معشوق کو عاشق کی دوستی پر کبھی غرور نہیں ہوتا۔

سعید نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے، رشتۂ الفت رگِ گردن کی طرح کٹ نہ جائے کیونکہ دوستی کا گھمنڈ بڑا فتنہ ہے جس سے اندیشہ ہے کہ تُو دشمن ہو جائے گا اور اس کے باعث رشتۂ الفت منقطع ہو جائے گا۔

۲۔ اگر اس فصلِ بہاری میں اس قدر زیادہ پھول نہ ہوں جو سرو کے قامت کو ڈھانک لیں تو سمجھ لو کہ بہار کی قوتِ نشوونما میں کمی ہے گویا اگر یہ کمی نہ ہوتی تو اس قدر پھول ہوتے کہ سرو کے قامت پر پھولوں کا پیرہن چڑھ جاتا۔

آسی:- فصلِ بہار میں سبزہ کی نشوونما کی یہ شان ہونا چاہئے کہ سرو جس پر پھول نہیں آتے اس پر بھی پھول آجائیں اور اس قدر آئیں کہ پیراہنِ سرو ہو جائیں۔

۱۹۶

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے، ۱ نالہ پابندِ نے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے ۲ گر باغ گدائے مے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے ۳ پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ۴ ہر چند کہیں کہ 'ہے' نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے ۵ اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے
کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد! ۶ مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب!
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

۱۔ فریاد کرنے کے لئے کسی لے کی ضرورت نہیں ہے جس طرح کوئی چاہے فریاد کرے، نالہ نَے کا پابند نہیں۔ یعنی اسے تصنع سے کچھ لگاؤ نہیں۔ جو بات دل سے نکلتی ہے اُس میں اثر ہوتا ہے۔

۲۔ تو بنوں سے کشکولِ گدائی اور کدوئے شراب بنایا جاتا ہے، کہتے ہیں۔ اگر باغ شراب باغ کی بھیک نہ مانگتا تو پھر باغبان باغوں میں تو بنے کیوں بوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ان تو بنوں سے باغ ضرور شراب کی بھیک مانگتا ہے، ورنہ باغبان ہرگز تو بنے نہ بوتے۔

۳۔ یہ شعر تصوف میں ہے۔ کہتے ہیں باوجود اس کے کہ ہر شے میں تو جلوہ گر ہے، مگر تیرے مانند کوئی شے عالمِ جسمانی میں نہیں یعنی تیری ذات ''باہمہ اور بے ہمہ'' کے مصداق ہے۔

۴۔ دیکھنا، خبردار! تم ہستی کا فریب نہ کھانا! ہر چند سب کہیں، کہ ''ہے''۔ لیکن تم یہی سمجھنا کہ نہیں ہے کیونکہ فریبِ ہستی میں پھنس کر انسان طلسمِ اوہام میں گرفتار اور جلوۂ حقیقت سے محروم رہ جاتا ہے۔

۵۔ اردی:۔ ماہ بہار: دے :۔ ماہ خزاں:

اگر تو غم سے محفوظ رہنا چاہتا ہے تو خوشی کو ترک کردے۔ پھر تجھے کبھی غم نہ ہوگا کیونکہ تیرے لئے خوشی اور غم برابر ہو جائے گا۔ اس کی مثال یہ دیتے ہیں کہ اگر بہار کا موسم نہ ہو تو خزاں بھی نہ ہو، گویا ایک سی حالت رہے۔

۶۔ حالی:۔ مگس کی قے، یعنی شہد۔

زاہد جو شہد پینے کو ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے۔ شاعر اس کو شراب پینے کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے، بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کی قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ شہد وہ چیز ہے جسے زاہد پسند کرتا ہے کیونکہ وہ جنت میں ملے گا۔

۷۔ ردیف غزل میں ''نہیں ہے، نہیں، ہے'' بار بار آیا ہے، ردیف کو ایک نئے ڈھنگ سے صرف کرنے کے لئے غالبؔ نے ازراہِ شوخی اپنا نام ہی ''نہیں ہے'' رکھ لیا ہے۔ چنانچہ دریافت کرتے ہیں کہ جب ہستی کے متعلق تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ ''نہیں ہے'' اور عدم کے بارے میں بھی تمہارا یہی قول ہے کہ وہ ''نہیں ہے''۔ تو اے ''نہیں ہے''! یہ بتلایئے کہ آپ ہیں کیا؟

۱۹۷

نہ پوچھ نسخہ مرہم جراحتِ دل کا ۱ کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

۱۔ جراحت بمعنی زخم:۔ مجھ سے زخمِ دل کے مرہم کا نسخہ نہ پوچھ کیونکہ اس میں سب سے زیادہ جز ریزۂ الماس کا ہے۔ ریزۂ الماس سے زخم اور بھی زیادہ بڑھتا ہے۔ کیونکہ وہ زخم کو بُری طرح سے کاٹتا ہے۔ بقول حسرت ریزۂ الماس کو زخمِ دل کا مرہم کہہ کر اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔

۲۔ بہت دنوں میں تغافل نے تجھ میں یہ بات پیدا کی کہ کبھی کبھی تو ایک اچٹتی ہوئی نگہ ہم پر ڈال لیتا ہے یعنی پہلے تغافل نادانستہ تھا۔ کیونکہ تو ہمیں جانتا ہی نہ تھا۔ لیکن اب تو تغافل دانستہ ہے جس کو درحقیقت التفاتِ معشوقانہ کہنا چاہئے۔ اگرچہ بظاہر ہم اس کو ایسا نہیں کہہ سکتے۔ اس میں لطیفہ یہ بھی ہے کہ ''نگہ'' ''نگاہ'' سے بقدر ایک الف کم ہے۔

۱۹۸

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے ۱ مرتے ہیں ولے ان کی تمنّا نہیں کرتے
درپردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی ۲ ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے
غالبؔ کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

۱۔ ہمارا رشک اس قدر بڑھا ہے کہ ہم اپنے رشک کو بھی گوارا نہیں کرتے، حالانکہ مرے جاتے ہیں مگر اس کی تمنّا نہیں کرتے کہ تمنّا کریں گے، تو اپنے پر رشک آئے گا جو ہمیں کسی طرح گوارا نہیں۔ اسی مضمون کو اس طرح بھی لکھا ہے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۲۔ درپردہ:۔ پوشیدہ طور پر: ربطِ نہانی:۔ پوشیدہ تعلق:

شاعر بطور شکایت کہتا ہے کہ وہ جو غیر سے بے تکلفانہ ملتے ہیں اس میں ایک بھید ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم نہ ہو سکے کہ ان کے رقیب کے ساتھ خاص الخاص تعلقات ہیں۔ گویا ان کا

غیر سے پردہ کرنا ایک قسم کا پردہ ہے جس کی وجہ سے ان کے وہ تعلقات پوشیدہ رہتے ہیں جن کو شاعر ربطِ نہانی کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے اس مضمون کو یوں بھی ادا کیا ہے ۔

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی　　منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

۳۔ غالبؔ تمہارا عاشقِ صادق ہے اور تم اس کو بُرا کہتے ہو۔ یہ اچھا نہیں کرتے ۔ کیونکہ اس طرح سے اربابِ ہوس (رقیب) ناامید ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر جب تم غالبؔ جیسے عاشق صادق کو بُرا کہتے ہو اُن کا کیا حشر ہوگا، جن کا عشق محض ہوس پر مبنی ہے۔

۱۹۹

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگ فروغ ۱ خطِ پیالہ سراسر نگاہ گلچیں ہے
کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے ۲ کہ ایک عُمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
بجا ہے گر نہ سُنے نالہ ہائے بلبلِ زار ۳ کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے
اسدؔ ہے نزع میں چل بیوفا برائے خُدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے!

۱۔ کسب:- حاصل کرنا: خطِ پیالہ کو نگاہِ گلچیں سے مشابہ ہے۔
شراب تیرے سُرخ سُرخ ہونٹوں سے رنگ اور چمک حاصل کرتی ہے اور جام پر جو خط پڑے ہوئے ہیں وہ سراسر نگاہ گل چیں ہیں۔ جو تیرے پھول جیسے ہونٹوں کی گل چینی کر رہے ہیں یا کسبِ رنگ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

۲۔ دیوانے کو نیند نہیں آتی۔ تمام رات بے قراری اور وحشت میں گزر جاتی ہے۔ کہتے ہیں کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے کیونکہ یہ ایک عرصہ دراز سے تکیہ پر سر رکھنے کی حسرت میں مبتلا ہے۔ بقول بیخودؔ مطلب یہ ہے کہ وصل میں سودائے عشق میں کمی ہو کر سر تکیہ سے آشنا ہو جائے گا اور نیند بھی آجائے گی۔

آسیؔ :- کبھی تو میرے دلِ شوریدہ پر رحم کر! ایک مدت سے کم طاقتی کی وجہ سے بالیں پر پڑا رہتا ہے اور اپنی حسرتِ شوریدگی یعنی دیوانگی اور بیابان گردی کو دبا کر رکھتا ہے تو کم ازکم کبھی تو ایسا کر کہ اس میں یہ طاقت آجائے کہ اپنی حسرتوں کو پورا کر سکے اور اپنی صفتِ شوریدگی سے متصف ہو۔

طباطبائی:- ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہونا دو معنی رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ مدّت سے بالیں پر سر رکھنے کی حسرت ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسی ناتوانی ہے کہ بالیں سے سر نہیں اُٹھ سکتا اور اس صورت میں عجب نہیں کہ دل کا لفظ غلط کتابت ہو اور مصنف نے سرِ شوریدہ کہا ہو۔ مگر معنی شعر ہر طرح سے ظاہر ہیں۔

۳۔ نم شبنم کو اس کی سفیدی کی وجہ سے پنبہ کہا ہے۔ کہتے ہیں۔ اگر گوشِ گل نالہ ہائے بلبلِ زار نہ سُنے تو بجا ہے کیونکہ اس کے کان میں شبنم کا پنبہ ہے۔

۴۔ اے بے وفا! اس وقت اسدؔ حالتِ نزاع میں ہے۔ خُدا کے لئے چل! یہ ایسا وقت ہے کہ تجھے اس وقت تمکین وخودداری اور حجاب و شرم ترک کردینا چاہئے۔

۲۰۰

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو ۱ یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی ۲ وائے ناکامی کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے
عارضِ گل دیکھ رُوئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

۱۔ معشوق کی آنکھ کو شعراُ چشمِ بیمار باندھا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں معشوقوں کی آنکھ محوِ تغافل کیوں نہ ہو یعنی اُسے ضرور محوِ تغافل ہونا چاہئے کیونکہ وہ ایک بیمار ہے اور اُس بیمار کو نظارے سے پرہیز بتایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تغافل شعاری اس نے اپنا وطیرہ بنا لیا ہے تا کہ یہ پرہیز نہ ٹوٹنے پائے۔

۲۔ امید یہ تھی کہ جب وہ قتل کرے گا تو ہم جی بھر اسے دیکھ لیں گے۔ لیکن وائے ناکامی! اُس کافر کا خنجر تیز ہے، وہ ہمیں فوراً ہی قتل کر دے گا۔ اور مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی۔ اگر اُس کا خنجر کُند ہوتا تو گلا کٹنے میں دیر لگتی اور ہم اپنی حسرتِ دیدار نکال لیتے۔

۳۔ عارضِ گل اور روئے یار میں بدرجہ اتم مشابہت ہے، کہتے ہیں عارض گل دیکھ کر مجھے روئے یار یاد آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فصلِ بہاری کی جوشش دل میں جوشِ اشتیاق برانگیختہ کرتی ہے۔ جوششِ اشتیاق سے مراد جذبۂ عشق ومحبّت ہے۔

۲۰۱

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہئے ۱ ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہئے!
یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے ۲ قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے!
رہے ہے یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب ۳ اگر نہ کہئے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہئے!
زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب ۴ کہ بن کہے ہی اُنہیں سب خبر ہے، کیا کہئے!
سمجھ کے کرتے ہیں، بازار میں وہ پرسشِ حال ۵ کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گزر ہے، کیا کہئے!
تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال ۶ ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہئے!
اُنہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیا لڑیئے ۷ ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہئے!
حسد سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے ۸ ستم بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہئے!

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہئے

۱۔ اگر نامہ بر نے اس کو دل دیا اور وہ اس پر عاشق ہو کر میرا رقیب بن گیا تو میں اُسے کیا کہوں، وہ بھی میری طرح کا انسان ہے، فرشتہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا حسن اس قدر دلفریب ہے کہ نامہ بر کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔

دوسرا مفہوم :- وہ ہمارا نامہ بر ہے اور ہمارے اوپر اس کی خدماتِ نامہ بری کا احسان ہے۔ اس لئے اسے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ نیز یہ کہ وہ انسان ہے اور انسان سے غلطی ہوا ہی کرتی ہے۔

۲۔ آج ہمیں موت کی سخت ضرورت ہے تاکہ آلامِ عشق جو ناقابلِ برداشت صورت اختیار کر چکے ہیں، ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں اور ہماری خلاصی ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ قضا آئے بغیر نہیں رہے گی۔ ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ لیکن ضد کی وجہ سے آج نہیں آئے گی۔ قضا کی اس ضد کی وجہ سے ہمیں اس سے جس قدر شکوہ ہے وہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔

۳۔ گہ و بیگہ :- وقت بے وقت یعنی ہر وقت۔ رقیب کوئے دوست میں ہر وقت پڑا رہتا ہے۔ وقت بے وقت جس وقت دیکھو وہیں موجود ہے۔ ایسی صورت میں اب ہم کوئے یار کو دشمن کا گھر نہ کہیں تو کیا کہیں۔

۴۔ کرشمہ :- نازِ معشوقانہ۔

اس کی کرشمہ سازی تعریف سے مستغنی ہے جس کے ذریعہ سے اس نے ہمیں یہ دم دے رکھا ہے کہ ہمیں تیرا حال کہے بغیر ہی معلوم ہے۔ اس فریب میں آ کر میں اس سے اپنا حال بھی نہیں کہہ سکتا گویا یہ سمجھتا ہوں کہ جب اسے معلوم ہی ہے تو پھر میں کیا کہوں۔

۵۔ وہ ایسا عیار ہے کہ جان بوجھ کر سرِ بازار مجھ سے میرا حال پوچھتا ہے تاکہ میں کچھ نہ کہہ سکوں اور یہ سمجھ کر خاموش ہو جاؤں کہ سرِ راہ گزر ہے کیا کہئے یا بقول سعیدؔ ان سے یہ کہہ دوں کہ سرِ رہ گزر ہے راستہ چل رہا ہے یہاں کیا بیان کروں۔

آسیؔ :- اس شعر سے مرزا کی وضعداری کے ساتھ ساتھ گزشتہ تہذیب کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے کہ پہلے شرفا بازار میں باتیں کرنا بھی عیب سمجھتے تھے۔

۶۔ عاشق معشوق سے کہتا ہے کہ تم بیگانۂ وفا ہو اور تمہیں سرشتۂ وفا کا مطلق خیال نہیں، پھر اپنی مٹھی بند کر لیتا ہے اور محبوب سے پوچھتا ہے کہ اچھا اگر یہی بات ہے تو بتاؤ میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ حالانکہ پہلے مصرعہ میں اس نے سررشتہ وفا کا نام ظاہر کر دیا ہے لیکن معشوق پھر بھی نہیں بتا سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب وفا سے اس درجہ بیگانہ ہے کہ وہ باوجود بتا دینے کے یہ نہیں جانتا کہ ہمارے ہاتھ میں سررشتہ وفا ہے (تمام متفق)

آسیؔ ان معنوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ تاویل ہے جو طبعِ سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ صاف صاف معنی یہ ہیں کہ تم وہ تغافل شعار جفا کار ہو کہ تمہیں سررشتہ وفا کا ذرا بھی خیال نہیں اور تم اس کو چھوڑ چکے۔ البتہ یہ سررشتہ ہمارے ہاتھ میں ابھی کچھ کچھ باقی ہے، اگرچہ کچھ کچھ ہے، مگر ہے ضرور۔ اب ہم تم سے کیا کہیں۔

۷۔ زعم یعنی گمان۔ انہیں ہمارے سوال پر جنوں کا گماں گزرتا ہے۔ جب وہ ہمیں دیوانہ سمجھتے ہیں۔ تو ہم اُن سے کیا لڑیں۔ لہٰذا ہم نے اُن سے جواب کی امید بھی منقطع کر لی ہے (تمام متفق)

آسیؔ نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ انہیں ہمارے سوال پر ہمارے جنوں کا خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

۸۔ کیا کیجئے اور کیا کہیے۔ عاجز ہونے کے مقام پر بولے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں جس شخص میں کمالِ سخن ہوتا ہے، زمانہ اُس کے ساتھ حسد کرنے لگتا ہے۔ گویا کمالِ سخن کی سزا حسد ہے اور جس شخص میں کوئی ہُنر ہوتا ہے تو ہُنر کے صلے میں اس پر ستم توڑے جاتے ہیں گویا متاعِ ہنر کی قیمت ستم ٹھہری۔ اس شعر میں شاعر نے زمانے کی ناقدردانی کا اظہار کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ زمانہ کا یہ برتاؤ ہمارے ہی ساتھ نہیں بلکہ ہر ہنرمند اور کاملِ سخن زمانے کے ہاتھوں مصیبتوں میں مبتلا ہے۔

۹۔ یہ کس نے کہا ہے کہ غالبؔ بُرا نہیں، وہ ضرور بُرا ہے۔ لیکن صرف اتنا ہی کہ وہ دیوانہ ہے اور جو دیوانہ ہو اُس کا کہنا ہی کیا یعنی دیوانے کو کچھ سُننا بیکار ہے۔

۲۰۲

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے ۱ کر گئی وابستۂ تن میری عُریانی مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں ۲ مرحبا میں، کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی اُس کی خاطر جمع ہے ۳ جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی ۴ لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے ۵ اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے
وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا ۶ لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے!
وعدہ آنے کا وفا کیجیے، یہ کیا انداز ہے ۷ تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ وا ! ۸ پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے ازسرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

۱۔ دامن افشانی:۔ ترکِ لباس۔ مراد ترکِ تعلق دنیا۔

جب میری عریانی نے یہ دیکھا کہ میں در پردہ ترکِ لباس کر کے عریاں یعنی آزاد ہونا چاہتا ہوں تو اُس نے مجھے وابستۂ تن کر دیا۔ جب میں وابستۂ تن ہوا تو مجبور ہو گیا۔ اب میں جسم کی قید سے کسی طرح آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ مطلب یہ ہے ترکِ تعلقاتِ دنیا کسی طرح ممکن نہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ ترکِ لباس کر کے میں تعلقِ لباس سے آزاد ہو جاؤں گا لیکن ترکِ لباس کرنے کے باوجود جسم کی

پابندی باقی رہی اور حقیقی آزادی جس کا میں خواہشمند تھا پھر بھی حاصل نہ ہو سکی۔

۲۔ سنگِ فساں:۔ وہ پتھر جس پر تلوار کی سان رکھی جاتی ہے۔ گراں جانی:۔ سخت جانی۔ میں اپنی سخت جانی کی بدولت تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں بن گیا۔ اب ہر وقت وہ مجھ پر تیغِ نظر تیز کرتا ہے۔ آفرین ہے تجھ پر اے گرانجانی! تو میرے لئے کس قدر مبارک ثابت ہوئی ہے۔

طباطبائیؔ:۔ دوسرا مصرعہ بطورِ طعن کہا ہے۔ ممکن ہے شاعر نے اس واقعہ پر اظہارِ مسرّت کیا ہو۔ کیونکہ عاشقوں کو تکلیف مرغوب ہوتی ہے۔

۳۔ پُرسشہائے پنہانی:۔ بقولِ سعیدؔ وہ پرسش جو در پردہ کی جائے۔ باقی شارحین متفق ہیں کہ اس سے مراد پرسش ہے جو خواب و خیال میں کی جاتی ہے۔

کہتے ہیں، اس کی طرف سے بے التفاتی کیوں نہ ہو۔ اس کی خاطر جمع ہے کہ میں پرسشہائے پنہانی میں محو ہوں۔ اس لئے محبوب کی بے اعتنائی مجھ کو ناگوار معلوم نہ ہوگی۔

۴۔ جب کاتبِ تقدیر نے میرے غمخانہ کی قسمت لکھی تو منجملہ اسبابِ ویرانی کے میری ذات کو بھی اپنے گھر کی ویرانی کا ایک سبب قرار دیا۔ مطلب یہ ہوا کہ میں خود اپنی خانہ ویرانی کا سبب ہوں۔

حسرتؔ:۔ اسباب کے بجائے مجھ کو اسبابِ ویرانی ملا۔

۵۔ مجھے نوائے مرغِ چمن سُنے کا بہت شوق ہے کیونکہ مرغِ بستاں میرا ہم پیشہ ہے۔ لیکن معشوق میرے اس شوق کو دیکھ کر مجھ سے بدگماں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کاش مجھ کو یہ شوق نہ ہوتا۔ پھر معشوق بھی مجھ سے بدگمان ہوتا ہے۔

۶۔ میرا خیال تھا کہ قبر میں میرے جسم و جان کو آرام ملے گا، اس لئے میں نے گور میں جانا یعنی مرنا پسند کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ شورِ محشر نے مجھے وہاں بھی آرام کا سانس نہ لینے دیا۔

۷۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میں تیرے گھر آؤں گا، میں جب سے آپ کے انتظار میں دروازہ پر کھڑا ہوں، نہ کہیں آ سکتا ہوں نہ جا سکتا ہوں۔ یہ کیا انداز ہے کہ آپ نے مجھے میرے ہی گھر کا دربان مقرر کر دیا ہے۔ مہربانی فرما کر وعدہ وفا کیجیے اور مجھے اس تکلیفِ انتظار اور فرضِ دربانی سے نجات دیجئے۔

بقول حالی وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے۔ بالکل نیا پیرایہ بیان ہے۔

۸۔ ہاں اے آمدِ فصلِ بہاری کی مسرت سبحان اللہ۔ میں بالکل مُردہ ہو گیا تھا اور سودائے غزل خوانی بالکل بُھلا بیٹھا تھا۔ لیکن تیری آمد آمد سے پھر سودائے غزل خوانی میرے دل میں تازہ ہو گیا ہے۔

۹۔ میرزا یوسف علی خاں غالبؔ کے بھائی تھے۔ وہ تیس برس تک دیوانہ رہے۔ غالبؔ کو ان سے بہت محبت تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحت یاب ہوتے ہیں ازراہِ محبت یہ مسرت اس شعر میں ظاہر ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں خداوند تعالیٰ نے میرے بھائی یوسف علی خاں کو ازسرِ نو زندگی عنایت فرمائی۔ میرزا یوسف میرے لئے دوسرے یوسف ہیں کیونکہ خدا نے ان کی جان بچائی ہے یا یہ کہ میری نظروں میں ایسے ہی عزیز ہیں جیسے حضرت یوسف تھے۔

۲۰۳

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے	۱ سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے
ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن ،	۲ تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے
یا رب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہئے	۳ رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے
طبع ہے مشتاقِ لذتہائے حسرت کیا کروں	۴ آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے
دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے	۵ عشق سے آتے تھے مانع مرزا صاحب مجھے

۱۔ آسی :۔ عالمِ خوشی میں بھی بار بار یا رب پکار اُٹھتا ہوں۔ گویا میرا ہنسنا میرے لئے تسبیح زاہد کا کام دے رہا ہے کہ ہنستا ہوں اور یارب کہتا ہوں۔ قاعدہ ہے کہ شادی ہو یا غم ہو، ہر حالت میں دل میں ایک کیفیت سی پیدا ہوتی ہے اور آدمی کی زبان سے بیساختہ یا اللہ، یارب وغیرہ ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں اور اسی سے مصنف کی یہاں مراد ہے۔ خندہ زیرِ لب سے مراد وہ خندہ ہے کہ ازیادِ غم میں انسان مسکراتا ہے اور سانس لے کر ایسے الفاظ کہہ اُٹھتا ہے۔ ارے میرے اللہ ! ارے میرے مالک ! اسی کو مصنف مراد لیتا ہے کہ بظاہر خوشی کی صورت ہے۔ لیکن یہ ہنسی تسبیح زاہد ہے جس سے مجھ کو بس خدا ہی یاد آ رہا ہے۔ فارسی میں اسی خیال کی دوسرے الفاظ پر بنا رکھی ہے۔

مبادا ہمچو ماربحہ ازہم بگسلد غالبؔ   نفس با ایں ضعیفی بر نتابد شورِ یار بہا

طباطبائی :۔ یارب کے معنی فارسی محاورہ میں خدا کی دہائی ہے اور سبحۂ زاہد سے وہ ذکرِ خفی مراد ہے جو چپکے چپکے ہونٹوں میں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شادی میں بھی مجھے شورِ یارب نہیں بھولا ہے۔ میرا خندۂ زیرِ لب گویا زاہد کا ذکرِ خفی ہے (بیخودؔ۔ سعیدؔ)

حسرتؔ :۔ جس طرح دانہ ہائے تسبیح سے صورتِ خنداں نمایاں ہوتی ہے، لیکن ان پر ذکرِ یارب ہوتا ہے۔ اسی طرح مجھے شادی میں بھی ہنگامۂ فریاد رہتا ہے۔ یارب کے الفاظ میں ایہام ہے۔(سعید)

۲۔ قفلِ ابجد :۔ یہ ایک قسم کا قفل ہے، اس میں بہت سی پھرکیاں ہوتی ہیں۔ جن پر مختلف حروف کندہ ہوتے ہیں۔ قفل کھولنے کے لئے صناع ایک لفظ مقرر کر دیتا ہے۔ ان حروف کو جوڑ کر یہ لفظ بناتے ہیں۔ بس جونہی یہ لفظ ترتیب پاتا ہے قفل کُھل جاتا ہے۔

کہتے ہیں طلسمِ قفلِ ابجد میرے لئے ایک مکتب خانہ تھا۔ میں نے اس مکتب میں یہ سبق پڑھا ہے کہ جس طرح سے قفلِ ابجد کا کُھلا لفظِ مقررہ کے مرتب ہونے پر مبنی ہے یعنی رہنِ سخن ہے۔ گویا میری گرفتہ خاطری اور انقباضِ طبع کا علاج شغلِ شعر و سخن ہے (تمام متفق)

آسیؔ نے مکتب کے لغوی معنی مراد لئے ہیں یعنی وہ مقام جس جگہ بیٹھ کر لکھیں۔ کہتے ہیں میری خوشیِ دل فکرِ شعر پر منحصر ہے۔ خانۂ مکتب یعنی جہاں بیٹھ کر میں لکھتا ہوں۔ طلسمِ قفلِ ابجد کا حکم رکھتا ہے کہ جیسے ادھر اس کے حروفِ معینہ کو یکجا کیا اور ادھر وہ کھلا۔ ایسے ہی ادھر میں اپنے لکھنے کی جگہ پر بیٹھا ، ادھر میری طبعیت کو کشادگی حاصل ہوئی اور شعر کہنے شروع کئے۔ ظاہر ہے کہ یہ معنی تاویلی ہیں۔ اصل مطلب وہی ہے جو میں نے لکھا ہے۔

۳۔ زندانی یعنی قیدی۔ یارب میں اس جنوں کی داد کس سے طلب کروں کہ جب میں زنداں میں تھا تو صحرانوردی کو اچھا جانتا تھا اور جب صحرا میں ہوں تو اہلِ زنداں کی آسائش و آرام پر مجھے رشک آتا ہے۔

۴۔ میں کیا کروں میری طبعیت حسرتوں کی لذات کی مشتاق ہے۔ اسی لئے ہر آرزو سے مرا مطلب شکستِ آرزو ہوتا ہے۔ کیونکہ شکستِ آرزو میں مجھے لذت حاصل ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ہر آرزو اسی نیت سے کرتا ہوں کہ وہ ٹوٹ جائے اور مجھ کو حسرتِ لذت اُٹھانے کا موقع ملے۔

۵۔ بطورِ طعن کہتے ہیں کہ آپ تو ہمیں عشق کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ اب دل لگا کر آپ کی بھی میرے جیسی حالت ہوگئی۔

۲۰۴

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے ۱ چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے
قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے ۲ جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر ۳ ہنوز اُس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے
نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی ۴ اُسے یوسف کی بُوئے پیرہن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے ۵ شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے
رہے دل ہی میں تیر اچھا، جگر کے پار ہو بہتر ۶ غرض شستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے
نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی ۷ وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل ۸ مگر پھر تابِ زلفِ پُر شکن کی آزمائش ہے
رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو ۹ ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب!
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

۱۔ اس طرح پر قلعہ میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ کہتے ہیں۔ آج بادشاہ کے دربار میں شعرا کی آزمائش ہے۔ گویا بادشاہ کا دربار ایک چمن ہے۔ اور اس چمن میں خوش نوایانِ چمن (شعرا) کا امتحان ہے کہ دیکھیں وہ کس کس انداز سے اپنے اپنے نغمے سُناتے ہیں۔

۲۔ قیس :۔ مجنوں۔ کوہ کن۔ فرہاد۔

قیس اور فرہاد کی آزمائش تو قد و گیسو سے لی جاتی ہے۔ لیکن جس مقامِ عشق پر ہم ہیں وہاں عشاق کی آزمائش دار و رسن سے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا امتحاں عشق سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

۳۔ ابھی تو کوہکن کی محض طاقتِ جسمانی کا امتحان ہو رہا ہے کہ اس سے پہاڑ کھود کر نہر نکالنے کو کہا گیا ہے۔ جب طاقت جسم کی آزمائش ہوجائے گی تو پھر اس کے حوصلہ کا امتحان لیا جائے گا۔ یعنی ایک بڑھیا کو یہ پیغام دیکر بھیجا جائیگا کہ شیریں مرگئی۔ اس آزمائش میں وہ رہ جائے گا اور سر پر تیشہ مار کر اپنا خاتمہ کرلے گا۔

۴۔ پیرِ کنعان :۔ حضرت یوسفؑ کے والد حضرت یعقوبؑ۔

نسیمِ مصر جو حضرت یوسف کے پیراہن کی خوشبو اڑا کر لائی ہے، اس کو اس فعل سے حضرت یعقوبؑ کی خیر خواہی مقصود نہیں، بلکہ وہ حضرت یوسف کے پیراہن کی خوشبو کا امتحان لینا چاہتی ہے کہ آیا حضرت یعقوب پر اس کا کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں، یا یہ کہ بوئے پیراہن میں کس قدر تاثیر ہے۔

۵۔ دیکھو وہ غارتگر صبر و شکیب بزم میں آرہا ہے، پھر نہ کہنا کہ میں غافل تھا اور غفلت کی حالت میں وہ متاعِ صبر و شکیب لوٹ کر لے گیا، ہم یہ پہلے سے بتائے دیتے ہیں کہ وہ اہلِ بزم کے صبر و شکیب کی آزمائش کرنے آرہا ہے۔

۶۔ شست :۔ نشانہ۔ ناوک فگن :۔ تیرانداز۔

اگر تیر دل میں رہ جائے تو اچھا ہے اور اگر جگر کے پار ہو جائے تو اور بھی زیادہ اچھا ہے۔ غرض ان دونوں صورتوں میں کوئی نہ کوئی صورت ضرور ہونی چاہئے پھر ہم اس کے نشانہ کے قائل ہو سکتے ہیں۔

۷۔ گیرائی :۔ گرفت۔ تسبیح شیخ اور زنار برہمن میں کوئی گیرائی نہیں۔ جس نے ان کو گرفتار کر رکھا ہو بلکہ ان سے شیخ و برہمن کی وفاداری کی آزمائش مقصود ہے۔ یعنی دیکھنا یہ ہے کہ وہ کب تک اپنی وضع کو نباہتے اور وفادار رہتے ہیں۔

۸۔ اے دلِ وابستہ (قیدی) تو پہلے زلفِ پُر شکن کا امتحان کئی مرتبہ کر چکا ہے اور آزاد نہیں ہو سکا۔ اب تجھے تڑپنے سے کیا حاصل ہوگا۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ تو اسی طرح پڑا رہے۔ کیا تو پھر زلفِ پُرشکن کی طاقت آزمانا چاہتا ہے۔

۹۔ جب زہرِ غم ہر رگ و پے میں اُترے گا تو پتہ نہیں کیا ہوگا۔ ابھی تو زہرِ غم میرے کام و دہن تک ہی پہنچا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آغازِ عشق ایسا سخت ہے تو خدا جانے انجام کیسا ہوگا۔

۱۰۔ وہ میرے گھر ہرگز نہیں آئیں گے، وعدہ کیسا؟ اب دیکھنا یہ ہے کہ چرخِ کہن ان کے نہ آنے سے ہمیں کس کس نئی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ نیا فتنہ سے مراد ان کے آنے کا فتنہ ہے۔ آسی لکھتے ہیں کہ نیا فتنہ اس وجہ سے کہا ہے کہ اول تو وہ وعدہ ہی نہ کرتے تھے۔ اب وعدہ کیا تو وعدہ خلافی کا صدمہ میرے لئے نیا صدمہ ہے، دیکھئے کیا ہوگا۔

۲۰۵

کبھی نیکی بھی اُسکے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے ۱ جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے ۲ کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
وہ بد خو اور میری داستانِ عشق طولانی ۳ عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
اُدھر یہ بدگمانی ہے، ادھر یہ ناتوانی ہے ۴ نہ پوچھا جائے ہے اس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے ۵ کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
تکلف بر طرف نظارگی میں بھی سہی لیکن ۶ وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی ۷ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدّعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۱۔ اگر کبھی میرے ساتھ نیکی کرنے کا خیال اس کے جی میں آجاتا ہے تو اس بنا پر کہ تمام عمر تو مجھ پر ظلم کئے ہیں اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے ان کی کیا تلافی ہوسکتی ہے، وہ میرے ساتھ نیکی نہیں کرتا۔

۲۔ خدایا شاید میرے جذبۂ دل کی اُلٹی تاثیر ہے کہ اس کو میں جس قدر اپنی طرف کھینچتا ہوں وہ اُلٹا مجھ سے کھنچتا ہے۔ یعنی جتنا میں اس کو اپنے قریب لانا چاہتا ہوں اتنا ہی وہ دُور ہوتا جاتا ہے یا کھنچتا جائے ہے بمعنی آزردہ اور کشیدہ خاطر ہوا جاتا ہے۔

۳۔ وہ سے مراد معشوق۔ عبارت مختصر یعنی قصہ مختصر۔

معشوق بدخواور بدمزاج ہے اور میرا افسانہ بہت طولانی ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ میرا قاصد بھی اُسے سُن کر گھبرا جاتا ہے کہ میں اتنا لمبا افسانہ اس بدخُو سے کیسے کہوں گا اور اگر کہوں گا تو میری مفت میں شامت آجائے گی۔ عجب مصیبت میں مبتلا ہوں۔

۴۔ اُدھر ایسی بدگمانی ہے کہ وہ میرے دعوئ محبت کو بھی جھوٹ سمجھتا ہے اور اس بدگمانی کے سبب سے وہ کچھ نہیں پوچھتا اور ادھر اس قدر ناتوانی ہے کہ کمزوری کے سبب سے میں بول بھی نہیں سکتا کہ اس کی بدگمانی کو دُور کر دوں۔ لہذا عجب مصیبت میں مبتلا ہوں کہ یہ غلط فہمی کیسے دُور ہو۔

بقول طباطبائی شعر میں ترکیب کے تشابہ اور تقابل سے عجب لطف پیدا ہو گیا ہے۔

۵۔ خیالِ یار کا دامن ہاتھ میں تھا، لیکن ناامیدی نے مجھے ایسا گرایا ہے کہ اب دامانِ خیال یار بھی ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس قدر ناامید ہو گئے ہیں کہ خیالِ یار بھی دل سے نکلا جاتا ہے، اس لئے نااُمیدی کو مدد کے لئے پکارتے ہیں۔

۶۔ بیشک میں بھی اس کے دیکھنے والوں میں شامل ہوں لیکن یہ ظلم مجھ سے ہرگز دیکھا نہیں جاتا کہ وہ دیکھا جائے۔ یعنی کوئی اُسے دیکھے۔ مطلب یہ ہے کہ رشک کی وجہ سے مجھے گوارا نہیں کہ کوئی اسے دیکھے۔ یہی مضمون پہلے اس طرح لکھ چکے ہیں۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۷۔ حالؔی:- اس میں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قویٰ جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی۔ ابتدائے عشق میں انہی کو صدمہ پہنچا۔ بس اب نہ عشق ترک ہوسکتا ہے اور نہ اس پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ مدّعی یعنی رقیب جس کو بدگمانی کی وجہ سے ہم خدا کے حوالے بھی نہیں کر سکتے یعنی بوقتِ رخصت یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جاؤ سدھارو۔ تمہیں سپرد خدا کیا۔ قیامت ہے کہ وہ میرے رقیب کا ہم سفر ہو، گویا میں اس کو رقیب کے حوالے کردوں۔

۲۰۶

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے ۱ کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے
نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی ۲ تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے
بہ پیچ وتابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ ۳ نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے
وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

۱۔ کشادو بست مژہ:- پلکوں کا بار بار کھلنا اور بند ہونا۔ سیلی:- طمانچہ۔ تھپّڑ۔ تماشا سے مراد تماشائے دُنیا یا تماشائے حُسن۔

کہتے ہیں چونکہ تماشائے حُسن کی بہت زیادہ مشق کرنا جنون کی علامت ہے اس لئے تماشائے حُسن کے وقت پلکوں کا بار بار بند ہونا اور کُھلا طمانچہ ہائے ندامت کا پڑنا ہے جو آنکھوں پر لگائے جارہے ہیں۔

۲۔ خدا جانے طعنِ بدعہدی کا دھبہ کیونکر مٹے گا، تو لاکھ آرائش کرے، مگر اس داغ بدعہدی کی موجودگی میں جب تو آرائش کے لئے آئینہ دیکھتا ہے تو آئینہ تیرے لئے ورطۂ ملامت بن جاتا ہے، کیونکہ آرائشِ غیروں کو دکھانے کے لئے ہوتی ہے، جو عین بدعہدی ہے۔ اس لئے آئینہ دیکھ کر تو گردابِ ندامت میں غرق ہو جاتا ہے۔ آئینہ کو ورطہ سے تشبیہ دی ہے۔

۳۔ ہوس کے بیچ دے دے کر عافیت اور سلامتی کی سلک (لڑی) نہ توڑ، کیونکہ نگاہِ عجز یعنی ترکِ ہوس سررشتۂ سلامتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سلامتی اور عافیت عاجزی اور کم ہوسی میں ہے۔ ہوس کے ساتھ سلامتی اور عافیت ممکن نہیں۔

۴۔ حسرت :۔ محبوب اور رقیب کے معاملہ کا ذکر بطور طعن کرتا ہے۔ کہتا ہے بڑا ستم ہے کہ محبوب تو آمادۂ وفا ہو اور دعویٔ عشق جھوٹا ہو۔ یہ اسی قسم کی بات ہے کہ بہار تو واقعی آئی ہے لیکن جنون میں بناوٹ ہو۔

۲۰۷

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جاوے مجھے ۱ میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے!
کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم ۲ واں تلک کوئی کسی حیلہ سے پہنچا دے مجھے!
منہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب ۳ کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے!
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں ۴ زلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے!

۱۔ میں عشق میں گُھل گُھل کر اس قدر لاغر ہو گیا ہوں کہ اگر تو اپنی بزم میں مجھے جگہ دے تو میں اسی بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ کوئی مُجھے دیکھ کر بتلا نہ سکے گا کہ یہ فلاں شخص بیٹھا ہے یا یہ کہ کوئی مجھے دیکھ ہی نہ سکے گا۔ پھر خوف کیا ہے۔ مجھے اپنی بزم میں جگہ دے دے۔

۲۔ اس میں کوئی تعجب نہیں، اگر اسے میری خراب حالت دیکھ کر رحم آجائے کوئی میرے حال پر اس قدر کرم کرے کہ مجھے وہاں تک پہنچا دے۔

۳۔ اگر تو اپنا حسین چہرہ نہیں دکھاتا تو نہ سہی، مجھے یہ بھی منظور ہے، لیکن اتنا تو کر کہ چہرے پر سے پردہ ہٹا کر اپنی خشم آلودہ آنکھیں ہی دکھلا دے۔

۴۔ شانہ بمعنی کنگھی۔ وہ میری گرفتاری سے اس قدر خوش ہوتا ہے کہ اگر میں اس کی زلف بن جاؤں تو وہ مجھے کنگھی میں الجھا دے۔ مطلب یہ ہے۔ مجھے تکلیف پہنچانے میں اگر اس کو تکلیف پہنچے تو وہ اس کی مطلق پروا نہیں کرے گا۔

۲۰۸

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے ۱ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اِک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک ۲ اِک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور ۳ جز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے ۴ گِھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے ۵ تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو، خود بین وخود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں ۶ بیٹھا ہے بُتِ آئینہ سیما مرے آگے
پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا ۸ کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر ۹ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام ۱۰ مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مرنہیں جاتے ۱۱ آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے
ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو! ۱۲ آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ۱۳ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ وہم مشرب و ہم راز ہے میرا!
غالبؔ کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے!

۱۔ بازیچۂ اطفال یعنی ''بچّوں کا کھیل''۔ میری نظروں میں دُنیا بچّوں کا کھیل ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے سامنے شب وروز ایک تماشا ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہے میں حادثاتِ دُنیا کو

بچوں کا کھیل سمجھتا ہوں اور اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔

۲۔ اورنگ یعنی تخت۔ تختِ سلیمان آسمان پر اُڑا کرتا تھا: اعجازِ مسیح یہ تھا کہ وہ قُم کہہ کر مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ فرماتے ہیں۔ میں تختِ سلیمان کو ایک کھیل سمجھتا ہوں اور اعجازِ مسیحا میرے نزدیک ایک معمولی سی بات ہے۔ بقول طباطبائی دوسرے مصرعہ میں ''ایک بات'' نے دوہرا لطف پیدا کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیا اور اہلِ دُنیا کا اقبال وکمال میری نظر میں ہیچ ہے۔

۳۔ میں صورتِ عالم کو محض نام ہی خیال کرتا ہوں، یا اس سے آگے کچھ نہیں مانتا اور ہستی اشیاء کو ایک وہم سمجھتا ہوں اور وہم اس کو کہتے ہیں۔ جس کا کوئی وجود نہ ہو۔ حاصل شعر یہ ہے کہ ذاتِ خداوند تعالےٰ کے سوا میں کسی چیز کو موجود نہیں سمجھتا۔

۴۔ میں صحرانوردی میں اس قدر خاک اُڑاتا ہوں کہ صحرا گرد میں چھپ جاتا ہے اور مجھ سے پناہ مانگتا ہے۔ میں آنکھوں سے اس قدر اشک بہاتا ہوں کہ دریا ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو ہیچ سمجھتا ہے اور میرے سامنے اظہارِ عجز کے لئے اپنا ماتھا زمین پر رگڑتا ہے۔

بیخود:- میں آنکھوں سے اس قدر اشک بہاتا ہوں کہ دریا میرے آگے بہہ نکلتا ہے۔ پانی کے زور کو جبیں رگڑنے سے تعبیر کیا ہے۔ طباطبائی نے بھی دوسرا مفہوم یہی لکھا ہے۔

۵۔ مجھ سے مت پوچھ کہ میرا تیرے پیچھے کیا حال ہے۔ بس یہ سمجھ لے کہ جس طرح تو میرے آگے حیا اور شوخی سے دل تنگ اور شرمایا ہوا رہتا ہے اُسی طرح میں تیرے پیچھے (تیری جدائی) میں بیقرار اور مضطراب رہتا ہوں۔ آگے اور پیچھے کے لفظوں نے شعر میں عجب کیفیت پیدا کر دی ہے۔

طباطبائی و آسی نے دوسرا مفہوم یہ نکالا ہے۔ ''تو اپنی بے اعتنائی یا حُسن کو میری آنکھ سے دیکھ! اور اسی پر قیاس کر لے کہ تیری مفارقت میں میرا کیا حال ہوتا ہوگا''۔

۶۔ تم یہ سچ کہتے ہو کہ میں خود بیں وخود آرا ہوں۔ بھلا جب تم جیسا آئینہ سیما معشوق میرے سامنے بیٹھا ہو تو پھر میں کیوں نہ خود بیں وخود آرا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے حُسن نے مجھے مغرور ومتکبر بنا دیا ہے۔

۷۔ کوئی میرے سامنے ساغر وشیشہ رکھ دے، پھر دیکھے میرے منہ سے کیسے پھول جھڑتے ہیں۔

بیخود:- سُنا گیا ہے کہ میرزا صاحب شام کے وقت شراب پیتے اور شب کو سرخوشی کے عالم میں عجب پُر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔

۸۔ اگر کوئی شخص تیرا نام میرے سامنے لیتا ہے تو رشک کی وجہ سے مجھے سخت ناگوار گزرتا ہے۔ مشکل یہ آپڑی ہے کہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ تیرا نام میرے سامنے نہ لے کیونکہ ایسا کہنے سے سُننے والوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ مجھے تیرے نام سے نفرت ہے۔ لہٰذا میں ایسے رشک سے باز آیا۔ جس سے نفرت کا گمان گزرے۔

۹۔ کلیسا:- گرجا: میں عجب کشاکش میں مبتلا ہوں۔ ادھر کعبہ ہے۔ اُدھر کلیسا ہے۔ اگر کفر مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے، تو ایمان مجھ اُدھر جانے سے روکتا ہے۔ بقول طباطبائی کعبہ پیچھے پڑ کر روکتا ہے کہ اُدھر نہ جا اور سامنے کلیسا کھینچ رہا ہے کہ ادھر چل۔

آسی:- بے مثل شعر کہا ہے۔ خصوصاً مصرعہ ثانی اگر دیوان کے دیوان اس پر سے صدقے کر دیے جائیں تو بجا ہے۔

۱۰۔ عاشق ہونے کی حیثیت سے مجھے معشوقوں کے فریب میں آجانا چاہئے تھا لیکن میں ایسا عاشق ہوں جو معشوقوں کے فریب میں نہیں آسکتا بلکہ اُلٹا انہی کو فریب دیتا ہوں۔ چنانچہ یہ میری معشوق فریبی کا نتیجہ ہے کہ لیلیٰ مجنوں کو میرے سامنے بُرا کہتی ہے گویا مجھے اس سے اچھا جانتی ہے۔

۱۱۔ کہتے ہیں شبِ وصل میں سبھی خوش ہوا کرتے ہیں۔ لیکن میری طرح شادی مرگ نہیں ہو جاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شبِ ہجر میں جو میں اکثر مر جانے کی دعائیں مانگا کرتا تھا وہ شبِ وصل میں میرے آگے آئیں (تمام متفق)

آسی کہتے ہیں کہ شبِ ہجر میں میں یہ دُعا مانگا کرتا تھا، یا اللہ اگر مروں تو شبِ وصل میں مروں، ہجر میں ناکام مرنا تو بُرا ہے۔ لہٰذا آج شبِ وصال وہ مراد پوری ہوگئی۔

طباطبائی:- وصل کی خوشی میں مر جانا اور لوگ بھی باندھا کرتے ہیں۔ مگر یہ بات ہی اور ہے۔ ساری کرامات محاورہ اور زبان کی ہے جس نے مرنے کے مضمون کو زندہ کر دیا ہے۔ فکرِ غالب کے کارناموں میں یہ شعر بھی شمار کرنا چاہئے۔

۱۲۔ میرے دل میں ایک دریائے خون موجزن ہے۔ کاش اسی پر اکتفا ہو۔ گویا دریائے

خوں آنکھوں سے بہہ کر میری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن ایسا کہاں ہوتا ہے۔ دیکھئے، ابھی میرے آگے کیا کیا آتا ہے۔ اور یہ عشق کیا کیا دکھاتا ہے۔

۱۳۔ آخری وقت آگا ہے۔ ضعف اس قدر ہے کہ ہاتھوں میں بالکل طاقت نہیں رہی۔ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ کہتے ہیں، اگر ہاتھوں میں قوت نہیں تو کیا ہوا۔ آنکھوں میں تو دم موجود ہے۔ شراب و ساغر کو میرے سامنے سے کیوں اُٹھاتے ہو، میرے سامنے ہی پڑے رہنے دو۔ تاکہ میں دیکھ کر اپنے دل کو تسکین دُوں۔

طباطبائی:- یہ شعر بھی مُصحف کے چیدہ اشعار میں مشہور ہے۔ مگر تمنا والے شعر کو نہیں پہنچتا۔ حقیقتاً خوب شعر کہا ہے۔ سعید لکھتے ہیں شراب کی مذمت کی ہے یعنی شراب ایسی بُری چیز ہے۔ اگر اس کی عادت پڑ جائے تو آخر وقت تک نہیں چھوٹ سکتی۔ یا اپنی کثرتِ شراب نوشی کا اظہار کیا ہے۔

۱۴۔ چونکہ غالب میرا ہم پیشہ، ہم نوالہ، ہم پیالہ اور ہمراز ہے، اس لئے آپ میرے سامنے اُسے بُرا کیوں کہیں ع

غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

آسی:- آپ اُس کو بُرا کہتے ہیں تو گویا مجھے بُرا کہتے ہیں۔ اسی طرح آپ مجھے بھی بُرا سمجھتے ہوں گے۔

طباطبائی:- معلوم ہوتا ہے معشوق کی طرف خطاب کیا ہے اور وہ یہ نہیں جانتا کہ غالب یہی ہے۔ (بیخود)

۲۰۹

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدّعا کہئے ۱ تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستم گر ہیں" ۲ مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہئے
وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جائے ۳ نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے!
نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں، ۴ وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہئے!
جو مدّعی بنے اُس کے نہ مدّعی بنئے، ۵ جو نا سزا کہے اُس کو نہ نا سزا کہئے!

کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھئے، ۶ کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہئے!
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجیے ۷ کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہئے!
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجیے ۸ کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے!
نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو نگار تو ہے ۹ روانیِ روش و مستیِ ادا کہئے!
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے ۱۰ طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہئے!
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے!

۱۔ جب میں تم سے اپنا حال کہتا ہوں تو تم ہمیشہ یہی کہتے ہو کہ آخر تمہارا مطلب کیا ہے۔ "اپنا مطلب بیان کرو"۔ تم ہی بتاؤ اگر تم ہی اس طرح سے کہو تو پھر بھلا میں کچھ کہنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ تم میرے حال سے اچھی طرح واقف ہو، مگر جان بوجھ کر پوچھتے ہو کہ تمہارا مطلب کیا ہے، میں ایسی صورت میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

۲۔ مجھے آپ کی ہر بات پر "بجا و درست" کہنے کی عادت ہو گئی ہے، اس لئے مہربانی کر کے پھر دوبارہ طعن سے یہ نہ کہنا کہ "ہم ستمگر ہیں"۔ میری زبان سے حسبِ عادت "بجا و درست" نکل جائے گا۔ یعنی میں کہہ بیٹھوں گا کہ ہاں واقعی آپ ستمگر ہیں اور یہ بات آپ کو ناگوار گزرے گی۔ کیا عجب ہے کہ یہ سُن کر مزاجِ ناز برہم ہو جائے اور میری مفت میں شامت آئے۔ (آسی)

باقی شارحین کا خیال ہے کہ معشوق نے طعن سے کہا تھا کہ ہم ستمگر ہیں اور ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ بجا و درست، اس پر معشوق کو غصہ آگیا۔ اب یہ اپنی صفائی پیش کرتے ہیں کہ دیکھنا اب یہ بات ہم سے نہ پوچھنا۔

۳۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ نگاہِ یار نشتر ہے اور نشتر کسی کا ہمدرد اور آشنا نہیں ہوتا، لیکن جب وہ دل میں اُتر جائے اور دل اُسے قبول کر لے تو پھر نگاہِ ناز کو آشنا اور دوست کہنے میں کیا ہرج ہے۔

۴۔ جراحت بمعنی زخم۔ پیکان کے زخم سے میرے دل کو تسلی اور تسکین نہیں۔ وہ زخمِ تیغ ہے جو میری دلکشائی اور تسلی خاطر کا باعث ہوتا ہے۔ لفظ دلکشا میں ایہام ہے۔ زخمِ تیر دل میں محض ایک رخنہ ڈال دیتا ہے اور زخمِ تلوار بہت کشادہ ہوتا ہے اس لئے زخمِ تیغ کو دلکشا کہا ہے۔

۵۔ مدّعی بمعنی دشمن۔ جو شخص کہ دشمن بن جائے اور دشمنی کرے تو اس کے ساتھ دشمنی نہ کرنی چاہئے۔ اسی طرح جو شخص بُرا کہے اس کے جواب میں اس کو بُرا نہیں کہنا چاہئے۔

۶۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ کہیں اپنے مرض کی حقیقت جانکاہی لکھتے ہیں کہ مرض نے جان کو گھلا ڈالا ہے اور کہیں دوا کی ناسازی اور ناموافقت کا رونا روتے ہیں کہ کوئی دوا طبیعت کے موافق نہیں آتی۔

۷۔ صبر گریز پا یعنی وہ صبر جو بہت جلد جاتا رہے۔ فرماتے ہیں۔ کبھی شدائدِ آلام ومصائب کی شکایت کرتے ہیں اور کبھی پیمانہ صبر کے بار بار چھلک جانے کا دُکھڑا روتے ہیں۔

۸۔ خون بہا:۔ فدیہ، وہ قیمت جو خون کے بدلے ادا کی جاتی ہے۔ اگر جان پاس نہ ہو اور وہ جاتی رہے تو پھر قاتل کو اس کا خون بہا ادا کیجیے کہ جان نہیں دے سکتے تو یہ حاضر ہے اور اگر زبان کٹ جائے تو خنجر مرحبا اور آفرین کہئے۔ (آسی)

باقی شارحین پہلے مصرعہ کی یہ شرح بیان کرتے ہیں۔ ''اگر جان جاتی رہے تو قاتل کو بخش دیجئے''۔

۹۔ اگر محبوب کو محبّت نہیں تو کیا ہوا۔ اس سے اس کی شانِ محبوبی میں کوئی فرق نہیں آتا ایسی صورت میں مناسب یہ ہے کہ اس کی اس کوتاہی کو صرفِ نظر کر کے اس کی خوش خرامی اور مستی ادا کی تعریف کیجئے۔

۱۰۔ اگر بہار کو فرصتِ قیام نہیں تو کیا ہوا۔ آخر وہ بہار تو ہے۔ بس اس صورت میں شادابیِ چمن اور خوبیِ ہوا کی تعریف کرنی لازم ہے۔

۱۱۔ سفینہ بمعنی کشتی۔ اے غالبؔ! جب کہ کشتی کنارے ہی پر آ لگی تو اب خدا سے نا خدا کے ظلم وستم کیا کہوں، وقت گزر گیا، غنیمت ہے گزشتہ مصائب یاد کر کے مصیبتوں کا تازہ کرنا بیکار ہے۔

طباطبائی:۔ لقمان نے چار باتوں پر حکمت واخلاق کو منحصر کر دیا ہے۔ موت اور خدا کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے اور اگر کسی پر کچھ احسان کیا ہو، یا کسی نے کچھ بُرائی کی ہو تو اُسے بھول جانا چاہئے۔

۲۱۰

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے ۱ دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی ۲ تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم ۳ بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر ۴ پردے میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا ۵ آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ ۶ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

۱۔ حالی:۔ دھویا جانا:۔ بے شرم وبیباک ہونا: پاک:۔ آزاد یا شہدا۔

مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھوں سے آنسو نہ نکلے تھے تو اس بات کا پاس اور لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے، مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ہم ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے اس مطلب کو ان الفاظ میں ادا کرنا کہ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے، بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے۔

۲۔ ہمارے دو حساب تھے، اوّل یہ کہ شراب کی قیمت کہاں سے آئے جو ادا کر کے شراب مہیّا کی جائے، دوسرے آلاتِ مے کشی کے حساب وشمار کا جھگڑا کہ ان کو کہاں کہاں باندھے پھریں اور کب تک ان کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کریں۔ سو ان دونوں حسابوں کا جھگڑا اس طرح پاک ہوا کہ ہم آلاتِ مے کشی بیچ کر شراب پی گئے۔ بقول طباطبائی رندوں کا حسنِ سلیقہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ جھگڑوں سے بھی چھوٹے اور شراب بھی مِل گئی۔

۳۔ اگرچہ تم آوارگی سے سارے زمانے میں بدنام ہو گئے لیکن اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ تم طبیعت کے چالاک ہو گئے۔ گویا اب تم کسی کے دھوکے میں نہ آؤ گے۔ کیونکہ کافی ٹھوکریں کھا چکے ہو۔

۴۔ نالہ بلبل کو کون بے اثر کہتا ہے۔ اس کے اثر سے لاکھوں گلوں کے جگر چاک ہو گئے۔

مطلب یہ ہے کہ پھول کھلتے نہیں بلکہ نالہ بلبل کے اثر سے ان کے جگر چاک ہوتے ہیں۔

۵۔ اہلِ شوق:۔ اہلِ عشق۔ اہلِ شوق کا وجود و عدم تو کیا پوچھتا ہے وہ تو اپنی آگ (آتشِ شوق) میں خس و خاشاک کی طرح جل بجھے ہیں اور اب نہ اُن کا وجود ہے اور نہ عدم ہے، گویا وہ فنانی الشوق ہو چکے ہیں۔

۶۔ حالیؔ:۔ شاہدِ حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے۔ اس کو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سحابی کہتا ہے ۔

اے زاہد و عاشق زتو درنالہ و آہ — دُور توؤ نزدیک ترا حال تباہ
کس نیست کہ جاں ازتو سلامت ببرد — آں رابہ تغافل کشی ایں رابہ نگاہ

پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آ کر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے۔ جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔

۷۔ کل اس نے اسدؔ کی لاش کچھ ایسے رنگ سے اُٹھائی کہ دشمنوں کے دل بھی رشک کی وجہ سے غمناک ہو گئے۔ دوسرا مفہوم تحقیر کا ہے کہ اس نے اس ذلت و تحقیر کے ساتھ اسدؔ کی لاش اُٹھائی کہ اسے دیکھ کر دشمنوں کو بھی رنج ہوا۔

۲۱۱

نشہ ہا شاداب رنگ و سازہا مستِ طرب ۱ شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست ۲ واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

۱۔ رنگ سے مراد رنگِ محفل۔ نغمہ کو باعتبارِ روانی جوئبار سے تشبیہ دی ہے اور شیشۂ مے کو باعتبارِ سبزی جوئبارِ نغمہ کا سروِ سبز کہا ہے۔ رنگِ محفل سے نشہ شاداب و مسرور ہے۔ ساز موسیقی نشۂ طرب سے مست ہے اور شیشۂ مے رنگینیِ شراب سے نغمۂ جوئبار کا سروِ سبز معلوم ہوتا ہے۔ مصنف نے بہار اور شراب کی کیفیت دکھائی ہے۔

۲۔ اے ہمنشیں! مجھے یہ مت کہو کہ نالہ کشی اور آہ و فریاد سے دوست کی محفلِ عیش کو پریشان نہ کر کیونکہ اس کی محفلِ عیش و نشاط میں جا کر میرا نالہ بھی نغمہ بن جاتا ہے۔ جب میرا نالہ نغمہ بن گیا تو اس سے محفلِ عیش میں کیسے خلل پڑ سکتا ہے۔ نالہ کے نغمہ بننے سے دوسرا مفہوم یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ میرے نالے سُن کر مسرور ہوتا ہے پہلے مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا ہے ۔

دُور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہوا — نغمہ بن جاتا ہے گر نالہ بھی میرا جائے ہے

۲۱۲

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے ۱ دعویِٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ حیرتِ انجامِ گل، ۲ یک جہاں زانو تامل درقفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام ۳ ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ ولب آشنائے خندہ ہے

۱۔ دانتوں کی شوخیِ ناز کا اظہار ہنسی کے لئے ہوا کرتا ہے، یعنی وہ ہنسی کے وقت اپنی شوخی اور چمک دکھاتے ہیں اور چونکہ دانت ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے ان کو جمعیتِ احباب سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کہتے ہیں بالکل اسی طرح سے احباب کا دعویٰ جمعیت جائے خندہ ہے۔ کیونکہ یہ جمعیت بالکل عارضی ہے۔

بیخودؔ لکھتے ہیں کہ جس طرح بڑھاپے میں دانت ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں، اسی طرح دوستوں میں بھی جدائی ہو جایا کرتی ہے۔

۲۔ عدم میں اس لئے کہ کھلنے کے بعد غنچہ معدوم اور گل پیدا ہو گیا۔ یک جہاں زانو تامل یعنی بیحد فکر و تامل کے وقت انسان سر بزانو ہو جاتا ہے۔ اس ترکیب سے مطلب فکر و تامل بیحد ہوا۔ درقفائے خندہ:۔ کھل جانے کے بعد:

غنچہ جب کھل گیا تو معدوم ہو گیا اور گل آموجود ہوا۔ اب عدم میں غنچہ محو حیرت ہے کہ میرا انجام بھی وہی ہوگا جو اور پھولوں کا ہوا ہے، اس لئے وہ کھل جانے کے بعد بہت زیادہ فکر و تردد میں ہے (تمام متفق)

بیخودؔ نے یک جہاں زانو تامل کی شرح میں اختلاف کیا ہے۔ لکھتے ہیں، جس فکر و تامل میں غنچہ مبتلا ہے اس کی مقدارِ مہلت زانو بدلنے تک کی مدت ہے یعنی فکر اور سوچ کے وقت انسان سر بزانو ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر میں تھک جانے کے بعد زانو بدلتا ہے اور سر کو زانو پر سے اُٹھا لیتا ہے۔ گویا اتنی سی دیر میں پھول کو اپنا انجام نظر آ جاتا ہے اور وہ کملا جاتا ہے یا جھڑ جاتا ہے۔

آسی :- یعنی ہنوز عدم میں ہے ہستی میں نہیں ظاہر ہوا۔ مگر انجامِ گل کی ہستی پر محو ہو رہا ہے اور وہ غنچہ سوچتا ہے کہ خندہ کے پیچھے بہت سا فکر پوشیدہ ہے۔ دوسرا مفہوم وہی لکھا ہے جو میں لکھ چکا ہوں۔

۳۔ کلفتِ افسردگی:- افسردگی کی تکلیف۔ مایوس الحالی: عیشِ بے تابی۔ بیتابی کی راحت، وہ آرام جو بیتابی میں حاصل ہوتا ہے:
دندان دردل فشردن:- دل میں دانت گڑو دینا۔ بیتاب ہو کر دل کو چبا ڈالنا۔ گویا تکلیف برداشت کرنا:

کلفتِ افسردگی کی حالت میں عیشِ بیتابی حرام ہے۔ اس لئے عالمِ افسردگی میں ہم بیتابی کے لطف حاصل نہیں کرتے، ورنہ ہم دل کو چبا ڈالیں اور اس ترکیب سے عیشِ بیتابی کے مزے اُڑائیں۔ مطلب یہ ہوا کہ دل کو دانتوں سے زخمی کرنے سے زخم پیدا ہو جائیگا۔ زخم کے لئے خندہ لازم ہے اور خندہ لوازماتِ عیش میں سے ہے (طباطبائی، بیخود، آسی)

آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے کہ ہم افسردگی سے مجبور ہیں جس کے مذہب میں عیش بیتابی حرام ہے ورنہ اپنے دل کو زخمی کرنا اور خون پینا یہ تو عین خوشی کی جگہ ہے اور اس پر فخر کرنا چاہئے (حسرت۔ سعید)

۴۔ احباب سوزشِ باطن کے قائل نہیں ہیں ورنہ میری حالت یہ ہے کہ دل پر گریہ طاری ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہنسی ہے یعنی بظاہر میں خوش نظر آتا ہوں۔ لیکن میرا دل مبتلائے رنج ہے۔ آشنا کا لفظ محیط کے مناسبات میں سے ہے، آشنا پیراک کو کہتے ہیں۔

۲۱۳

حُسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے ۱ آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن ۲ چشمِ واگر دیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

۱۔ اگرچہ حُسن بے پروا اور بے نیاز ہے لیکن پھر بھی وہ متاعِ جلوہ کا خریدار ہے اور اس کی خواہش رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کی خواہش کی وجہ سے آئینہ اس کا زانوئے فکر بن گیا ہے یعنی وہ ہر وقت آئینہ دیکھتا رہتا ہے تاکہ اُسے دیکھ دیکھ کر کوئی نئی ایجاد جلوہ میں کرے۔

۲۔ آگہی:- ہوشیاری: رنگ باختن:- رنگ بدلنا: چشمِ واگر دیدہ:- کُھلی ہوئی آنکھ آغوش سے مشابہ ہے: تماشا:- جلوہ بظاہر:

اے آگاہی تو کب تک جلوۂ ظاہر کے تماشے میں مصروف و محو رہے گی۔ کُھلی ہوئی آنکھ یعنی چشمِ تماشا جو جلوۂ ظاہر کو دیکھنے کے لئے حیرت سے کُھلی ہوئی ہے۔ وہ جلوہ کے لئے آغوش وداع ہے جو اس کو رخصت کے لئے واہوئی ہے۔ غرض مطلب یہ ہے کہ جلوہ عالم اس قدر بے ثبات و ناپائیدار ہے کہ اس کے لئے چشمِ کشادہ ہی آغوشِ وداع ہے۔

۲۱۴

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی ۱ مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر ۲ کب تک خیالِ طرۂ لیلےٰ کرے کوئی
افسردگی نہیں طرب افشائے التفات ۳ ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے ۴ آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی ۵ کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل ۶ تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز ۷ تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست ۸ نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر ۹ فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز ۱۰ یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل ۱۱ جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی!

۱۔ حالی:- صوفیا کی اصطلاح میں محادثت اور مسافرت (یعنی عبد و معبود کے درمیان گفتگو ہونی) کے دو مرتبے ہیں، جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ شاہدِ حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہئے۔ یعنی

جب تک دِل تیغِ عشق سے مجروح نہ ہو، یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔

۲۔ تمام عالم وحشتِ مجنوں کا غبار ہے، کب تک اسے کوئی طرۂ لیلیٰ سمجھتا رہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام عالم ایک دھوکا ہے، اس لئے کوئی کب تک اس کو طرۂ لیلیٰ کی طرح خیال کرے گا۔ طرہ زینت و آرائش کی چیز ہے اور عاشقوں کو مرغوب ہے۔ وحشتِ مجنوں اور طرۂ لیلیٰ میں تناسب ہے۔

آسی نے اس کے علاوہ دو معنی اور لکھے ہیں لیکن زبردستی کے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ (۱) دُنیا میں غبارِ وحشت مجنوں اُڑا رہا ہے۔ آخر اسے کوئی کب تک نہ دیکھے اور لیلیٰ کا کوئی کہاں تک خیال کرے یعنی بمقابلہ حُسن لیلیٰ کے عشقِ مجنوں زیادہ قابلِ دید ہے (۲) مجنوں کی اس درجہ پریشانی اور وحشت پر نگاہ نہ ڈالنا اور اس غبار سے آلودگیِ طرۂ لیلیٰ کا لحاظ کرنا ظلم ہے۔

۳۔ طرب افشائے التفات:۔ التفاتِ معشوق کی خوشی پیدا کرنے والی: افسردگی:۔ غمزدگی: افسردگی سے التفاتِ معشوق کی خوشی حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہاں اگر کوئی سراپا درد بن جائے تو ممکن ہے کہ معشوق کے دل میں جگہ پیدا ہو سکے۔ (حسرت، سعید، بیخود)

طباطبائی:۔ میری تنگ دلی ایسی نہیں کہ التفات کر کے خوش ہو یعنی کسی کے التفات کرنے سے میری گرفتگیِ خاطر رفع نہیں ہوتی۔ ہاں درد بن کر دل میں کوئی جگہ پیدا کرے تو کرے۔ غرضکہ تنگیِ دل کی یہ حالت ہے کہ درد کے سوا کسی کی گنجائش نہیں ہے۔ (۲) میرے ہم خیال۔

آسی نے تیسری شرح یہ بھی لکھی ہے کہ افسردگی سے التفاتِ معشوق کو خوشی نہیں ہو سکتی، البتہ کوئی سراپا درد بن جائے تو اس کے التفات کو خوش کر سکتا ہے۔ طباطبائی اور آسی کا خیال ہے کہ مُصنّف نے یقیناً طرب افشائی کہا ہے۔ کیونکہ طرب اور افشا دونوں لفظ عربی ہیں اور ترکیب فارسی ہے۔ غالب سے یہ غلطی ممکن نہیں۔

۴۔ اے ندیم (ہم نشین) رونے پر مجھے ملامت نہ کر، کیونکہ آخر کب تک کوئی اپنے دل کی بھڑاس نہ نکالے اور منقبض خاطر بیٹھا رہے۔

۵۔ ہم نے اس خیال سے اپنا جگر چاک کیا کہ وہ ہمارے حال کی پرسش کریں، مگر جب چاکِ جگر سے یہ بات حاصل نہ ہوئی تو اب گریبان چاک کرنے سے کیا فائدہ ہے، سوائے اس کے کہ ہم گریبان چاک کر کے رسوائی گریبان کے موجب بنیں۔ گویا یہ کہلوائیں کہ گریبان چاک ہونے

کا بھی کوئی اثر نہ ہوا (سعید)

آسی، بیخود اور طباطبائی نے یہ مفہوم لیا ہے کہ گریبان پھاڑ کر اپنے آپ کو رسوا اور بدنام کرنے سے کیا فائدہ۔

۶۔ میرے جگر کے ٹکڑے صحرا کے ہر خار میں بندھے پڑے ہیں، ان کی رنگینی سے ہر خار شاخِ گل بن گیا ہے اور پُر خار صحرا چمن کا منظر پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لختِ جگر عاشق کے بکثرت خون رونے اور صحرانوردی کرنے سے ہر خار پر چپکے ہیں، اس لئے کہتا ہے کہ کب تک کوئی صحرا کی باغبانی کرے۔ یاد رہے باغبان کے فرائض میں آبیاری کرنا اور پھول لگانا شامل ہے (سعید، آسی، حسرت)

طباطبائی اور بیخود:۔ اب صحرا کی بہار میں کیا بات باقی رہی ہے جو کوئی باغبانی کیا کرے۔

۷۔ تُو وہ ذات ہے جسے کوئی دیکھ نہیں سکتا، کیونکہ نگاہ کی ناکامی برق نظارہ سوز ہے۔ مطلب یہ ہے۔ اگر کوئی تیرا جلوہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو ناکامِ نگاہ برق بن کر گرتی ہے اور قوتِ دید کو سلب کر دیتی ہے۔ یہ مضمون مصنف نے مختلف پیراؤں سے باندھا ہے۔

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا ——— مستی سے ہر نگاہ ترے رُخ پر بکھر گئی
جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز ——— آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں مُنہ چھپائے کیوں

۸۔ سنگ و خشت:۔ اینٹ پتھر: صدف:۔ سیپی: شکست:۔ سے مُراد ضربِ سنگ۔

اگر کوئی شخص جنون سے سودا کرے تو اس سودے میں اُسے کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر سنگ و خشت جو لڑکے دیوانے کو مارتے ہیں وہ ایک صدف ہے جس میں سے گوہرِ شکست حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے وہ سودا جس میں موتی حاصل ہوں، فائدہ سے خالی نہیں۔

۹۔ تیرا وعدہ بڑا صبر آزما ہے۔ میری ساری عمر ایفائے عہد کی اُمید میں بسر ہوگئی۔ مگر پھر بھی تیرا وعدہ پورا نہ ہوا۔ گویا ہم انتظار ہی میں مر گئے اور تیری تمنا کرنے کا وقت ہی نہ آنے پایا۔ پھر تیری تمنا کس وقت کی جاتی۔

۱۰۔ طباطبائی:۔ معنی آفرینی اور اخلاقی مضامین وایجاد و اختراعِ لطائف ایسا وحشی فن ہے،

جس سے یاس پیدا ہوتی ہے۔ پھر بھی سب اس مرض میں مبتلا ہیں۔ ایجاد کے مناسبات سے ''پیدا کرنا'' اور درد کو پیدا کرنا جس کے لئے پیدائی نہیں، لطف سے خالی نہیں (بیخود)

حسرت:- ایجاد کی طبیعت میں جو وحشت ہے وہ یاس خیز ہے یعنی ہم وحشی لوگ یاس کو ایجاد کیا کرتے ہیں اور اس طرح پر گویا مایوس ہونے پر مجبور ہیں۔

سعید:- دردِ عشق وہ درد نہیں، جس کو کوئی پیدا کر سکے۔ اس میں کسی کوشش اور اختراع وایجاد کا نتیجہ ہمیشہ مایوس کن ہوتا ہے۔ مرزا پہلے لکھ چکے ہیں ۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

آسی:- ایجاد سے مراد غالباً عالمِ ایجاد ہے۔ اس صورت میں یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ عالمِ ایجاد کی طبیعت ہی میں وحشت ہے اور یہ وحشت یاس خیز اور مایوس کن، بلکہ یہ یاس ایک درد ہے جو ہر ساکنِ عالمِ ایجاد کے دل میں پیدا ہونا ضروری ہے۔

سہا:- اس عالم ایجاد کی طبیعت میں یا ممکنات کے خاصہ میں وحشت و بیگانگی ہے اور اس سے توقع رکھنی عبث ہے اور یہ وحشت و بیگانگی ایسا درد نہیں جو کوئی پیدا نہ کرے۔

۱۱۔ مجنوں کا کام یہ ہے کہ اپنے لباس کو پھاڑے۔ جب جسم پر لباس نہ رہا تو دیوانہ بیکار ہو گیا، کہتے ہیں لباس پھاڑنے کے بعد بیکاری جنوں کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے سر کو پیٹے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب سر کو پیٹتے پیٹتے ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر دیوانہ کیا کرے کیونکہ جنون میں بیکار بیٹھا نہیں جاتا۔

۱۲۔ فروغِ شمعِ سخن بہت مشکل ہے۔ یہ خصوصیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے کوئی دل گداختہ پیدا کرے۔ مطلب یہ ہے کہ بغیر دلِ دردمند کے فروغِ سخن ممکن نہیں۔

۲۱۵

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی　۱　میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی　۲　ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر　۳　دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے　۴　وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　۵　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سُنو گر بُرا کہے کوئی!　۶　نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی!　۷　بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند　۸　کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے　۹　اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

۱۔ ابنِ مریم یعنی حضرت عیسےٰ، جن کا معجزہ مُردوں کو زندہ اور بیماروں کے دُکھ دُور کرنا تھا۔ فرماتے ہیں۔ اگر کوئی عیسےٰ ہے تو ہوا کرے۔ میں تو جب جانوں کہ کوئی میرے دُکھ دُور کرے (شاید بیماری عشق کو عیسےٰ بھی اچھا نہ کر سکتے ہوں) کیونکہ یہ کوئی مرض نہیں بلکہ ایک قسم کا وہم ہے۔

۲۔ شرع و آئین:۔ قانونِ دین و دُنیا:

میں نے مانا کہ دُنیا کا مدار قانون پر ہے اور قاتل کو قتل کی سزا دی جاتی ہے۔ لیکن کوئی ایسے قاتل کو کیا سزا دے سکتا ہے جو بغیر تلوار کے قتل کر ڈالتا ہے۔

حسرت نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے کہ جس پر بسبب نزاکتِ حُسن کوئی حدِ شرعی کا جاری کرنا گوارا نہ کرتا ہو۔ الخ

۳۔ کڑی کمان یعنی سخت کمان، جس قدر کمان سخت ہوتی ہے، اُسی قدر تیر میں بھی زیادہ زور ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس کی چال ایسی ہے، جیسے کڑی کمان کا تیر ہوتا ہے۔ یعنی بے محابا اس کی خوش خرامی تیر کی طرح سینے کے پار ہوتی ہے۔ ایسے کے دل میں کوئی جگہ پیدا کرے تو بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے کے دل میں کوئی جگہ پیدا کرنی بہت مشکل ہے۔

۴۔ اگر ان کے سامنے ذرا بھی بات کی جائے تو وہ زبان کاٹ ڈالتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ان کے دل میں آئے وہ کہے جائیں اور ہم خاموش بیٹھے سُنا کریں۔

۵۔ خدا جانے جوشِ وحشت میں کیا کیا بک رہا ہوں، خدا کرے کوئی میری باتوں کو نہ سمجھے۔ مطلب یہ ہے کہ رازِ عشق فاش نہ ہو جائے۔

۶۔ اگر کوئی تمہیں بُرا کہے تو سُنی اَن سُنی کر دو اور اگر کوئی بُرا کرے تو چشم پوشی کرو۔ یعنی عیب چینی نہ کرو۔ قوت برداشت پیدا کرو۔

۷۔ اگر کوئی غلط راستے پر چلے تو اُس کو روک لو، اور اگر کوئی خطا کرے تو اُس کو فراخ دلی سے معاف کردو۔

۸۔ دُنیا میں کون شخص ہے جو حاجتمند نہیں ہے، کوئی کس کس کی حاجت روا کرے۔ اگر کوئی تمہاری حاجت روا نہ کرے تو شکایت زبان پر نہ لاؤ، کیونکہ ہر شخص کی اپنی اپنی ضرورتیں ہوتی ہیں۔

۹۔ خضر راہنمائی کرتے ہوئے سکندر کو چشمۂ آبحیات پر لے گئے تھے لیکن سکندر نے یہ دیکھ کر کہ چشمۂ آبحیات کے گرد بہت سے بوڑھے پڑے ہوئے سِسک رہے ہیں، آبِ حیات نہ پیا اور یونہی واپس آ گیا۔ کہتے ہیں، دیکھ لو سکندر کے ساتھ خضر نے کیا کیا، رہنما بنا اور پھر بھی آبِ حیات نصیب نہ ہوا۔ حضرتِ خضر سے بڑھ کر اور رہنما کون ہوسکتا ہے۔ ایسی حالت میں اب کوئی کس کو رہنما بنائے۔

۱۰۔ جب کوئی توقع ہی نہیں رہی تو پھر کس برتے پر کسی کا گِلہ شکوہ کیا جائے۔ گِلہ کرنے کا اس وقت فائدہ ہوسکتا ہے، جب مطلب براری کی امید ہو۔ ظاہر ہے۔ جب توقعات منقطع ہو جائیں تو گلہ کرنے سے نفرت اور دشمنی بڑھتی ہے۔

۲۱۶

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے! ۱ غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے ۲ رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے!
سخن میں خامہ غالبؔ کی آتش افشانی !
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے!

۱۔ غمِ گیتی:۔ غمِ دُنیا: ساقیِ کوثر:۔ حضرت علیؓ

میں نے مانا غمِ دُنیا بہت زیادہ ہے لیکن کیا ہوا۔ غم کو دُور کرنے کے لئے میرے پاس شراب بھی تو بہت زیادہ ہے۔ شراب بہت اس لئے ہے کہ میں ساقیِ کوثر کا غلام ہوں وہ کبھی مجھ کو تشنہ

نہ رہنے دیں گے۔

سعید:۔ رہی اس شراب پینے کے گناہ کی سزا سو اس کی بھی ہم کو فکر نہیں، کیونکہ میں ساقیِ کوثر کا غلام ہوں وہ اپنے غلام کی شفاعت خود کرینگے۔

۲۔ ہم تمہاری طرز و روش کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کیا ہے، کہنے کو تو مجھ پر ظلم و ستم نہیں کرتے لیکن رقیب پر جو تمہارا لطف و کرم ہے، وہی میرے لئے ستم ہے اور ستم کس کو کہتے ہیں (حسرت، طباطبائی، بیخود)

آسی:۔ تم کسی پر مہربان بھی ہوتے ہو تو ظلم کرنے کے لئے ہوتے ہو۔ لہٰذا اگر رقیب پر مہربان ہو تو کیا ستم ہے، وہی اُس پر ظلم کرتے ہو گے۔

سعید:۔ تمہارا جو ہمارے ساتھ برتاؤ ہے ہم اُس کو خوب جانتے ہیں یعنی بُرا ہے پس جب تم رقیب پر مہربانی کرتے ہو تو ہماری شکایت عبث ہے۔

۳۔ ہم شاعری میں قلمِ غالبؔ کی آتش افشانی کا یقین رکھتے ہیں، لیکن اب اس میں دم ہی کہاں باقی رہا ہے۔

۲۱۷

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے ۱ سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے
جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم ۲ ہوں وہ میں سبزہ کہ زہر آب اُگاتا ہے مجھے
مدّعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے ۳ آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک ۴ آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے!
زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے ۵ دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

۱۔ خفقان میں ڈر بہت لگا کرتا ہے اور خفقانی ہر وقت توہمات سے مغلوب رہتا ہے۔ کہتے ہیں، باغ نے مجھ کو خفقانی سمجھ لیا ہے، اس لئے وہ مجھے ہر وقت ڈراتا رہتا ہے۔ اس کی ہر شاخِ گل کا سایہ خفقانی ہونے کی وجہ سے مجھے افعی معلوم دیتا ہے اور میں سہما جاتا ہوں۔

۲۔ جوہرِ تیغ سبزی مائل ہوتا ہے اور وہ تلوار کو زہر آب میں بجھانے سے نمودار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں جس طرح سبزۂ جوہرِ تیغ سوائے زہر آب کے کسی دوسرے سرچشمہ پر نہیں اُگتا۔ اسی طرح

میں وہ سبزہ ہوں کہ مجھے بھی زہر آب (غم) ہی اُگاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری سرشت غم و غصہ سے ہے۔

۳۔ مدّعا حاصل نہ ہونے سے میرا دل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ چونکہ میرا دل آئینہ تھا، اس لئے ٹوٹ جانے سے آئینوں کے بہت ٹکڑے ہو گئے۔ اب ان آئینوں میں مدّعا شکستِ دل کا تماشا دیکھنے میں محو ہے۔ چونکہ ان ٹکڑوں میں ہر طرف شکستِ دل کا تماشا نظر آ رہا ہے اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے جس طرح کوئی مجھے آئینہ خانہ میں لئے جاتا ہے۔ (تمام متفق)

آسی نے ایک مفہوم یہ بھی تراشا ہے۔ کوئی مجھے آئینہ خانہ میں لئے جاتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں میرا دل ٹوٹے اور میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے تماشے میں محو ہوں اور میرا دل ٹوٹنا اس پر منحصر ہے کہ میں حیران ہوں گا اور اس سے میرا دل ٹوٹے گا۔

۴۔ میں نالہ کو سرمایۂ دُنیا اور دُنیا کو ایک مٹھی بھر خاک سمجھتا ہوں اور میری نظروں میں آسمان ایک بیضۂ قمری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیا میری نظروں میں ہیچ ہے۔ کیونکہ اس کا حاصل سوائے رنج و محن کے اور کچھ نہیں آسمان اور بیضۂ قمری میں بلحاظ رنگ مشابہت ہے۔

طباطبائی:۔ آسمان پر بیضۂ قمری کی پھبتی کہی ہے کہ جس میں کفِ خاک کے سوا کچھ نہیں اور اس مٹھی بھر خاک کی قسمت میں عمر بھر کی نالہ کشی لکھی ہے اور بیضۂ قمری اس لئے کہا کہ قمری نالہ کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ چونکہ قمری کا رنگ خاکی ہوتا ہے۔ اس لئے بھی آسمان کو بیضۂ قمری قرار دینا خالی از لطف نہیں۔

۵۔ حالی:۔ ''کون اُٹھاتا ہے مجھے''۔ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اُٹھا دیتے تھے، اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اُٹھاتا ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اُٹھا دیتے تھے۔ دیکھوں اب میرا جنازہ کون اُٹھاتا ہے۔

۲۱۸

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی ۱ اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگزار کی!
جب اُسکے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ ۲ لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی!
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے ۳ کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی!

۱۔ کوکبۂ شہریار یعنی وہ سوار جو بادشاہ کی اردلی میں رہیں کہتے ہیں۔ راستے کی خاک بھ کیوں نہ اترائے، اس کا اترانا بجا ہے کیونکہ بادشاہ کے سپاہی اس کو روندتے ہوئے گزرے ہیں بقول آسی جب بادشاہ کے اردلیوں کے روندنے سے خاک کو یہ فخر ہے، تو زہے نصیب اس کے جس پر بادشاہ مہربان ہو۔

۲۔ نمود یعنی شہرت۔ جس لالہ زار کو دیکھنے کے لئے بادشاہ خود تشریف لائیں تو بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ اس لالہ زار کی لوگوں میں شہرت اور مقبولیت نہ ہو۔

۳۔ ہم سیرِ گلستاں کے بھوکے نہیں ہیں، مگر ہوائے بہار میں ایسی کشش ہے کہ وہ خود بہ خو ہمارا دل اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، اس لئے ہم اس سے کیوں نہ حظ حاصل کریں۔

۲۱۹

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ۱ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اُسکی گردن پر ۲ وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن ۳ بہت بے آبرو ہوکر تیرے کوچہ سے ہم نکلے
بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا ۴ اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اُسکو خط تو ہم سے لکھوائے ۵ ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
ہوئی اس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی ۶ پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی ۷ وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا ۸ اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ ۹ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۱۔ حالی:۔ ''خواہش پر دم نکلنا''۔ اس کے پورے ہونے کے لئے جلدی کرنا۔ چنانچہ ک ہیں۔ کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو، یعنی کیوں جلدی کرتے ہو۔ پہلے مصرعہ م بمقتضائے مقام یہ الفاظ کہ ''دل میں باقی ہیں''۔ مقدر ماننے جائیں''۔ یعنی ہمارے دل میں ہزارو ایسی خواہشیں باقی ہیں کہ جن میں سے ہر خواہش کے لئے ہم مرے جاتے ہیں۔ ہمارے ارمان بہ نکل چکے ہیں لیکن پھر بھی باقی ہیں۔

۲۔ میرا قاتل اس بات سے ڈرتا ہے کہ اگر میں اس کو قتل کر دوں گا تو اس کا خون میری گردن پر رہے گا۔ اس کا اس بات سے ڈرنا بیکار ہے، کیونکہ وہ خون جو چشمِ تر سے عمر بھر بہتا رہا اور کبھی نہ تھما، وہ اس کی گردن پر کیا ٹھہرے گا یعنی جسم میں نہیں رہیگا تو گردن پر کیا رہے گا۔

۳۔ کوچہ یار کو کس خوبی سے بہشت کہا ہے۔ ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں کہ حضرتِ آدم بہشت سے نکالے گئے تھے، لیکن جس بے آبروئی کے ساتھ ہم تیرے کوچہ سے نکلے ہیں وہ اس طرح نہ نکلے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ان سے زیادہ بے آبرو اور بے عزّت کئے گئے ہیں۔

۴۔ بھرم یعنی حقیقت اور اصلیت۔ تیرے قامت کی درازی کی لوگ بہت تعریف کرتے ہیں، لیکن یہ تعریفیں اسی وقت تک ہیں جب تک تیری زلفیں لپٹی ہوئی ہیں۔ جس وقت ان کے پیچ وخم نکلیں گے تو قامت کی درازی کی حقیقت کُھل جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ تیری زلفیں تیرے قد سے بھی زیادہ دراز ہیں۔

۵۔ عاشق کو شبہ ہے کہ تمام شہر والوں کی میرے معشوق سے خط کتابت ہے اس لئے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کون کون ان سے خط کتابت کرتا ہے اور اسے کیا کیا لکھواتا ہے، اس نے خط نویسی کا پیشہ اختیار کیا ہے۔ صبح ہوتے ہی کان پر قلم لگا کر گھر سے نکل جاتا ہے اور گلی کوچوں میں پھرتا ہے کہ لوگ منشی سمجھ کر اُسے بُلا لیں اور خط لکھوائیں۔

آسی لکھتے ہیں کہ ہم اس کا نام لکھنے کے عاشق ہیں۔ اس لئے ہم نے یہ ترکیب نکالی ہے۔ لیکن یہ معنی کچھ لطف نہیں دیتے۔

۶۔ بادہ آشامی یعنی شراب نوشی جمشید سے مشہور تھی۔ گویا پھر وہ زمانہ آگیا ہے کہ جامِ جم نکلے اور اس کو میرے نام سے شہرت ہو کیونکہ جمشید تو رہا نہیں اب میں جامِ جمشید کا حریف ہوں۔ جامِ جم کے متعلق مشہور ہے کہ جمشید نے ایجاد کیا تھا۔ اس میں تمام عالم کی سیر ہوتی تھی وہ اس میں شراب بھر کر پیا کرتا تھا نیز شراب کو بھی جمشید کی ایجاد کہا جاتا ہے۔

۷۔ جن لوگوں سے ہمیں اُمید تھی کہ وہ ہماری خستگی اور دردمندی کی داد دینگے، جب ہم نے اپنا درد ان کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے اپنی درد بھری داستان سُنائی جس سے معلوم ہوا کہ وہ ہم سے بھی زیادہ فلک زدہ اور ستم رسیدہ ہیں۔ ع

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

آسی نے دُوسرا مفہوم یہ لکھا ہے اور اس کو ہمارے مفہوم پر ترجیح دی ہے کہتے ہیں کہ ہم نے جس کسی سے خستگی کی داد ملنے کی توقع کی۔ جس کے سامنے اس بات کا اظہار فخریہ کرنا چاہا کہ ہم نے اتنے ستم سہے ہیں وہ لوگ ہم سے بھی زیادہ تیغِ ستمِ یار کے دل خستہ تھے۔

۸۔ محبت میں مرنے اور جینے کا امتیاز اُٹھ گیا۔ کیونکہ جسے دیکھ کر جیتے ہیں، اُسی کافر پہ مرتے ہیں۔ بقول بیخود حاصل زمین یہی شعر ہے۔

۹۔ شراب ایسی چیز ہے کہ اسے واعظ بھی چھپ چھپ کر پیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہاں میخانہ کا دروازہ اور کہاں حضرتِ واعظ، کل کی بات ہے کہ ہم میخانہ سے شراب پی کر نکل رہے تھے کہ حضرتِ واعظ داخل ہوئے گویا ہم نے انہیں میخانہ میں جاتے ہوئے دیکھ لیا۔

۲۲۰

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جایئے ۱ بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جایئے

بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کُنجِ قفس ۲ ازسرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جایئے

۱۔ شرار سے پوچھتے ہیں کہ اگر ہم صدا بن جائیں تو پہاڑ کے لئے بار خاطر ہوں کیونکہ جو آواز پہاڑوں سے ٹکراتی ہے، وہ گونج بن کر واپس آجاتی ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ پہاڑ پر بار خاطر تھی، اس لئے پہاڑ نے اُسے واپس لوٹا دیا کہتے ہیں۔ اے شرارِ جستہ پھر آخر ہم کو کیا ہونا چاہئے۔ بقولِ حسرت اس اندازِ سوال سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ میں بھی شرار کی مانند بے تکلف دم بھر میں جل کر فنا ہو جانا چاہتا ہوں (سعید و حسرت)

طباطبائی:- شرار کی از خود رفتگی اور بے تکلفی کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ تیری طرح بھلا ہم کیا بے تکلف ہو جائیں اور کیونکر ضبط کو ہاتھ سے دیں۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ اگر صدا کی طرح سبک و لطیف بن کر تڑپیں تو بھی کوہ ایسے سنگین و پُرتمکین جسم کے بارِ خاطر ہو جائیں۔ غرض یہ کہ جہاں تک ہو سکے ضبط کرنا اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہئے۔ وجہ مناسبت اس شعر میں یہ ہے کہ شرار پتھر سے نکلتا ہے اور صدا پہاڑ سے ٹکرا کر پلٹ آتی ہے یعنی اس کی بار خاطر ہوتی ہے اور اسی سبب سے وہ اسے ردّ کرتا ہے (آسی، بیخود)

۲۔ میرا کنجِ قفس بیضہ کی طرح ہے جو بال و پر کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے۔ اگر میں اس کنجِ قفس سے آزاد ہو جاؤں تو سمجھونگا مجھے از سرِ نو زندگی حاصل ہوئی مطلب یہ ہے کہ جس طرح انڈے سے بچہ نکلنے کے بعد نئی زندگی شروع کرتا ہے اسی طرح قفس سے آزاد ہونے کے بعد نئی زندگی شروع ہوگی بقول طباطبائی اگر فلک سے بیضۂ فلک مراد لیں تو عالمِ ارواح میں نئی زندگی شروع ہوگی۔

۲۲۱

مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے ۱ موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے
جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو ۲ جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ ۳ صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

۱۔ ساقی کی ادائے غفلت پر مستی شراب تک ہلاک ہے۔ شراب اس کی غفلت کے ذوق میں ایسی بے خود ہوتی ہے کہ موجِ شراب چشمِ ساغر کی مژۂ خواب آلود معلوم ہوتی ہے۔

بقول حسرتؔ موجِ شراب کو چشمِ ساغر کی مژہ قرار دیا اور اس کی خوابناکی کا یہ سبب بتایا کہ مستی شراب کو بھی ساقی کی ادائے تغافل نے مست و بے خود بنا رکھا ہے۔

۲۔ میرے دل میں سوائے زخمِ تیغِ ناز کے اور کوئی آرزو نہیں یہی وجہ ہے کہ جیبِ خیال تیرے ہاتھوں سے چاک ہے۔ "بھی" سے پتہ چلتا ہے کہ گریبان پہلے سے چاک تھا۔

طباطبائی:۔ جیبِ خیال سے دل مراد ہے اور جب دل میں زخمِ تیغِ ناز ہوا تو جیبِ خیال چاک ہوئی۔ پھر اس میں آرزو کیونکر رہ سکے۔

۳۔ جوشِ جنوں نے وسعتِ نظر کو بڑھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہر چیز بے حقیقت معلوم ہوتی ہے یہاں تک کہ صحرا باوجود اپنی پہنائی کے ہماری نظروں میں ایک مشتِ خاک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ (آسی، سعید)

طباطبائی و بیخود:۔ صحرا کو دیکھ کر ایسا جوشِ جنوں پیدا ہوا ہے کہ اب سوجھتا نہیں۔ گویا صحرا میری آنکھوں کے لئے مٹھی بھر خاک تھی اور جس آنکھ میں خاک جھونک دی جائے اُسے کیا سوجھے گا۔

۲۲۲

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی ۱ قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

۱۔ لبِ عیسیٰ میں یہ تاثیر تھی کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ کہتے ہیں کشتہ لبِ لعلِ بتاں پر عیسےٰ کا یہ جادو نہیں چلتا، بلکہ لبِ عیسےٰ کی جنبش ان کشتگان کے حق میں لوری کا کام دیتی ہے۔ جس طرح کوئی بچے کو سلانے کے لئے پنگھوڑے کو جنبش دیتا ہے اور اس جنبش سے نینداور زیادہ گہری ہوجاتی ہے یہاں یہی حال جنبش لبِ عیسےٰ کا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کشتگانِ لبِ لعلیں کی نیند قیامت کی گہری نیند نہیں ہے بلکہ لبِ عیسیٰ کی جنبش سے وہ اور بھی زیادہ گہری ہوجاتی ہے۔

۲۲۳

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے ۱ نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے
بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا ۲ شیشہ میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

۱۔ نقشِ پا کی صورت کان سے اور جادہ کی انگلی سے مشابہت ہے، کہتے ہیں طوفانِ آب کی آواز آرہی ہے۔ اسے سُن کر نقشِ پا نے اپنے کان میں جادہ کی انگلی رکھ لی ہے تاکہ طوفانِ آب کی آواز سے وہ خوف زدہ نہ ہو۔ خوف پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ طوفان آئے گا تو نقش مٹ جائے گا۔

طباطبائی نے اس شعر کو بے معنی لکھا ہے۔

۲۔ بادہ کو نبضِ پری سے مشابہت دی ہے، پھر اس کی وحشت کو ظاہر کیا ہے۔ کہتے ہیں کس کی چشمِ مست نے بزمِ مے کو وحشت کدہ بنا دیا ہے کہ وحشت کے مارے شیشے میں بصورتِ موجِ بادہ گویا نبضِ پری پنہاں ہے (موجِ بادہ سے یعنی بصورتِ موجِ بادہ)

۲۲۴

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

تمنا کرنے سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ تمنا پوری ہو بلکہ میں تمنا کی طلسم کاری کا تماشائی ہوں۔ گویا یہ دیکھتا ہوں کہ تمنا کیسے کیسے رنگ اور تماشے دکھاتی ہے۔

۲۲۵

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر میری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

قسمت سے قسمت نامہ مراد ہے اور فرض یہ کیا ہے کہ خطِ تقدیر کے سب حروف تصویروں کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ زمانہ قدیم میں جب فنِ تحریر ایجاد نہ ہوا تھا تو اظہار مطلب تصویریں کھینچ

کر کیا جاتا تھا۔ میرے قسمت نامہ میں شب ہائے فراق کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے جیسے لکھتے وقت کاغذ پر سیاہی گر جائے اور وہ کاغذ بالکل سیاہ ہوجائے۔

۲۲۶

ہجومِ نالہ حیرتِ عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے ۱ خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
تکلف برطرف ہے جانستاں تر، لطفِ بدخویاں ۲ نگاہِ بے حجاب ناز تیغ تیز عریاں ہے
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی ۳ کہ صبحِ عید مجھ کو بدتراز چاکِ گریباں ہے
دل ودیں نقد لاساقی سے گر سودا کیا چاہے ۴ کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے
غم آغوشِ بلامیں پرورش دیتا ہے عاشق کو ۵ چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

۱۔حسرت:۔ حیرت عاجز، یعنی عاجز حیرت ہجوم نالہ اس بات سے عاجز ہے کہ حیرت کی وجہ سے آہ وفغاں ناممکن ہے۔ چنانچہ خموشی جولازمِ حیرت ہے، اس عجز کا اظہار کررہی ہے خس بدندان ہونے سے اظہارِ عجز مراد ہے اور ریشۂ نیستاں اس لحاظ سے آیا ہے کہ نیستاں کی بھی بعینہٖ یہی حالت ہوتی ہے کہ باوجود یکہ اس سے بانسلیاں بن سکتی ہیں اور اس لئے اس کو لاکھوں نالہائے ناکشیدہ کا مجمع کہہ سکتے ہیں اور خموشی نیستان خس بدنداں نظر آتی ہے (سعید)

طباطبائی:۔میدانِ جنگ میں جب کوئی گروہ مغلوب ہوجاتا ہے تو اظہار عجز کرنے کے لئے گھاس پھونس وغیرہ منہ میں دبا کر دکھاتے ہیں کہ لڑائی موقوف کرو یہاں ہجوم نالہ نے لشکر کشی کی ہے اور حیرت ایک نالہ کرنے میں بھی عاجز ہے اور اسی عجز کا اظہار کرنے کے لئے غم خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے۔

لیکن خس بدنداں ہونے کیلئے ریشۂ نیستاں کی کیا تخصیص ہے۔ یہ کہ وہ نالہ وفریاد کی جڑ ہے۔ یہ کہ ریشے سے نے پیدا ہوئی ہے اور نے سے نالہ اور حالتِ ضبط میں نالے چھپے ہوئے ہیں۔ جس طرح ریشۂ نیستاں میں پنہاں ہورہے ہیں۔ حرف ندا محذوف ہے یعنی اے ہجومِ نالہ مراد ہے۔ فقط ہجوم نالہ کو مخاطب کر کے مصنف نے ریشۂ صد نیستاں کہنے کا باعث بنادیا (آسی، بیخود)

مولوی ابوالکمال امید:۔اے ہجومِ نالہ میں حیرت کی وجہ سے نالہ کشی سے مجبور ہوں۔ میری خموشی سے خفا نہ ہو بلکہ اس کو ریشۂ نیستاں سمجھ کہ اس سے میرے عجز کا اظہار ہوتا ہے اور یہ بھی ثبوت

ملتا ہے کہ میں سراسر نالہ ہوں ایک جگہ ریشہ نے کو اسی طرح اور بھی باندھ چکے ہیں ۔
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو لیا دانتوں میں جو تنکا بنا ریشہ نیستاں کا

بیخود:۔باوجود ہجومِ نالہ کے حیرت نے عرض فغاں سے عاجز کردیا ہے ۔گویا خموشی نے نیستاں کو جس میں سینکڑوں بانسریاں موجود ہیں خس بدنداں کر رکھا ہے، مطلب یہ ہے کہ باوجود قوت گویائی کے رازداری کے لحاظ نے لب سی دئے ہیں ۔

۲۔بدخویاں جمع بدخو کی یعنی معشوق۔ جانستاں تر:۔زیادہ قاتل۔
تکلف برطرف بدخو معشوقوں کا لطف وکرم اور بھی زیادہ قاتل اور ہلاک کن ہے کیونکہ نگاہِ ناز تیغ ہے، اس لئے نگاہِ ناز بے حجاب کو جانستان تر کہا ہے۔

۳۔ کثرتِ غم سے خوشی کی کیفیت اس قدر خراب ہوگئی ہے کہ صبحِ عید جو ہر کس وناکس کے لئے بے انتہا خوشی کا باعث ہوتی ہے مجھ کو چاک گریبان سے بھی بدتر معلوم ہوتی ہے۔ گریبان کا چاک ہونا انتہائی رنج وغم کی علامت ہے ۔

۴۔متاعِ دست گرداں بمعنی وہ چیز جو نقد قیمت پر بکے۔ اس شعر کے متعلق طباطبائی لکھتے ہی کہ ساغر کو متاعِ دست گرداں کہنا ایسا لطف رکھتا ہے کہ دل ودین نیازِ مصنف کرنا چاہئے ۔

اگر تو ساقی سے سودا کرنا چاہتا ہے اور شراب خریدنے کا آرزومند ہے تو نقدِ دل ودین اس کے حوالے کر اور شراب خرید لے۔ یہاں ادھار سے کام نہیں چلتا۔ یاد رہے متاع ساغر وہ جنس ہے جو ہمیشہ نقد قیمت پر بکتی ہے۔ بقولِ سعید اپنے دین وملت کو خیر باد کہہ۔ ماسوا سے دل ہٹا۔ پھر اس کی خواہش کر ۔

۵۔ آغوشِ بلا:۔ مصیبتوں کی گود۔ قلزم:۔ سمندر۔ صرصر:۔ہوائے تندوتیز۔ مرجان:۔ مونگا۔
مرجان سمندر میں پرورش پاتا ہے اور اس کا رنگ سُرخ ہوتا ہے اس لئے چراغ کو مرجان سے مشابہ کیا ہے۔ غمِ عشق عاشق کو آغوشِ بلا میں پالتا ہے۔ گویا اس کی تمام زندگی مصائب وآلام میں بسر ہوتی ہے۔ اپنے آپکو عاشق سمجھ کر کہتا ہے کہ ہمارا چراغ طوفانِ صرصر میں اسی طرح روشن رہتا ہے جیسے مرجان کا چراغ طوفانِ سمندر میں ہوائے تیز وتند میں چراغ بجھ جاتا ہے لیکن عاشق مصائب کا عادی ہوتا ہے اس لئے اس کا چراغ باوجود طوفانِ باد کے روشن رہتا ہے۔ اس کی مثال یہ دی ہے کہ

مرجان سمندر کے طوفان کا عادی ہے۔ اس لئے باوجود طوفانوں کے وہ پرورش پاتا ہے۔

۲۲۷

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے ۱ نگاہ دل سے ترے سُرمہ سا نکلتی ہے
فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم ۲ صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ ۳ کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

۱۔ تماشا ادا:۔ تماشا دکھانے والی۔ تماشا ادا نگاہ کی صفت ہے سُرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔ اسی سے فائدہ اُٹھا کر مصنف نے سُرمہ اور خاموشی کو ایک چیز بتلایا ہے۔ کہتے ہیں خاموشی کی وجہ سے تیری نگاہ جو انداز تماشا دکھانے والی ہے، تیرے دل سے سُرمہ آلود ہوکر نکلتی ہے (حسرت، سعید)

طباطبائی :۔ خاموشی میں تیری نگاہ تیرے دل ہی سے سُرمہ آلود ہوکر نکلتی ہے یعنی تیری خاموشی ہی نگاہ کو سُرمہ آلود کر دیتی ہے یعنی بہ سبب ملائمت کے خاموشی اور سُرمہ ایک ہی چیز ہے۔

آسی:۔ نگاہ تماشا ادائے معشوق میں اور کوئی سُرمہ نہیں لگاتی بلکہ وہ اس کے دل ہی سے سُرمہ سا ہوکر نکلتی ہے اور خموشی ہی اس کو زینت دیتی ہے۔ یعنی اس میں سُرمہ لگاتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جب تو خاموشی کی حالت میں تماشائے بزم کرتا ہے تو تیری نگاہ پیاری اور سُرمہ سا معلوم ہوتی ہے۔

بیخود:۔ سُرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ تیری خاموشیوں میں بھی ایک ادائے اظہار پائی جاتی ہے۔ گویا تیرے دل کے ارادے سے جو نگاہ نکلتی ہے، وہ سرمہ سا نکلتی ہے یعنی آواز بے صوت ہوتی ہے۔

۲۔ فشار بمعنی بھینچنا۔ جب کبھی صبا غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے تو غنچہ اس کو اکیلا پاکر اپنی آغوش میں خوب بھینچتا ہے۔ صبا شرم سے پانی پانی ہوجاتی ہے۔ یہی عرق شرم شبنم ہے گویا شبنم اس طرح سے بنتی ہے۔ (آسی، طباطبائی، بیخود)

سعید و حسرت لکھتے ہیں کہ غنچے کو تنگیٔ خلوت کے فشار سے جو پسینہ آ جاتا ہے، وہی شبنم ہے۔

۳۔ معشوق کی تیغ نگاہ کی آبداری اور تیزی کی کیفیت سینۂ عاشق سے نہ پوچھو کہ وہ کیسی ہے بلکہ روزنِ در کے زخم کو دیکھو وہ اتنے بڑے ہیں کہ ان میں سے ہوا نکلتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ نظر جس نے دروازے کے کواڑوں میں اتنے بڑے بڑے سوراخ ڈال دیئے کہ ان میں سے ہوا نکلتی ہے۔ اگر سینۂ عاشق پر وار کرے گی تو ظاہر ہے کہ اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ جس زخم سے ہوا نکلے وہ مہلک ہوتا ہے اس لئے سینۂ عاشق کے زخم جوان کی نگاہ نے ڈالے ہیں سخت مہلک ہیں اور زخمِ روزنِ در سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معشوق دروازہ میں سے جھانکتا ہے اور اس کے دروازے میں جو سوراخ ہیں، وہ اس کی تیغ نگاہ کے زخم ہیں۔

۲۲۸

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے ۱ نافہ دماغ آہوئے دشتِ تتار ہے
کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا ۲ آئینہ فرشِ ششِ جہتِ انتظار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جائے غبارِ شوق ۳ گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے
دل مدعی و دیدہ بنا مدّعا علیہ ۴ نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب ۵ اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے
پچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے ۶ وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر ۷ ہر ذرّے کے نقاب میں دل بیقرار ہے
اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں ۸ طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی ۹ اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے
غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

۱۔ شانہ بمعنی کنگھی۔ جس جگہ نسیم زلفِ یار میں شانہ کرتی ہے۔ یعنی زلفوں کو سنوارتی ہے، وہاں زلفِ یار کی خوشبو اس قدر پھیلتی ہے کہ تمام فضا کو معطّر کر دیتی ہے اور یہ خوشبو آہوئے دشتِ تتار کے دماغ میں اس قدر بس جاتی ہے کہ اس کا دماغ بھی نافہ بن جاتا ہے۔ گویا نافہ میں تو خوشبو ہوتی ہی ہے، آہوئے تتار کے دماغ میں بھی اس قدر خوشبوئے زلفِ مشکیں جاتی ہے کہ وہ بھی نافہ کی طرح

خوشبو دینے لگتا ہے۔

۲۔حیرت کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے، کہتے ہیں اے خدا حیرت کس کے جلوے کا سراغ لگانا چاہتی ہے کہ اس کے انتظار میں حیرت نے ہر طرف آئینہ کا فرش بچھا دیا ہے یعنی ہر طرف آئینے ہی آئینے لگادیئے ہیں اس میں نکتہ یہ ہے کہ سراغ رساں لوگ گمشدہ چیز کا عکس دیکھنے کے لئے ہر طرف بڑے بڑے آئینے لگادیتے ہیں۔تاکہ مدّعا جہاں کہیں ہو نظر آجائے۔

۳۔تنگیِ جا کی وجہ سے میرا شوق پس گیا۔پس کر ذرّہ ذرّہ ہو کر غبار بن گیا۔غبار بن کر فضا میں پھیل گیا اور اُس نے دام کی صورت اختیار کرلی۔ کہتے ہیں اگر میرا یہی دام ہے تو سمجھ لو کہ تمام وسعتِ صحرا کو یہ دام شکار کرلے گا۔مطلب یہ ہے کہ میرا غبارِ شوق تمام صحرا پر چھاجائے گا۔

۴۔روبکاری یعنی پیشی تاریخ۔ دل مدّعی بنا ہے اور اُس نے آنکھ پر دعویٰ کیا ہے،گویا آنکھ مدعا علیہ ہے دعویٰ یہ ہے کہ آنکھ نے نظارہ کیا اور دل کا خون ہوگیا۔اس لئے دل کے نقصان کی تلافی کی جائے آج اس نظارہ کے مقدمہ کی پھر پیشی ہے ۔

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا   آج پھر اُس کی روبکاری ہے

۵۔آب چھڑکنا:۔ایران میں ایک رسم ہے جب کوئی سفر کو جاتا ہے تو آئینہ پر پانی چھڑکتے ہیں۔تاکہ مسافر بخیریت واپس آجائے اور اُسے راستہ میں کوئی تکلیف نہ ہو۔

بلبل کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ شبنم آئینۂ برگ گل پر پانی چھڑک رہی ہے،گویا وہ بہار کو رخصت کررہی ہے کہ خیریت سے جائے اور خیریت سے واپس آئے (طباطبائی و بیخودؔ)

سعیدؔ نے ایک اور بات پیدا کی ہے،لکھتے ہیں جغرافیۂ طبعی کا یہ اصول ہے کہ اوس ہمیشہ اس روز پڑتی ہے جس روز ابر نہ ہو۔اس لئے اوس کا پڑنا یعنی مطلع کا صاف رہنا رخصت برسات یعنی موسم بہار کی علامت ہوئی۔

۶۔ہمیں اس بات کی پچ آپڑی ہے یعنی ہمیں اس بات کا نباہنا ضرور ہے معشوق نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے اس کے وعدہ کی پچ آپڑی ہے تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ معشوق کے وعدہ انتظار نہ کیا اس لیے وہ آئیں یا نہ آئیں، میں اُن کا انتظار ضرور کروں گا۔ بقول بیخودؔ یہ شعر بیت الغزل ہے۔

۷۔دھوپ کی چمک سے ذرّے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں یہی چمکنا ذرّہ کا تڑپنا ہے اور دل بیقرار سے مشابہ کرنے کا موجب۔

لیلیٰ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ وادی مجنوں میں سے بے پردہ مت گزر کیونکہ وہاں کا ہر ذرّہ ذرّہ نہیں بلکہ وہ دلِ بیقرار ہے جو ذرّہ کے پردے میں بیتابی مجنوں کا آئینہ دار ہے۔وادیِ مجنوں میں جانے سے روکنے کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ مجنوں کے دل کی بے تابی لیلے کے دل پر اثر انداز نہ ہو۔

۸۔ یک کفِ خس یعنی مٹھی بھر تنکے " فرماتے ہیں۔اے عندلیب اپنے آشیانہ کے لئے جو بھی چار تنکے جمع کرنے ہیں کرلے۔فصل بہار کی آمد آمد کا غلغلہ مچ رہا ہے، جب طوفان بہار آگیا ہے تو پھر تنکا بھی نہ مل سکے گا کیونکہ اثر بہار سے خشک تنکے سبز ہوجائیں گے۔

۹۔اے بے دماغ اپنے دل کو اس لئے ضائع نہ کر کہ وہ جلوۂ معرفت نہیں دکھاتا۔اگر وہ آئینہ معرفت نہیں نہ سہی آئینۂ تصویر تو ہے جب وہ آئینۂ تصویر ہوا تو یقیناً اس میں تصاویر نظر آجائیں گی اور سیر ہوگی۔آئینۂ تمثال دار سے مطلب یہ ہے کہ اس میں معشوق کا عکس نظر آتا ہے اور معشوق کا عکس نظر آنا معرفت کے خلاف ہے۔ اصل میں دل کعبہ ہے، اس لئے اس میں سے بتوں کو نکالنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ بے دماغ اپنے دل کو برباد کرنا چاہتا ہے،لیکن شاعر اسے روکتا ہے کہ اگر دل کعبہ نہ بن سکا تو بت خانہ سہی، کیونکہ اس میں بھی ایک قسم کی کیفیت ہے۔

۱۰۔ کفیل یعنی ضامن۔ شاعر کا عقیدہ ہے کہ جو شخص غفلت اور بے خبری میں عمر بسر کرے اور موت کو بھولا رہے اسے ناگہانی موت آجاتی ہے کہتے ہیں ہماری حالت یہ ہے کہ غفلت نے ہماری عمر کا ٹھیکہ لیا ہے اور ہم نشاط و مسرت کے ضامن بن گئے ہیں یعنی ہمیشہ غافل ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ عیش و آرام سے گزرے گی، اس لئے اے مرگِ ناگہاں جب تیرے آنے کے اسباب موجود ہیں تو پھر تجھے کس بات کا انتظار ہے۔آجا!

بقول آسیؔ حاصل اس شعر کا نہایت اچھا ہے یعنی انسان اسی فکر میں رہتا ہے کہ ہمیشہ عیش و عشرت سے بسر ہوگی اور اسی میں اس کی غفلت بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ موت آجاتی ہے۔

۲۲۹

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے ۱ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں ۲ گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا ۳ افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے
سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے ۴ وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں ۵ شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے
درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو ۶ صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے
غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے!
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

۱۔ میں ایسا حسین کہاں سے لاؤں جسے لوگ تجھ سا کہیں اور تو بھی قائل ہو جائے کہ واقعی یہ مجھ جیسا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ میں تیرے سامنے آئینہ پیش کردوں کہ تجھ سا حسین مہیا ہو جائے اور تو اس کو دیکھ کر حیران رہ جائے اور تیرا حیران ہونا لوگوں کا تماشہ ہو جائے۔
بجز اس طریق کے غیر ممکن ہے کہ تجھ جیسا معشوق میں تجھ کو دکھا کر تجھے قائل کرسکوں۔
۲۔ تیری بزمِ خیال سے مراد میرا دل ہے۔ سویدا:۔ وہ سیاہ داغ جو دل میں ہوتا ہے۔
حسرت نے تیری بزمِ خیال یعنی میرے دل میں تیری رنگین نگاہوں کا ایک گلدستہ رکھا ہے جسے سب لوگ سویدا کے نام سے پکارتے ہیں ظاہر ہے کہ گلدستہ بزم کے لئے باعثِ زینت ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں جو خالِ سویدا ہے، وہ تیری حسرت بھری نگاہوں کا گلدستہ ہے۔ اپنے دل کو معشوق کی بزمِ خیال اس لئے کہا ہے کہ اس میں معشوق کا خیال جلوہ گر رہتا ہے۔
۳۔ اے خدا گوشِ محبت میں افسونِ انتظار جسے لوگ تمنا کہتے ہیں کس نے پھونکا ہے۔
تمنائے معشوق کو افسونِ انتظار کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبت پیدا ہوتے ہی تمنائے معشوق کیسے پیدا ہوگئی۔
۴۔ غریبی یعنی بے وطنی۔ غم بے وطنی نے میرا ایسا حال بنادیا ہے کہ جی چاہتا ہے اپنے سر پر ایک مٹھی بھر خاک ڈالوں۔ لیکن وہ مشتِ خاک ایسی ہو کہ لوگ یہ کہیں اس نے ایک صحرا کی خاک

اپنے سر پر ڈالی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غربت میں جی بھر کے خاک اُڑانی چاہئے (آسی۔ بیخود)
سعیدؔ لکھتے ہیں کہ کثرتِ دردِ غریبی سے تنگ آ کر صحرا نوردی اختیار کیجئے۔ غریبی میں ایہام ہے۔
طباطبائیؔ:۔ اشارہ یہ ہے کہ یہ شخص آوارۂ دشت و صحرا ہونے کا ارادہ کررہا ہے اور دردِ بے وطنی درپے ہے اور خاک اُڑانے پر نہایت آمادہ ہے کہ صحرا کو ایک مشت خاک سمجھتا ہے۔
۵۔ عنانِ گسیختہ:۔ جس کی باگ ٹوٹ گئی ہو یعنی شوق بے اختیار۔ حسرتِ دیدار کی وجہ سے میری چشمِ تر میں وہ جوش اشک پوشیدہ ہے کہ جس کو دریا کہہ سکتے ہیں۔
آسیؔ:۔ میری چشمِ تر میں حسرتِ دیدار نے شوق کو پنہاں کردیا ہے اور وہ شوق نکلنے کے لئے بیتاب ہے اور بصورت دریا آنکھ سے نکل رہا ہے۔ یعنی حسرتِ دیدار کے شوق میں رو رہا ہوں۔
۶۔ پنبہ:۔ رُوئی۔ سفیدئ پنبہ کو سپیدئ صبح سے تشبیہ دی ہے۔
صبح بہار سے باغوں میں پھول کھلتے ہیں لیکن عیش و نشاط کے پھول صبح بہار سے نہیں کھلتے گلہائے عیش کے کھلنے کے لئے وہ بہار درکار ہے جس کو صبح بہار پنبہ مینا کہا جاتا ہے۔ کہ پنبہ مینا کا شیشۂ شراب میں سے نکلنا وہ صبح عیش پیدا کرتا ہے جس سے بادہ خواروں کے بستہ دل شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ اس شعر میں پنبۂ مینا کی سفیدی کو وجہ شبہ قرار دیا ہے۔
۷۔ غالبؔ! اگر مجھے واعظ برا کہتا ہے تو برا نہ مان۔ بھلا دنیا میں ایسا بھی کوئی ہے جسے سب اچھا کہیں۔ مطلب یہ ہے اگر ایک واعظ تجھے برا کہتا ہے تو کیا ہوا سب رند تو تجھے اچھا جانتے ہیں۔

۲۳۰

شبنم بہ گل و لالہ نہ خالی ز ادا ہے ۱ داغِ دلِ بے درد نظر گاہِ حیا ہے!
دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار ۲ آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے
شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی ۳ جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد شوق ۴ آئینہ باندازِ گلِ آغوش کشا ہے
قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ ۵ اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے!
خوئے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو ۶ معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

مجبوری و دعوئے گرفتاری اُلفت ۷ دستِ تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ ۸ تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے!
اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی ۹ سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۱۰ یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ ۱۱ کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

۱۔نہ خالی زادا:۔ ادا سے خالی نہیں، یعنی کچھ مطلب رکھتی ہیں۔گل لالہ پر جو شبنم کے قطرات پڑے ہیں وہ مطلب سے خالی نہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ جس دل میں درد نہ ہو مگر داغ ہو، وہ باعثِ ننگ و عار ہے۔ظاہر ہے کہ لالہ کے دل میں داغ تو ہے مگر درد (عشق) نہیں چونکہ یہ بات اس کے لئے باعثِ شرم ہے اس لئے اس شرم سے اسے عرقِ شرم آ گیا اور عرقِ شرم یہی قطراتِ شبنم ہیں، بقول حسرتؔ مذہب عشق میں داغِ بیدرد کا موجب شرم ہونا مسلّم ہے۔

۲۔سعیدؔ(۱) ہمارا دل کشمکشِ حسرتِ دیدار سے خون ہوکر اس بُتِ بدستِ حنا کے ہاتھ کا شیشہ بن گیا (۲) معشوق کے ہاتھ میں آئینۂ حنا بندھا ہوا ہے کہ کسی وقت چھوٹا ہی نہیں اور ادھر حسرتِ دیدار کی کش مکش سے ہمارا دل خون ہورہا ہے اس لئے کہ اس کے چہرے کو دیکھیں تو کس طرح دیکھیں۔یہ آئینہ بیچ میں حائل ہے۔

طباطبائیؔ:۔ آئینہ دل مہندی بن گیا ہے یعنی حسرتِ دیدار نے اسے پیس ڈالا اور اس کے جگر کو لہو کر دیا۔دل کو آئینہ بنا کر پھر اسے حنا بنا دیا بہت ہی تصنع ہے۔

حسرتؔ:۔(۱) دل اور آئینہ کہ رسائیِ قسمت کا مقابلہ کرتا ہے۔ایک ہمارا دل ہے جو خون شدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار ہے اور ایک آئینہ ہے جو اس بتِ بدستِ حنا کے ہاتھ میں ہے (۲) وہی جو سعیدؔ نے لکھے ہیں۔

آسیؔ:۔میرا دل حیران جو آئینہ اس لئے بنا تھا کہ معشوق اسے دیکھے اور اس صورت سے وہ معشوق کا نظارہ کرے وہ حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا، مگر اس تک نہ پہنچا اور کم بخت حنا اس کے ہاتھ کی آئینہ بنی ہوئی ہے۔

(۲) میرا دل جو حسرت دیدار میں خون ہوگیا تھا وہ صورتِ آئینہ حنا بن کر اس کے دستِ

نازک میں پہنچا ہے۔

۳۔شعلۂ عشق مجھے اس قدر نہ جلاتا جس قدر شعلہ نے جلایا ہے۔گویا افسردگی دل پر جی اس قدر جلا ہے کہ اتنا شعلہ سے نہ جلتا۔ جی جلنا سے مراد دل کڑھنا ہے ظاہر ہے دل اس بات سے جلا ہے کہ اس میں شعلہ پیدا نہ ہوا اور شعلہ کا نہ پیدا ہونا ناکامیِ عشق کی نشانی ہے گویا دل ناکامیِ عشق سے اتنا جلا ہے جتنا شعلہ عشق سے نہ جلتا۔

۴۔تمثال:۔تصویر، عکس۔ترے عکس میں وہ شوخی ہے کہ آئینہ نے کمال شوق سے پھول کی طرح اپنی گود کھول دی ہے، تاکہ تیرے عکس کو اپنی آغوش میں لے لے۔

بیخودؔ:۔تیری تصویر میں بھی ایسی شوخی کوٹ کوٹ کر بھردی گئی ہے کہ اس پر جو آئینہ لگایا گیا ہے، وہ پھول کی طرح شوقِ ہم آغوشی میں آغوش کشا ہوگیا ہے۔

۵۔حالیؔ:۔اگر ''اے'' کے بدلے ''جز'' پڑھا جائے تو شعر کا مطلب صاف ہوجاتا ہے۔یہ معنی ان کو مرزا صاحب نے خود بتائے تھے۔

کہتے ہیں سوائے نالے کے جگر سوختہ (عشق) کا کوئی نشان نہیں۔ چنانچہ قمری اور بلبل کے عشق ہونے کا نشان بھی صرف ان کی نالہ کشی سے ملتا ہے، ورنہ قمری ایک کفِ خاکستر ہے اپنے خاکی رنگ کی وجہ سے اور قفس رنگ ہے، اپنے رنگین پروں کی بدولت گویا ان کی ہستی کفِ خاکستر اور قفس رنگ سے زیادہ نہیں (تمام متفق)

آسیؔ:۔نالہ کو مخاطب کرکے پوچھتا ہے کہ قمری سرو کی عاشق ہے اور وہ غمِ اُلفت میں جل کر خاک کی صورت ہوگئی ہے اور اس صورت میں اس کا پتہ ملتا ہے۔بلبل عشق گل میں مقید ہوکر ایسی فنا ہوئی ہے کہ بس قفسِ رنگ ہی رہ گئی ہے یعنی صرف رنگ ہے۔ باقی اس میں دل و جان نہیں ہے اور یہ رنگ بھی اس اثر سے ہے کہ وہ گل کی عاشق ہے اور اس کا رنگ اس کے رگ و پے میں سرایت کرچکا ہے۔بلبل کا اس سے نشان ملتا ہے مگر اے نالہ میرے جگر سوختہ کا کیا نشان ہے۔ میں اگر اس کو ڈھونڈوں تو کس صورت سے ڈھنڈوں او رکیونکر پاؤں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا جلا ہے کہ اس کا کسی صورت اور کسی رنگ سے سراغ نہیں ملتا۔

۶۔تو معشوق ہے لیکن بے حوصلہ۔ معشوقیت کا اقتضا یہ تھا کہ تو وحشتِ دل پسند کرتا۔ تیری

اس بے حوصلگی کی عادت نے میری وحشتِ دل ٹھنڈی کردی اگر تو باحوصلہ ہوتا تو پھر عشق کا مزا آتا۔ معشوق ہوکر بے حوصلہ ہونا اور عشق کی وحشت کی تاب نہ لانا یعنی ناز وانداز اور جور وجفانہ کرنا میرے واسطے سخت مصیبت ہے۔ کیونکہ آتشِ عشق اس سے ٹھنڈی ہوئی جاتی ہے۔

۷۔ مجبوری کی حالت میں محبّت کا دعویٰ ایسا ہی ہے جیسے کسی کا ہاتھ بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہو اور نکل نہ سکتا ہو لیکن دکھانے کے لئے وہ شخص لوگوں سے یہ کہے کہ ہم پیانِ محبّت کو نباہ رہے ہیں۔ خوبیِ شعر میں یہ ہے کہ عہد کرتے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں یہاں ہاتھ پر پتھر ہے۔

۸۔ تیری تیغِ ستم دیکھ کر شہیدانِ گزشتہ کا حال معلوم ہوتا ہے گویا تیری تیغ تیغ نہیں ہے بلکہ ایک آئینۂ تصویر نما ہے جس میں تیری تیغ کے گزشتہ جور وستم کی تصویر نظر آتی ہے۔

بیخودؔ و طباطبائی:۔ تیرے ستم کا اندازہ دیکھ کر ستم رسیدوں پر جو گزری ہوگی۔ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

سعید:۔ جو ظلم وہ آج کررہی ہے وہی شہیدانِ سابق کو جھیلنے پڑے ہوں گے۔

۹۔ حالیؔ:۔ یہ خطاب ہے آفتابِ حقیقت کی طرف کہتا ہے کہ جیسے سایہ متّہم بوجود ہے اور فی الواقع اس کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح ہم بھی اس کے دھوکے میں پڑے ہیں۔ اگر آفتابِ حقیقت کی کوئی تجلی ہم پہ لمعہ فگن ہوجائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنا فی شمس ہوجائیں کیونکہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کا فور ہوا۔

طباطبائیؔ و آسیؔ:۔ یعنی ادھر بھی کرم کراور دقت پڑنے کا محاورہ جس محل پر مصنف نے صرف کیا ہے، اس کی خوبی بیان نہیں ہوسکتی۔

۱۰۔ حالیؔ:۔ یعنی گناہ جو ہم نے کئے ہیں اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کرسکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی ان کی بھی داد ملنی چاہئے۔ شعر کی خوبی بیان سے باہر ہے۔ بقول طباطبائیؔ میرتقی کو بھی حسرت ہوتی ہوگی کہ یہ مضمون مرزا نوشہ کیلئے بچ رہا۔

۱۱۔ اے غالبؔ! خلق کی بیگانگی سے بیدل نہ ہو، میری جان اگر تیرا کوئی ہمدرد مددگار نہیں ہے تو نہ سہی خدا تو ہے۔

۲۳۱

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی ۱ قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں ۲ پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی
واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو ۳ کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج ۴ اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا ۵ گویا ابھی سُنی نہیں آواز صُور کی!
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں ۶ کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب ۷ آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر ۸ کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

۱۔ تجلّی:۔ جلوہ۔ نور:۔ نورِ خدا۔

تجلّی کو اپنا نور دکھانے کے لئے تیرے قد ورخ کا انتظار تھا کہ ایسی پیاری شکل ملے تو میں اس میں ظہور کروں چنانچہ تیرے قد ورخ کی بدولت ظہور کی قسمت کھلی کہ اب وہ ظاہر ہوگئی۔

آسیؔ نے ”قسمت کھلی تیرے قد ورخ کے ظہور کی“ لکھا ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تجلّی کو اپنا اظہار مقصود تھا۔ چنانچہ وہ تیرے قد ورخ میں ظاہر ہوئی اور اس طرح سے تیری قسمت جاگی۔

۲۔ خونچکاں لباس دیکھ کر ہر شخص متوحش ہوتا ہے لیکن تیرے شہیدوں کے خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں اور وہ ایسے بھلے معلوم ہوتے ہیں کہ حوریں بھی انہیں حسرت بھری نظروں سے دیکھتی اور دل سے پسند کرتی ہیں۔ بقول حالیؔ یہ شعر حقیقت ومجاز دونوں پہلو رکھتا ہے مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے۔ طباطبائیؔ لکھتے ہیں یہ شعر بھی ایسا کہا ہے کہ کروڑوں میں ایک آدھ ایسا نکلتا ہے۔

۳۔ شرابِ طہور:۔ پاک شراب جو بہشت میں ملے گی۔ واعظ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ تمہاری شرابِ طہور کی کیا بات ہے، نہ تم خود اسکو پی سکتے ہو نہ کسی اور کو پلا سکتے ہو مگر اس کی تعریفیں اس قدر کرتے ہو، معلوم ہوتا ہے یہ تمہاری شرابِ طہور محض خیالی شراب ہے جس کی تعریفوں سے تم اپنا اور دوسروں کا دل خوش کرلیا کرتے ہو۔ جنّت کے خیالی ہونے کے متعلق پہلے لکھ چکے ہیں ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن   دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

۴۔عقیدہ یہ ہے کہ قیامت کے دن جب صور پھونکا جائے گا تو تمام مُردے زندہ ہو جائیں گے کہتے ہیں میرا قاتل اس قدر غافل اور بے خبر ہے کہ صورِ قیامت پھونک دیا گیا یعنی مُردوں کو اُٹھنے کا حکم ہو گیا لیکن اُسے مطلق خبر نہیں۔ صور کی آواز سے میں جو اُٹھا ہوں تو وہ مجھ سے لڑتا ہے کہ تو کیوں اُٹھا۔ اس شعر میں معشوق کی غفلت شعاری کے علاوہ دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ مجھ سے اس بات پر لڑتا ہے کہ تُو میرا کشتہ ہے تجھے میرے حکم سے اُٹھنا چاہئے تھا تو شور سن کر کیوں اُٹھا۔

۵۔طیور:۔ جمع طائر کی، پرندے۔

بلبل نغمہ سنج ہے۔ اس کی نغمہ سنجی سے معلوم ہوتا ہے کہ بہار آنے والی ہے۔ چونکہ یہ خبر طیور کی زبانی ہے اور ہم نے اُڑتے اُڑتے سُنی ہے اس لیے خدا جانے یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ بقول طباطبائی یہ تشبیہ نہایت بدیع ہے اور انصاف یہ ہے کہ نئی ہے۔

۶۔واں سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ زمانۂ قدیم میں خانۂ کعبہ بُت خانہ تھا۔ رسولِ مقبول نے بتوں کو توڑ کر اس کو خانۂ خدا بنایا۔ کہتے ہیں اے شخص! تُو میری بُت پرستی پر غضبناک نہ ہو۔ تجھ کو اس بات پر غصہ آتا ہے کہ تو خانہ کعبہ کا احترام کرتا ہے اور میں بتوں کو پوجتا ہوں۔ یاد رہے میرے مسلک اور تیرے مذہب میں کچھ زیادہ فرق نہیں کیونکہ زمانۂ قدیم میں خانۂ کعبہ بُت خانہ تھا اگر یہ اب وہاں سے نکال دیے گئے تو کیا ہوا، آخر ان کو خانۂ کعبہ سے دُور کی نسبت تو ہے۔

۷۔یہ کیا ضروری ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر صاف جواب ملا تھا کہ تُو ہم کو نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح ہر ایک کو صاف جواب ملے۔ ممکن ہے کہ ہماری درخواست منظور ہو جائے اور خداوندِ تعالیٰ ہمیں اپنا جلوہ دکھا دے اس لئے آؤ ہم بھی کوہ طور کی سیر کریں اور اپنی قسمت آزمائیں۔ مایوسی گناہ ہے۔

۸۔ کہتے ہیں کلام میں گرمی اتنی زیادہ نہیں ہونی چاہئے کہ جس سے بات کی جائے وہ گرمیِ کلام کی شکایت زبان پر لائے۔ یعنی بات سنتے ہی چیخ اُٹھے کہ گرمیِ کلام نے مار ڈالا۔

۹۔حالی:۔ اس شعر سے مرزا کی کمال شوخیِ طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اس زمانہ میں لکھی تھی جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس

کے لئے منّت مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کروں گا اور سفرِ حج کا وہ اشتیاق ادھر حج کے ثواب کی یہ بے قدری۔

۲۳۲

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے ۱ یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے!
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ۲ ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں ۳ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زاہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی ۴ پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں ۵ پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے ۶ آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر گراب بھی نہ بنے بات کہ اُن کو ۷ انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ ۸ رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے
ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے!
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

۱۔بودا یعنی کمزور میرا ناکام دل غم کھانے میں بہت کمزور ہے اس لئے اس کو ذرا سے رنج کی بھی تاب نہیں۔ مثلاً آج ہمارے پاس مئے گلرنگ تھوڑی ہے۔ بس یہی غم اس کے لئے بہت زیادہ ہے۔ حالانکہ کوئی بات نہیں زیادہ نہ سہی۔ لیکن اپنے بودے پن کی وجہ سے وہ اسے بھی زیادہ غم سمجھتا ہے۔ (بیخود)

آسی:۔ میرا دل غم کھانے میں بہت ہی کمزور ہے اگر بہت سی شراب ہوتی تو اس کو پی کر غم کے دن گزار دیتا۔ کیونکہ وہ اندوہ رُبا ہے۔ مگر چونکہ غم زیادہ ہے، شراب کم ہے۔ میرے واسطے اور بھی افزونیِ غم کا سبب ہے۔

۲۔حالی:۔ یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ میرے لئے کافی ہے۔ مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع بہ ہیچ نہ سمجھے، اس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا (بیخود، سعید)

آسیؔ:- ساقی کے پاسِ ادب سے یہ نہیں کہہ سکتا۔ الخ

طباطبائی:- شراب کی حرص کے بیان میں شعراء نے خم خالی کئے ہیں۔ مگر ہمیشہ یہ مضمون بے کیف رہا، اس شعر کو دیکھئے اس کا مضمون کیسا ہوشربا ہے کہ اس سے بڑھ کر حرصِ مے کا بیان نہیں ہوسکتا۔

۳- حالیؔ:- کہنا یہ مقصود ہے کہ جو شخص گمنامی اور کس میرسی کی حالت میں ہوتا ہے، اس کا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا۔ ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نمود کے ساتھ وابستہ ہیں "۔ اس مضمون کو ایک قیدی پرندے کی زبانی اس طرح ادا کیا ہے کہ جب میں آزاد تھا اور اپنے آشیانے میں رہتا تھا تو ہر وقت صیادؔ کمان میں تیر لگائے گھات میں رہتا تھا کہ کب میں زد پر آؤں اور وہ کب مجھے نشانہ بنادے۔ کبھی مجھے گرفتار کرنے کے لئے جال بچھاتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض ہر وقت بے چینی اور بے قراری دل کو پژمردہ اور متفکر رکھتی تھی، گرفتار ہوکر قفس میں آنے کے بعد یہ سب تفکرات دُور ہوگئے اور میں آرام سے سوگیا۔ تسکینِ خاطر کا خوب پہلو نکالا ہے۔

۴- میں ایسے زہد کو بھی نہیں مانتا جس میں ریا بالکل نہ ہو۔ کیونکہ اس میں بھی جزا کا خیال بہت زیادہ ہوتا ہے یعنی جو شخص سچے دل سے ریاضت کرتا ہے اس کو یہی خیال ہوتا ہے کہ اس زہد و تقویٰ کے بدلے اگلے جہان میں اسے عیش و آرام ملے گا یہی جزا کا خیال ہے جو زُہد کو میری نظروں میں بے وقعت بنادیتا ہے۔ مطلب یہ ہے زہد و تقویٰ بغیر جزا کے خیال کے ہونا چاہئے۔

۵- اہلِ خرد عامیانہ رسموں کے بہت زیادہ پابند ہیں، کیا اسی کا نام روشِ خاص ہے، جس پر وہ نازاں ہیں۔ انہیں ناز اس وقت زیبا تھا، جب وہ عامیانہ رسموں کے پابند نہ ہونے اور کوئی روشِ خاص رکھتے۔

آسیؔ نے دوسرا مفہوم یہ نکالا ہے کہ اہلِ خرد بھی دُنیا میں بہت ہیں۔ لہٰذا ان کی روشِ خاص نہ رہی۔ رسم عام ہوگئی اور یہ کچھ قابلِ فخر نہیں ہے۔ مزا جب تھا کہ جب کوئی روشِ خاص ہوتی اور وہ اس پر ناز کرتے۔

بقول طباطبائی جس روش کا یہ شعر ہے۔ اس روش پر مصنف کو ناز ہو تو زیبا ہے۔

۶- مجھے چاہِ زمزم پر ہی رہنے دو، مجھے طوافِ حرم اقدس سے کیا کام ہے۔ میرا جامۂ احرام تو شراب سے آلودہ ہے۔ اگر میں زمزم پر رہوں گا تو اپنا جامۂ احرام پاک کرلوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ

حج کرنے سے پہلے طہارتِ جسمانی لازم ہے اور مصنف کی شوخی یہ ہے کہ وہ طہارت بھی آبِ زمزم سے کرنا چاہتا ہے۔ اس مضمون کو اس طرح بھی لکھا ہے۔

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم ؛ دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

۷- ابرام یعنی اصرار۔ ضد۔ اگر اب بھی بات نہ بنے اور میرا مقصد حاصل نہ ہو تو نہایت افسوس ہے۔ کیونکہ اُن کا انکار نہیں اور میں بہت زیادہ مصر ہوں۔

۸- موت سے شکایت کرتے ہیں کہ تُو بہت جلد آگئی ابھی تو عشق میں جگر خوں ہوکر آنکھ سے بھی ٹپکنے نہیں پایا۔ مجھے کچھ مدت اور اس دُنیا میں رہنے دے۔ کیونکہ مجھے یہاں ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی ابتدائے عشق ہے۔ تکمیلِ عشق کی مہلت دے تاکہ منازلِ عشق کی تمام صعوبتیں اُٹھاؤں اور ان سے لطف اندوز ہوں۔

۹- کوئی ایسا شخص بھی ہے جو غالبؔ کو نہ جانے یعنی غالبؔ کو سبھی جانتے ہیں۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ بدنام ہے۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ شاعر بھی اچھا ہے۔

۲۳۳

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ۱ جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لختِ لخت کو ۲ عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم ۳ برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس ۴ مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق ۵ سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل ۶ سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب ۷ نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے ۸ پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
پھر شوق کررہا ہے خریدار کی طلب ۹ عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل ولالہ پر خیال ۱۰ صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا ۱۱ جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس ۱۲ زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو ۱۳ سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اِک نو بہارِ ناز کوتا کے ہے پھر نگاہ ۱۴ چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں ۱۵ سرزیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن ۱۶ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

۱-یار کو مہماں بُلائے ہوئے مدّت ہوگئی ہے اور زمانہ گزر گیا ہے کہ شرابِ روشن کے ساغروں سے بزم کو روشن نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ یار آئے تو پھر بزم کو جوشِ قدح سے چراغاں کروں۔ شراب آتشیں کو چراغ تصور کیا ہے۔

۲-عرصہ ہوگیا ہے کہ مژگانِ یار کی دعوت نہیں کی اس لیے جگر کے ٹکڑوں کو میں پھر جمع کر رہا ہوں تا کہ دعوتِ مژگانِ یار کروں۔ظاہر ہے کہ پہلے دعوتِ مژگانِ یار کر چکے ہیں جس کی وجہ سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوچکا ہے اور اس کو اب جمع کر رہے ہیں بقول طباطبائیؔ جو کچھ غالبؔ نے لکھا ہے۔ زینت کا لفظ وہ لطف ہرگز پیدا نہیں کر سکتا جو دعوت نے کیا ہے۔

۳-وضع احتیاط سے گریبان پھاڑنے میں احتیاط کرنا مراد ہے برسوں ہوگئے ہیں کہ میں نے گریبان چاک نہیں کیا۔ اس وضع احتیاط کی وجہ سے میرا دل گھبرانے لگا اور دل میں ایک قسم کی بے چینی پیدا ہوگئی ہے۔

۴- گرم یعنی مصروف۔ میرا نفس پھر نالہائے شرربار کھینچنے میں مصروف ہے کیونکہ نالوں کی شرر باری سے جو کیفیت چراغاں کی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی سیر کئے ہوئے مدّت ہوگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر ایسے نالے کھینچنے کو جی چاہتا ہے جو شرر باری سے چراغاں کا منظر پیدا کردیں۔

۵-جراحتِ دل یعنی زخمِ دل۔ طبیبِ عشق زخمِ دل کی پرسش اور عیادت کو چلا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ لاکھوں نمک دان ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر عشق پھر زخمِ دل پر نمک چھڑک کر آتشِ عشق کو مشتعل کرنے والا ہے۔

۶-میں خامۂ مژگاں کو پھر خونِ دل میں ڈبو رہا ہوں تا کہ اپنے دامن پر گلکاریاں کروں۔مطلب یہ ہے کہ مژگاں کا موقلم ہے اور خون دل کی روشنائی۔ جس سے صفحۂ دامن پر گلکاریاں ہوں گی۔

۷-میرے دل اور آنکھوں میں رقابت پیدا ہوگئی ہے کیونکہ دل نے خیالِ یار اور آنکھوں نے اس کے نظارے کا پھر سامان فراہم کیا ہے۔

۸-طواف:-چکّر کا ٹنا۔ پندار بمعنی غرور، خود داری۔

میرا دل خودداری کا صنم کدہ ویران کر کے کوئے ملامت کی طرف جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خود داری کو ترک کر کے میرا دل کوچہ عشق میں طواف کو چلا ہے، جہاں اسے طرح طرح کی ذلّتیں اور ملامتیں اُٹھانی پڑیں گی، گویا پہلے عشق کرنے سے خودداری مانع تھی۔ اب خودداری کا طلسم ٹوٹ گیا ہے، خودداری کا صنم کدہ کہنا لطف سے خالی نہیں۔

۹-شوق یعنی عشق کو پھر کسی خریدار کی طلب ہے اس لئے اس نے متاعِ عقل و دل و جان کو سجایا ہے، تا کہ کوئی خریدار (معشوق) آئے اور ان چیزوں کی خریداری کرے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق کسی معشوق کا طلبگار ہے جو عقل و دل اور جان کو غارت کر دے۔

۱۰-طباطبائیؔ:- گل و لالہ کا حسینوں سے استعارہ ہے اور صد گلستاں نگاہ میں گلستاں کو پیمانۂ نگاہ فرض کیا ہے، اس سبب سے کہ گلستاں پر نگاہ رغبت اور شوق کی پڑتی ہے۔

سعیدؔ:-صد گلستاں نگاہ کئے ہوئے یعنی نہایت ذوق وشوق کے ساتھ نگاہ کئے ہوئے۔

آسیؔ:-ہر گل ولالہ پر خیال دوڑ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اس صورت سے میری نگاہ کو رشکِ صد گلستاں بنائے یعنی ذوقِ نظارۂ گلستاں سے یا اثرِ نظارہ سے۔

بیخودؔ:-پھر خیال حسینوں کی طرف دوڑنے لگا ہے۔ نگاہ میں سینکڑوں باغوں کا سامان فراہم کئے ہوئے۔

۱۱-عنوان:- بمعنی سرخی۔ نامۂ دلدار کے دلفریب عنوان پر میں اس قدر مفتوں ہوں کہ اس کا خط میں اس طرح کھولنا چاہتا ہوں کہ اپنی جان کو اس کے عنوان کی دلفریبی پر قربان کردوں یا بقول آسیؔ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ میرا شوق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ الخ

۱۲۔ پھر میری ہوس نظارہ کی طلبگار ہے یعنی کوئی لبِ بام پر کھڑا ہو اور اس کی سیاہ زُلفیں اس کے چاند جیسے چہرے کے اردگرد پریشان ہوں۔

۱۳۔ پھر میری آرزو چاہتی ہے کہ کوئی میرے سامنے بیٹھا ہو اور اس نے اپنی مژگاں کے خنجروں کو سرمہ سے تیز کر رکھا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی سُرگیں چشم معشوق میرے سامنے بیٹھا ہو اور وہ تیرِ نظر سے میرے دل کو زخمی کر رہا ہو۔

۱۴۔ پھر میری نگاہ ایک نو بہارِ ناز کو ڈھونڈتی پھرتی ہے جس نے اپنا چہرہ فروغ مے سے گلستاں بنا رکھا ہو۔ مطلب یہ کہ شراب کے اثر سے اس کے چہرے پر سرخی اور رنگینی نمودار ہو (مے اور تاک اور دیگر الفاظ میں مناسبت ہے)

۱۵۔ پھر جی میں سمائی ہے کہ ہم معشوق کے در پر پڑے رہیں اور ہمارا سر دربان کے بارِ احسان سے جُھکا رہے۔ دربان کا احسان یہ ہے کہ معشوق کے دروازے پر پڑے رہنے کی اجازت دے دے۔

۱۶۔ پھر دل کو آرزو ہے کہ زمانۂ گزشتہ کی طرح ہمیں ایسی فرصت مِل جائے کہ رات دن تصورِ جاناں کئے ہوئے بیٹھے رہیں۔ بقول طباطبائی رات دن زلف و رُخ کے تصور میں رہیں۔

۱۷۔ ہمیں نہ چھیڑو کیونکہ ہم جوشِ اشک سے طوفان برپا کرنے کا ارادہ کئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی چھیڑے گا۔ تو ہم اس قدر روئینگے کہ طوفان برپا کردینگے۔

۲۳۴

نوید امن ہے بیدادِ دوست جاں کیلئے ۱ رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے
بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے ۲ رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونفشاں کے لئے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر ۳ نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے
رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک ۴ بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے
فلک نہ دُور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں ۵ درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر ۶ کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے ۷ اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل ۸ کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے
دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے ۹ بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لے
زباں پہ بارِ خدا یا یہ کس کا نام آیا ! ۱۰ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے
نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملّت و ملک ۱۱ بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے
زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش ۱۲ بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے ۱۳ سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

۱۔ نوید بمعنی خوشخبری۔ بیدادِ دوست میری جان کے لئے امن اور چین کی خوشخبری ہے، کیونکہ دوست نے کوئی طرزِ ستم آسمان کے لئے باقی نہیں رکھی۔ سبھی قسم کے ظلم اُس نے مجھ پر ختم کردئے ہیں لہٰذا میری جان جورِ فلک سے بے خطر ہوگئی ہے۔

۲۔ اگر مژگانِ یار تشنۂ خوں ہیں تو ہوا کریں۔ آخر میری مژگاں بھی تو خونفشاں ہیں، اس لئے مجھے چاہئے کہ کچھ خون میں اپنی مژگان کی خونفشانی کے لئے رکھ لوں، تمام کا تمام خون مژہ یار کی نذر نہ کردوں، اگر میں سب خون اس کے حوالے کردوں گا تو میرے پاس اپنی مژگاں کے لئے کیا رہے گا۔

۳۔ خضر عمرِ جاوداں کے مالک ہیں۔ کہتے ہیں جناب خضر آپ کی عمرِ جاوداں کس کام کی ہے نہ کسی سے ملتے جلتے ہو نہ کسی کو دکھائی دیتے ہو۔ بلکہ عمرِ جاوداں کے لئے چور بن گئے ہو۔ بھلا یہ کوئی زندگی ہے۔ زندہ ہم ہیں کہ تمام دُنیا سے رُوشناس ہیں اور ہر ایک سے کُھلم کُھلا ملتے ہیں

۴۔ میں مصیبت میں مبتلا ہوں لیکن پھر بھی رشک نے مجھے نہیں چھوڑا یعنی مصیبت میں مصیبت یہ ہے کہ میں مبتلائے آفتِ رشک ہوں اور یہ رشک اس بات کا ہے کہ تیری ادا بلا ہی سہی لیکن وہ سارے جہاں کے لئے بلائے جاں کیوں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اگر بلا بھی تھی، تو صرف میرے لئے ہونی چاہئے تھی۔

۵۔ اے فلک: یہ درست ہے کہ قاتل کی درازدستی کا امتحان اسی وقت ہوسکتا ہے، جب کہ

شکار اس سے دُور ہو لیکن کیا صرف میں ہی اس امتحان کے لئے رہ گیا ہوں کہ تُو نے مجھے قاتل سے دُور رکھا ہے۔ اے فلک! مجھے اس سے دُور نہ رکھ کیونکہ اور بھی بہت ہیں جنہیں دُور رکھ کر قاتل کی دراز دستی کا امتحان ہو سکتا ہے۔

۶۔میری کوشش اور سعی کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی اسیر پرندہ قفس میں آشیانہ بنانے کیلئے تنکے جمع کرتا ہو۔ گویا میری کوشش بے سُود بھی ہے اور قابلِ رحم بھی۔ بقول حالیؔ اس سے زیادہ سخت کسی پیرایہ میں بیان نہیں ہو سکتی۔

۷۔حالیؔ:۔غالبؔ نے اتنے بڑے مضمون کو کہ میں جو معشوق کے مکان پر پہنچا تو اول خاموش کھڑا رہا، پھر پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔ اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے، اس لئے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے۔ اس شعر میں ادا کیا ہے۔

جو واقعہ میرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضروری تھی، ایک یہ کہ پاسبان نے سائل کے ساتھ کیا سلوک کیا، دوسرے یہ کہ سائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا۔ گو یہ دونوں باتیں بہ صراحت بیان نہیں کی گئیں۔ صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ مگر صراحت زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس کے سوا روز مرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

۸۔غزل کا تنگ میدان میرے شوق کے مقابلے میں کم ہے، یعنی جن مضامینِ شوق کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں، وہ غزل میں نہیں لکھ سکتا میرے بیان کے لئے کچھ اور زیادہ وسعت چاہئے۔ لہٰذا غزل سرائی چھوڑ کر مدح سرائی شروع کرتا ہوں۔

۹۔ تجمل حسین خاں فرخ آباد کے نواب تھے۔ انہوں نے کمال شوق سے غالبؔ کو بُلوایا تھا۔ کہتے ہیں اصل میں خدا نے عیش و آرام محض تجمل حسین کے لئے بنایا ہے لیکن دوسروں کو اس مصلحت سے تھوڑا بہت عیش و آرام دے دیا ہے کہ تجمل حسین کے عیش و آرام کو نظر نہ لگے۔

۱۰۔یااللہ میری زبان پر یہ کس کا نام آیا ہے کہ میری زبان نے میرے منہ کو متعدد بار چوما۔ تجمل حسین خاں کہنے میں زبان کئی مرتبہ کام و دہن کو چھوتی ہے۔ اسی کو بوسہ سے تعبیر کیا ہے۔ یا یہ

کہ خوشی کی وجہ سے زبان نے منہ کو چوما۔ یا جس کے اثر سے میرے نطق نے میری زبان کو چوم لیا، واقعہ یہ ہے کہ سچ مچ چومنا مراد نہیں صرف اظہارِ محبت مقصود ہے۔

۱۱۔ نصیر:۔مددگار۔ دولت:۔ حکومت۔ معین:۔مددگار۔

وہ دین و دولت کا مددگار اور ملک و ملّت کا حامی ہے اور اس کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ چرخِ بریں اس کے آستانے کے واسطے بنایا گیا ہے۔

۱۲۔حالیؔ:۔مرزا نے اپنے ممدوح کو ایک ایسے کمال کے ساتھ موصوف کیا ہے، جو تمام کمالات کی جڑ ہے یعنی وہ ہر چیز کو کامل تر اور افضل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے، اس لئے ہر شے اپنے تیئں کامل تر حالت میں اس کو دکھانا چاہتا ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر یہی حال ہے تو شاید آسمان کی زیب و زینت کے لئے اور ستارے پیدا کئے جائیں اس پر سوائے اس کے کہ کوئی منطقی اعتراض کیا جائے اور کسی طرح کی گرفت نہیں ہو سکتی۔

طباطبائیؔ لکھتے ہیں کہ ’’مولوی حالیؔ صاحب نے جو معنی لکھے ہیں اُس پر کوئی قرینہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ممدوح کا نام تجمل حسین ہے اسی سبب سے زمانہ اس کے عہد میں مصروفِ تجمل آرائش ہے۔" کیا عجب ہے کہ زہرہ و مشتری کی طرح آسمان کے لئے اور ستارے بھی بن جائیں‘‘۔

۱۳۔ممدوح کی تعریف و مدح لکھتے لکھتے ورق ختم ہو گیا اور اس کی تعریف ابھی اتنی باقی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بحرِ بیکراں (ناپیدا کنار سمندر) کے لئے ایک سفینہ (کشتی) درکار ہے یعنی اس کی تعریف بہت ہے۔ وہ چند کاغذوں پر نہیں لکھی جا سکتی۔ سفینہ کا لفظ بحر کی مناسبت سے لائے ہیں اور اس سے مقصود دفتر یا بہت بڑی بیاض ہے۔

۱۴۔میں آج ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوا ہوں یعنی میں نے غزل میں مدح لکھی ہے۔ میں یارانِ نکتہ داں کو صلائے عام دیتا ہوں کہ وہ بھی غزل میں مدح کرنے کا یہ نیا ڈھنگ اختیار کریں۔

قصائد

۲۳۵

ساز یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار ۔ سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

مستی بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ ۲ ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار
سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ ۳ تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار
مستیِ ابر سے گل چینِ طرب ہے حسرت ۴ کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بُلبل ۵ راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار
سونپے ہے فیض ہوا صورتِ مژگانِ یتیم ۶ سرنوشتِ دو جہاں ابر بیک سطرِ غبار
کاٹ کر پھینکیے ناخن تو باندازِ ہلال، ۷ قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار!
کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز ۸ دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار!
میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی ۹ بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار!
موجِ گل ڈھونڈ نہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ ۱۰ گم کرے گوشۂ میخانہ میں گرتو دستار!
کھینچے گر مانیؔ اندیشہ چمن کی تصویر ۱۱ سبزہ مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار
لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ ۱۲ طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار!
وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا ۱۳ چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور ۱۴ رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار
سبزۂ نہ چمن ویک خطِ پشتِ لبِ بام ۱۵ رفعتِ ہمّتِ صدعارف و یک اوجِ حصار
واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرکاہ ۱۶ وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار
خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا ۱۷ چشمِ نقشِ قدمِ آئینۂ بختِ بیدار
ذرّہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز ۱۸ گرد اس دشت کی امیدکو احرامِ بہار
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز ۱۹ عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار ۱ دلِ پروانہ چراغاں پرِ بلبل گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز ۲ ذوق میں جلوہ کے تیرے بہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں ۳ سلکِ اختر میں مہِ نومژۂ گوہر بار
ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز ۴ ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبیؐ ۵ جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار
جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر ۶ یک طرف نازشِ مژگان و دگر سوغمِ خار
مردمک سے ہو عزاخانۂ اقبالِ نگاہ ۷ خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمنِ آلِ نبی کو بہ طرب خانۂ دہر ۸ عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار
دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق ۹ فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

۱۔ذرّہ کو ایک ساز تصوّر کیا ہے۔ فیضِ چمن:۔اثرِ بہار۔ لالہ بیداغ:۔اثرِ بہار مراد ہے۔ مطلب یہ ہے بہار کے اثر سے لالہ کا داغ دُور ہوگیا ہے۔ داغ سیاہ ہوتا ہے۔ بہار میں سیاہی کا کیا کام ہے۔ اس وقت تو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہونا چاہئے۔

سویدا:۔دل میں ایک سیاہ تل ہوتا ہے۔

کہتے ہیں فیضِ بہار سے باغ کا کوئی ذرّہ بیکار نہیں رہا۔ ہر ذرّہ کا ساز متحرک ہے، یہاں تک کہ لالہ کا داغ دور ہوگیا ہے۔ سایہ ایک بیکار چیز تھی لیکن شاعر نے اثرِ بہار دکھانے کے لئے اُسے باکار بنادیا ہے۔

طباطبائی لکھتے ہیں۔ لالے کی صفت بے داغ سے دو باتیں پیدا ہوئیں ایک تو رنگِ بہار کی خوبی سے لالے میں داغ نہیں رہا۔ دوسرے یہ کہ داغ اگر لالے میں ہوتا تو وہی سویدائے بہار تھا۔ لیکن جب اس میں داغ نہیں ہے تو اس کے سائے میں سویدائے بہار کا حُسن و تناسب پیدا ہوگیا۔

۲۔عرض:۔ظاہر کرنا۔ تیغِ کہسار:۔قلۂ کوہ کو تیغِ کہسار کہتے ہیں یعنی پہاڑ کی چوٹی۔ جوہر:۔ یعنی سبزۂ کہسار۔ عرض و جواہر اور جوہر و تیغ لفظی رعایت رکھتے ہیں۔ پہلے کہسار کو ایک تیغ قرار دیا۔ پھر سبزۂ کہسار کو جوہرِ تیغ، جوہرِ تیغ کی تیزی ظاہر کرنے کے لئے کہا ہے کہ بادِ صبا کی مستی کے اثر سے وہ سبزہ جو تیغِ کہسار کا جوہر تھا۔ مینائے شراب کے ریزے بن گیا ہے۔ ظاہر ہے سبزہ کو مینا کی کرچوں کے ساتھ رنگ میں مشابہت ہے۔ بقول طباطبائی اس شعر میں عرض و جوہر کو جمع کیا ہے۔

۳۔زمُرّد:۔سبز رنگ کا قیمتی پتھر۔ داغِ پلنگ:۔چیتے کی کھال پر سیاہ دھبّے ہوتے ہیں۔

ریشہ نارنج صفت:۔نارنج کے ریشوں کی طرح۔

اس شعر میں بھی تاثیرِ بہار دکھائی ہے کہتے ہیں۔ بہار کے اثر سے چیتے کے سیاہ داغ جامِ زمرّدیں کی طرح سبز ہوگئے ہیں اور شرارے نارنج کے ریشوں کی طرح سبز ہوگئے ہیں۔ شرر کو ریشہ نارنج سے سُرخی کی وجہ سے مشابہت تامہ حاصل ہے۔ یہ دونوں تشبیہیں نہایت بدیع ہیں۔

۴۔ گل چینِ طرب:۔مسرّت کے باغ سے گل چینی کرنے والی، یعنی بہت زیادہ محفوظ۔ دو عالم کا فشار:۔دونوں عالم کے غم فراموش ہو جانا لفظ۔ فشار اور آغوش میں رعایت پیدا ہوگئی ہے۔

ہر طرف ابر چھایا ہے۔ گویا اس نے دو عالم کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر میرے دل میں حسرت پیدا ہوتی ہے کہ دیکھو ابر نے دو عالم کو اپنی آغوش میں بھینچ رکھا ہے۔ حسرت اس وجہ سے ہے کہ میری آغوش خالی ہے۔ لیکن یہ حسرت تکلیف دہ نہیں طرب انگیز ہے۔ کیونکہ مستی ابر سے میں بھی مسرور ہوں اور اس طرح سے دو عالم کے غموں کا فراموش ہو جانا ممکن ہے۔ خوشی کی ترنگ میں انسان اکثر غم بھول جاتا ہے۔

۵۔ معموری:۔ آباد۔ راہِ خوابیدہ:۔سُونی راہیں جہاں کوئی نہ چلے پھرے۔ خندۂ گل:۔ پھول کے چٹکنے کی آواز۔ بیدار:۔ آباد، پُر رونق۔

وہ راستے جو سُونے پڑے تھے، موسمِ بہار کی آمد سے پُر رونق ہو گئے ہیں اور تمام کوہ و صحرا بلبلوں کے چہچہوں سے آباد ہیں۔ بلبلیں وہیں چہچہے کرتی ہیں، جہاں پھول ہوتے ہیں۔ پھولوں کے چٹکنے کو خندۂ گل کہہ کر مسرت کا ایک سماں پیدا کر دیا ہے۔

آسی نے دوسرے معنوں میں راہِ خوابیدہ سے مراد وہ لوگ لئے ہیں، جو راہ میں سو گئے تھے، گویا وہ خندۂ گل سے بیدار ہوگئے ہیں۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ معموری کی جگہ معمورہ استعمال کرنا بہتر تھا۔

۶۔ فیضِ ہوا:۔ موسمِ بہار کی تاثیر۔ مژگانِ یتیم:۔یتیم کی خاک آلود آنکھوں سے مدتوں اشک جاری رہتے ہیں۔ سرنوشت:۔تقدیر، قسمت کا لکھا۔ دوجہاں ابر بہت زیادہ ابر۔ ایک سطرِ غبار:۔ تھوڑا سا غبار۔

اگر آسمان پر ذرا سا غبار آتا ہے تو بادِ بہاری اس کو مژگانِ یتیم کی خاصیت عطا فرماتی ہے گویا مژگانِ یتیم کی طرح مدتوں اشک برساتا ہے مطلب یہ ہے کہ فیضِ ہوا سے غبار میں بھی ابرِ کثیر کی

خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ مرزا صاحب نے اس شعر میں کمال نازک خیالی دکھائی ہے الفاظ بھی نہایت مناسب ہیں۔

۷۔ باندازِ ہلال:۔ہلال کی طرح۔ قوتِ نامیہ:۔بڑھنے کی قوت، بالیدگی۔

قوتِ نامیہ میں اس قدر زور پیدا ہو گیا ہے کہ اگر ناخن تراش کر پھینکتے تو وہ ہلال کی طرح بڑھتے بڑھتے بدر بن جاتا ہے۔ تراشے ہوئے ناخن کی شکل ہلال جیسی ہوتی ہے۔

۸۔ کفِ ہر خاک:۔خاک کی ہر مٹھی۔ قمری کا رنگ خاکستری ہوتا ہے۔ اس لئے ہر کفِ خاک قمری بن گئی۔ بہ گردوں شدہ:۔خاک کی صفت ہے خاک اُڑ کر آسمان کی طرف جاتی ہے۔ کاغذِ آتش زدہ:۔ جلا ہوا کاغذ، کاغذ جل جانے کے بعد جال کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ اس میں جالی پڑ جاتی ہے۔

تاثیر ہوا سے ہر چیز میں جان پڑ جاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ خاک کی ہر مٹھی بھی جب آسمان کی طرف چڑھی تو وہ قمری بن گئی اور کاغذ جل جانے کے بعد دام بن گیا جو طاؤس کو شکار کرتا ہے۔

۹۔ اگر تجھے بھی میکدے میں بیٹھ کر گل چینی کرنے کی آرزو ہے تو بہار کی تاثیر تیری اس آرزو کو بھی پوری کردیگی۔ اس آرزو کے پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ شراب کا ایک پیالہ بھر اور اسے طاقِ گلزار میں رکھ کر بھول جا۔ قوتِ نامیہ اس پیالے سے ہزار پیالے اور ہزار طاق پیدا کر دیگی۔ گویا گلزار میں میکدہ پیدا ہو جائیگا اور تو میکدے میں گل چینی کی آرزو پوری کر سکے گا۔

۱۰۔ اگر تو نشے کے عالم میں اپنی پگڑی میکدے کے کسی کونے میں بھول جائے تو پھر تجھے اس پگڑی کو میخانے کے کونوں میں نہیں بلکہ غنچۂ باغ کے خلوت خانے میں ڈھونڈنا چاہئے فیضِ بہار سے گوشہ میخانہ غنچۂ باغ کا خلوت کدہ بن جائیگا اور تیری گمشدہ دستار موجِ گل ہوجائے گی۔

سبحان اللہ کیا نازک خیالی ہے۔ پگڑی جب تک بندھی رہتی ہے غنچہ کی مثل ہے۔

۱۱۔ مانیِ اندیشہ:۔مانی بابل کا مشہور مصوّر ہے۔ اس نے اپنی مصوّری کی وجہ سے پیغمبری کا دعوےٰ کیا تھا اور اپنی مصوّری کو اپنا معجزہ قرار دیا تھا مراد ہے اندیشہ یعنی قوتِ متخیلہ۔ خطِ نو خیز:۔ سبزہ آغاز۔ اگر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر کھینچے تو بادِ بہاری کی تاثیر سے اس کا خطِ پرکار خطِ نوخیز کی طرح سبز ہو جائے۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ مانی اندیشہ کو تصویر اُتارنے میں پرکار کی کیا ضرورت ہے۔ پھر خود ہی فرماتے ہیں کہ پرکار سے بھی پرکار اندیشہ مراد ہے۔

۱۲۔ منقار:۔ چونچ ۔ مدحت:۔ مدح ۔ طوطی:۔ ایک سبز رنگ کا چھوٹا سا پرندہ جو مثل طوطے کے بولتا ہے۔

بادشاہ کی مدح سرائی کے لئے سبزۂ کہسار کے طوطی نے لعل سے زبان پیدا کرلی ہے سبزۂ کوہسار کو طوطی اور لعل کو منقارِ طوطی قرار دیکر یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ سرخ منقار والا طوطی تیری مدح سرائی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ لطف یہ ہے کہ لعل اور سبزہ کوہساروں ہی میں ہوتا ہے۔

۱۳۔ قالب:۔ سانچہ۔ خشت:۔ اینٹ۔

یہ طوطی اس بادشاہ کی تعریف کرے گا، جس کے محل کی تعمیر کے لئے جبرئیل کی آنکھیں اینٹیں بنائی گئی ہیں۔

۱۴۔ فلک العرش:۔ یعنی آسمان ہفتم۔ ہجومِ کثرت خمیدگی کو ظاہر کرنے کیلئے لائے گئے ہیں۔ خم:۔ خمیدگی ۔ رشتہ:۔ سلسلہ ۔ ساز:۔ سامان۔ طناب:۔ وہ سوت جس سے معمار دیوار کا سیدھا یا ٹیڑھا پن دیکھتے ہیں۔

اس عالیشان محل کی تعمیر کیلئے ساتواں آسمان دوش مزدور کی طرح بہت ہی زیادہ خم ہوگیا ہے۔ اس محل کے بنانے والے معمار کا سوت فیضِ ازل کا رشتہ ہے۔ یعنی اس محل کی تعمیر میں فیضِ ازل نگہدار ہے۔

حسرت، آسی اور سعید خم کے معنی مٹکے کے لیتے ہیں گویا فلک العرش ایک بڑا سا خم ہے کہ مزدور تعمیر کے لئے اُس میں پانی بھر کر لاتے ہیں۔

۱۵۔ سبزۂ نہ چمن:۔ نو آسمان کی سبزی، یعنی بہت ہی زیادہ سبزی۔ ممدوح کے محل کی پشت لب بام کا ایک خط تو چمنوں یا آسمانوں کے سبزہ کے برابر ہے اور اس کے محل کی بلند سو" عارفوں کی ہمت کے برابر بلند ہے واؤ دونوں مصرعوں میں مساوات کے معنی دے رہی ہے۔

طباطبائی لکھتے ہیں حرفِ عطف ان معنوں میں محض فارسی میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۶۔ خاشاک:۔ تنکے وغیرہ۔ کاہ:۔ سوکھی ہوئی گھاس۔ مروحہ:۔ پنکھا۔ بال پری:۔ پری کے بازو۔

اس محل کے کوڑے کرکٹ میں سے جس شخص کو ایک تنکا مل جائے وہ پری کے بازو کے پنکھے سے بھی بیزار ہو جائے۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ "یہ مبالغہ غیر عادی ہے کیونکہ بیزاری کا کوئی سبب نہیں" (حالانکہ وجہ معقول موجود ہے)

۱۷۔ نجف:۔ وہ مقام جہاں حضرت علیؓ کا روضہ ہے۔ عرفا:۔ عارف کی جمع۔ جوہر وہ شے ہے جس سے دوسری شے قائم ہو اور اس کی ذات بذاتِ خود قائم ہو۔

صرف صحرائے نجف کی خاک عارفوں کی سیر کا جوہر ہے اور صحرائے نجف کی زمیں پر جو نقش قدم بنتے ہیں، وہ گویا بخت بیدار کا آئینہ ہوتے ہیں یعنی ان میں بخت بیدار کی صورت نظر آتی ہے۔

۱۸۔ صحرائے نجف کا ہر ذرہ خورشید کے لئے آئینہ ناز ہے، حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ ذرہ خورشید پہ ناز کرتا ہے اور دشت کی گرد محض نسبت نجف کی وجہ سے امید کے لئے فصل بہار کا جامۂ احرام ہے۔

۱۹۔ حسرت:۔ ایجاد کو اس خاک پاک کی آفرینش پر ناز ہے۔ پس نجف کی ہر موجِ غبار گویا آفرینش و ایجاد کی انگڑائی ہے، جس کے ذریعہ وہ بزبان حال یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم کو اس شرابِ فخر و ناز (یعنی ناز ایجادِ نجف) کی پھر خواہش ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس سرزمیں کو پیدا کرکے آفرینش کو بار بار ناز ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مطلع ثانی

۱۔ اے شمع شبستانِ بہار! تیرے فیض سے سب کی مرادیں حاصل ہوگئی ہیں۔ پروانے کا دل چراغاں بن گیا ہے بلبل کے پر گلزار ہوگئے ہیں۔ ظاہر ہے پروانہ کا معشوق چراغ ہے اور بلبل کا محبوب پھول۔

۲- کیا تعجب ہے کہ آئینہ خانہ تیرے جلوۂ شوق اور تیرے دیدار کے ذوق میں مثلِ طاؤس پرواز کرنے لگے۔ اس نادر تشبیہ کی بھی تعریف کرتے ہیں۔

۳- غم سے مراد یہاں غمِ آلِ رسول، یعنی اولاد حضرت علیؑ ہے۔ کہتے ہیں اے شاہِ نجف! تیری اولاد کے غم میں آسمان پرستاروں کی لڑی میں مہ نو گوہر بار بن گیا ہے۔ مہ نو کو مژہ اور ستاروں کو سلکِ اشک قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غمِ حسینؑ میں جو آنسو نکلتے ہیں وہ موتی کا رتبہ رکھتے ہیں۔

۴- بقول طباطبائی ''ہم'' اس شعر میں بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ فارسی میں یہ استعمال قابلِ اعتراض نہیں۔ مہرِ نماز سے مراد سجدہ گاہ ہے جس پر اہلِ تشیع سجدہ کرتے ہیں۔ استظہار:- پشت پناہ۔ کہتے ہیں تیرا نقشِ قدم عبادت کے لئے سجدہ گاہ ہے اور تیرا حوصلہ ریاضت کے لئے پشت پناہ یعنی تقویت کا باعث ہے۔

۵- تیری مدح میں نعتِ نبی کا زمزمہ پوشیدہ ہے، یعنی تیری مدح در پردہ نبی کی مدح ہے اور جس شخص نے تیری محبّت کا جام پی لیا، سمجھ لو وہ بادۂ اسرار سے سرشار ہو گیا۔

۶- دستِ دُعا کو آئینہ اور دُعا کی تاثیر کو اس آئینہ کا جوہر تصور کیا ہے۔ کہتے ہیں ایک طرف دُعا کی تاثیر مژگانِ اشک ریز کے لئے باعثِ ناز ہے کیونکہ صدقِ دل سے دُعا کرتے وقت آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور دُعا قبول ہو جاتی ہے اور دوسری طرف خارِ حسرت کے لئے رنج و ملال کا موجب۔ کیونکہ دُعا قبول ہونے پر حسرت پامال ہو جاتی ہے۔

۷- مردمک:- آنکھ کی پتلی۔ پتلی سیاہ ہوتی ہے اس لئے اس کو عزاخانہ سے تشبیہ دی ہے۔

اقبال:- بخت مندی و کامرانی۔ آئینہ دار:- فرمانبردار و تابعدار۔

جو آنکھ تیرے در کی خاک کی فرمانبردار اور تابعدار نہ ہو۔ اس کی نگاہ اقبال کا عزاخانہ بن جائے۔ یعنی وہ ہمیشہ اقبال کے سوگ میں سیاہ پوش رہے اور اس کو اقبال مندی دیکھنی نصیب نہ ہو۔

۸- طاقِ محراب کی وجہ سے خمیازۂ سیلاب سے تشبیہ دی ہے۔

خمیازۂ سیلاب:- موجِ سیلاب۔

خدا کرے آلِ نبی کے دشمن کے لئے اس دُنیا کے عشرت کدہ کا ہر طاقِ دیوار موجِ سیلاب بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو کبھی خوشی نصیب نہ ہو۔

۹- اے اسدؔ! آنکھ سے لے کر دل تک میں ایک آئینہ پر تو شوق بن گیا ہوں یعنی سرتاپا شوق ہو گیا ہوں اور معنی شوق سے میرے ساغر کا خط سرشار ہے۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ خط کا لفظ محض مناسبت کی وجہ سے لائے ہیں ورنہ اس کی ضرورت نہ تھی گویا شعر کا مفہوم محض اس قدر ہے۔ کہ معنی شوق سے سرشار ہے۔

۲۳۶

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں ۱ ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق ۲ بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دُنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم ۳ لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت ۴ سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں!
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم ۵ دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دُنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم ۶ صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکیں
عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس ۷ وصلِ زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں
کوہ کن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب ۸ بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں
کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز ۹ کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن ۱۰ نہ سرو برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ ۱۱ یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر ۱۲ یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں
مظہرِ فیضِ خدا، جان و دلِ ختمِ رسل ۱۳ قبلۂ آلِ نبیؐ کعبۂ ایجادِ یقیں
ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام ۱۴ ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں
جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا ۱۵ وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
نسبت نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے ۱۶ ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں
فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا ۱۷ بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
بُرِّشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا ۱۸ قطع ہو جائے نہ سررشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے ۱۹ رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بُت خانۂ چیں
جاں پناہا، دل و جاں فیض رسانا، شاہا ۲۰ وصیِ ختمِ رُسل تو ہے بہ فتوائے یقیں
جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر ۲۱ نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں!
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیراز واجب ۲۲ شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں!
آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ ۲۳ رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں
تیرے در کے لئے اسباب نثار آمادہ ۲۴ خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں
تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں ۲۵ تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
کس سے ہوسکتی ہے مدّاحیِ ممدوحِ ۲۶ کس سے ہوسکتی ہے آرائشِ فردوس بریں
جنسِ بازارِ معاصی اسداللہ اسدؔ ۲۷ کہ سوا تیرے کوئی اُس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب ۲۸ ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول ۲۹ کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں
غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز ۳۰ کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو اُلفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق ۳۱ کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا ۳۲ نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ ۳۳ وقفِ احباب گُل و سنبلِ فردوس بریں

۱۔صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے کہ جتنی جسِ شخص اور چیز میں قابلیت ہوتی ہے اتنا ہی اس کو نُور پہنچتا ہے۔فرماتے ہیں تمام دُنیا ذات باری کی جلوہ گاہ ہے اور اس کی تخلیق کا باعث اس معشوقِ حقیقی کی خود بینی ہے۔اگر اسے اپنا پرتو وجود دیکھنا مقصود نہ ہوتا تو کوئی چیز دُنیا میں پیدا نہ ہوتی۔یوں سمجھنا چاہیئے کہ تمام مخلوقات ایک آئینہ ہے، جس میں وہ اپنا جمال دیکھتا ہے اور اس کی تخلیق کا سبب اس کی خود بینی ہے۔

۲۔تماشا یعنی نظارۂ عالم۔فرماتے ہیں ہم نے اس دُنیائے فانی کا نظارہ ایسی بے دلی سے کیا کہ اس سے نہ عبرت حاصل ہوئی نہ ذوق پیدا ہوا۔اسی طرح ہماری تمنا بالکل بیکس ہے کہ نہ وہ دُنیا سے متعلق ہے۔نہ دین سے۔بقول، بیخود طباطبائی اگر انسان دُنیا کے تماشے سے عبرت حاصل

کرے تو دین کا فائدہ ہے اور اگر لطف اُٹھائے تو دُنیا کے مزے ہیں مگر ہماری بے دلیِ تماشا و بے کسی تمنا نے دونوں فائدوں سے ہمیں محروم رکھا۔

۳۔ہرزہ:۔لغو، بیہودہ۔زیر و بم:۔نیچی اور اُونچی آواز۔ہستی کو بم اور زیر کو عدم سے مشابہ کیا ہے۔تمکین:۔ہوشیاری۔

ہستی اور نیستی کے نغمے بالکل بے معنی ہیں اور دیوانگی و فرزانگی میں فرق کرنا لغو ہے۔مطلب یہ ہے کہ باوجود باری تعالےٰ کے سوا تمام اشیاء کے وجود و عدم یا دیوانگی و فرزانگی کے متعلق بحث کرنا فضول ہے۔اسی کی ذات کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

۴۔نقشِ معنی:۔ظاہرداری۔عرضِ صورت:۔اظہار صورت

جو لوگ معنی شناسی کے دعویدار ہیں، وہ درحقیقت ظاہرداری کرتے ہیں اور جو لوگ حق گوئی کا دعوےٰ کرتے ہیں انہیں اپنی تعریف و تحسین کی خواہش ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ اہلِ زمانہ میں اصلیت اور حقیقت نہیں رہی۔معنی شناسی اور حق گوئی ظاہرداری، تعریف اور تحسین کی آلودگی سے پاک ہونی چاہئے۔

۵۔لاف:۔بمعنی شیخی۔دُنیا کے معاملات میں اپنی عقلمندی کی شیخی مارنا غلط ہے اور امورِ دینی میں نفع عبادت کی امید فضول۔حقیقت امر یہ ہے کہ دُنیا و دین دونوں ایک ساغرِ غفلت کی تلچھٹ ہیں۔

۶۔بادبدست:۔بے فائدہ، لا حاصل۔فرق:۔سر۔

دُنیا ایسی جگہ ہے کہ یہاں تسلیم و رضا سے کچھ حاصل نہیں۔او رخودداری اور وقار سے نقشِ قدم کی طرح ذلت ہی حاصل ہوتی ہے ظاہر ہے، نقشِ قدم خاک بسر ہوتا ہے۔مطلب یہ ہے۔دُنیا میں ان صفات کی کچھ قدر نہیں بلکہ اُلٹی خواری ہے۔

۷۔عشق کیا ہے؟ اجزائے حواس کے منتشر ہوجانے کا نام عشق ہے اور وصل کیا ہے؟ حُسنِ یقین کے آئینے کا زنگار۔اگر آئینہ یقین مجلّا ہوتا تو جلوۂ معشوق اپنی صُورت میں نظر آتا۔گویا دائمی وصل حاصل ہوجاتا۔

۸۔کوہکن کون ہے؟ وہ ایک بھوکا مزدور ہے اپنے رقیب کے عشرت کدہ کا، اس لئے وہ شیریں کے عشق میں کامیابی حاصل نہیں کرسکا اور کوہِ بے ستون شیریں کے خوابِ غفلت کی تصویر ہے

جس سے فرہاد سر پھوڑ کر مر گیا اور شیریں کو خبر تک نہ ہوئی۔

۹۔ آج کل کے عاشقوں کے متعلق کہتا ہے کہ اہلِ وفا کی آہوں میں آتش خیزی اور دردمندوں کے نالوں میں اثر کس نے دیکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ وفا کی آہیں اور نالے بے اثر ہیں۔

۱۰۔ سامع:۔ سننے والا۔ زمزمہ:۔ نغمہ۔ یہاں طنزاً ہرزہ سرائی مراد ہے۔ سروبرگ:۔ طاقت۔

اہلِ جہاں کی ہرزہ سرائی کو میں مجبوراً سُن ضرور لیتا ہوں، لیکن نہ تو مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ اس کی تعریف کرسکوں اور نہ اتنا دماغ ہے کہ اظہارِ نفرت کرسکوں۔

۱۱۔ ہرزہ سرا:۔ بیہودہ گو۔ عیاذاً باللہ:۔ پناہ بخدا۔ معاذاللہ!

میں بھی اس قدر بیہودہ واقع ہوا ہوں کہ آدابِ وقار و تمکنت سے ایک دم خارج ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ وہ باتیں جو میں بیان کر چکا ہوں۔ خلافِ آداب و تمکین ہیں۔ یہ شعر گریز ہے۔

۱۲۔ نقش:۔ تعویذ۔ لاحول:۔ نہیں ہے قوت مگر خدا کو۔ خامۂ ہذیان تحریر:۔ وہ قلم جو ہمیشہ بیہودہ اور بے معنی باتیں لکھتا ہو۔

اے بیہودہ نویس قلم! اب تو نقش، لاحول لکھ تاکہ تیرا ہذیان دور ہو اور اے میری وسوسوں میں پھنسی ہوئی فطرت! تُو یا علی لکھ تاکہ تیرے وسوسے دُور ہوں اور تُو راہِ راست پر آئے۔

۱۳۔ میرے ممدوح یعنی حضرت علیؓ فیضِ خداوندی کا مظہر (ظاہر کرنے والے) ہیں اور رسول مقبول خاتم النبیین کے جان و دل ہیں۔ آلِ نبی کا قبلہ ہیں اور یقین کے کعبے کے موجد۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک ان کی ذات بہت مقدّس ہے۔

۱۴۔ گردِ تصویرِ زمین سے گرد و زمین مراد ہے۔ وہ سرمایۂ ایجادِ عالم جہاں سرگرمِ خرام ہو، وہاں کی ہر مشتِ خاک گرد و زمین بن جاتی ہے ایجاد کی رعایت سے کہا ہے کہ اس کے پیروں تلے کی خاک سے بہت سے عالم پیدا ہو جاتے ہیں۔

۱۵۔ ممدوح کا نقشِ قدم جس جگہ جلوہ پرداز ہو، اس تھوڑی سی جگہ کی خاک دونوں عالم کے لئے باعثِ شرف ہوتی ہے۔

۱۶۔ حضرت علیؓ کی کیفیت ابوتراب ہے اور تراب کے معنی خاک کے ہیں۔ ظاہر ہے زمین کو

خاک سے نسبت ہے۔ پس اسی نام کی نسبت کی وجہ سے زمین کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ ابد تک پشتِ فلک اس فخر و ناز کے باعثِ خم رہے گی۔

۱۷۔ اے اسدؔ! یہ اُسی کے خلقِ عظیم کا فیض ہے کہ گل کو پہنچا ہے۔ گویا اس کے اثر سے گل میں خوشبو پیدا ہوئی ہے اور بوئے گل سے بادِ صبا معطّر ہوئی ہے۔

۱۸۔ ممدوح کی ذوالفقار (تلوار) کی کاٹ کا سارے جہان میں چرچا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کے چرچوں سے سررشتہ ایجادِ عالم ہی منقطع نہ ہو جائے۔

۱۹۔ ممدوح کا جلوہ ایسا کفر سوز واقع ہوا ہے کہ اس سے عاشق کے رنگ کی طرح چین کے بت خانہ کی رونق اُڑ جاتی ہے۔

رنگ کا ٹوٹنا اور رونق کا اُڑنا اُردو محاورہ کے خلاف ہے۔ مرزا صاحب نے فارسی محاورات کا ترجمہ کر ڈالا ہے شاید بُت خانے کی رعایت سے ایسا کیا ہے۔

۲۰۔ وصی کے لفظی معنی "جس کو وصیّت کی گئی ہو یعنی جانشین" اے جان کو پناہ دینے والے اور دل و جان کو فیض پہنچانے والے بادشاہ! بے شک خاتم النبیین کا تو ہی وصی یعنی جانشین ہے۔

۲۱۔ دوش:۔ کاندھا۔ اطہر:۔ نہایت پاک۔ ناصیہ:۔ پیشانی۔

تیرے نہایت پاک جسم کا منبر دوشِ پیمبر ہے اور تیرے نامِ نامی کا نگینہ عرش کی پیشانی ہے۔ حضرتِ علیؓ نے دوشِ پیمبر پر سوار ہو کر خانۂ کعبہ کے بُت توڑے تھے۔ دوسرے مصرعے سے یہ مراد ہے کہ تیرا نامِ نامی عرشِ معلےٰ پر لکھا ہوا ہے جب رسول مقبولؐ عرش پر تشریف لے گئے تو انہوں نے وہاں "علیؓ" لکھا ہوا دیکھا۔

۲۲۔ واجب:۔ خدا تعالےٰ۔ باندھے آئیں:۔ یعنی آئینہ بندی و آرائش۔

تیری مدح سوائے خدائے تعالےٰ کے کوئی نہیں کرسکتا شمع کی آرائش اور آئینہ بندی شعلۂ شمع کے سوا اور کون کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے شمع کو شعلہ ہی سے آرائش حاصل ہوتی ہے۔ گویا ممدوح کی ذاتِ گرامی کو فنا فی اللہ ہو جانے کی وجہ سے خدائے تعالےٰ سے وہی تعلق حاصل ہو گیا ہے، جو شمع کو شعلہ سے ہے۔

۲۳۔ ممدوح کے سنگِ آستاں کو آئینہ قرار دیا ہے اور اس پر حضرتِ جبرئیل امین کے سجدے

کے نشانوں کو اس آئینہ کا جوہر فرماتے ہیں تیرے سنگِ آستاں کے آئینے میں جبرئیل امین کے سجدوں کے نشانات جوہرِ آئینہ کی طرح نظر آتے ہیں۔

۲۴۔ آمادہ یعنی تیار۔ مہیا۔ خدا تعالےٰ نے جو خاکیوں کو جان و دل و دین دیئے ہیں، وہ تیرے در پر سب نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔

۲۵۔ دل و جان اور کام و زبان سب تیری مدح کے لئے ہیں اور لوح وقلم اور دست وجبیں تیری تسلیم بجالانے کے لئے ہیں ظاہر ہے سلام ہاتھ سے کیا جاتا ہے اور سجدہ پیشانی سے ۔

۲۶ جو شخص خدا کا ممدوح ہو، اس کی مدح کس سے ہو سکتی ہے اور فردوسِ بریں کی آرائش سوائے خدا کے اور کون کرسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو حضرت علیؑ کی مدح کرتا ہے۔اس کے لئے بہشت آراستہ کی جاتی ہے

۲۷۔ اسداللہ نام اسدؔ تخلص بازار معاصی کی ایک جنس ہے جس کا سوائے تیرے کوئی خریدار نہیں۔

سعید لکھتے ہیں اسد اللہ حضرت علیؑ کا لقب ہے اس لئے ان سے خطاب کر کے کہا یعنی اے اسد اللہ علی...... الخ دوسرے شعر سے مطلب صاف ہو جاتا ہے۔

۲۸۔ چونکہ اس کو تیرے حوصلۂ فضل و کرم پر بہت ہی زیادہ یقین ہے اس لئے وہ اپنے عرض مطالب میں اس قدر گستاخ ہو گیا ہے۔

۲۹۔ اجابت یعنی قبولیت۔ میری دعا کو ایسا حسنِ قبول کا مرتبہ دے کہ میرے ایک ایک حرف پر قبولیت سو بار آمین کہے۔

۳۰۔ غمِ حسین سے میرے دل کو اس قدر لبریز کردے کہ خونِ جگر سے میری آنکھیں رنگین رہیں۔

۳۱۔ تیرے دُلدل کی اُلفت میں میری طبیعت کو ایسا شوق اور عشق ہو جائے کہ جہاں اس کا قدم ہو وہیں میری جبیں ہو۔

۳۲۔ اُلفت نسب دل کی صفت ہے یعنی ایسا دل جس کو اُلفت سے نسبت اور سینۂ توحید فضا سے مراد وہ سینہ جس کی فضا توحید ہو یعنی وہ توحید سے معمور ہو۔ مطلب یہ ہے۔ میرے دل کو ممدوح

کی اُلفت سے نسبت ہو اور میرے سینے کی فضا توحید سے معمور رہے۔ میری نگاہ اس کی جلوہ پرست ہو اور میرا نفس صداقت پسند۔

۳۳۔ دوزخ کے شعلے اور دھواں ممدوح کے دشمنوں پر صرف ہوں اور فردوس بریں کے گل و سنبل اس کے جواب کے لئے وقف ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆

۲۳۷

ہاں مہِ نَو سُنیں ہم اس کا نام ۱ جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح ۲ یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب ۳ بندہ عاجز ہے گردشِ ایّام!
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا ۴ آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص ۵ حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے ۶ لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہئے کہنا ۷ صبح جو جائے اور آئے شام!
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا ۸ تیرا آغاز اور ترا انجام!
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے ۹ مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں ۱۰ ایک ہی ہے اُمید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش ۱۱ غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو ۱۲ تب کہا ہے بطرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ ۱۳ قرب ہر روز بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا ۱۴ جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو ۱۵ پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون ۱۶ مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے ۱۷ اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص ۱۸ گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ، ۱۹ کیا نہ دے گا مجھے مےِ گلفام
جب کہ چودہ منازلِ فلکی ۲۰ کر چکی قطع تیری تیزیِ گام!
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر ۲۱ کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز، ۲۲ اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا، ۲۳ توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام ۲۴ تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں ۲۵ غم سے جب ہوگئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا، یہی غنیمت ہے ۲۶ کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دُشنام
کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس ۲۷ اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اُس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد ۲۸ چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ دام
بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار ۲۹ دل کے لینے میں جن کا تھا اِبرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ، اب تُو کہہ! ۳۰ اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا ۳۱ ہیں مہ و مہرو زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن! ۳۲ نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ ۳۳ مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف ۳۴ نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز ۳۵ جس کا ہر قول معنیِ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم ۳۶ رزم میں اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا ۳۷ اے ترا عہد فرخی فرجام
چشمِ بد دُور خسروانہ شکوہ ۳۸ لوحش اللہ عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم ۳۹ جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے ۴۰ ایرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے ۴۱ گیو گودرز و بیژن و رہّام
مرحبا موشگافیِ ناوک! ۴۲ آفریں آبداریِ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف ۴۳ تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند ۴۵ برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا، ۴۶ تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام
فنِ صورت گری میں تیرا گرز، ۴۷ گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اس کے مضروب کے سروتن سے ۴۸ کیوں نمایاں ہوصورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پزیر ہوئے ۴۹ صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور ان اوراق میں بکلکِ قضا ۵۰ مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش ۵۱ لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں ۵۲ گنبدِ تیز گرد نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں ۵۳ خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی ۵۴ وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز ۵۵ ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی ۵۶ دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجب حکم ۵۷ اس رقم کو دیا طرازِ دوام!
ہے ازل سے روانیِ آغاز ۵۸ ہو ابد تک رسائیِ انجام!

اسمہ تو کی خمیدگی کو سلام کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے ہلال! ذرا ہمیں اس کا نام بھی بتا دے، جس کو تو اس طرح جھک کر سلام کر رہا ہے۔

۲-ہر مہینے میں چاند دو دن چھپا کرتا ہے اور تیسرے روز پھر نکلتا ہے مثلاً اگر ۲۶ تاریخ کو چھپتا ہے۔ تو ۲۹ کو نکلتا ہے۔ ان دنوں میں صبح کے وقت بہت کم دیر کے لئے دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد دو دن غائب رہتا ہے کہتے ہیں۔ دو دن تو صبح دم نظر آیا تو ایسا ہی نازک اور پتلا تھا اور یہی تیرا انداز تھا۔ ان دنوں کا چاند بہت باریک ہوتا ہے۔

۳-پھر دو دن تو کہاں غائب رہا۔ ٹھیک ہے بندہ دنوں کی گردش سے عاجز ہے۔ گویا تیری کچھ خطا نہیں۔

۴-تُو اُڑ کے کہاں جاتا۔ کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ آسمان نے ہر طرف تاروں کا جال بچھا رکھا تھا اس لئے تو باہر نہ آ سکا۔

۵-اے خاص و عام کو سرور بخشنے والے! مرحبا اور عوام و عام کے سرور و نشاط کے باعث آفرین!

۶-چاند تیسرے دن نکلا ہے اس لیے کہتے ہیں کہ تین دن نہ آنے کی خفت مٹانے کے لئے اب تو عید کا مسرت بخش پیغام لے کر آیا ہے، اب تجھ سے کون پوچھ سکتا ہے کہ تو کہاں رہا۔

۷-تو ۲۶ ویں کی صبح کو غائب ہوا تھا اور ۲۹ ویں کی شام کو نکل آیا گویا صبح کو گیا تھا اور شام کو واپس آ گیا۔ پس اس کو بھولا نہیں کہتے جو صبح کا گیا شام کو آ جائے۔

قابلِ تعریف شعر ہے۔ کس خوبی سے محاورہ نظم کیا ہے۔

۸-ایک میں کیا، سب نے تیرے آغاز اور انجام کو جان لیا کہ تُو پہلے بڑھتا ہے، پھر تنزل پذیر ہوتا ہے اور پھر ترقی کے مدارج طے کر کے پورا چاند ہو جاتا ہے۔

۹-نمام بمعنی چغلخور۔ اے ہلال! تُو مجھ سے اپنے دل کا راز کیوں چھپاتا ہے؟ کیا تُو مجھے چغلخور سمجھتا ہے کہ میں کسی سے تیرا راز کہہ دوں گا؟

۱۰-یہ بات میں خوب جانتا ہوں۔ آج ساری دُنیا میں لوگوں کی صرف ایک امید گاہ ہے جہاں سے وہ مرادیں پاتے ہیں۔

۱۱-یہ میں نے مان لیا کہ تو اس کا حلقہ بگوش غلام ہے لیکن میں تجھ سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا غالب اس کا غلام نہیں ہے یعنی ہم دونوں اس کے غلام ہیں۔ پردہ کس بات کا ہے۔

۱۲-میں جانتا ہوں کہ تُو بھی یہ بات خوب جانتا ہے کہ میں بھی اس کا غلام ہوں یہی سبب ہے کہ میں نے تجھ سے بطور استفہام یہ بات پوچھی ہے کہ غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟

۱۳-اے ماہ! مہرِ تاباں کو اس کی بارگاہ میں قربِ ہر روزہ ہمیشہ کے لئے حاصل ہو تو ہو۔

۱۴-روشناسی :- باریابی۔ پایہ :- رتبہ۔ ماہ صیام :- ماہِ رمضان۔

لیکن تجھ کو اس کی بارگاہ میں روشناسی کا رتبہ سوائے عیدِ رمضان کی تقریب کے کبھی حاصل نہیں ہوتا۔

۱۵-میں یہ بات خوب جانتا ہوں اور تجھ کو بتائے دیتا ہوں کہ اب تو اس کے فیض سے پھر پُورا چاند بننا چاہتا ہے۔ مرزا صاحب نے مہِ نو کی رازداری حاصل کرنے کے لئے اس کو یہ بات بتلائی ہے۔

۱۶-تو ماہ بن۔ مہتاب بن۔ میں کون ہوں، مجھے تو کچھ انعام تھوڑا ہی دے گا۔ بڑا بے تکلف شعر ہے۔ عید کے انعام کی طرف کس خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے۔

۱۷-کہیں یہ خیال نہ کرنا کہ مجھے تجھ پر رشک آتا ہے، کیونکہ میں اب انعام سے محروم ہو جاؤں گا۔ نہیں یہ بات نہیں۔ تیرے انعام سے مجھے کیا کام ہے۔ میرا اور ان کا جدا معاملہ ہے۔ میں محروم نہیں ہوں کہ اس قسم کے خیالات کو اپنے دل میں جگہ دُوں۔

۱۸-اگر تجھے ممدوح سے رحمتِ عام کی امید ہے تو مجھے اس سے بخششِ خاص کی آرزو ہے۔ لفظ خاص استعمال کر کے اپنا رتبہ بڑھایا ہے۔

۱۹-وہ ممدوح جو تجھے عالم کے منوّر کرنے کی قوت عطا کرے گا۔ کیا وہ مجھے بے گل رنگ نہ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ضرور میری مراد بھی پوری ہوگی۔

۲۰-جب کہ تیری تیز رفتاری آسمان کے چودہ منازل طے کر چکے یعنی تو ہلال سے بدر بن جائے۔

۲۱-اور تیری چاندنی سے ہر گلی کوچہ، محل صحن اور در و دیوار منوّر ہو جائیں۔

۲۲-تو اس وقت میرے ہاتھ میں اپنی جیسی شکل کا چمکتا دمکتا ایک بلّوری جام دیکھنا۔

۲۳-کہتے ہیں شراب اور شبِ مہتاب کا نام آتے ہی میں قصیدہ لکھتے لکھتے غزل لکھنے لگا۔

اس موقع پر توسنِ طبع کو روکنے کی ضرورت تھی۔ لیکن ذکرِ شراب نے چابک کا کام کیا۔ اب وہ بھلا کہاں رُکتا ہے۔

۲۴۔ میں ویسے ہی مرجاتا، تو نے مفت میں میرے قتل کا الزام اپنے سر لیا اور اپنے آپ کو بدنام کیا۔

۲۵۔ شراب بھی حرام ہے اور زندگی بھی حرام ہے۔ کہتے ہیں جب غم سے زندگی حرام ہوگئی تو پھر میں کیوں نہ ہر وقت شراب پیے جاؤں کیونکہ شراب سے غم غلط ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب دونوں طرح زندگی حرام ہورہی ہے تو پھر آسان راستہ کیوں نہ اختیار کروں جواز شراب کا بہترین شاعرانہ استدلال ہے اور مضمون نہایت شوخ اور لطیف۔

۲۶۔ بوسے کا تو ذکر ہی نہ کرو۔ وہ ہمیں کب ملتا ہے۔ بس یہی غنیمت ہے کہ انہیں یہ بات معلوم نہیں کہ ہمیں گالیاں کھانے میں بھی لطف آتا ہے۔ خدا کرے انہیں یہ بات معلوم نہ ہو ورنہ وہ ہمیں اس لذت سے بھی محروم کردیں گے۔

۲۷۔ احرام کعبے میں باندھتے ہیں کہتے ہیں جس طرح اب ہم نے بجائے کعبہ کے دیر میں احرام باندھا ہے، اسی طرح ہم بجائے دیر کے کعبہ میں جاکر ناقوس بجائیں گے۔ مطلب یہ کہ جب ہمارا کچھ مذہب نہیں تو پھر ہم ہر مذہب کے برخلاف ہی چلیں گے۔

۲۸۔ مجھے وہ جام عرفان میسّر ہے، جس سے چرخ نے گردش مستعار لی ہے۔ یعنی اس جام کی شراب سے مست ہوکر آسمان رقص و گردش کر رہا ہے۔

۲۹۔ ابرام یعنی ضد۔ تعجب ہے جنھیں دل لینے کی ضد تھی۔ یعنی کہتے تھے کہ ہم ضرور تمہارا دل لیں گے۔ انہیں بوسہ دینے میں انکار ہے۔

۳۰۔ فرماتے ہیں، میں نے اپنا نام غالبؔ اس وجہ سے رکھا ہے کہ انہیں مجھ پر غصہ آئے اور وہ کہیں کہ اوہو یہ بھی غالب ہوگیا۔ حقیقتاً میں غالب نہیں بلکہ مغلوب ہوں۔ اپنا غالب نام رکھنا ان سے ایک چھیڑ ہے مطلب یہ ہے کہ ان کے غصہ میں بھی ایک لطف ہے۔

۳۱۔ یہاں سے پھر قصیدہ شروع ہوتا ہے اور شاعر ماہ سے مخاطب ہوکر کہتا ہے اے پری چہرہ اور تیز رفتار قاصد! میں تو سب کچھ کہہ چکا، اب تُو کیا کہتا ہے۔ بوجہ حُسن کے پری اور بسبب تیز

رفتاری کے چاند کو پیک تیز خرام کہا ہے۔

۳۲۔ مریخ کو بہرام فلک کہتے ہیں۔ وہ کون ہے جس کے در پر چاند سُورج زہرہ اور مریخ جبیں سائی کرتے ہیں؟

۳۳۔ اگر تُو نہیں جانتا تو میری زبانی اس شہنشاہ بلند مرتبت کا نام سُن!

۳۴۔ یعنی بہادر شاہ بادشاہ جو چشم و دل کے قبلہ ہیں اور جلال والا کرام کے مظہر ہیں کیونکہ چشم امید انہی کی طرف لگی ہوئی ہے اور دل ان کی طرف رجوع ہے۔

۳۵۔ حدیقہ:۔ باغ۔ طریقہ:۔ طریق، راستہ۔

وہ طریقۂ انصاف کے شہسوار اور باغِ اسلام کے نو بہار ہیں۔

۳۶۔ جس کا ہر فعل ایک معجزہ ہے اور جس کا ہر قول الہام ہے۔

۳۷۔ قیصر و جم:۔ دو جلیل القدر بادشاہ۔ رستم و سام:۔ ایران کے دو مشہور پہلوان۔

بزم میں قیصر و جم اس کے مہمان ہیں اور وہ اس کا میزبان ہے گویا اس کی شان یہ ہے کہ قیصر و جم جیسے بادشاہ اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں اور رزم میں رستم و سام جیسے مشہور پہلوانوں کا وہ استاد ہے۔ گویا رستم و سام ممدوح سے طریق ہائے جنگ سیکھتے ہیں۔

۳۸۔ یہاں سے گریز شروع ہوتا ہے کہتے ہیں اے شہنشاہ! تیرے لطف و کرم زندگی بڑھانے والے ہیں اور تیرا دورِ حکومت مبارک زمانہ ہے۔

۳۹۔ خدا تجھ کو نظرِ بد سے بچائے۔ تیرا شاہانہ دبدبہ ہے۔ اور ماشاءاللہ تیرا کلام عارفانہ کلام ہے۔

۴۰۔ قیصرِ روم جیسے عالیشان بادشاہ تیرے جاں نثاروں میں اور جام کے مرشد یعنی جمشید جیسے لوگ تیرے جرعہ خواروں میں ہیں یعنی تجھ سے فیض حاصل کرتے ہیں۔

سعید، آسی اور طباطبائی نے مرشد جام مولانا جامی مراد لیے ہیں۔ قیصر کے مقابلے میں جمشید ہونا چاہیے نہ کہ غریب جامی۔

۴۱۔ ایرج اور تور (فریدوں شاہ فارس کے بیٹے) خسرو (نوشیرواں کا بیٹا) اور بہرام بادشاہ عراق تجھ کو اپنے ملک کا وارث جانتے ہیں۔

۴۲۔سب مشہور پہلوان تیرے بازو کا لوہا مانتے ہیں۔

۴۳۔موشگافی:۔بال کو چیرنا۔ناوک:۔تیر۔صمصام:۔ تلوار۔

سبحان اللہ! تیرے تیر کی موشگافی کے بھی کیا کہتے ہیں اور میری تلوار کی آبداری کی کیا بات ہے۔

۴۴۔ہدف بمعنی نشانہ۔ تیرا تیر دشمن کے تیر کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ تیری تلوار دشمن کی تلوار میں گھس جاتی ہے، جس طرح نیام میں داخل ہوتی ہے۔

۴۵-۴۶۔دونوں شعروں میں لف ونشر مرتب ہے۔ تیرے کوہ پیکر ہاتھی کی چنگھاڑ نے بجلی کی کڑک کا دم بند کردیا ہے اور تیرے سبک رفتار گھوڑے کی چال برق کو کیسا الزام دے رہی ہے۔یعنی یہ کہتی ہے کہ اے برق! تو میرے ساتھ چل بھی نہیں سکتی۔ پیچھے رہ جاتی ہے۔

۴۷-۴۸۔صورت گری:۔تصویر کشی۔ دستگاہ:۔مہارت۔ ادغام:۔دوحرفوں کو ایک کردینا۔

اگر فنِ مصوری میں تیرا گرز پوری پوری مہارت نہ رکھتا ہوتو پھر مضروب کے سرو جسم سے ادغام کی تصویر کیونکر بنے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا گرز رزم خوردہ کے سروتن کو ایک کردیتا ہے اور اس طرح سے ادغام کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

۴۹۔رقم پزیر ہوئے:۔ لکھے گئے۔ لیالی:۔لیل کی جمع، رات۔ ایّام:۔دن۔

جب ازل میں دن اور رات کے صفحات لکھے گئے یعنی دن اور رات کی تخلیق ہوئی۔

۵۰۔تو ان صفحوں پر قضا کے قلم نے نقل نہیں بلکہ اجمال کے ساتھ احکام خداوندی تحریر فرمائے۔

۵۱۔شاہد:۔ معشوق۔ دشمن کام:۔وہ شخص جو دشمنوں کی مراد کے موافق تباہ حال ہو۔

تو معشوقوں کو عاشق کش اور عاشقوں کو دشمنوں کی مراد کے مطابق تباہ و برباد لکھ دیا یعنی معشوق عاشقوں کو قتل کیا کریں گے اور عاشق ہمیشہ برباد اور تباہ حال رہیں گے۔

۵۲۔آسمان کے متعلق یہ حکم ہوا کہ اس کو سب لوگ جلدی جلدی گھومنے والا نیلا گنبد کہیں۔

۵۳۔اس کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ معشوق کے خال کو دانہ اور زلف کو دام لکھا جائے۔

۵۴۔ لف ونشر مرتب ہے۔ پھر آگ کو سوز۔ پانی کو نمی۔ ہوا کو بھاگتے پھرنے کی قوت

اور خاک کو آرام کی خاصیت عطا کی گئی۔ رمیدن کے معنی بھاگنا۔

۵۵۔ خسرو:۔ بادشاہ÷شحنہ:۔کوتوال۔

سُورج کو دن کے بادشاہ کا لقب عطا ہوا اور ماہِ تاباں کو کوتوال شام کا۔

۵۶۔ توقیع سلطنت:۔فرمانِ شاہی÷ ارقام:۔تحریر÷

اسی طرح تیرے فرمانِ سلطنت کے لئے بھی حسبِ ضابطہ حکم نافذ ہوا۔

۵۷۔ حکمِ خداوندی سے کاتبِ حکم نے تیرے فرمانِ سلطنت پر ہمیشگی کا طغرا بنادیا ہے۔

کہ تیری سلطنت کے ہمیشہ قائم رہنے کا حکم ہوا۔

۵۸۔تیری سلطنت ازل سے جاری ہے۔خدا کرے اس کے انجام کی ابد تک رسائی ہو یعنی تیری سلطنت ازل سے ابد تک جاری رہے۔

۲۳۸

صبح دم دروازۂ خاور کھلا ۱ مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں ۲ شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود ۳ صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ۴ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو ۵ موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر ۶ اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا
تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر ۷ بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا
لاکے ساقی نے صبوحی کے لئے ۸ رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ ۹ کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا ۱۰ خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا
شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے ۱۱ رازِ ہستی اُس پر سرتا سر کھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں ۱۲ مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے ۱۳ عقدۂ احکامِ پیغمبر کُھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام ۱۴ اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کُھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے ۱۵ واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کُھلا
توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ۱۶ تھان سے وہ غیرتِ صرصر کُھلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب ۱۷ تو کہے بُت خانۂ آذر کُھلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کی ۱۸ منصبِ مہر و مہ و محور کُھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک ۱۹ میری حدِ وسع سے باہر کُھلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید ۲۰ کس نے کھولا کب کُھلا کیونکر کُھلا
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار ۲۱ مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کُھلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس ۲۲ لوگ جانیں طبلۂ عنبر کُھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کُھلا ۲۳ کاش کے ہوتا قفس کا در کُھلا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے ۲۴ یار کا دروازہ پاویں گر کُھلا
ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ ۲۵ دوست کا ہے راز دُشمن پر کُھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ! ۲۶ زخم لیکن داغ سے بہتر کُھلا
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں ۲۷ کب کمر سے غمزہ کے خنجر کُھلا
مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ ۲۸ رہ روی میں پردۂ رہبر کُھلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک ۲۹ آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کُھلا
نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ ۳۰ رہ گیا خط میری چھاتی پر کُھلا
دیکھیو غالبؔ سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کُھلا!

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال ۳۲ پھر مہ و خورشید کا دفتر کُھلا
خامہ نے پائی طبیعت سے مدد ۳۳ بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کُھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ ۳۴ یاں عرض سے رتبۂ جوہر کُھلا
مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا ۳۵ بادشہ کا رایتِ لشکر کُھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب ۳۶ اب علوئے پایۂ منبر کھلا
سکّۂ شہ کا ہوا ہے روشناس ۳۷ اب عیارِ آبروئے زر کُھلا!
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ! ۳۸ اب مآلِ سعیِ اسکندر کُھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے ۳۹ اب فریبِ طغرل و سنجر کُھلا
ہو سکے کیا مدح ہاں ایک نام ہے ۴۰ دفترِ مدحِ جہاں داور کُھلا
فکر اچھی پر ستائشِ ناتمام ۴۱ عجزِ اعجازِ ستائش گر کُھلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل ۴۲ تم پہ اے خاقانِ نام آور کُھلا
تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کُھلا!

۱۔ خاور:۔ یعنی مشرق۔ صبحدم مشرق کا دروازہ کُھل گیا۔ اس دروازے سے آفتاب عالمتاب کا جلوہ نظر آیا۔

۲۔ رات کو موتیوں کا خزانہ کُھلا ہوا تھا یعنی ہر طرف ستارے چمک رہے تھے۔ ان موتیوں کو ستاروں کے بادشاہ (آفتاب) نے صرف کر ڈالا۔ مطلب یہ ہے آفتاب طلوع ہوتے ہی ستارے چھپ گئے۔

۳۔ علم سیمیا ایک علم ہے جس کے زور سے ایسی چیزیں نظر آتی ہیں، جن کا حقیقتاً کوئی وجود نہیں ہوتا۔ فرماتے ہیں رات کو جو چاند اور ستارے ہمیں نظر آرہے تھے۔ حقیقتاً وہ کچھ نہ تھے، وہ صرف سیمیا کا کرشمہ تھے۔ اگر وہ کچھ ہوتے تو صبح کو بھی نظر آتے۔ چاند اور ستاروں کا یہ راز ہمیں صبح کو معلوم ہوا۔ رات کو ہم دھوکے ہی میں رہے۔

۴۔ کواکب یعنی ستارے۔ اصل میں کچھ ہیں اور نظر کچھ اور آتے ہیں۔ گویا یہ بازیگر ہیں، جو

ہمیں کُھلا دھوکا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ستارے ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ لیکن ہمیں قریب قریب نظر آتے ہیں۔ اکثر ستارے بے نور ہیں' لیکن سورج کی چمک سے منور ہوجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیارے ستارے معلوم ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بس یہی کُھلا ہوا دھوکا ہے۔

۵۔ رات کے وقت ان ستاروں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے آسمان پر ہر طرف موتیوں کا زیور کُھلا پڑا ہے۔

۶۔ صبح کو مشرق کی جانب ایک آتشیں چہرہ معشوق کُھلے سر نظر آیا گویا صبح کا منظر تبدیل ہوگیا (سورج نکل آیا)

۷۔ جب ہم نے جادو کو' توڑا تو معلوم ہوا کہ وہ آتشیں چہرہ معشوق نہیں' بلکہ بادۂ گل رنگ کا ایک ساغر ہے۔

۸۔ صبوحی بمعنی وہ شراب جو خمار دُور کرنے کے لئے صبح کو پی جاتی ہے۔ اس ساغر کو ساقی نے صبوحی کے لئے لا کر رکھ دیا ہے اور یہ ایک سونے کا پیالہ ہے جس پر سر پوش نہیں ہے۔

۹۔ یہاں سے گریز شروع ہوتی ہے۔ کہتے ہیں۔ اس وقت بزمِ سلطانی آراستہ ہوئی' گویا امن وامان کے کعبے کا دروازہ کُھل گیا۔

۱۰۔ بادشاہ کے سر پر سونے کا تاج آفتابِ عالمتاب سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے تاجِ زرّیں کے سامنے آفتاب ماند پڑ گیا۔

۱۱۔ وہ بادشاہ روشن دل بہادر شاہ ہے۔ جس کے روشن دل پر رازِ ہستی سرتا سر ظاہر ہے۔

۱۲۔ تکوین یعنی تخلیق، پیدا ہونا۔ اور وہ ایسا بادشاہ ہے کہ جس کے پیدا ہونے سے نو آسمانوں اور سات ستاروں کے پیدا ہونے کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نو آسمان اور سات ستارے اسی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

۱۳۔ وہ ایسا بادشاہ ہے کہ اس کے تاویل کے ناخن کے احکامِ پیغمبری کی گتھیاں کُھلتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ مسائل شرعی کو حل کرنے کی پوری پوری قابلیت رکھتا ہے۔

۱۴۔ دارا:- ایک عالی مرتبہ بادشاہ ÷ سرہنگ:- معمولی سپاہی ÷ دفتر:- رجسٹر ÷ جب اس کے لشکریوں کا رجسٹر کھولا گیا تو اس میں سب سے پہلے دارا کا نام نکل آیا۔ گویا دارا اس

۳۱۔ دیکھنا! غالب سے نہ اُلجھنا۔ وہ ظاہر میں کافر دکھائی دیتا ہے لیکن در حقیقت وہ ولی ہے۔ اگر وہ بگڑ بیٹھا تو پھر تمہاری خیر نہیں۔

۳۲۔ غزل لکھتے لکھتے پھر مدح سرائی کا خیال آ گیا اور مدح بادشاہ میں ایسے شعر قلم سے نکلنے لگے' جو چاند اور سورج کا مقابلہ کرتے ہیں۔ گویا ماہ وخورشید کا دفتر کُھل گیا۔

۳۳۔ گویا قلم بادبان اور طبیعت لنگر ہے۔ قلم اُٹھاتے ہی طبیعت اس کی مدد کرنے لگی۔ جس وقت قلم رواں ہوا' اسی وقت طبیعت کُھل گئی۔ یعنی خود بخود شعر موزوں ہونے لگے۔

۳۴۔ مدح عرض ہے اور ممدوح جوہر۔ مدح سے ممدوح کی شان وشوکت ظاہر ہوتی ہے۔ گویا عرض سے جوہر کا رتبہ معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عرض جوہر سے بڑھ گیا ہے۔

۳۵۔ رایت یعنی نشانِ لشکر' جھنڈا۔ جس وقت بادشاہ کا نشانِ لشکر کُھلا' اُسے دیکھ کر آفتاب کانپ اٹھا اور آسمان چکرا گیا۔ آسمان کا چکر کھانا اور آفتاب کا کانپنا ایک مسلمہ ہے۔ شاعر نے اس کا سبب نشانِ لشکر قرار دیا ہے۔

۳۶۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ منبر کا رتبہ کیوں بلند ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خطیب اس پر کھڑے ہو کر بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے۔

۳۷۔ سونے کی آبرو کا سبب یہ ہے کہ اس پر بادشاہ کے نام کا سکہ ہے۔

۳۸۔ آئینہ سکندر نے ایجاد کیا تھا کہتے ہیں کہ اتنی مدّت بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ سکندر نے آئینہ ایجاد کرنے میں اتنی کوششیں کیوں کی تھیں۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کے آئینے کو میرا ممدوح اپنے سامنے رکھے۔

۳۹۔ طغرل اور سنجر فریب سے ملک کے وارث بن بیٹھے تھے۔ اب جب کہ سلطنت ممدوح کے ہاتھ میں آئی تو ان کا یہ فریب ظاہر ہوگیا اور لوگوں نے دیکھ لیا کہ ممدوح ہی ملک کا حقیقی وارث ہے۔

۴۰۔ جہاں داور یعنی بادشاہِ عالم۔ میں اس کی کیا تعریف کرسکتا ہوں۔ ہاں میرا نام اس کے مدح خوانوں میں مشہور ہوگیا کیونکہ میں نے اس کی مدح میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جیسی مدح ہونی چاہئے تھی مجھ سے نہیں ہوسکتی۔

۴۱۔ فکر تو اچھی ہے۔ لیکن مدح ناتمام رہی۔ اس سے شاعر کے اعجاز کا عجز ظاہر ہوگیا۔ معجز بیانی

کا دعوے پھر اعجاز میں عجز ثابت کرنا مرزا صاحب ہی کا حصّہ ہے۔

۴۲۔ خاقان یعنی بادشاہ۔ اے نام آور بادشاہ! میں جانتا ہوں کہ آپ لوحِ ازل کی تحریر سے خوب واقف ہیں، اس لئے مجھے اپنا حال بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۴۳۔ صاحب قران اس بادشاہ کو کہتے ہیں' جس کی ولادت کے وقت زحل اور مشتری کا قران عظمےٰ ہو۔ ایسا بادشاہ بڑا فاتح اور جلیل القدر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔ تم اس وقت تک صاحب قرانی کرو جب تک روز وشب کے طلسم کا دروازہ کھلا ہے۔ یعنی ابد تک۔

۲۳۹

صفتِ انبہ

ہاں دلِ درد مند زمزمہ ساز ۱ کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا ۲ شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے ۳ نکتہ ہائے خرد فزا لکھئے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے ۴ خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے؟ ۵ ثمر و شاخ گوئے چوگاں ہے!
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں ۶ آئے یہ گوئے اور یہ میداں!
آم کے آگے پیش جاوے خاک ۷ پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک!
نہ چلا جب کسی طرح مقدور ۸ بادۂ ناب بن گیا انگور!
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے ۹ شرم سے پانی پانی ہونا ہے!
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے ۱۰ آم کے آگے نیشکر کیا ہے!
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ، نہ بار ۱۱ جب خزاں آئے تب ہو اُس کی بہار
اور دوڑایئے قیاس کہاں ۱۲ جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی ۱۳ کوہ کن باوجود غمگینی!
جان دینے میں اُس کو یکتا جان ۱۴ پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر ۱۵ کہ دوا خانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام ۱۶ شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے ۱۷ باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بحکمِ رب الناس ۱۸ بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات ۱۹ مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل ۲۰ ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس ۲۱ رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر یک بار ۲۲ پھینک دیتا' طلائے دست فشار
رونقِ کار گاہِ برگ و نوا ۲۳ نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہ روِ راہِ خلد کا توشہ ۲۴ طوبےٰ وسدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم ۲۵ ناز پروردۂ بہار ہے آم!
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو' ۲۶ نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد ۲۷ عدل سے اس کے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں عزّ و شانِ جاہ و جلال ۲۸ زینتِ طینت و جمالِ کمال
کارفرمائے دین و دولت و بخت ۲۹ چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اُس کا ہما کا سایہ ہے ۳۰ خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے!
اے مفیضِ وجود و سایۂ نور' ۳۱ جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوندِ بندہ پرور کو' ۳۲ وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دلشاد و شادماں رکھیو
اور غالب پر مہرباں رکھیو

۱۔ ہاں اے دلِ دردمند زمزمہ ساز تو خزانۂ راز کا دروازہ کیوں نہیں کھولتا۔ مطلب یہ ہے ضرور کھول!

۲۔ جس وقت طبیعت میں آمد ہوتی ہے اور قلم کاغذ پر چلتا ہے تو اس کا غذ پر رواں ہونا بالکل ایسا ہی

ہے۔ جیسے شاخِ گل سے پھول جھڑتے ہیں۔

۳۔ اے دل! تو مجھ سے کیا پوچھتا ہے کہ کیا لکھئے؟ تو عقل بڑھانے والے نکتے لکھ اور کیا لکھے گا۔

۴۔ رطب بمعنی خرما' کھجور۔ اچھا اس وقت تو آموں کے متعلق کچھ لکھ۔ لیکن اس طرح کہ قلمِ نخل رطب افشاں ہو جائے۔ مطلب ہے قلم سے بہت ہی شیریں مضامین ٹپکیں۔

۵۔ مردِ میداں یعنی مدِّ مقابل۔ ثمر کو گیند اور شاخ کو چوگان سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں آم کا کوئی مدِّ مقابل نہیں۔ اس کا ثمر گیند ہے اور شاخ چوگان ہے۔

۶۔ تاک یعنی انگور کی بیل ÷ انگور کی بیل کے دل میں یہ ارمان کیوں رہے کہ اُس نے آم سے مقابلہ نہیں کیا۔ میدان میں آئے اور مقابلہ کر لے ہمیں گو دہمیں میدان'' یہ چوگان ہے اور یہ گیند موجود ہے۔

۷۔ آم کے آگے انگور کی بیل کی کیا خاک پیش جا سکتی ہے۔ بس اسی جلن میں وہ پڑی اپنے جی کے پھپھولے پھوڑتی ہے۔ انگوروں کو پھپھولوں سے تشبیہ دی ہے۔

۸۔ جب آم کے سامنے انگور کی کچھ پیش نہ گئی تو وہ ہار کر شرابِ ناب بن گیا۔ گویا اس طرح اس نے اپنے جلے پھپھولے پھوڑے۔

۹۔ کہتے ہیں' شرابِ ناب بننے میں بھی کوئی خوبی نہیں' یہ تو مجبور ہو کر اپنے جی کو کھونا ہے اور شرم سے پانی پانی ہونا ہے۔

۱۰۔ نیشکر بمعنی گنا۔ تم مجھ سے پوچھو۔ تمہیں معلوم نہیں' میں تمہیں بتاتا ہوں۔ آم کے آگے نیشکر بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

۱۱۔ نہ تو اس میں پھول ہیں' نہ شاخیں ہیں' نہ پتے ہیں' نہ پھل ہیں۔ پھر سب سے زیادہ خرابی یہ ہے کہ جب خزاں کا موسم آتا ہے تو اس کی بہار آتی ہے۔ گنا سردیوں میں ہوتا ہے۔

۱۲۔ آم کی تعریف اس سے زیادہ کیا کی جائے۔ اور کہاں کہاں قیاس دوڑایا جائے۔ یوں سمجھ لو کہ جان بہت ہی شیریں ہے۔ لیکن آم جیسی مٹھاس اس میں بھی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آم جان سے بھی بہتر ہیں۔

۱۳۔ ۱۴۔ اگر جان میں آم جیسی شیرینی ہوتی تو کوہکن باوجود غمگینی کے اس آسانی سے جان نہ دیتا۔ اگرچہ جان قربان کرنے میں وہ یکتائے روزگار تھا' شیرینی اور کوہکن کی رعایت خوب آئی ہے۔

۱۵۔ ۱۶۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ پھل دواخانہ ازل میں تیار ہوا ہے۔ وہاں آتشِ گل کی آنچ پر قند کا قوام تیار کیا گیا اور پھر اس شیرے کے تار کا نام ریشہ کہلایا۔

۱۷۔ ۱۸۔ رافت یعنی مہربانی' محبت۔ یا یہ بات ہوگی کہ باغِ جنت کے باغبانوں نے جوشِ محبت میں جنت سے خداوند تعالےٰ کے حکم سے شہد گلاسوں میں بھر بھر کے ان پر مہریں لگا کر بھیج دیا ہے۔

۱۹۔ یا یہ بات ہے کہ خضر علیہ اسلام نے شاخ نبات زمین میں لگائی اور پھر اس کو مدّتوں تک (بجائے پانی کے) آبحیات دیا۔

۲۰۔ پھر کہیں جا کر یہ درخت پھل لایا' ورنہ کہاں ہم اور کہاں یہ درخت۔

۲۱۔ ۲۲۔ کہتے ہیں خسرو کے پاس اس قسم کا کندن (خالص سونا) تھا کہ ہاتھ سے دبا کر اس کی جو چیز چاہتے تھے' بنا لیتے تھے۔ پرویز نے اس کا ترنج بنا لیا تھا۔ وہ ترنج اس کے دسترخوان پر رکھا رہتا تھا۔ پھر کسریٰ نے اس کے سونے کا ساگ بنوایا اور اس سے اپنے دسترخوان کو زینت دی۔ مرزا صاحب نے اسی سونے کو طلائے دست فشار اس لئے کہا ہے کہ موم کی طرح ہاتھ سے دب جاتا تھا۔

فرماتے ہیں خسرو کے پاس ایک سونے کا ترنج تھا۔ اس کا رنگ آم کی طرح زرد تھا۔ لیکن اس میں آم جیسی خوشبو نہیں تھی۔ اگر وہ کہیں آم کو دیکھ پاتا تو اس خالص سونے کو پھینک دیتا۔

۲۳۔ برگ ونوا سے مراد درخت اور خوش الحان پرندے۔ کارگاہ کے معنے کارخانے کے ہیں۔ یہاں چمن مراد ہے۔

کہتے ہیں۔ آم پُر بہار چمن کی رونق ہے اور خاندانِ آب وہوا یعنی بہار کے لئے باعث ناز ہے۔ دودمانِ آب وہوا سے باغ بھی مراد لے سکتے ہیں۔

۲۴۔ طوبےٰ:۔ جنت میں ایک درخت ہے جس کی ایک ایک شاخ بہشت میں جانے والوں کے مکانوں میں ہوگی۔ اس شاخ سے طرح طرح کے میوے اور خوشبوئیں پیدا ہوں گی ÷

سدرہ:۔ ساتویں آسمان پر ایک درخت ہے۔

آم جنت میں جانے والوں کا توشہ ہے اور طوبےٰ اور سدرہ کا جگر گوشہ ہے۔ بقول بیخود مراد یہ ہے کہ آم کھاتے کھاتے کوئی مر جائے تو وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ خوب توضیح ہے۔

۲۵۔ آم کا درخت خوب لدا پھندا اور پھولا پھلا ہے۔ گویا آم کو بہار نے بڑے ناز و نعم سے پالا

ہے۔

۲۶۔نوبر:۔بمعنی نیا پھل ÷

خاص کروہ آم جو آسانی سے دستیاب نہ ہوتا ہو اور باغِ سلطان کا نیا پھل ہو۔

۲۷۔اور بادشاہ بھی وہ بادشاہ جو عہدو پیمان کی ولایت کا والی ہے اور جس کا عدل وانصاف زمانے کا حامی۔

۲۸۔ میرا بادشاہ دین کے لئے باعثِ فخر ہے اور جاہ وجلال کی عزت وشان اس سے قائم ہے۔

اس کی ذات طینت کے لئے آرائش اور اُس کا جمال کمال کے لئے زینت کا باعث ہے۔

۲۹۔ کارفرما:۔یعنی حاکم' بادشاہ÷ وہ دین ودولت' اور بخت کا بادشاہ ہے اور تاج ومسند وتخت کو اس کی ذات سے آرائش حاصل ہے۔

۳۰۔اس کا سایہ ہُما کا سایہ ہے' گویا جس پر وہ اپنا سایہ ڈالتا ہے' وہ بادشاہ ہو جاتا ہے اور مخلوق کے سر پر اس کا سایہ خدا کا سایہ ہے۔یعنی وہ ظل اللہ ہے۔

۳۱۔ مفیض یعنی فیض پہنچانے والا۔ مراد خدا۔اے نور اور سائے کے فیض رساں جب تک سایہ اور نور کا وجود ہے۔

۳۲۔اس وقت تک اس بندہ پرور بادشاہ کو جو خزانوں کا مالک اور تخت وتاج کا وارث ہے۔

۳۳۔شاد دلشاد اور شادمان رکھیو اور اس کے ساتھ وہ غالب پر بھی مہربان رہے۔

قطعات

۲۲۰

اے شہنشاہِ فلک منظر و بے مثل ونظیر ۱ اے جہاندارِ کرم شیوہ وبے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ ۲ فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام ۳ تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کُھلا رابطۂ قربِ کلیم ۴ تجھ سے دُنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ ۵ بکرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش وطرب کی توفیر ۶ تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر ۷ زُہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین ۸ تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحّم مرے جینے کی نوید ۹ تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں ۱۰ چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ ۱۱ پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم ۱۲ کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل!

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی' ۱۳ غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل!

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر ۱۴ کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل!

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح ۱۵ میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف ۱۶ جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل!

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر ۱۷ کعبۂ امن واماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل!

۱۔فلک منظر:۔آسمان مرتبت،یعنی آسمان جیسے مرتبہ والا۔ بے عدیل:۔بے مثل بے شبہ:۔بے شبہ'جس کا کوئی ثانی نہ ہو÷

اے آسمان جیسے مرتبے والے اور بے مثل و بے نظیر شہنشاہ اور ایک کرم گستر جہاندار! تُو کرم گستری میں بے مثال اور لاثانی ہے۔

۲۔فرق:۔مانگ' سر÷ اورنگ:۔تخت÷ اکلیل:۔تاج۔

تخت تیرے پاؤں سے اپنے سرِ ارادت کو ملتا ہے اور تاج تیرے سر سے سعادت حاصل کرتا ہے۔

۳۔شانہ بمعنی کنگھی۔تیرا اندازِ سخن زلفِ الہام کے لئے شانہ ہے یعنی وہ الہامی باتوں کو سلجھاتا ہے اور تیرے قلم کی رفتار جبریل علیہ السلام کے پروں کی جنبش ہے یعنی اس سے الہامی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۴۔ کلیم اللہ کو جو خداوند کریم سے قرب حاصل تھا' وہ سُنی سُنائی بات تھی۔ لیکن تیرے قرب خداوندی کو دیکھ کر لوگوں نے اس بات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کلیم کو قربِ خداوندی کیونکر حاصل ہوا تھا۔ اس طرح تیرے دسترخوان کو دیکھ کر اہلِ دُنیا کو سخاوت خلیل اللہ (حضرت ابراہیم) کا اندازہ ہوگیا۔ مطلب یہ

ہے کہ دونوں خصوصیات تجھ میں موجود ہیں۔

۵۔ اپنی سخنوری سے تُو معنے ولفظ کا رتبہ بلند کرتا ہے اور اپنی سخاوت سے تُو بحرِ قلزم اور دریائے نیل کی پیشانی پر داغ لگاتا ہے۔ یعنی تیری سخاوت کے سامنے قلزم و نیل بھی شرمندہ ہیں۔

۶ و ۷۔ اس لئے تاکہ تیرے عہد میں عیش و مسرّت کی کثرت ہو نیز اس لئے کہ تیرے عہد میں رنج والم کی قلّت ہو ماہ نے بُرجِ ثور سے باہر جانا چھوڑ دیا اور زہرہ نے بُرجِ حوت سے نکلنا ترک کر دیا۔ جب یہ سیارے ان بُرجوں میں ہوتے ہیں تو زمانہ کثرت سے عیش کرتا ہے۔

۸۔ انجاحِ مقاصد بمعنی مقاصد کا پورا کرنا۔ تیری عقل و دانش میری کوتاہیوں اور غلطیوں کی اصلاح کرتی ہے اور تری بخشش میرے مقاصد کو پورا کرنے والی ہے۔

۹۔ اقبال بمعنی التفات۔ تیرے رحم و کرم کا میری جانب ملتفت ہونا میرے جینے کی خوشخبری ہے اور تیرا اندازِ تغافل میرے مرنے کی دلیل ہے۔ یعنی تیرے رحم سے میں جی سکتا ہوں اور تیرا تغافل میرے لئے موت ہے۔

۱۰۔ میرے ناموافق مقدر نے چاہا تھا کہ تُو مجھے پناہ نہ دے اور فلکِ کج رفتار کا ارادہ تھا کہ مجھ کو ذلیل و خوار کر دے۔

۱۱۔ فلکِ کج رفتار نے پہلے میرے ناخنِ تدبیر میں کیل ٹھونک دی اس کے بعد میرے سر رشتہ اوقات (کاروبار) میں گرہ ڈال دی تاکہ ناخنِ تدبیر عقدہ کشائی نہ کر سکے۔

۱۲۔ جرِّ ثقیل:- ایک علم ہے جس میں بھاری چیزوں کے اُٹھانے کے قاعدے بتلائے جاتے ہیں۔ تپشِ دل میرے لئے خوفِ عظیم کا باعث ہے اور سانس لینا بغیر جرِّ ثقیل کی امداد کے ممکن نہیں۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ دل کی تپش خوفِ عظیم سے خالی نہیں۔ اور سانس لینا جرِّ ثقیل سے کم نہیں۔

۱۳۔ لقا کی ڈاڑھی:- داستانِ امیر حمزہ میں مرقوم ہے کہ لقا کی ڈاڑھی کے ہر ایک بال میں موتی پروئے جاتے تھے ÷ عمرو کی زنبیل:- عمرو عیار کی زنبیل میں ایک دُنیا آباد تھی۔ عمرو عیار ہر چیز کو اس میں ڈال دیتا تھا۔ لیکن وہ کسی طرح پُر نہ ہوتی تھی۔

کہتے ہیں میرا وہ کاغذ جس پر میں نے اشعار لکھے ہیں' معانی کے موتیوں سے اس قدر بھرا ہوا ہے' جیسے لقا کی ڈاڑھی اور دُنیا زمانے کے غم میرے سینے میں اس طرح سمائے ہیں کہ اسے عمرو عیار کی زنبیل

کہنا چاہئے کہ وہ کسی طرح پُر ہی نہیں ہوتا۔

۱۴۔ میری فکر میں اشارات کثیر ہیں' اگرچہ میرا قلم کم لکھنے کا عادی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری عبارت کم ہے' لیکن اس میں معانی بہت ہیں۔

۱۵۔ ابہام:- کسی بات کو نہایت مبہم طور پر بیان کرنا ÷ توضیح:- کسی بات کو وضاحت سے کھول کر بیان کرنا۔

میرا مبہم بیان بھی ایسا صاف ہوتا ہے کہ توضیح و تشریح اس پر قربان ہوتی ہے اور میری مجمل اور مختصر بات سے تفصیل ٹپکتی ہے۔ مطلب یہ ہے تُو میرے اشاروں کنایوں کو بالتفصیل سمجھتا ہے۔

۱۶۔ نیک حالت بمعنی خوش حالی۔ اگر میں تکلیف میں نہ ہوتا۔ یعنی خوش حال ہوتا تو اے ممدوح میں آپ کو نہ دیتا۔ نیز اگر میری طبیعت پریشان ہوتی تو میں اپنا مقصد (صلہ و انعام) حاصل کرنے کے لئے اتنی جلدی نہ کرتا۔

۱۷۔ اے قبلۂ دو عالم! غریب نوازی میں اتنی دیر نہیں ہونی چاہئے اور اے کعبۂ امن و امان! عقدہ کشائی میں اس قدر ڈھیل مناسب نہیں۔ سارے قطعہ کا نچوڑ یہی شعر ہے۔ بقول طباطبائی عقدہ کشائی سے ڈھیل دینے کو جس قدر مشابہت ہے' اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یعنی یہ سچ ہے کہ بے ڈھیل دیئے گرہ نہیں کھل سکتی۔ لیکن اتنی ڈھیل کوئی نہیں دیتا۔

۲۲۱

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری — کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ — قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

۱۔ غیروں کی وفاداری تقریر کرتے تھے یعنی بیان کیا کرتے تھے۔ یہ فارسی محاورے کا ترجمہ ہے کہتے ہیں وہ دن گئے جب تم بغیر سوچے سمجھے غیروں کی وفاداری کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اور ہم خاموش بیٹھے سُنا کرتے تھے۔

۲۔ اب جب کہ غیروں سے آپ کی بگڑ گئی ہے تو اب آپ شرمندہ کیوں ہوتے ہیں اور اس شرمندگی کے باعث ہم سے ملنا جلنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اس شرمندگی کو چھوڑو اور ہم سے مل جاؤ۔ ہم سے قسم لے لو جو کبھی ہم یہ بھی کہیں کہ کیوں ہم نہ کہتے تھے۔ "کیوں ہم نہ کہتے تھے"۔ میں جو لطف ہے' وہ بیان میں

نہیں آسکتا۔ ایسے موقع پر صرف اسی قدر کہا جاتا ہے اور اس سے مطلب یہ ہے کہ ہم نہ کہتے تھے یہ لوگ بے وفا ہیں۔

۲۴۲

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں! ۱ اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب ۲ وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ انکی نگاہیں کہ حف نظر ۳ طاقت رُبا وہ اُن کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

۱۔ ہائے ہائے اے ہم نشین! تو نے کلکتہ کا ذکر کر کے میرے دل پر ایک تیر چلا دیا یعنی کلکتہ یاد آنے سے میرا دل تڑپ گیا۔

۲۔ مطرّا یعنی شاداب۔ ہائے ہائے کلکتہ کا نام سنتے ہی وہاں کے وہ ہرے بھرے صاف ستھرے سبزہ زار اور طرح دار معشوق یاد آ گئے۔

۳۔ حفِ نظر بمعنی چشم بد دور۔ ہائے ہائے وہ ان کی صبر آزما نگاہیں' خدا ان کو نظرِ بد سے بچائے اور ان کے وہ طاقت رُبا اشارے یاد آ گئے۔

۴۔ سبحان اللہ! کلکتہ کے وہ تازہ اور شیریں میوے اور ہائے ہائے وہاں کی وہ خالص اور خوش گوار شرابیں۔

چکنی ڈلی

۲۴۳

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی ۱ زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے ۲ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے ۳ حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے
مسّی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے!

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے ۵ سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے!
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجیے ۶ خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلےٰ کہیے!
حجرالاسودِ دیوارِ حرم کیجیے فرض ۷ نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے!
وضع میں اس کو سمجھ لیجیے قافِ تریاق ۸ رنگ میں سبزۂ نو خیز مسیحا کہیے!
صومعے میں اُسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز ۹ میکدے میں اُسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے!
کیوں اُسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے ۱۰ کیوں اُسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے
کیوں اُسے گوہرِ نایاب تصور کیجیے! ۱۱ کیوں اُسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اُسے تکمۂ پیراہنِ لیلےٰ لکھیے ۱۲ کیوں اُسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے!

حالیؔ:۔ (یادگارِ غالب) ''۱۸۷۱ء میں جب کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتہ گئے ہوئے تھے مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتہ کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے' نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے اور میں بھی حاضر تھا۔ ایک مجلس میں جہاں مرزا صاحب بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا' شعرا کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں۔ ویسا نہیں۔ اس پر بات بڑھی۔ اس شخص نے کہا۔ فیضی جب پہلی بار اکبر کے رُوبرو گیا تھا۔ اُس نے ڈھائی سو شعروں کا قصیدہ اُسی وقت کہہ کر پڑھا تھا۔ مرزا بولے اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر کہہ سکتے ہیں۔ مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے یہ گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا''۔

اُردو شاعری میں اس قطعہ کی مثال مشکل سے ملے گی۔ مرزا نے گیارہ شعروں میں عدیم المثال تشبیہات نظم کیں جن کی تعداد ۲۱ ہے۔

۱۔ کفِ دست یعنی ہتھیلی:۔ آپ کی ہتھیلی پر جو چکنی ڈلی ہے' اُس کی جس قدر تعریف کریں' درست ہے۔ یہ چکنی ڈلی اچھی اس سبب سے ہے کہ آپ کے ہاتھ پر رکھی ہے۔

۲۔ انگشت بدنداں:- حیرانی کی کیفیت ÷ سر بگریباں ÷ فکر کی حالت۔

قلم حیران ہے کہ میں اسے کیا لکھوں اور قوّتِ گویائی فکر میں ڈوب گئی ہے کہ میں اسے کیا کہوں۔

۳۔ حرز یعنی تعویذ۔ اس کو عزیزانِ گرامی کے خط کی مُہر لکھا جائے یا طرح دار اور سُرخ و سپید معشوقوں کے بازو کا تعویذ کیا جائے۔

۴۔ اسے حسینوں کی مسّی بھری انگلی کی پور لکھیے یا عاشق شیدا کے جگر کا داغ کہیے۔

۵۔ خاتم:- انگوٹھی ÷ مانا:- مشابہ ÷ سر پستان:- بھٹنی ÷

اسے حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ کی انگوٹھی کا مشابہ لکھا جائے یا پریزاد کے پستان کی بھٹنی کہا جائے۔

۶۔ اسے قیس کے اخترِ سوختہ سے نسبت دینی چاہیے یا لیلیٰ کے دلکش چہرے کا سیاہ تل کہنا چاہیے؟

اختر سوختہ کہکر چکنی سے تشبیہ تام پیدا کر دی ہے۔ چکنی سیاہ ہوتی ہے۔

۷۔ یا تو اسے دیوارِ حرم کا حجر الاسود فرض کیجیے یا بیابانِ ختن کے ہرن کا نافہ لکھیے۔ حجر الاسود ایک سیاہ پتھر ہے، جو خانۂ کعبہ کی دیوار میں نصب ہے۔ حجاج اسے بوسہ دیتے ہیں۔ اعتقاد یہ ہے کہ اسے بوسہ دینے سے گناہ دُور ہو جاتے ہیں۔

۸۔ اگر اسے وضع میں تریاق کا قاف سمجھیے تو رنگ میں مسیحا کا سبزۂ نوخیز کہیے۔ طباطبائی لکھتے ہیں ''سمجھیے'' میں میم ساکن اور جیم متحرک نظم ہوا ہے اس طرح کسی اُستاد نے نہیں باندھا۔ خلاف محاورہ ہے۔

۹۔ صومعہ:- عبادت خانہ ÷ مہرِ نماز:- سجدہ گاہ۔ جس پر اہلِ تشیع سجدہ کرتے ہیں ÷ خشتِ خمِ صہبا:- شراب کے مٹکے کے منہ پر ایک اینٹ رکھ دیتے ہیں کہ شراب اُڑنے نہ پائے۔

اگر اس چکنی ڈلی کو عبادت خانے میں مہرِ نماز ٹھہرائیے تو میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے۔

مطلب یہ ہے کہ عبادت خانوں میں اس پر زاہد اور مے خانوں میں اس پر مست سجدہ کرتے ہیں۔

۱۰۔ اس چکنی ڈلی کو گنجِ محبت کے دروازے کا قفل کیوں لکھیے اور کیوں اسے تمنّا کی پرکار کا مرکز کہیے۔ اس لئے کہ تمنّا پرکار کی طرح اس کے گرد گھومتی ہے۔

۱۱۔ کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیا جائے اور کیوں اسے عنقا کی آنکھ کی پُتلی کہا جائے۔

۱۲۔ سلمہ عرب کی ایک حسینہ کا نام ہے۔ کہتے ہیں کیوں اسے لیلے کے پیراہن کا تکمہ لکھیں اور کیوں اسے سلمہ کی اُونٹنی کا نقشِ قدم کہیں۔

۱۳۔ ان سب تشبیہوں سے بہتر یہ تشبیہ ہے کہ بندہ پرور کے کفِ دست کو دل تصوّر کر لیجیے اور اس چکنی ڈلی کو اس دل کا خالِ سویدا کہیے۔

۴۴۴

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے ۱ مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر ۲ جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

حالی:- جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہلِ دربار کے لئے بطورِ اولوش کے بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکریے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گزرانتے تھے۔ یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے۔ جس وقت بادشاہی چوبدار اولوش لے کر آیا۔ ایک باہر کا رہنے والا طالب علم جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اُس نے متعجب ہو کر پوچھا۔ کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطورِ اولوش کے تقسیم ہوتی ہے۔ مرزا نے کہا۔ ارے احمق چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جنابِ باری میں فریاد کی کہ دُنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں اور مجھ سے سینکڑوں چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے، ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا۔ اے چنے! تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے، ورنہ ہمارا بھی جی یہی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔

۱۔۲۔ حضور والا نے جو مجھے بیسن کی روغنی روٹی بھیجی ہے، اس کی حقیقت تو مجھ سے نہ پوچھ۔ بس یہ سمجھ لے کہ اگر حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی کھاتے تو بہشت سے ہرگز باہر نہ نکالے جاتے۔

سہرا

۴۴۵

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا ۱ باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے ۲ ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ ۳ مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی ۴ ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا ۵ ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے ۶ رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز ۷ چاہئے پھولوں کا بھی ایک مکرّر سہرا
جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے ۸ گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رُخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک ۹ کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابر بہار ۱۰ لائیگا تابِ گراں باریٔ گوہر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں ۱۱ دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

بادشاہ کے چھوٹے بیٹے مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر مرزا نے یہ سہرا لکھا اور ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں گزرانا۔ اس سے پہلے اُردو میں سہرے لکھنے کا دستور نہ تھا۔ گویا مرزا غالبؔ سہرے کے موجد ہیں۔

۱۔ اے نصیب! خوش ہو کہ آج تیرے سر سہرا ہے۔ اب تُو شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا باندھ۔ افسوس ہے مرزا صاحب پورا محاورہ نظم نہیں کر سکے۔ محاورہ میں خالی سہرا نہیں بولا جاتا۔ ظاہر کرنا چاہئے تھا کہ کس چیز کا سر سہرا ہے۔ شعر کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اصلی سہرا مراد ہے۔ حالانکہ مصنّف کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ اُستاد ذوقؔ نے اپنے مطلع میں یہ کمی پوری کردی ہے۔

اے جوان بخت مبارک تجھے سر پر سہرا آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

۲۔ تیرے اس چاند سے مکھڑے پر سہرا بہت ہی بھلا معلوم دیتا ہے۔ گویا سہرا تیرے حسنِ دل افروز کا زیور ہے۔

۳۔ لمبر:۔نمبر۔درجہ۔گزشتہ صدی میں لمبر ہی مستعمل تھا۔طرفِ کلاہ:۔گوشۂ کلاہ÷
اے گوشۂ کلاہ! تجھے شہزادہ کے سر پر چڑھنا کج زیب دیتا ہے۔ لیکن مجھے ڈر یہ ہے کہ کہیں تیرا درجہ سہرا نہ چھین لے۔ یعنی سہرا باندھنے سے کہیں تو نیچے نہ دب جائے۔

۴۔ مرزا صاحب نے کشتی کے لفظ سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ کہتے ہیں۔ اس سہرے کو گوندھنے میں ایک ناؤ موتی پرودئے گئے ہوں گے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر سہرے کو کشتی میں لگا کر کیوں لاتے۔ ذوقؔ کا یہ شعر غالبؔ کے اس شعر سے بہت بڑھا ہوا ہے۔

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک کشتی زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

۵۔ دریا بمعنی سمندر۔ سات سمندروں کے موتی جمع کئے ہونگے پھر کہیں جا کر اس انداز کا گز بھر سہرا بنا ہوگا۔ بنا کا لفظ خوب ہے۔

۶۔ دُولھا کے چہرے سے جو گرمی کے باعث پسینے کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سہرے کی لڑیاں نہیں ہیں بلکہ ابر گہر بار کی رگیں ہیں۔ گرمی سے گرمیٔ حسن مراد ہے۔

۷۔ یہ ایک بے ادبی تھی کہ سہرا قبا سے آگے بڑھ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قبا کے برابر آ کر رُک گیا اور آگے نہ بڑھا۔

۸۔ تاکہ شہزادے کے سہرے میں گندھ کر موتی اس بات پر نہ اترائیں کہ ہم ہی سب کچھ ہیں۔ اس لئے پھولوں کے سہرے کی بھی ضرورت ہے۔

۹۔ جب خوشی کے مارے پھول اپنے میں نہیں سماتے تو پھر پھولوں کا سہرا کوئی کیونکر گوندھ سکتا ہے۔
بیخودؔ:۔کلیوں کا کھلنا گویا قبائے گل کا جوشِ مسرّت سے چاک ہو جانا ہے۔ ایسی صورت میں سہرے کا گوندھا جانا دشوار ہو گیا ہے۔

۱۰۔ ادھر رخ روشن کی دمک ہے اُدھر گوہر غلطان کی چمک ہے پھر بھلا سر مہ و اختر کی چمک دمک کیوں نہ دکھلائے۔

۱۱۔ اس سہرے میں ریشم کا تار نہیں ہے بلکہ رگِ ابرِ بہار ہے اس لئے وہ موتیوں کے بھاری وزن کو بخوبی اُٹھا لے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ریشم کا تار اس قدر موتیوں کے بوجھ کو نہیں اُٹھا سکتا اور ابرِ بہار میں تو موتی برسا ہی کرتے ہیں۔

۱۲۔ ہم سخن فہم ہیں' غالبؔ کے طرفدار نہیں کہ اس کی رو رعایت کریں۔ بھلا دیکھیں' اس سہرے سے بڑھ کر کوئی سہرا کہہ دے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے بہتر سہرا لکھنا نا ممکن ہے۔ یہ غالبؔ ہی کا حق ہے۔

آبحیات:۔" جہاں پناہ نے جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا۔ تو مقطع دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔ اُستاد ذوقؔ مرحوم جو حسبِ معمول حضور میں گئے تو یہ سہرا دیا اور کہا۔ اُستاد اسے تو دیکھو انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے فرمایا۔ تم بھی ایک سہرا لکھ دو۔ عرض کی بہت خوب' پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور کہا کہ مقطع کو بھی دیکھا؟ عرض کی حضور دیکھا۔ غرض وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا:۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا ۱ آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک ۲ کشتی زریں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حُسن سے مانندِ شعاعِ خورشید ۳ رُخِ پُر نُور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

وہ کہے صَلِ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ ۴ دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تابِ اور بنی میں رہ اخلاص بہم ۵ گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دُھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی ۶ گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیونکر سہرا

رُوئے فرّخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار ۷ تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش ۸ سر پہ دستار ہے' دستار کے اُوپر سہرا

اِک گہر بھی نہیں صدکانِ گہر میں چھوڑا ۹ تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہار ۱۰ اللہ اللہ رے پھولوں کا معطّر سہرا

سر پہ طرہ ہے مزّین تو گلے میں بدّھی ۱۱ کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک ۱۲ کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اُٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے ۱۳ دمِ نظارہ ترے رُوئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا ۱۴ واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنا گر سہرا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سُنا دو ان کو

دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اربابِ نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اسی وقت انہیں ملا اور شہر کی گلی گلی کوچے کوچے میں پھیل گیا۔ مرزا بڑے اداشناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور۔ اسی وقت یہ قطعہ لکھ کر حضور میں گزرانا۔ سب طرف تعریفیں ہوئیں۔

معذرت

۲۲۶

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی ۱ اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری ۲ کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل ۳ ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں ۴ مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال ۵ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر ۶ سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدّعا ۷ جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر ۸ دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات ۹ مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ ۱۰ سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت نہیں بری ۱۱ ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

۱۔ مجھے اپنا واقعی حال عرض کرنا مقصود ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے اپنے حسنِ طبیعت کا بیان منظور نہیں۔

۲۔ میرے آباؤ اجداد کا پیشہ سو سال سے سپاہ گری ہے اور یہی پیشہ میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ شاعری کو ذریعہ عزّت نہیں سمجھتا۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ سیف اہلِ قلم سے زیادہ عزّت رکھتے ہیں۔

۳۔ آزادہ رو:- آزادروش ÷ مسلک:- طریقہ' راستہ ÷

میں ایک آزادہ رو انسان ہوں اور میرا طریقہ' صلحِ کل ہے' میں کسی کا دل نہیں دکھاتا اور میں ہرگز کسی سے عداوت و بغض نہیں رکھتا۔

۴۔ یہ سچ ہے کہ مجھے عزت' مرتبہ اور دولتمندی حاصل نہیں۔ لیکن یہ کیا کم اعزاز ہے کہ میں ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ کا غلام ہوں۔

۵۔ بادشاہ کا غلام ہوتے ہوئے' مجھے بادشاہ کے اُستاد سے پرخاش ہو۔ توبہ۔ توبہ۔ یہ تاب۔ یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے۔

٦۔ بادشاہ کا دل جامِ جہاں نما ہے۔ اس میں وہ ہر ایک چیز کی حقیقت دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے مجھے اپنی بریت کے لئے قسم کھانے اور گواہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔

٧۔ بھلا مجھے ریختہ گوئی سے کیا واسطہ۔ کہاں میں کہاں ریختہ گوئی۔ میں تو فارسی کا شاعر ہوں۔ ہاں صرف خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُردو میں کہہ لیتا ہوں۔

٨۔ امتثالِ امر یعنی تعمیلِ حکم۔ محض حضور کے حکم سے یہ سہرا لکھا گیا تھا اور وہ بھی اس وقت جب میں نے دیکھا کہ سوائے تعمیلِ حکم کے کچھ چارہ کار نہیں۔

٩۔ سہرے کے مقطع میں محض ایک شاعرانہ اور سخن گسترانہ بات آ پڑی ہے ورنہ اس سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ میں محبت کے راہ ورسم منقطع کردوں۔

١٠۔ اگر میں نے اس مقطع میں کسی پر چوٹ کی ہو تو کالا منہ ہو۔ میں کوئی دیوانہ نہیں، مجنوں نہیں، وحشی نہیں، کہ ایسی قبیح حرکت کرتا۔

١١۔ مانا کہ میری قسمت بُری ہے لیکن میری طبیعت بُری نہیں۔ یہ شکر کا مقام ہے کہ مجھے کسی سے اس بات کی شکایت نہیں۔

١٢۔ خدا گواہ ہے کہ میں اپنے قول کا سچا ہوں اور میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے جھوٹ بولنے کی عادت قطعی نہیں۔

مدح

۲۴۷

نصرتِ الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے ۱ تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے ۲ رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں ۳ غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست ۴ نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں ۵ یہ دُعا شام و سحر قاضیٔ حاجات سے ہے

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا ٦ گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے
اُس پہ گزرے نہ گماں ریو وریا کا زنہار
غالبؔ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

١۔ اے نصرت الملک بہادر! آپ مجھے یہ بتلائیں کہ مجھے جو آپ سے اتنی عقیدت اور محبت ہے وہ کس وجہ سے ہے؟ مطلب یہ ہے کہ ایسی ارادت انعام و اکرام کی وجہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ کچھ روحانی اور قلبی تعلق ہے۔

استفہام اور استعجاب نے بلاغت پیدا کر دی ہے۔

٢۔ تو وہ ہستی ہے کہ اگر تو اپنی محفل آراستہ کرے تو بزم مہ و مہر کو بھی تیری ذات سے رونق حاصل ہو جائے۔

٣۔ تیرے مقابلے میں میں وہ ہوں کہ اگر میں اپنے آپ پر غور کرتا ہوں تو غیر تو دور رہے مجھے خود اپنے آپ سے نفرت ہوتی ہے۔

٤۔ خدا اس خستگی یعنی خستہ دلی کا بھلا کرے کہ جس کے سبب سے میرے دل کو تیرے ہاتھ سے ایک گونہ نسبت حاصل ہے مطلب یہ ہے کہ میں مفلس ہوں اس لئے تیرا دستِ کرم مجھ تک پہنچتا ہے۔

٥۔ تیرے ہاتھ میں ہمیشہ توسنِ دولت و حکومت کی باگ رہے بس قاضیِ حاجات سے شام و سحر میری یہی دُعا ہے۔

٦۔ اس شعر میں ایہام ہے۔ ''خضر سلطان'' بہادر شاہ بادشاہ کے ایک فرزند کا بھی نام تھا۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ پہلے لکھ چکے ہیں۔

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز   شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

٧۔ ریو وریا بمعنی مکاری و ریاکاری۔ غالبؔ پر ریاکاری اور مکاری کا شبہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ ایک خاک نشین فقیر ہے اور اہلِ خرابات سے ہے۔ مطلب یہ ہے۔ زاہد لوگ ریاکار ہو سکتے ہیں رند نہیں ہوتے۔

☆☆☆☆☆☆☆

آخری چہار شنبہ

۲۴۸

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو ۱ رکھ دیں چمن میں بھر کے مےِ مشکبو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پئے اور ہو کے مست ۲ سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
غالبؔ یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ ۳ بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں ۴ ہے جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ ماند
یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے ۵ لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند

۱۔ آج آخری چہار شنبہ ہے۔ چلو ہم بھی چمن میں مےِ مشکبو کی ناند بھر کر رکھ دیں' کیونکہ آج کے دن احباب سبزہ روندنے کے لئے چمن میں آئیں گے۔ گلگشت باغ کے ساتھ مے نوشی کا بھی لطف رہے گا۔ ماہِ صفر کے آخری چہار شنبے کو جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا یوم صحت ہے۔ لال قلعہ میں اس روز روشنی کی جاتی تھی اور سونے چاندی کے چھلّے تقسیم ہوتے تھے۔

آسیؔ لکھتے ہیں۔ ممکن ہے محرم کی حرمت کی وجہ سے آخر ماہ صفر تک غالبؔ بادہ نوشی نہ کرتے ہوں اور اسی وجہ سے کہا ہو کہ اس دن صفر کا مہینہ ختم ہو جائے گا۔ چلو باغ میں شراب کی ناند بھر کر رکھ دیں۔

یہ مفہوم قرین قیاس نہیں ہے۔

۲۔ تاکہ جو باغ میں آئے وہ شراب بھر کے جام پئے اور پھر مستی کے عالم میں سبزے کو روندتا پھرے اور پھولوں کے پودوں کو پھاند جائے۔

۳۔ غالبؔ! تم یہ کیا فضول باتیں لکھ رہے ہو۔ اب مجھے بادشاہ کی مدح کے سوا دوسری کوئی بات لکھنی اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے۔ تشبیب کو چھوڑو اور مدح شروع کرو۔

۴۔ آج بادشاہ کے محل میں سونے چاندی کے چھلّے تقسیم ہو رہے ہیں۔ ان چھلّوں کی چمک دمک کے سامنے مہر و ماہ کا سیم و زر بھی ماند ہے مطلب یہ ہے کہ یہ چھلّے مہر و ماہ سے زیادہ چمکدار ہیں۔ ان چھلّوں کو دم کئے ہوئے پانی میں بجھا کر بانٹا کرتے تھے۔

۵۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ چھلّے نہیں ہیں بلکہ لاکھوں چاندوں اور بیشمار سورجوں کو بیچ میں سے خالی کر دیا ہے۔

مدح شاہ

۲۴۹

اے شاہِ جہانگیر' جہاں بخش جہاندار' ۱ ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو ۲ تو وا کرے اُس عقدے کو سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟ ۳ گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا ۴ ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت!
ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی ۵ ہے داغِ غلامی ترا، توقیعِ امارت
تُو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلان ۶ تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی ۷ باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل ۸ ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دُعا پر ۹ قاصر ہے ستائش میں تری میری عبارت
نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں ۱۰ نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھ کو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک!
غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

۱۔ اے بادشاہِ جہاں گیر! اے بادشاہِ جہاں بخش اور اے بادشاہِ جہاندار تجھ کو غیب سے سو طرح کی بشارتیں حاصل ہیں۔ بیخودؔ لکھتے ہیں کہ متذکرہ صفات تجھے اس وجہ سے حاصل ہیں کہ تجھے ہر کام کے لئے پہلے سے بشارت ہو جاتی ہے۔

۲۔ وہ عقدۂ دشوار جو باوجود کوششوں کے وا نہیں ہوتا' وہ تیرے اشارے سے کھل جاتا ہے۔

۳۔ اس وقت تک حضرتِ خضر تذکرِ خیر سکندر سے نہیں کر سکتے جب تک وہ آبحیات سے اپنا منہ پاک نہ کر لیں۔ پہلے مصرعہ میں استفہامِ انکاری ہے۔

۴۔ آصف برخیا حضرت سلیمان کے وزیر تھے۔ ان کو حضرت سلیمان کی وزارت سے فخر حاصل تھا۔ اگر چہ حضرت سلیمان تیری وزارت کریں۔ تو ان کیلئے تیری وزارت باعثِ فخر ہوگی۔ دوسرا مفہوم یہ ہے

جو شخص تیری وزارت کرے، وہ سلیمان کے لئے باعثِ فخر ہے۔

۵۔ جس کو تو نے اپنا مرید کر کے مریدی کی سند دے دی۔ گویا اسے فرمانِ الٰہی مل گیا اور جس کو تیرا داغِ غلامی نصیب ہو گیا گویا اسے امیری کی سند مل گئی۔ مطلب یہ ہے تیری غلامی امیری سے بڑھ کر ہے۔

۶۔۷۔ لف ونشر مرتب ہے۔ اگر تُو پانی کے بہنے کی طاقت دفع کر دے تو دریا کی موجوں میں روانی ڈھونڈے نہ ملے اور اگر تُو آگ کی حرارت سلب کر دے تو جلا دینے والی آگ میں حرارت نام کو باقی نہ رہے۔

۸۔ توغّل:۔ مہارت کامل ÷ سحر طرازی:۔ فنِ شاعری ÷

اگرچہ میں شاعری میں مہارت کامل رکھتا ہوں۔ اور اگرچہ میں سحر طرازی میں مشّاق ہوں۔

۹۔ میرا ارادہ تھا کہ میں تجھ سے کچھ تیری شکایتیں کروں۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ میری عبارت تیری شکایت میں قاصر ہے۔ میں تیری شکایت نہیں لکھ سکتا۔ اس لئے مجبوراً مدح کو دُعا پر ختم کرتا ہوں۔

۱۰۔ نظارگی بمعنی دیکھنے والے اسمِ فاعل۔ آج نوروز ہے گویا آج وہ دن ہے کہ اہلِ بصیرت آج تجھے دیکھ رہے ہیں۔

۱۱۔ نوروز کے دن آفتاب برجِ حمل میں ہوتا ہے اور یہ صورت شادمانیِ خلق کا باعث ہے۔ اسے شرفِ آفتاب کہتے ہیں۔ تجھے شرفِ آفتاب جہاں تاب مبارک ہو اور مجھے تیرے عتبۂ عالیہ (آسمان بلند) کی زیارت۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ تجھے آفتاب کا شرف و مرتبہ مبارک ہو۔

۲۵۰

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو ۱ اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو ۲ روزہ اگر نہ کھائے تو مجبور کیا کرے

اس قطعہ کے متعلق مرزا نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔ "یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کے حضور میں پڑھا تھا۔ اس کو سن کر تمام حاضرین بے اختیار ہنس پڑے تھے۔

دستگاہ:۔ بمعنی قدرت ومقدور ÷ روزہ کھانے سے مراد روزہ نہ رکھنا ہے۔ جس شخص کو روزہ کھولنے کا تھوڑا بہت مقدور ہے اسے روزہ ضرور رکھنا چاہئے۔ لیکن جس شخص کے پاس روزہ کھولنے کے بعد کھانے کے لئے کچھ نہ ہو وہ غریب اگر روزہ نہ کھائے۔ تو کیا کرے۔

گزارشِ مصنف بحضورِ شاہ

۲۵۱

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ ۱ اے جہاں دارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں ۲ تھا میں اِک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ۳ ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز ۴ روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری ۵ ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی ۶ جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں ۷ بادشہ کا غلامِ کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مدّاح ۸ تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار!
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر ۹ نسبتیں ہو گئیں مشخص چار!
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں ۱۰ مدعائے ضروری الاظہار!
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں ۱۱ ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہئے آخر ۱۲ تانہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش ۱۳ جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال ۱۴ کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ ۱۵ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان ۱۶ دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی ۱۷ وقنا ربّنا عذاب النّار
میری تنخواہ جو مقرر ہے ۱۸ اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک ۱۹ خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات ۲۰ اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض ۲۱ اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا ۲۲ ہوگیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں ۲۳ شاعرِ نغز گوئے و خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیے ۲۴ ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجیے! ۲۵ ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد ۲۶ قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا ۲۷ آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ ۲۸ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام ۲۹ شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

حالیؔ:- یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے بادشاہ کے حضور میں اس درخواست کے ساتھ گزرانا تھا کہ ان کی تنخواہ جو ششماہی گزرنے پر اکٹھی چھ مہینے کی ملا کرتی ہے وہ ماہ بماہ ملا کرے۔ چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی تھی۔

۱۔ اے وہ شہنشاہ! کہ تیرا تخت آسمان ہے اور اے وہ جہانباں! کہ تیری حکومت آفتاب کی طرح کل جہان پر ہے۔ اس شعر میں مصنّف نے صنعت براعت الاستہلال صرف کی ہے۔ ممدوح کو آفتاب آثار لکھ کر مطلع ہی میں ظاہر کر دیا ہے کہ موسمِ سرما کی شکایت کریں گے۔

۲۔ میں ایک محتاج گوشہ نشین فقیر اور مصیبت زدہ خستہ دل شخص تھا۔

۳۔ تمہارے آبرو بخشنے سے مجھے بہت زیادہ عزّت و شہرت حاصل ہوئی۔

۴۔ گویا تمہاری ذرّہ نوازی سے مرتبہ اس قدر بلند ہوا کہ مجھ سے ذرّۂ بے مقدار کو سیارے جاننے اور پہچاننے لگے ہیں۔

۵،۶۔ اگرچہ اپنی بے ہنری کی وجہ سے میں خود اپنی نظروں میں اتنا حقیر و ذلیل ہوں کہ اگر میں اپنے آپ کو خاکی کہوں تو یہ سُن کر خاک کو بھی شرم آ جائے۔

۷۔ لیکن پھر بھی میں اپنے دل میں خوش ہوں کہ میں بادشاہ کا ایک کارگزار غلام ہوں۔

۸۔ یہ خانہ زاد غلام، مرید اور مدّاح ہمیشہ سے عرائض نویسی کی خدمت انجام دیتا تھا۔

۹۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آخرکار میں نوکر بھی ہوگیا۔ اور حضور سے مجھے مذکورہ بالا چار نسبتیں ہوگئیں۔ یعنی خانہ زاد، مرید، مدّاح اور عریضہ نگار ہوگیا۔

۱۰۔ اگر میں اپنا ضروری مدّعا آپ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔

۱۱۔ اے پیرومرشد (بادشاہ) اگرچہ مجھے سر اور دستار کو آرائش دینے کا شوق نہیں۔

۱۲۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ لباس تو جاڑے میں ہونا چاہئے۔ تاکہ موسمِ سرما کی سخت ٹھنڈی ہوا تکلیف نہ دے۔

۱۳۔ اگرچہ میرا جسم لاغر اور کمزور ہے، لیکن پھر بھی مجھے لباس کی تو ضرورت ہے۔

۱۴۔ میں نے اس سال کپڑے وغیرہ بالکل نہیں خریدے اور اس بار کچھ نہیں بنایا۔

۱۵۔ رات کو آگ سینک کر گزارہ کرتا ہوں اور دن کو دُھوپ تاپ کر۔ ایسے دن رات بھاڑ میں جائیں، جن میں میری یہ حالت ہو۔

۱۶۔ انسان آخر کہاں تک آگ تاپے اور کب تک دُھوپ کھائے۔

۱۷۔ دُھوپ کی تپش اور آگ کی حرارت سے بس خدا ہی بچائے۔ وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار یعنی خدا ہم کو آگ (دوزخ) کی گرمی سے بچائے۔

۱۸۔ ہنجار بمعنی طریقہ۔ قلعہ سے جو میری تنخواہ مقرر ہے، اس کے ملنے کا عجب ڈھنگ ہے۔

۱۹۔ دُنیا کا دستور ہے کہ مُردے کی چھ ماہی سال میں ایک مرتبہ ہوتی ہے۔

۲۰۔ لیکن مجھے دیکھئے کہ میں زندہ ہوں مگر میری چھ ماہی سال میں دو بار ہوتی ہے۔ چھ مہینے کے بعد تنخواہ ملنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں زندہ ہوں مگر مُردوں سے بدتر۔

۲۱۔ سود کی تکرار۔ یعنی سود در سود۔ میں ہر مہینے قرض لیتا ہوں اور اس طرح سود بڑھتا چلا جاتا ہے۔

۲۲۔ ان حالات میں ساہوکار میری تنخواہ میں ایک تہائی کا شریک ہوگیا ہے۔ یعنی ایک تہائی تنخواہ سود میں لگ جاتی ہے۔

۲۳۔ نغز گو بمعنی خوش گو۔ موجودہ دور میں مجھ جیسا خوش گو اور معنی آفریں شاعر نہیں ملے گا۔

۲۴۔ اگر میری زبان سے جنگ و جدل کا بیان سُنیں تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ میری زبان ہی شمشیر جوہردار ہے۔

۲۵۔ اگر آپ مجھ سے بزم کا نقشہ کھچوائیں تو آپ محسوس کریں گے۔ کہ میرا قلم ابرِ گوہر بار ہے یعنی ہر طرف موتی برسائے گا۔

غالبؔ قلم کو مذکر لکھتے ہیں۔ اہلِ دہلی ہمیشہ سے مونث کہتے ہیں۔

۲۶۔ جب مجھ میں ایسا جوہر قابلیت موجود ہے تو ظلم ہوگا کہ آپ میرے کلام کی داد نہ دیں اور قہر ہوگا۔ اگر آپ میری قدر نہ کریں۔

۲۷۔ غضب ہے کہ میں آپ کا غلام ہوتے ہوئے ننگا پھروں اور آپ کا نوکر ہو کر قرض کھاؤں۔ گویا یہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔

۲۸۔ مہربانی فرما کر میری تنخواہ بجائے چھ ماہی کے ماہ بماہ کر دیجئے۔ تاکہ میں آرام سے زندگی بسر کر سکوں۔

۲۹۔ میں اپنا کلام اب دُعا پر ختم کرتا ہوں۔ چونکہ یہ قطعہ مرزا صاحب نے اپنی خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادہ لکھا ہے۔ نیز قصیدہ کے قوانین کو بھی مدِنظر نہیں رکھا۔ اس لئے کہتے ہیں کہ مجھے شاعری سے کوئی سروکار نہیں۔ شاعری سے یہاں صنعتِ شاعرانہ مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس قطعہ میں کسی قسم کی صنعتِ شاعرانہ نہیں ہے۔

۳۰۔ آپ ہزار برس زندہ سلامت رہیں اور ہر برس کے دن پچاس ہزار ہوں۔ یعنی آپ کا اقبال و دولت ابد تک رہے۔

۲۵۲

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے ۱ جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے ۲ کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

۱۔ سیہ گلیم بمعنی سیاہ پوش یعنی سیاہ بخت۔ چونکہ میں بدنصیب و بدبخت ہوں، اس لئے دنیا میں جو شخص فتح و ظفر کا طلبگار ہے اسے چاہئے کہ میرا نام نہ لے۔ اگر میرا نام لے گا تو کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکے گا۔

۲۔ میں وہ بدنصیب ہوں کہ آج تک مجھے کسی پر غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ جو شخص میرا شریک ہوتا ہے، اس کا حصہ ہمیشہ مجھ سے زیادہ ہوتا ہے۔ شریکِ غالب اس شریک کو کہتے ہیں جس کا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو۔ غالب کے لفظ نے ایک عجیب لطف اور معنی پیدا کر دیئے ہیں۔

۲۵۳

سہل تھا مسہل و لے یہ سخت مشکل آپڑی ۱ مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد ۲ تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے

مسہل:۔ جلاب ÷ تبرید:۔ ٹھنڈائی جو جلاب کی گرمی دُور کرنے کے لئے پی جاتی ہے۔

مسہل لینا تو آسان ہے لیکن سخت مشکل یہ آپڑی ہے کہ بادشاہ کے دربار سے غیر حاضر رہنے سے میری کیا حالت ہوگی۔ مسہل لینے سے پہلے تین دن میں منضج پیوں گا۔ اس کے بعد تین دن مسہل ہوں گے اور پھر تین دن تبریدیں ہوں گی۔ اس طرح سے میں بارہ دن غیر حاضر رہوں گا۔ مولانا حالیؔ لکھتے ہیں۔ ایک شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل، جن میں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں۔ کس عمدگی سے بیان کی ہے۔ یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔ (یادگارِ غالبؔ)

قطعہ تاریخ

۲۵۴

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ نہ کیوں ہو مادہ سالِ عیسوی "محظوظ"

خجستہ: مبارک ÷ طوے:۔ جشنِ عروسی ÷ محفوظ:۔ خوش، سرور ÷ فرخندہ:۔ مبارک ÷ محظوظ سے سن عروسی نکلتا ہے۔

۲۵۵

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اس کی کیا ہے تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"

ناہید:۔ زہرہ۔ اس ستارے کو رقاصہ فلک بھی کہتے ہیں۔

۲۵۶

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں، دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

حالی:- بادشاہ کے دربار کے یہ آداب تھے کہ آپس میں جو دربار دار وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے۔ چونکہ اُردو محاورے میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ آشنا نہیں۔ اس لئے میرزا نے اس کو اس پرائے میں بیان کیا ہے۔

رُباعیات

۲۵۷

بعد اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال ایّامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آپہنچے ہیں تاسوادِ اقلیمِ عدم اے عمرِ گذشتہ یک قدم استقبال

اتمام بمعنی ختم کرنا۔ انجام کو پہنچانا۔ بچپن کی خوشیوں کا زمانہ ختم کرنے کے بعد مست الست جوانی آئی۔ جوانی کے دن غفلت میں گزرے۔ اب ہم ملک کے گردونواح میں پہنچ گئے۔ یعنی بڈھے ہوگئے۔ اے عمر گزشتہ! چونکہ تو عدم میں ہے اس لئے ہمارے استقبال کے لئے ایک قدم آگے جا۔ مطلب یہ ہے کہ جوانی کے ایک قدم آگے آجانے سے شبابِ رفتہ بھی چندون کیلئے واپس آجائے گا۔

لیّامِ شباب کے واپس آنے کی آرزو ظاہر کی ہے۔

۲۵۸

شبِ زلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُر نم تھا

رات کو مجھے اس محبوب کی زلف اور اس کے عرق فشاں چہرے کا غم تھا۔ میں اپنی کیفیت کیا بیان کروں۔ بس سمجھ لیجئے۔ میری کچھ عجیب حالت تھی۔ اسی عالم میں صبح تک میں ہزار آنکھ سے روتا رہا اور وہ اس طرح سے کہ میرا ہر قطرۂ اشک ایک چشم اشک ریز تھا۔ زلف و رُخ کے تصور میں چونکہ ہزار آنسو بہائے۔ اس لئے ان آنسوؤں نے زلفِ یار کی سیاہی اور رخِ یار کی سفیدی پیدا کرلی اور اس سیاہی اور سفیدی کی وجہ سے ہر

آنسو ایک آنکھ بن گیا۔ ظاہر ہے آنکھ میں سفیدی اور سیاہی ہوتی ہے۔ اس لئے میں ہزار آنکھ رویا۔

۲۵۹

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

جیسے آتش بازی بچوں کا کھیل ہے۔ بس سوزِ دل کی بھی بالکل یہی کیفیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے موجدِ عشق بھی کوئی قیامت کا پتلا تھا۔ جو اِن طفلانِ پری چہرہ کے لئے یہ کھیل ایجاد کر گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ستم پیشہ لوگ عاشقوں کے سوزِ جگر کا آتشبازی کی طرح تماشہ دیکھتے ہیں اور خوب خوش ہوتے ہیں۔

۲۶۰

دل تھا کہ جو جانِ درد تمہید سہی بیتابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلی افسوس تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

جانِ درد تمہید:- وہ جان جس کا آغاز درد سے ہوا ہو÷ فسردن:- افسردن ہونا÷ تجلی سے تجلیِ یار مراد ہے÷ تجدید:- ازسرِ نو پیدا کرنا÷

پہلے ہمارے پہلو میں دل تھا۔ جو ہم نے پُر درد زندگی۔ بیتابیِ رشک اور حسرتِ دید کی تکلیفوں کو برداشت کرلیا۔ لیکن اب ہم ہیں اور افسردگی۔ اس حالت میں اے تجلیِ یار! اگر متذکرہ بالا کیفیتوں کا اعادہ ممکن نہیں تو پھر انہیں ازسرِ نو ہی پیدا کردے۔ ظاہر ہے تکرار معدوم کی محال ہے۔ لیکن تجدید ممکن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ افسردگی، بیدلی، بیتابی اور رشک و حسرت کی آرزو ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر زندگی بے لطف ہوگئی ہے۔

۲۶۱

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورت کاغذ باد ملتے ہیں یہ بدقماش لڑنے کے لئے

حسد قماش:- حسد شعار÷ وحشت کدۂ تلاش:- دُنیا مُراد ہے÷ کاغذ باد:- پتنگ÷

فرماتے ہیں دُنیا کے رہنے والے حسد شعار ہیں۔ اور یہ دُنیا جو وحشت کدۂ تلاشِ معاش ہے لڑنے کے واسطے ہے۔ اس دُنیا میں دو شخصوں کا ملنا ایسا ہے۔ جیسے پتنگ کا ملنا۔ جب آپس میں ملتے ہیں لڑتے ہیں۔

گویا انسان کا انسان سے ملنا جنگ وجدل کا مترادف ہے۔

۲۶۲

دل سخت نژند ہوگیا ہے گویا   اس سے گلہ مند ہوگیا ہے گویا!
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں   غالبؔ منہ بند ہوگیا ہے گویا!

نژند بمعنی غمگین۔ مرادل بہت زیادہ غمگین ہے اور افسردہ ہوگیا ہے۔ گویا یار سے کچھ شکایتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ لیکن یار سے رنجیدہ اور گلہ مند ہونے کے باوجود ہم اس کے سامنے کچھ شکوہ شکایت کرہی نہیں سکتے۔ گویا اس کے سامنے منہ ہی بند ہوگیا۔ مصرعۂ آخر کے گویا کے لفظ میں ایہام ہے۔

۲۶۳

دکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالبؔ   دل رک کے بند ہوگیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں   سونا سوگند ہوگیا ہے غالبؔ

سوگند بمعنی قسم یعنی معدوم۔ غالبؔ میرے دل کو دکھ پسند آگیا ہے۔ اور غم کی وجہ سے میں اتنا گرفتہ خاطر ہوا ہوں کہ دل کی حرکت ہی بند ہوگئی ہے۔ خدا کی قسم! مجھے رات کو بالکل نیند نہیں آتی' گویا نیند آنا قسم کے برابر ہے۔ اکثر دیوانوں میں اس رباعی کا دوسرا مصرعہ غلط لکھا ہے۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ غالبؔ کو خود صحیح کیے ہوئے دیوان میں بھی یہ مصرعہ اسی طرح لکھا ہے۔ بہرحال مصرعہ کو رباعی کے وزن میں رکھنے کے لئے "رک" ایک مرتبہ ہونا چاہیئے۔

۲۶۴

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل   سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل!

چونکہ میرا کلام بہت ہی زیادہ مشکل ہے اس لئے سخنورانِ کامل اسے سن سن کر مجھ سے آسان کہنے کی فرمائش کرتے ہیں۔

حالی:- آخر کے مصرعہ میں دو معنی پیدا ہوگئے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر میں ان کی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے اور اگر آسان کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ برا مانتے ہیں اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخندان کامل کی

نافہمی اور کند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اگر صاف صاف بات نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں۔

۲۶۵

بھیجی ہے جو مجھ کو شہ جمجاہ نے دال   ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال   ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال!

شاہ جمجاہ:- جمشید جیسے مرتبے والا جلیل القدر بادشاہ' دوسرے مصرعہ میں دال کے معنی "دلالت کرنے والی"۔

بادشاہ کے ہاں اکثر مونگ کی دال پکا کرتی تھی اور وہ شاہ پسند دال کہلاتی تھی۔ کہیں بادشاہ نے یہ دال میرزا کو بھیجی ہے اور میرزا نے یہ رباعی اس کے شکریے میں لکھی ہے۔

جلیل القدر بادشاہ نے جو مجھ کو دال بھیجی ہے۔ یہ شہنشاہ کے لطف وعنایات پر دلالت کرتی ہے۔ یہ شاہ پسند دال بے شک وشبہ دولت' دین' دانش اور عدل کی دال ہے۔

۲۶۶

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلال باہم   آثارِ جلالی و جمالی باہم!
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم   ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

سافل و عالی بمعنی ادنے و اعلے ہمارے بادشاہ میں جلال و جمال کی دونوں صفات موجود ہیں۔ ہر طبقے کے لوگ اس سے کیوں نہ خوش ہوں کہ اب کی مرتبہ شبِ قدر اور دیوالی دونوں ایک ہی دن ہیں۔ اس رباعی کے الفاظ نہایت متناسب واقع ہوئے ہیں۔ شبِ قدر علوی اور دیوالی سفلی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۶۷

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے   تاشاہ یشوعِ دانش و داد کرے!
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ   ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے!

یشوع:- پھیلانا۔ رواج دینا + رشتۂ عمر:- ایک ڈوری ہوتی ہے۔ جس میں ہر سال ولادت کے دن گرہ لگائی جاتی ہے +

یہ رُباعی بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر لکھی ہے۔

کہتے ہیں' خدائے تعالے بادشاہ کو زندہ سلامت رکھے اور اس کی بقا سے رعایا کو شاد و آباد رکھے۔

دانش وعدل بادشاہ کے دم قدم سے جاری ہیں۔ وہ زندہ رہیں گے تو دانش وعدل جاری وساری رہیں گے۔ اس سالگرہ کی تقریب پر جو رشتہ عمر میں گرہ لگائی گئی ہے' وہ اصل میں صفر ہے' جو عدد کے سامنے لگایا گیا ہے۔ تا کہ اعداد عمر میں اضافہ ہو جائے۔ مثلاً اگر بادشاہ کی عمر ساٹھ سال ہے تو صفر لگنے سے ۶۰۰ سال کی ہو گئی۔

۲۶۸

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا — اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کریں! — ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

یہ رباعی بھی سالگرہ کے موقع کی ہے۔ اس رشتہ عمر میں لاکھ تار ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوں اور پھر اتنے ہی برس گنے جائیں' نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ شمار ہوں۔ شاعر کی محبت اس پر بھی اکتفا نہیں کرتی' وہ کہتا ہے یوں بھی نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہر سال کی بجائے ہر سو سال کے بعد رشتہ عمر میں گرہ لگائی فرض کی جائے اور ایسی گرہیں ہزار ہوں مطلب یہ ہے کہ بادشاہ لاکھوں برس کی عمر پائیں۔ اہل لکھنؤ سینکڑہ میں نُون غنہ نہیں بولتے۔ دلّی والے ہمیشہ سینکڑہ کہتے ہیں۔

۲۶۹

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں — عشاق کی پرستش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا — کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ اب اُس نے مردم آزاری ترک کر دی ہے۔ پہلے وہ عشاق کا حالِ زار دریافت کرنا عیب کی بات سمجھتا تھا۔ لیکن اب بلا تکلف انکی کیفیت دریافت کرتا ہے۔ لیکن میں یہ بات ہرگز نہیں مانتا۔ کیونکہ جو ہاتھ اُس نے ظلم سے روکا ہوگا۔ اُس میں ضرور تلوار ہوگی۔ تیسرے مصرعہ میں ہاتھ اُٹھانا ذو معنی ہے (۱) کسی کام سے ہاتھ اُٹھانا یا اس سے دست بردار ہونا (۲) مارنے کیلئے ہاتھ اُٹھانا۔ اس محاورے کے استعمال سے ایک نیا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

۲۷۰

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے — کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ — وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

حالی:- اس رباعی میں میرزا نے غائیت درجہ کی شوخی برتی ہے۔ جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی

ہے۔ کہتا ہے کہ ہم چند دربار کے بااختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ مگر وہ ہماری کارروائی میں درنگ اور لیت ولعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو۔ وہ تو آپ ہی صبح وشام کرنے والے ہیں۔ صبح وشام کرنا لیت ولعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح وشام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصلی مقصود یہی ہے کہ کارروائی خلق میں جیسی لیت ولعل وہاں ہوتی ہے۔ ایسی کہیں نہیں ہوتی۔ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

۲۷۱

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن — خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اس قطعہ کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون نظم کیا ہے۔ بادشاہ کے حضور میں پیش کی گئی تھی۔ کہتے ہیں۔ میں کھانے اور سونے کے سامان اور آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں۔ روزہ رکھنا میرا ایمان ہے لیکن روزہ گزارنے کے لئے خس کی ٹٹیوں اور برف آب کی ضرورت ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ وہ کہاں سے مہیا کروں۔ مطلب یہ ہے کہ روزہ رکھنے کے سامان بہم پہنچ سکتے تو میں ضرور روزہ رکھتا۔

تمام شُد

ہے۔ کہتا ہے کہ ہم چند دربار کے بااختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ مگر وہ ہماری کارروائی میں درنگ اور لیت ولعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو۔ وہ تو آپ ہی صبح وشام کرنے والے ہیں۔ صبح وشام کرنا لیت ولعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ وہ صبح وشام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصلی مقصود یہی ہے کہ کارروائی خلق میں جیسی لیت ولعل وہاں ہوتی ہے۔ ایسی کہیں نہیں ہوتی۔ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

۲۷۱

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن — خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اس قطعہ کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون نظم کیا ہے۔ بادشاہ کے حضور میں پیش کی گئی تھی۔ کہتے ہیں۔ میں کھانے اور سونے کے سامان اور آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں۔ روزہ رکھنا میرا ایمان ہے لیکن روزہ گزارنے کے لئے خس کی ٹٹیوں اور برف آب کی ضرورت ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ وہ کہاں سے مہیا کروں۔ مطلب یہ ہے کہ روزہ رکھنے کے سامان بہم پہنچ سکتے تو میں ضرور روزہ رکھتا۔

تمام شد

Bayane Ghalib Sharah Deewane Ghalib

(Complete Works of Ghalib with Meanings & Translation in Urdu)

by

Agha Mohammad Baqar

Ghalib as a poet

With the conquest of India by Persians, the art of ghazal writing came along in the wake of it. Though Ghalib's master pieces of art are in Persian, the irony is that he derived greater fame from the Urdu versions. He delivered excellence in quality to the Urdu languages of ghazal. The ghazal is a verse of amorousness - boy meets girl - the cry of a wounded gazelle. To understand ghazal, especially the ones by Ghalib, I think the reader wants to know that in this form of verse, the thought contained in every couplet is supposed to be independent and complete. In rare cases if it shows some relation with others, it is the skill of a master poet. The theme or mood of the ghazal need not be the same throughout because it is simply a diamond of many facets. Ghalib polished it with humanity. He is not a gloomy poet like good old Mir, instead he believed a poet should create beauty out of terror, flowers out of fire and good out of evil. He invited grief and misery till death, as though his contented soul had nothing to live for.



Kitabi Duniya
1955, T. Gate, Delhi - 6 (Ph : 3274847)


ISBN-81-87666-01-3